سہ ماہی **فکر و نظر** علی گڑھ

جلد ۲۴ | جنوری ۸۷ء تا جولائی ۱۹۸۸ء

مدیر معاون: محمد صابر

مجلسِ ادارت

* سیّد ہاشم علی (صدر)
(وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی)

* پروفیسر وصی الرحمٰن
(پرو وائس چانسلر)

* پروفیسر وحید اختر
* ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
* پروفیسر نسیم انصاری
* پروفیسر ایم۔ ایس۔ زیڈ چغتائی
* پروفیسر فصیح احمد صدیقی
* پروفیسر افضال قریشی

— سیٹنگ : ساجد علی خاں

قیمت: پچیس روپے ۲۵/

تیسرا کارواں

اداریہ		٥
مولانا حمید الدین فراہی	عبید اللہ فہد	٧
مولانا شوکت علی	قمر الہدیٰ فریدی	٢١
مولانا محمد علی جوہر	ڈاکٹر مشرف علی	٣١
راجہ غلام حسین	ضیاء الدین احمد برنی	٤٩
مولانا عبد الرزاق کانپوری	سعیدہ بانو	٥٣
مولانا ظفر علی خاں	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	٦١
میر محفوظ علی بدایونی	شمس بدایونی	٧٥
مقتدیٰ خاں شروانی	مالک رام	٨٧
ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری	پروفیسر خورشید الاسلام	٩٣
نواب احمد سعید خاں چھتاری	الطاف حسین ندوی	١٠١
مولانا اسلم جیراجپوری	ڈاکٹر محمد سالم قدوائی	١١٥
فانی بدایونی	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	١٢٧
چودھری خلیق الزماں	ڈاکٹر شان محمد	١٣٥
پروفیسر عبد المجید قریشی	ڈاکٹر جمال آرا نظامی	١٥١
سلطان حیدر جوش	وحید احمد	١٥٩
حسرت موہانی	پروفیسر نور الحسن نقوی	١٦٥
محمود احمد عباسی امروہوی	مالک رام	١٧٧
حکیم احمد شجاع	شہپر رسول	١٨٣
خان عبد الغفار خاں	محمد محمود فیض آبادی	١٨٩
سر سکندر حیات خاں	عبد المجید سالک	١٩٥
پروفیسر ہارون خاں شروانی	حسن الدین احمد	١٩٩
خلیفہ عبد الحکیم	ڈاکٹر محمد انظار الحق	٢٠٥

ڈاکٹر ذاکر حسین ——— ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ——— ۲۱۷
چارلس ایبروز اسٹوری ——— ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ——— ۲۳۵
رفیع احمد قدوائی ——— ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ——— ۲۴۱
پروفیسر رشید احمد صدیقی ——— مالک رام ——— ۲۴۷
کے۔ ایم۔ سردار پانیکر ——— پروفیسر محب الحسن ——— ۲۵۵
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ——— ضیاء الحق چودھری ——— ۲۶۱
سید سجاد حیدر یلدرم ——— پروفیسر ثریا حسین ——— ۲۶۹
ڈاکٹر عابد حسین ——— ڈاکٹر صغرا مہدی ——— ۲۷۵
مولانا ابوبکر شیث ——— محمد صابر صبرحدی ——— ۲۸۱
پروفیسر ابوبکر حلیم ——— جلیل قدوائی ——— ۲۸۷
مولانا احسن مارہروی ——— ڈاکٹر ظفر الاسلام ——— ۲۹۵
اقبال سہیل ——— ڈاکٹر اخلاق احمد ——— ۳۰۹
خواجہ غلام السیدین ——— صالحہ عابد حسین ——— ۳۱۹
راجہ راؤ ——— پروفیسر محمد یٰسین ——— ۳۲۷
عظیم بیگ چغتائی ——— محمد علی جوہر ——— ۳۳۷
خواجہ منظور حسین ——— پروفیسر اسلوب احمد انصاری ——— ۳۴۵
مولانا عبدالعزیز میمن ——— شیخ نذیر حسین ——— ۳۵۳
شفاء الملک حکیم عبد اللطیف ——— پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن ——— ۳۶۱
مولانا ضیا احمد بدایونی ——— مالک رام ——— ۳۷۱
مسز ممتاز جہاں حیدر ——— پروفیسر ثریا حسین ——— ۳۷۹
شیخ عبداللہ ——— پروفیسر آل احمد سرور ——— ۳۸۵
پروفیسر سالم کرنیکو ——— ڈاکٹر عبدالباری ——— ۳۹۳
ایل کے حیدر ——— مختار مسعود ——— ۴۰۵
عبدالماجد دریابادی ——— ظفر حسین خاں ——— ۴۱۷
پروفیسر ہادی حسن ——— ڈاکٹر کبیر احمد جائسی ——— ۴۲۵
پروفیسر محمد بابر مرزا ——— پروفیسر اطہر صدیقی ——— ۴۳۳
پروفیسر خلیل احمد چودھری ——— ڈاکٹر محمّد اقبال ——— ۴۴۳
ڈاکٹر یوسف حسین خاں ——— سید صباح الدین عبدالرحمٰن ——— ۴۴۹
سیدنا ابو محمد طاہر سیف الدین ——— ڈاکٹر حامد علی خاں ——— ۴۵۵

اداریہ

ناموران علی گڑھ کے تیسرے کارواں کی پہلی جلد پیش ہے۔ تیسرے کارواں میں اتنے اور ایسے اہم نام ہیں کہ سب کو ایک جلد میں پیش کرنا آسان نہیں تھا اس لیے یہ طے کیا گیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کردیا جائے۔ دوسری جلد آئندہ سال آپ کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ کچھ مضامین جمع ہوچکے ہیں ان میں سے بعض کی کتابت بھی ہوچکی ہے۔ کچھ لکھوائے جارہے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ تیسرے کارواں کی دوسری جلد میں ان تمام اہم ناموروں پر مضامین آجائیں جو اَب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

تیسرے کارواں کی پہلی جلد پروفیسر نورالحسن نقوی کی نگرانی میں ترتیب دی گئی اس لیے اس کی جملہ خوبیوں کی داد کے وہ مستحق ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے اس کو مرتب کیا، اس کی اشاعت میں بھی ان کے قیمتی مشورے شامل ہیں۔ نئی مجلس ادارت کی طرف سے ہم ان کو اور ان کی مجلس ادارت کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یقین ہے کہ آئندہ بھی ان کا تعاون اور مشورے ہمیں حاصل رہیں گے۔

"فکر و نظر" یونیورسٹی کا سہ ماہی علمی اور تحقیقی مجلّہ ہے جس کا مقصد اردو میں ایسے علمی، تحقیقی اور ادبی مضامین کی اشاعت ہے جن سے غور و فکر کے نئے پہلو سامنے آئیں نیز سرسید تحریک کے اہم گوشوں کا جدید تحقیقات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور ان کی عصری معنویت کو نمایاں کیا جائے۔ اس سلسلے میں جہاں ہم علی گڑھ کے ممتاز محققین اور عالموں کا تعاون حاصل کریں گے وہیں علی گڑھ سے باہر کے ممتاز دانشوروں کو بھی دعوت دیں گے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ رسالہ پابندی سے شایع ہو اور صحیح لوگوں تک پہونچے۔

وائس چانسلر سیّد ہاشم علی اختر صاحب کی نگرانی میں جو نئی مجلس ادارت تشکیل دی گئی ہے اس میں علی گڑھ کے ممتاز دانشور شامل ہیں۔ ان کے تجربے اور علم سے ہم یقیناً فیض حاصل کریں گے اور "فکر و نظر" کے معیار کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کریں گے۔

قارئین سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ہر شمارے کے بارے میں اپنی غیر جانب دار رائے سے نوازیں تاکہ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا اندازہ ہوتا رہے اور ہم ان رایوں کی روشنی میں اپنی اصلاح کرتے رہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی

عبید اللہ فہد

ـسرآنِ کریم کتابِ ہدایت اور کتابِ انقلاب ہے یہ
دکی تیرہ وتار فضا میں منارۂ نور اور ظلم واستبداد
ـہ اعلانِ جہاد ہے۔ اسی کتاب کی برکت سے عرب کے شتربانِ اقوامِ
ـدی خوان ہو گئے۔ شرک وجاہلیت سے نکل کر عدل و
ـے معلّم قرار پائے۔ لیکن آج اس کے قاری شب وروز کے
ـ باوجود اپنی دنیائے احساسات میں کوئی تبدیلی اور جہالت
ـہ کے خلاف کوئی تپش محسوس نہیں کرتے؟ اس کی وجہ
ـا ہم تو مفسرِ قرآن عبدالحمید فراہی کے فلسفۂ ربط و
ـرآن کو سمجھیے۔

ـولانا کی ولادت ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں اعظم گڑھ
ـا میں واقع ایک دیہات فریہا میں ہوئی۔ والدین نے
ـین نام رکھا، لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد عربی قواعد کی
ـبں حمید الدین کے بجائے مولانا نے عبدالحمید لکھنا شروع
ـا حیات یہی نام چھپتا رہا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے
ـر بزرگ علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں تشنگیٔ علم کی سیر
ـ حاضر ہوئے۔ شبلی نے اس ہونہار طالب علم کی ذکاوت
ـندی سے پتہ چلا لیا کہ آئندہ یہ دین وملت کا نام روشن
ـا چنانچہ انہیں اپنی صحبت میں رکھ لیا اور طلب علم کے
ـوعلامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی کی خدمت میں حاضری
ـاہی کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہاں مختصر مدت کے لیے قیام
اس عرصہ میں CANNING COLLEGE کے معروف

فارسی ادیب خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی سے ملاقات ہو گئی اور
دونوں میں محبت ویگانگت کے تعلقات اس حد تک بڑھے کہ موت
ہی نے انہیں ختم کرنے کی جرارت کی۔

عربی وفارسی کی یہ تعلیم علامہ کے لیے کافی ثابت نہ ہوئی اور
علامہ فیض الحسن سہارنپوری کی ادبی صلاحیت سے مستفید ہونے
کے لیے لاہور پہنچ گئے۔ لیکن علامہ سہارنپوری کے پاس فاضل وقت
نہ تھا کہ کسی کے لیے مزید جاں فشانی کرتے انہوں نے اورینٹل
کالج کے علاوہ اوقات میں پڑھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب
اصرار بڑھا تو بڑی مشکل سے کالج آنے اور واپس ہونے کے جو
اوقات ہیں ان ہی میں کچھ درس دینے پر تیار ہوئے۔ اس کم وقت
میں فراہی نے عربی ادب میں وہ کمال حاصل کیا کہ بقول سید سلیمان
ندوی انہوں نے عربی ادب میں مہارت حاصل کر لی اور شعر وانشاء
پردازی میں اپنے معاصروں سے سبقت لے گئے۔ جاہلیت کے تمام
دیوان کھنگال لیے۔ اس کے مشکل مقامات حل کر کے رکھ دیے
اور انھیں کے رنگ میں قصائد کہنے اور فصحائے عرب کی آن بان کے
ساتھ رسائل لکھنے لگے(۵)

مشرقی علوم میں یہ مہارت ۱۸۸۲ء تک بیس سال کی عمر میں
حاصل ہو گئی اب استاذ قرآن نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کے
حصول کی طرف توجہ مبذول کی کہ اس کے بغیر جدید دنیا کو صحیح اسلام سے
متعارف کرانا ناممکن تھا، چنانچہ اس مقصد کے لیے عالمِ اسلام کے
واحد مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لائے۔ اس وقت تک فراہی

سلام اور محققین کے درمیان ابھرتے اسکالر کی حیثیت سے
ہو چکے تھے چنانچہ سر سید احمد خاں نے انگریزی پرنسپل کی
یں فراہی کو اس تعارف کے ساتھ بھیجا کہ :

میں آپ کی خدمت میں ایک ایسا طالب علم بھیج
رہا ہوں جس کی نظیر کالج کے اساتذہ و طلبار میں
ربی و فارسی زبان دانی میں کوئی نہیں؛؛

ل کالج میں اس وقت علامہ شبلی نعمانی جیسے ماہر فن بھی
، استاد موجود تھے۔ یہ تعارفی کلمات انگریز استاد کو پسند
اور اس نے اپنی اور اپنے اساتذہ کی توہین محسوس کی۔ بھاگا
لی کی خدمت میں پہنچا اور پورا ماجرا بیان کیا۔ اس نے
ں کہا، کیا ہمارے کالج میں واقعی کوئی ایسا طالب علم یا
د موجود نہیں ہے جو اس نئے طالب علم کی طرح عربی و فارسی
، جانتا ہو؟ کیا آپ حضرات کی اس سے توہین نہیں ہوتی؟
رات کی زبان دانی اور علم کے لیے کیا یہ چیلنج نہیں ہے؟ لیکن
خفا کیا ہوتے کہ آج ان کا شاگرد اور برادر خورد ان کی عزت
کا ذریعہ بن رہا تھا، مسکرا کر بولے "شاید سر سید کے یہ
پ حضرات پر گراں گزرے ہیں لیکن میرا معاملہ مختلف ہے۔
اس پر فخر ہے کہ وہ عربی و فارسی میں میرا شاگرد رہ
ہے"۔

علی گڑھ کی علمی و تحقیقی آزاد فضا میں فراہی کو بہت کچھ سیکھنے
قع ملا، یہاں کی علمی مجلسوں، تحقیقی فضاؤں اور ادبی و لسانی
ل میں علامہ نے ایک طرف انگریزی زبان سیکھی اور دوسری
پروفیسر ٹامس آرنلڈ (THOMAS ARNOLD) سے فلسفۂ جدید کے درس
س طرح مجمع البحرین ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ لیکن دوسرے
ن طلبہ کی طرح تہذیب مغرب اور علوم مغرب نے انہیں مستغرب نہیں
بلکہ اس طوفان مغرب کی آشنائی نے انہیں پکا اور سچا مسلمان
عد میں بعض اسباب ایسے آئے کہ فراہی کو بادل نخواستہ علی گڑھ چھوڑنا
یہاں سے الٰہ آباد منتقل ہو کر ۱۸۹۲ء میں بی اے کی ڈگری لی اور
سر بی میں ایم اے میں داخلہ لیا لیکن بعض اسباب کی وجہ سے

امتحان نہ دے سکے(۷)۔ ۱۸۹۷ء میں مدرستہ الاسلام کراچی میں تدریس کی
کوشش کی۔ سر سید مرحوم نے سرٹیفکٹ دیا۔ اسی زمانہ میں مسٹر آرنلڈ
انگریزی میں عربی گرامر کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرانا چاہتے تھے اس کیلئے فراہی
کا نام ہی ان کے ذہن میں تھا۔

اسی زمانہ میں (۱۹۰۳ء میں) ہندوستان کے وائسرائے لارڈ
کرزن نے عرب سرداروں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کیلئے سواحل
عرب اور خلیج فارس کا سفر کیا۔ اس سفر میں ان کو ایک ایسے ترجمان کی ضرورت
محسوس ہوئی جو عربی و انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا ہو۔ اس
کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا۔ وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ رہے اور
عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی
وہ انہیں کی لکھی ہوئی تھی(۸)۔ لیکن مولانا نے حکومت کی خواہش کے باوجود
اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور نہ اسے اپنے لیے باعث افتخار سمجھا بلکہ
مولانا شبلی کے اصرار اور دباؤ سے مجبور ہو کر انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا تھا اور
بعد میں انہیں اپنی اس سیاسی غلطی پر افسوس رہا اور اپنے سامنے اس
واقعہ کے ذکر کو کبھی پسند نہ فرمایا۔

۱۹۰۶ء میں انگلش گورنمنٹ نے علی گڑھ اورنیٹل کالج کو ایک
معتد بہ عطیہ عربی تعلیم کیلئے دیا لیکن شرط یہ لگا دی کہ اس کا پروفیسر کوئی یوروپین
ہوگا چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لیے انتخاب ہوا۔ ساتھ ہی
مولانا مددگار پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ علی گڑھ آئے اور ۱۹۰۸ء تک یہیں
رہے۔ اس دوران مولانا نے جرمن فاضل سے عبرانی زبان سیکھی اور اس میں
اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ تورات و انجیل کو بغیر زحمت کے سمجھنے لگے۔ اور
اپنی تصنیفات میں ان سے کماحقہ استفادہ کیا۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن
شیروانی کے ہاں اکثر آمد و رفت رہی جس کا تذکرہ ان کے ایک مکتوب سے
ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں "مجھ کو مولانا (فراہی) سے دیرینہ نیاز حاصل تھا
ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے، علی گڑھ کی پروفیسری
کے زمانہ میں ملا پھر حیدرآباد میں ... علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر
قرآن کا شغف جاری تھا۔ روزانہ تین بجے شب سے صبح کے نو بجے
تک اس میں وقت صرف کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان

مانے میں دیگر کتب سماوی کا مطالعہ اور اس کی مدد
ہ کامل خاص کر پیش نظر تھا۔ اسی حالت میں علی گڑھ
۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔
سکے علاوہ بقیہ اوقات تالیف و تصنیف میں گزرنے
بلی سے بحث و مباحثے کے بعد ایک نئے عربی مدرسے کے
ن میں آیا۔ اور بالآخر سنہ ۱۹۱۰ء میں اعظم گڑھ کے قصبہ
ستہ الاصلاح کی بنیاد رکھ دی گئی جس نے آگے چل کر علم و
ت خدمات انجام دیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء تک مولانا کا قیام الٰہ آباد
ان مولانا شبلی نے مدرستہ الاصلاح کی نظامت کا بار
ں پر رکھنا چاہا تو ۹ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو ایک مکتوب میں
روز سرائے میر کے مدرسے میں قیام کر سکتے ہو میں بھی
ں کا نظم و نسق درست کر دیا جائے۔ اس کو گروکل کے
مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت
طرزِ زندگی ہو۔"(۱۰)
سنہ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن کے دارالعلوم کا الحاق مدراس
مشرقیات سے ختم کر دیا گیا تو ریاست کے تعلیمی محکمہ کے
سکے جدید انتظامات کی فکر لاحق ہوئی اور اس کے
یک مجلس بنائی گئی جس کے ایک ممبر مولانا شبلی بھی تھے۔
ے لیے ایک منصوبہ بنایا اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی تجویز
یم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لیے مولانا فراہی
تخاب ہوا اور مولانا سنہ ۱۹۱۴ء کے آغاز میں حیدرآباد چلے
یام کے دوران قرآن پاک کی خدمت کا کام جاری رہا۔ نواب
نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمے کا جو کام شروع کیا تھا اس
میں مولانا نے پورا وقت دیا افسوس کہ یہ ترجمہ نواب مرحوم
ر ضائع ہو گیا اور طباعت کی شکل نہ دیکھ سکا۔
کے اواخر میں جب علامہ شبلی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی
فا دیا تو وہاں سے لوٹ کر اعظم گڑھ کو اپنا ٹھکانا بنایا اور
نیشنل ہائی اسکول اور دارالمصنفین کو ملا کر ایک علمی
چاہا اور اس عزم و یاس کے ملے جلے ماحول میں مولانا
حمیدالدین کو لکھا"... افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر
نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے... اور اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے
سوا کون چلائے گا؟"(۱۱) پھر ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء کو دوبارہ لکھا کہ "ذرا اشارہ
ہو تو میرے پاس آجائیں میں خود روک رہا ہوں۔ ؎
مرا اگر تو بگذاری اے نفس طامع
بسے بادشاہی کنم در گدائی"

بہرحال سنہ ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد میں جب کہ جامعہ عثمانیہ کا خاکہ منظرِ عام
پر آرہا تھا، مولانا فراہی نے وہاں سے استعفا دے دیا اور ایک ہزار
ماہوار کی رقم چھوڑ کر وطن واپس چلے آئے اور بے نیازی و استغنا کی
روایت برقرار رکھی۔ حیدرآباد سے واپسی کے بعد مولانا مدرستہ الاصلاح
کی خدمت اور قرآن پاک کے تدبر و تحقیق مسائل میں ایسے لگے کہ پوری عمر
اس میں لگا دی اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آیا تو اس حال میں کہ قرآن پاک
ہی اوڑھنا بچھونا تھا۔

مولانا کو دو بیماریاں ایسی لگ گئی تھیں کہ چھوڑنے کا نام نہ لیتی
تھیں، ایک دردِ سر جس کا حملہ اکثر ہوتا رہتا تھا، دوسری شکایت پیشاب
رک جانے کی تھی۔ آخری بار جب یہ شکایت ہوئی تو انھیں آپریشن کے
لیے اپنے ہم وطن ڈاکٹر کے پاس متھرا جانا پڑا، آپریشن ناکام رہا اور وہیں
۱۹ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۱ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا اور
وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔(۱۲)

تقویٰ

مولانا کا تقویٰ زیادہ نمایاں تھا یا علم کا تفوق؟ یہ سوال ان
کے بہت سے شاگردوں کے ذہن میں پیدا ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ
إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ کے فرمانِ الٰہی کے
مطابق تقویٰ علم ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ مولانا جتنے بڑے عالم دین اور
محقق تھے اتنے ہی بڑے متقی، خدا ترس اور خدا رسیدہ شخص بھی تھے
چند واقعات ان کی برگزیدگی و للہیت کے اظہار کے لیے کافی ہیں۔
بچپن کا واقعہ ہے مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے تحصیلِ ادب کے
لیے لاہور روانہ ہو رہے تھے، والدہ سے رخصت ہو کر زنانخانے سے
نکلے تو روانہ پر والد نے پوچھا کہ والدہ نے کتنے روپے دیے؟ کوئی

دوسرا بچہ ہوتا تو فوراً جھوٹ بول دیتا کہ والد صاحب کی
رقم کم نہ ہو جائے لیکن انھوں نے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ سمجھی
اور صاف صاف کہہ دیا کہ نہیں بتاؤں گا، اس پر والد صاحب
ناراض ہونے کے بجائے خوش ہو گئے اور نہایت محبت سے فرمایا
کہ حمید جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اور خوش ہو کر مولانا کی توقع سے
زیادہ پیسے دیے۔

مولانا کے والد کے خلاف جائداد کا ایک مقدمہ تھا چوں کہ
فریق مخالف کو ان کی ایمان داری پر پورا اعتماد تھا اس لیے اس
نے اس مقدمہ میں مولانا ہی کو حکم بنا دیا۔ مقدمہ فیصلے کے لیے
عدالت سے مولانا کے پاس منتقل ہو گیا اور مولانا نے اس کا فیصلہ
والد کے خلاف کیا جس کے نتیجے میں مولانا کے والد کی جائیداد کا
ایک اچھا خاصا حصہ ان کے قبضے سے نکل گیا اور خود مولانا نے
یہ نقصان برداشت کیا کیوں کہ وہ جائیداد بالآخر مولانا ہی کی
طرف منتقل ہونے والی تھی۔

مولانا کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ حیدرآباد دکن میں قیام
کے دوران کبھی نظام کے دربار میں حاضری نہ دی۔ لوگوں نے انھیں
مجبور کیا کہ نظام سے ملاقات کرلیں، ملاقات کا وقت طے ہوا اور
جب دربار سے نکلنے لگے تو کسی صاحب نے پوچھا، کہیے کیسی ملاقات
رہی؟ فراہی نے پلٹ کر غصہ میں جواب دیا کہ جس طرح تم لوگوں سے
ملاقات ہوتی ہے۔ اس پر اس شخص نے برجستہ تبصرہ کیا "جسے طمع نہ ہو اسے
خوف بھی نہیں ہوتا"[۱۳] اور جب مولانا نے محسوس کیا کہ اب حیدرآباد میں
فقر و استغنا کی زندگی بسر کرنے کی گنجائش نہیں رہی تو اسے
خیرباد کہہ دیا۔ اسی طرح مولانا کی کرامتِ نفس ہی تھی کہ لارڈ کرزن
کے ساتھ دورہ کے لیے تیار نہ تھے۔ اور انھیں تیار کرنے کے
لیے مولانا شبلی کو اصرار بلکہ دباؤ سے کام لینا پڑا۔ اس کے باوجود
زندگی بھر اس رویہ پر انھیں پچھتاوا رہا۔

تواضع اور صبر و قناعت کی زندگی اتنی محبوب تھی کہ خوشحال
گھرانہ سے تعلق ہونے کے باوجود ہمیشہ نہایت سادہ اور طالب علمانہ
زندگی بسر کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا بیان ہے کہ

مولانا کی زندگی کے آخری پانچ چھ سال میری آنکھوں کے
گزرے ہیں اس دور میں انھوں نے اپنی زندگی کا معیار تو
بنا لیا تھا جو مدرسۃ الاصلاح کے غریب اساتذہ و طلبا کا
ہی ساتھ بیٹھ کر جو دال دلیا میسر آتا کھا لیتے، ہماری طرح
سادہ اور غریبانہ کپڑے پہنتے، ہمارے ہی ساتھ ٹاٹ پر
ان کی باعظمت پیشانی اور ان کے نورانی چہرے کے سوا
بھی ایسی نہیں تھی جس سے ایک اجنبی ہمارے درمیان ان کی
اندازہ کر سکتا۔[۱۴]

جرات اور بےباکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس
سمجھتے اس کا اعلان سرِ عام کرتے۔ اس میں کسی مداہنت
یا مصاحبت سے کام نہ لیتے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران پر
سے استفادہ کیا تھا اور فلسفہ کی تعلیم انہیں سے حاصل
مولانا ان سے خوش نہ تھے وہ ان کی کتاب ACHING OF
ISLAM کے ناقد تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں
سے روحِ جہاد ختم کرنے کے لیے لکھی گئی ہے"[۱۵] سر سید
اپنی تفسیرِ قرآن کا عربی زبان میں ترجمہ کرانے کا خیال پید
اس کام کے لیے نظرِ انتخاب مولانا پر پڑی، کیوں کہ اس
سر سید مرحوم کو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ط
ابن سعد سے سیرتِ نبوی کا ایک حصہ فارسی میں مولانا ہی
کیا تھا۔ اور وہ کتاب کالج کے نصاب میں داخل تھی۔ ا
امام غزالی کے کسی قلمی رسالے کو جو نہایت کرم خوردہ تھا طب
ضرورت پیش آئی تھی تو اس کی تصحیح و تہذیب کا کام فر
کیا تھا، چنانچہ قرآن کی تفسیر کے عربی ترجمے کے لیے ان
کوئی شخص نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب مولانا کے سامنے یہ
گئی تو مولانا نے فرمایا کہ میں اس اشاعتِ معصیت میں ک
لینا نہیں چاہتا۔ مولانا کے اس جواب کے بعد پھر کوئی شخص
سامنے یہ تجویز لانے کی جرات نہ کر سکا۔[۱۶] مولانا کے شاگر
مولانا امین احسن اصلاحی کا بیان ہے کہ سر سید مرحوم
خدمات انجام دی ہیں وہ بہت قابلِ قدر ہیں لیکن کا

کہ وہ اس کے لیے موزوں نہ تھے، کیوں کہ اس تفسیر
ں شکوک و شبہات کا شکار ہوئی اور ما بعد الطبیعیاتی تعلیمات
میں کمی آئی۔"(۱۷)

شاعر کی حیثیت سے

انے شاعری کو پیشہ نہیں بنایا نہ اس کی طرف باقاعدہ
فارسی و عربی زبانوں میں جو کچھ کہا اس نے اہل فن سے
۱۶ برس کی عمر میں فارسی کے مشکل گو شاعر خاقانی شیروانی
قصیدہ کہا۔ سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں یہ قصیدہ
صلاحیت کو پرکھنے کے لیے کافی ہے۔ چند اشعار
:

تو بود مضطر آئینہ — خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ
دبیار اے وہم بہیچ — فرمائے تو بیاور داز خاور آئینہ
ست بروے تو لاجرم — چشم سفید یافت بدیں کیفر آئینہ
شود ہمسر آفتاب — کے روئے ہمچو ماہ ترا ہمسر آئینہ

روں کا قصیدہ تھا۔ یہ فارسی اور قدرت کلام دیکھ کر
س رہ گئے، مولانا شبلی کا بیان ہے کہ میں نے اس کو لے
فی صاحب کو دکھایا اور پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام
نے فرمایا یہ تو نہیں بتا سکتا مگر قدماء میں سے کسی کا معلوم
لانا شبلی نے فرمایا، یہ عبدالحمید کا ہے، حیرت ہو گئی۔
ادر الکلامی عربی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ جنگ طرابلس
طویل نظم ہے وہ اگرچہ ان کی حمیت اسلام، محبت عرب
کی آئینہ دار ہے تو اس سے ان کی قدرت طباعی اور
اندازہ ہوتا ہے۔ اس شکست میں ہندوستانی مسلمان
طرح زخمی ہوئے اور ان کے جذبات و احساسات پر جو
گی اس کا اظہار اور ترجمانی فراہی نے اشعار میں اس

نوار ونکسی — أعلامنا بطرابلس
نوار وحولنا — الأعداء ترقب الخلس

من كل ذئب ان رأى — من عزة فينا اختلس
نبكي على إخواننا — بين القتيل ومن حبس(۲۰)

اور جب ترکی نے اٹلی سے معاہدہ کر کے طرابلس خالی کر دیا تو عرب اور تمام مسلمان ترکوں پر برہم ہو گئے۔ فراہی نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

يا ترك لا تبغوا الهوينا — لا تتغمو الحساد عينا
أتسلمون الظالمين — الغانمين لما حمينا
الناهبين بلادنا — والغاصبين لما حوينا
تحمي الخلافة بالسيو — ف ابا تراث إذا انتضينا
فوثبتم أفق مجدها — بدمائنا لما سقينا(۲۱)

ان چند اشعار سے فراہی کی قادر الکلامی اور زباں آوری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابھی تک مولانا کے اس پہلو پر لکھا نہیں گیا۔ ارباب ادب کا کام ہے کہ فراہی کی شعری سرمایہ کو پرکھیں اور ادب و شعر کے میدان میں ان کا جو عطیہ ہے اجاگر کریں۔ یہاں تو بس ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اجمالی تذکرہ مقصود ہے۔

تصنیفات

علامہ کا اصل موضوع قرآن ہے۔ بیشتر سرمایہ نظم قرآن اور تفسیر قرآن کے اصول و مبادی سے متعلق ہے۔ ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا ہلکا سا تعارف کرایا جا رہا ہے:

۱۔ تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان

مولانا کی تفسیر نظام القرآن کے چند اجزاء عربی میں شائع ہو چکے ہیں ان کا اردو ترجمہ بھی مولانا امین احسن اصلاحی کے شگفتہ قلم سے اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس میں مولانا نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہر آیت کو ماقبل و مابعد کی آیت سے، ہر رکوع کو ماقبل و مابعد کے رکوع سے اور ہر سورہ کو ماقبل و مابعد کے سورہ سے مربوط کیا جائے کہ ان کی نگاہ میں اسرار قرآن اور اعجاز قرآن کی کلید اس کا نظم ہی ہے۔

فاتحہ نظام القرآن

یہ دراصل تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے جس میں مصنف نے
تفسیر سے بحث کی ہے۔ نیز آیۃ بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر بھی
ہ کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔

الإمعان فی اقسام القرآن

اس میں مصنف نے پہلے قسم کی حقیقت اور اس کی مختلف قسموں
ث کی ہے اور پھر ان کی اصل حقیقت پر بڑے مدلل اور مفصل انداز
وشنی ڈالی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ اقسام القرآن کے نام سے طبع
ا ہے۔

دات القرآن

اس میں قرآن پاک کے بعض مشکل الفاظ کی تحقیق ہے جس میں مصنف
ام مفسرین اور اہل لغت سے ہٹ کر نیا مفہوم نکالا ہے لیکن کلام عرب
لائل سے اپنے نوادرات کو اس طرح مزین کر دیا ہے کہ انہیں صرف نظر
شکل ہے۔

لیب القرآن

اس میں مولانا نے قرآن کے ادبی اسالیب سے بحث کی ہے اور دکھایا
ہ کلام عرب میں معروف الفاظ و معانی کو قرآن نے ایک نئے اسلوب کا جا
طرح پہنایا کہ وہ معجزہ بن کر رہ گیا اور آج تک کوئی بڑے سے بڑا ادیب
اس کے اعجاز کو چیلنج نہ کر سکا۔

- دلائل النظام

اس رسالہ میں مولانا نے قرآن کے نظام نظم کو دلائل سے ثابت کیا ہے
شکلات نظم کے حل کے لیے چند اصول بیان کیے ہیں جن سے یہ حقیقت
ح ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک ایک منظم و مربوط کتاب الٰہی ہے اور یہ کہ ہر
بیم علمائے تفسیر نے اس نظم کو تسلیم کیا اور اپنی تفسیر میں اس کی رعایت
نے کی کوشش کی ہے۔

۷ - الرأی الصحیح فیمن ھو الذبیح

اس کتاب میں پہلے قربانی کی حقیقت اور اسلام میں اس کی اہمیت
پر گفتگو کی گئی ہے اس کے بعد تورات اور قرآن مجید کے محکم دلائل سے یہ ثابت
کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی
قربانی کی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ذبیح کون؟ کے نام سے چھپ چکا ہے۔

۸ - جمہرۃ البلاغۃ

اس کتاب میں مولانا نے ادبائے عرب کے کلام سے بلاغت کے وہ اصول
متعین کیے ہیں جو قرآنی بلاغت کو پرکھنے کے لیے معیار کا کام دے سکتے
ہیں۔ ساتھ ہی جرجانی و سکاکی کی کتابوں سے ماخوذ مروجہ علم بلاغت کو
ناکافی اور یونانیوں سے مستفاد ثابت کیا ہے اس طرح بلاغت کی دنیا
میں یہ رسالہ دراصل ایک انقلاب ہے۔

۹ - التکمیل فی اصول التاویل

اس کتاب میں مصنف نے وہ اصول بیان کیے ہیں جو قرآن کی تاویل
میں پیش نظر رکھنے چاہئیں اور جن کو خود انہوں نے اپنی تفسیر میں پیش نظر
رکھا ہے۔

۱۰ - فی ملکوت اللہ

اس کتاب میں مولانا نے قوموں کے عروج و زوال اور حق و باطل
کی فتح و شکست سے متعلق قرآن مجید کے ابدی اصول و قوانین بیان کیے ہیں
اور ان کی روشنی میں اسلامی نظام سیاست کی وضاحت کی ہے۔

۱۱ - القائد الی عیون العقائد

اس میں مولانا نے دین کے اصولی مباحث توحید رسالت اور
معاد وغیرہ پر بڑے عقلی اور محکم انداز میں بحث کی ہے اور دلائل خود قرآن
سے فراہم کیے ہیں اور جدید علم کلام کی ترتیب نو کے اصول بھی
بتائے ہیں۔

یوان حمید

لاناکا عربی دیوان ہے۔ اس میں مولانا کا وہ مشہور قصیدہ بھی ہے
طرابلس کے خونیں حادثہ پر لکھا ہے اور جس کے کچھ اشعار اوپر
گئے ہیں۔ یہ قصیدہ جب شیخ سنوسی نے سنا تو ان کی آنکھیں رو
.

ے پہلوی

مولانا کا فارسی دیوان ہے۔

سباق النحو (اول ودوم)

دونوں رسالوں میں مصنف نے ابتدائی نحو و صرف کو نہایت
اور آسان انداز میں مرتب کر دیا ہے جس میں زیادہ زور مشق و
ہے۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ابتدائی قواعد کے لیے ان سے بہتر
نک اختیار نہیں کیے گئے۔

اب الامثال

عربی زبان میں امثال و حکایات کا شستہ و فصیح ترجمہ ہے جو
بجات عربی کے لیے مفید ہے۔

ر نامہ

شان سلیمانؑ کا خالص فارسی میں منظوم ترجمہ۔

لمات

فح القرآن[۲۲]

لق، فلسفہ قدیم وجدید کی خامیوں سے بحث کرنے کے بعد مولانا
ا فلسفہ کے اصول بیان کر کے ان کی عقلی قدر و قیمت سے بحث

ة القرآن

س میں مولانا فقہی مسائل سے متعلق اپنے لطیف استنباطات جمع کرنا چاہتے

سباب النزول

ت قرآنی کے شان نزول سے متعلق مولانا کے خیالات جمع کیے گئے ہیں۔

۲۰۔ کتاب الرسوخ فی معرفة الناسخ والمنسوخ

مولانا نے ناسخ و منسوخ کے متعلق اپنے خیالات اس میں جمع کر دیے ہیں۔

۲۱۔ اوصاف القرآن (۲۳ الف)

قرآن کی خصوصیات خود قرآن کی زبانی، پر مولانا لکھنا چاہتے تھے۔

۲۲۔ کتاب الحکمة

اس میں مولانا نے حکمت قرآن اور اس کے استنباط کے طریقوں کی
وضاحت کی ہے۔

(۲۳) کتاب العقل وما فوق العقل

غالباً یہ رسالہ عقلیات اسلام سے متعلق ہے۔

(۲۴) الازمان والادیان

دین میں خاص خاص مہینوں، دنوں اور تاریخوں اور اوقات کے
اہتمام میں جو رموز پنہاں ہیں ان سے مولانا نے اس رسالہ میں بحث کی ہے۔

(۲۵) احکام الاصول باحکام الرسول

مولانا اس تصنیف میں اس بات کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ نبیؐ نے جو
تعلیمات و ہدایات دی ہیں وہ سب قرآن سے مستنبط ہیں۔

(۲۶) فلسفة البلاغة

اس کے مباحث جمہرۃ البلاغہ میں شامل ہو چکے ہیں۔

(۲۷) سلیقة العروض

نحو و صرف کی طرح فن عروض کو بھی مولانا جدید سائنٹفک طریقہ پر
مرتب کرنا چاہتے تھے۔

(۲۸) الاکلیل فی شرح الانجیل

اس میں مولانا نے انجیل کے ان الفاظ اور عبارتوں کی تشریح کی ہے
جن کی نصاریٰ نے بطور خاص تحریف کی ہے۔

(۲۹) النحو الجدید

اسباق النحو کے بعد مولانا کا نحو و صرف کے میدان میں اگلا قدم تھا
جو ناتمام رہ گیا۔

(۳۰) رسالہ فی اصلاح الناس

اس میں مولانا نے مسلمانوں کی اصلاح کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے
جس کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے الاصلاح مرحوم میں شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ القرآن

مولانا قرآن کی جمع و ترتیب سے متعلق اپنا نظریہ خود قرآنی دلائل سے ثابت
ہے تھے۔

الرائع فی اصول الشرائع

، افادات فراہی

مطالعۂ قرآن کے وقت مولانا نے جابجا جو حواشی لکھے ہیں وہ طلبہ
کے لیے بے حد مفید ہیں، ان کی اشاعت سے مشکل الفاظ کی تشریح اور
ے بعض مشکل الفاظ کی تفہیم میں کافی مدد مل سکتی ہے (۲۳ ب)

۴) شفاعت اور کفارہ کی تردید میں ایک رسالہ مولانا نے انگریزی میں
تھا جواب ناپید ہے لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے اسے مطبوعات
رست میں رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اس وقت چھپا تھا۔

مخطوطات کی اکثر تحقیقات مکمل نہیں ہیں بلکہ چند فصلوں اور یادداشتوں
، زیادہ مولانا اس پر نہ لکھ سکے، البتہ وہی اشارے اس قدر قیمتی اور
ع ہیں کہ ان کی روشنی میں علم و تحقیق کے شیدائی بہت کچھ کام کرسکتے
ہ۔

ولانا فراہی اور اصلاحِ امت

مولانا فراہی گرچہ میدانِ عمل میں اتر کر عوام کی قیادت و رہنمائی کا
فریضہ انجام نہ دے سکے اور یہ طریق کار ان کے زاویۂ نظر سے مختلف بھی تھا۔
وہ اس بات کے قائل تھے کہ پہلے علماء کی فکری و عملی خرابیاں دور ہوں کیونکہ
جب تک ان کی اصلاح نہ ہو عوام کی اصلاح نہیں ہوسکتی، علماء کی اصلاح
کو وہ مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں
نے اپنے اظہار افکار کا ذریعہ عربی زبان کو بنایا۔ مولانا فرماتے تھے کہ چونکہ
میرے پیش نظر تمام عالم اسلامی کے علماء ہیں اس لیے میں نے عربی کو اپنے
افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے کیوں کہ یہی زبان تمام عالم اسلامی کے
علماء کی مشترک زبان ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خالص اکیڈمک طرز کے محقق اور مصنف
تھے بلکہ ان کی تمام فکری کاوشیں ایک گہرے جذبۂ اصلاح کا نتیجہ تھیں وہ
قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے تمام علوم و افکار کا جائزہ لے کر ایک طرف تو
یہ چاہتے تھے کہ باطل افکار و نظریات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیں اور دوسری
طرف زندگی کے تمام پہلوؤں اور اس کے مسائل پر غور کرنے کے لئے قرآن سے
رہنمائی حاصل کرنے کی راہیں کھول دیں چنانچہ وہ
اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور آج ہندوستان میں اصلاحِ
امت اور انقلاب امامت کا کام کرنے والی تنظیمیں اس طرز فکر اور طرز تدبر
کی نمائندہ اور اس سے متاثر و خوشہ چیں ہیں۔

مولانا نے تفسیر قرآن کے اصول دریافت ہی اس لیے کیے تھے کہ
مغرب کی فاسد عقلیت سے متاثر ہونے کے بجائے آج کی نسل اسلام کی صالح
عقلیت کے سایہ میں پروان چڑھے اور مغربی افکار و نظریات سے مرعوبیت
کے بجائے ان کا ناقد ہو کیوں کہ نظام قرآن کے اصولوں کو برت کر ہی قرآن
کی من مانی تاویلات کا دروازہ بند کیا جاسکتا تھا اور تجدد کے پرپرزوں کو کاٹا
جاسکتا تھا، پھر قرآن پاک کی غلط تعلیم و تعلم کے مروجہ طریقوں سے ہی تعلیم یافتہ طبقہ کمزور، منفعل اور ہر نئی
سازش کا آسانی سے شکار ہو رہا تھا اس لیے ضرورت تھی کہ تدبر قرآن کا وہ
طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن اور فہم قرآن کے دروازے
کھلیں اور اس کی روشنی میں امت مسلمہ کے خلاف برپا ہر فتنہ اور سازش
کا مقابلہ کیا جاسکے۔

فہم قرآن کے چند اصول

مولانا کا اصل کارنامہ قرآن کے ان اصولوں کی بازیافت ہے جن کی مدد
سے ہم قرآن کے اعجاز کا راز پاسکتے ہیں اور جن کی روشنی میں اس کتاب حکیم
کی انقلاب آفرینی سے بھی واقف ہوسکتے ہیں۔ یہاں ان اصولوں کی مختصر
وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ مولانا نے سب سے اولین توجہ قرآن پر دی، ان کی نگاہ میں تفسیر قرآن
میں جو پہلی چیز مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے اس کے بعد نبی صلی اللہ
علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے، مولانا کو اس بات پر یقین تھا کہ صحیح
احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے تاہم انھوں نے روایت کو بطور
تائید پیش کیا ہے۔ بطور اصل نہیں (۲۴ د)۔

۲۔ مولانا کا خیال تھا کہ شانِ نزول کی تلاش میں سر رشتہ نظم کو ہاتھ
سے نہ چھوڑنا چاہیے ورنہ اس کی مثال اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری

یک چھا ہے پر پہنچ گیا ہو اور نہیں جا تا کاب کدھر جائے۔ علامہ کا کہنا
ن نزول خود قرآن سے اخذ کرنا چاہیئے اور احادیث اور روایات کے
سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں[۲۵]۔
، خبر اگرچہ متواتر ہو قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی، اس کی یا تو تاویل
یا اس میں توقف کریں گے، لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں

، قرآن مجید بالکل قطعی الدلالت ہے، ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال
ی قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے
ل کر دیے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے
اسے سامنے رکھ دیں، اس میں قول راجح کا انتخاب کھونے ہماری تمیز پر چھوڑا
، یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب کے تمام رطب و یابس
یں[۲۷]۔

مولانا کے نزدیک اعجاز قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس
میں سے ہے۔ اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے دانے بلکہ ایک
حقیر ذرّے سے لے کر اس گنبد گردوں تک جو کچھ ہے معجزہ ہی معجزہ ہے لیکن
ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی بھی خلقت اظہار اعجاز کے لیے نہیں ہوتی۔
۔ مولانا کے نزدیک ہر سورہ کا عمود ایک ہوتا ہے اور اس کے لیے یہ
نہیں ہوتا کہ وہ سب سے زیادہ عظیم الشان بات ہو، بلکہ اس کا سب سے
جامع ہونا ضروری ہے کیوں کہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لیے شیرازہ
بنتا ہے ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے اہم چیز
ہے۔
۔ تمام آیات ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں، ان کے اندر باہم ترتیب
ت ہوتی ہے۔ اگر کوئی چیز قرآن میں کسی دوسری چیز کے ساتھ ملائی جاتی
رمیں 'قران نجوم' کی مانند گوناگوں مناسبتیں ہوتی ہیں اور ہر ترتیب
ہر ایک نیا جلوۂ حسن و جمال رکھتی ہے۔
، ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور سورتوں کے مطالب میں جو
نظر آتی ہے وہ محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔
، چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے بڑی
ں کی ہم سر ہیں، چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی

وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں۔

۱۰۔ مولانا نے اپنی کتاب نظام القرآن میں بنیادی طور پر نظم پر زور دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن جو اسرار و حکم کا لازوال خزینہ یا علوم و معارف کا ناپیدا کنار سمندر ہے اس کا راز اسی نظم میں پوشیدہ ہے۔

۱۱۔ قسموں کے سلسلے میں مولانا کا بیان ہے کہ وہ مقسم علیہ پر دلیل و شہادت ہیں۔ چنانچہ قرآن کی مختلف قسموں کو بطور مثال پیش کر کے اپنے خیال کو مدلل و مستحکم بنایا ہے[۲۸]۔

معاصرین کا خراجِ عقیدت

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق ناظم مولانا عبدالحیٔ لکھنوی علامہ فراہیؒ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

> "وہ چوٹی کے علماء میں سے تھے، علوم ادبیہ سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے، انشاء و ادب پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اور بار اور ادبی علوم سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ فہم و فراست، وکاوت و ذہانت، زہد و عفت، نیک نفسی و بلند ہمتی کی وہ تصویر تھے، لایعنی باتوں سے بہت دور، ابناء دنیا سے بالکل بے پروا، عربی علوم میں انھیں رسوخ حاصل تھا۔ بلاغت پر انھیں گہری نظر تھی۔ جاہلی دواوین اور عربی اسالیب کلام پر وہ حاوی تھے، صحف سماویہ کا بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر اچھی نظر تھی۔ ان کی ساری دلچسپیوں اور عرق ریزیوں کا محور قرآن پاک تھا۔ وہ قرآن پاک پر غور و تدبّر کرتے، اس کے بحر معانی میں غواصی کرتے، اس کے تمام اسالیب کو سمجھنے کی کوشش کرتے، ان کا عقیدہ تھا کہ پورا قرآن ایک منظم و مربوط کلام ہے، ساری آیات ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں، چنانچہ ان کی تفسیر نظام القرآن کا اصل الاصول یہی ہے"۔[۲۹]

علامہ مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں کہ میرا قیام دیوبند میں کچھ تو طالب علم کی حیثیت سے رہا اور کچھ دن مدرسے کی ملازمت اور خدمت میں گزرے کہ اچانک مجھے مقادیر نے حیدرآباد پہنچا دیا۔ مولانا فراہیؒ کی قرآن دانی کا شہرہ

سن چکا تھا، خدا نے ان کی صحبت کی سعادت سے سرفراز فرمایا اور قرآن کے چند جدید پہلو مجھ پر مولانا کی صحبت میں کھلے"۔[۳۰]

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"اسی طرح تفسیر قرآن کے سلسلے میں ہندوستان کے بعض جدید کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہو سکتی ہے جسے ہم ہندوستان کے ان کارناموں کے مقابلے میں قابل لحاظ قرار دے سکتے ہوں۔ قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ باوجود اہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسنِ قبول اہلِ علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا ہو، سب سے پہلے اس سلسلے میں جو چیز یعنی تیرھویں صدی کی ابتدا میں پیش ہوئی وہ ہندوستان کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے، یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔ مگر یہ تو پچھلے زمانے کی بات ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا ولی اللّٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنے نشأۃِ ثانیہ میں جو کام اس سلسلے میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کی طرف ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی بائبل اور قرآن کے تعلقات اور ادبی مباحث) سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انھوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی"۔[۳۱]

علامہ رشید رضا مصری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور شاہ معین الدین ندوی[۳۲] جیسے اساطین علم مولانا فراہی کے کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بعد جتنے تفسیری کام ہوئے ہیں ان سب پر ان کا زبردست اثر ہے اور ان کا اعتراف خود ان مفسرین کرام نے کیا ہے۔[۳۳]

حواشی و تعلیقات

(۱) قرآن کو اللہ نے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ ۲:۲) اور بَيِّنَة اور نور قرار دیا ہے اور ہدایت و رحمت سے بھی ملقب کیا ہے۔ ذیل کی آیات کا مطالعہ اس سلسلے میں مفید رہے گا: نساء: ۱۷۴، انعام: ۱۵۷

(۲) قرآن کہتا ہے وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (فرقان: ۵۲) یہاں مفسرین کا اتفاق ہے کہ "بہ" کا مرجع قرآن ہے۔ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۳) اس مضمون کی بیشتر معلومات علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے دو مضامین کے علاوہ ازہر یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے جمع کیے گئے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ بعنوان "حميد الدين الفراهي حياته ومنهجه في تفسير القرآن وأثره في الهند" (از سید سعید احسن عابدی) سے ماخوذ ہیں جس کے لیے مضمون نگار ان بزرگانِ علم کا ممنون ہے، یہ غیر مطبوعہ عربی مقالہ جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ کے کتب خانے میں موجود ہے (مولانا جلیل احسن ندوی کلیکشن میں) استاذی مولانا ابوبکر اصلاحی اور دوست عبدالرحمٰن فلاحی کی معرفت ۲۹۴ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ پڑھنے کو ملا۔ اللہ تعالیٰ بزرگوں اور احباب کو جزائے خیر دے۔

(۴) مولانا احتشام الدین اصلاحی کا بیان ہے کہ علامہ فیض الحسن نے کہا کہ کالج جاتے اور وہاں سے واپس ہوتے وقت راستہ میں ممکن ہو تو پڑھ لیا کرو کہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی وقت نہیں اور میں تانگہ پر بیٹھ کر آتا جاتا ہوں جس میں صرف ایک آدمی کی گنجائش ہوتی ہے، مولانا نے حامی بھر لی اور پھر معمول ہو گیا کہ تانگہ کے پیچھے دوڑتے جاتے اور درس لیتے جاتے، یہ محنت و مشقت اس طالب علم نے کی جو ناز و نعم میں پلا بڑھا تھا۔

(۵) حیات حمید، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء ص ۵

(۶) اس دلچسپ واقعہ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سرسید مرحوم نے انگریز پرنسپل کو یہ بھی لکھا کہ فراہی کو عربی و فارسی علوم کی تحصیل سے بری قرار دیا جائے کیونکہ وہ ان علوم میں

یہ۔ دیکھیے مجلہ معارف، اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء۔
مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جہاں تک تحقیق
تی ہے اس کی راہیں ان کے لیے کھل ہی چکی تھیں اب محض ڈگری کی
ن دیتے پھرنا ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔
اس وقت برٹش حکومت کی خارجہ پالیسی یہ تھی کہ بہر قیمت انگریز مفاد
کیا جائے۔ ۵ مئی ۱۹۰۳ء کو لارڈ LANS DOWNE لینس ڈاؤن
ز میں یہ اعلان کیا تھا کہ

(1) THE BRITISH GOVERNMENT SHOULD PROTECT
PROMOTE THE BRITISH TRADE IN THE GULF.
(2) SHE WHOULD REGARD THE ESTABLISHMENT
VAVAL BASE IN THE GULF BY ANY OTHER P
AS VERY GRAVE MENACE TO THE BRITISH I
ESTS AND SHE WOULD CERTAINLY RE
BY ALL MEANS, AND
(3) SHE WOULD NOT EXCLUDE THE LE
ATE TRADE OF OTHER POWERS.
[QUOTED FROM, ISHTIAQUE AHMAD, A
IRANIAN RELATION 1905-1919, ASIA
LISHING HOUSE NEW YORK, 197?, P.4

یہ وارننگ لارڈ کرزن (LORD CURZON) کے ذریعہ
۱۹۰۳ء میں اس وقت بھی دہرائی گئی جب کہ خلیجی ممالک کا دورہ کرتے
ی عرب ساحل پر جہاز میں عرب شیوخ سے خطاب کر رہے تھے اس
ان کیا کہ خلیج میں انگریزی مفادات کو بہر حال اولیت ملنی چاہیے
سلسلے میں کسی بھی قسم کی مزاحمت یا مبارزت کا مقابلہ کیا جائے گا۔

(SEE: WARD AND GOOCH, THE CAMBRIDGE
TORY OF BRITISH FOREIGN POLICY 1783
VOL. III, 1923, P. 321
فراہی کو اس تقریر کا عربی ترجمہ کرنا پڑا تھا اور انھیں عمر بھر اس

رہا افسوس رہا کہ کیوں ظالمانہ نظام کا آلہ بنے۔
(۹) مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی، علامہ حمید الدین فراہی ایک عظیم
مفسر، مکتبۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۸۶ء ص ۴۴
(۱۰) علامہ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، دار المصنفین اعظم گڑھ،
جلد دوم، ص ۳۳
(۱۱) نفس مرجع ص ۴۷
(۱۲) ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک برابر مولانا مدرسۃ الاصلاح کی خدمت
میں لگے رہے، ہفتہ میں تین دن شب و روز مدرسہ پر قیام فرماتے،
اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن پاک کا درس دیتے، متعلقین کو اپنے تعلیمی
و قرآنی نظریات سے روشناس کراتے اور قرآن پر غور و تدبر کا کام
جاری رکھتے۔
(۱۳) یہ ماہر سر اکبر حیدری تھے۔
(۱۴) حیات حمید، ص ۴۵
(۱۵) مولانا فراہی کے اس تجزیہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے
دیکھیے: ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ جولائی ستمبر
۱۹۸۵ء، مضمون، برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں صوفیائے کرام
کا حصہ۔
(۱۶) مولانا عنایت اللہ سبحانی، نفس مصدر، ص ۱۲
(۱۷) ڈاکٹر سید احسن عابدی، نفس مصدر، ص ۵۲
(۱۸) مولانا فراہی کی ادبی صلاحیتوں کو عالم عرب کے نامور محقق و ادیب
شیخ تقی الدین ہلالی نے اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے "علامہ حمید الدین
صاحب کا ایک عربی دیوان ہے جس کا کچھ حصہ میں نے خود ان سے سنا ہے،
بہت ہی فصیح و بلیغ اور دل پذیر، مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے والا،
ان کے اندر زندگی کی روح پھونک دینے والا، جنگ طرابلس، جنگ عظیم
اور انگریزوں کی اسلام دشمنی کا تذکرہ بہت ہی موثر انداز میں، علامہ عربی
بولنے پر پوری طرح قادر ہیں، زبان انتہائی فصیح و بلیغ ہے، علماء ہند
تو کجا علماء عرب میں بھی ایسے قادر الکلام خال خال ہیں" (دیکھیے مجلہ
الضیاء لکھنؤ، شمارہ رجب ۱۳۵۲ھ)
(۱۹) نوائے پہلوی، دائرہ حمیدیہ، نقش گاہ اصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

مرود پارسی، ص ۸

یوان المعلم عبدالحمید الفراہی، دائرہ حمیدیہ، مدرستہ الاصلاح
سنہ ۱۹۶۷ء ص ۸

نس مصدر، ص ۱۵

ولانا اس کتاب میں قرآن کے طرز استدلال پر جو کچھ لکھنا چاہتے
ایک ہلکا سا اندازہ ان کے ایک مضمون کے اُردو ترجمے سے ہوتا ہے
بل اصلاحی نے کیا ہے، دیکھیے مجلہ علوم القرآن، جلد ا، شمارہ ۲،
رن سنہ ۱۹۸۹ء۔

ت) جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے غالباً مولانا سلطان احمد اصلاحی
ع پر داد تحقیق دے رہے ہیں توقع ہے کہ جلد وہ چیز منظر عام پر
۔

) مثال کے طور پر الاتقان فی علوم القرآن پر مولانا نے جو حواشی
وہ ان کی تنقیدی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کا پتہ دیتے
نا اجمل اصلاحی نے ان حواشی کو علوم القرآن جلد ا، شمارہ ا ص ۱۲۴۔
ب کیا ہے اس کو دیکھ کر مولانا امین احسن اصلاحی کے اس قول کی
یق کی جاسکتی ہے کہ مولانا " مطالعہ کے لیے ہمیشہ اونچے درجے
منتخب کرتے تھے اور ہر چیز کو نہایت گہری تنقید کے ساتھ
تھے، کتاب انگریزی ہو یا عربی اس کے حاشیہ پر عربی میں اس کے
حث پر اپنے تنقیدی نوٹ لکھتے جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان
کی کتابیں اہل علم کے لیے بڑی قیمتی چیزیں بن جاتی تھیں"۔ یہ
طلبہ کے لیے بہت مفید ثابت ہیں، ہم لوگوں نے جامعۃ الفلاح

میں قرآن کی تعلیم و تفہیم میں ان حواشی سے بہت استفادہ کیا بلکہ ہمارے
ایک سینیر دوست نے انھیں محنت سے خوش خط لکھ کر مجلد کرا لیا تھا۔

(۲۴) مولانا حمید الدین فراہی، مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۲۰،
(مطبع دائرہ حمیدیہ اعظم گڑھ)

(۲۵) نفس مصدر ص ۲۶

(۲۶) نفس مصدر ص ۳۲

(۲۷) نفس مصدر ص ۴۵

(۲۸) ملاحظہ ہو مولانا کا رسالہ الإمعان فی اقسام القرآن۔

(۲۹) نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۳۰ - ۲۲۹

(۳۰) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، دار المصنفین اعظم گڑھ، ص ۵

(۳۱) مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
ندوۃ المصنفین دہلی، جلد دوم، ص ۸۰ - ۲۷۹

(۳۲) ان حضرات کے تاثرات دیکھنے کے لیے بالترتیب ملاحظہ ہوں:
مجلۃ المنار جلد اول، شمارہ ۱۲ سنہ ۱۹۳۰ء، المسلمون فی الہند ص ۴۳، مجلہ معارف
ستمبر سنہ ۱۹۶۷ء، ڈاکٹر عبیداللہ فراہی کے قلم سے، ترجمان القرآن جلد ۶ عدد ۶
نیز جلد ۱۹ عدد ۴، ۵، ۶، صدق لکھنؤ شمارہ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۳۶ء، معارف
دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء، فہرست مطبوعات دائرہ حمیدیہ اعظم گڑھ، ص ۵، اس کے
علاوہ رسالہ اُردو جولائی سنہ ۱۹۳۶ء، الجمعیۃ ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء، ہمارا
بجنور اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کے شمارے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۳۳) دیکھیے خاکسار کے مضمون نظم قرآن اور علمائے ہند کا حاشیہ
۱۹، ۲۰، ۲۱، حیات نو اکتوبر سنہ ۱۹۸۶ء

مولانا شوکت علی

قمر الہدیٰ فریدی

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور
ٹرسٹی ؛ خلافت تحریک کے ممتاز رہنما اور جنگ آزادی کے
جاں باز سپاہی، "مولانا" شوکت علی کو ایک زمانے میں
ملک کا بچہ بچہ جانتا تھا۔

شہرت بھی دولت کی طرح بعض اوقات اندھی ہو
جاتی ہے ؛ اس لیے وہ کب کس کے حصے میں آجائے، کہنا
مشکل ہے۔ لیکن شوکت علی کی شہرت اتفاقیہ نہیں تھی ،
کسی بیساکھی کا عطیہ بھی نہیں تھی ؛ بلکہ ملت پر سب کچھ
نچھاور کر دینے کے لیے بے قرار اُن کے اپنے جذبۂ بے اختیار
کا ایک ادنیٰ صلہ تھی !

وہ مولانا نہیں تھے ، مسٹر تھے ، مسٹر شوکت علی بی اے
علیگ ! یکایک ان کے سر میں قوم کی خدمت کا سودا سمایا،
اور ایسا سمایا کہ اس کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔ ان کے مرشد مولانا
عبدالباری فرنگی محلی نے شوق کی یہ وارفتگی دیکھی تو
انھیں "مولانا" کا اعزازی لقب عطا کر دیا۔ ظفر علی خاں کے
روزنامہ "زمیندار" نے اس لقب کو ہندوستان کے کونے
کونے میں پہنچا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسٹر شوکت علی، "مولانا"
شوکت علی ہو گئے !

مسٹر سے مولانا بننے تک کی یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور
سبق آموز بھی !

مسٹر شوکت علی یو۔پی کے ایک ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ

تھے۔ ان کے آبائی وطن کے بارے میں اختلاف ہے
مطابق اُن کے دادا شیخ علی بخش مراد آباد کے رہ
یہی ان کے اجداد کی سرزمین تھی، اور یہیں سے وہ
رام پور چلے گئے تھے۔ اس کے برعکس دوسری روا
میں نجیب آباد، ضلع بجنور کے باشندہ تھے۔ و
میں مراد آباد تشریف لائے، اور کچھ دنوں بعد اسے
رام پور میں جا بسے جہاں نواب یوسف علی خاں
معتمد علیہ بنا لیا۔

۱۸۵۷ء کے رستاخیز میں شیخ علی بخش نے
اور نینی تال میں مقیم انگریز افسروں کے درمیان پ
سہولتیں فراہم کیں، جس کے عوض میں قیام امن
برطانیہ کی جانب سے گورنر جنرل نے انھیں پانچ
اور تین ہزار روپے سالانہ آمدنی کی ایک جاگیر
خطاب بھی ملا۔

خان صاحب کا اثر و رسوخ ان کے بیٹے عبدا
جلد ہی انھیں ریاست میں ایک اچھی ملازمت مل گ
عبدالعلی خاں کا نکاح امروہہ ضلع مراد آبا
علی خاں پنج ہزاری (دربار اکبری) کی صاحب زاد
سے ہوا تھا۔ جن کے بطن سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی
علی ان کی چوتھی اولاد تھے۔ پانچویں محمد علی جوہر
علی سے عمر میں تقریباً پانچ سال چھوٹے تھے۔

شوکت علی ۱۸۷۳ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے سات برس بعد ان کے والد تینتیس سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہوئے۔ یہ ۱۸۸۰ء کی بات ہے۔ آبادی بانو بیگم نے ابھی زندگی کی صرف اٹھائیس بہاریں دیکھی تھیں کہ بیوہ ہوگئیں۔ وہ ایک دانش مند خاتون تھیں۔ شوہر نے جو جائیداد چھوڑی تھی اس کی آمدنی سے انھوں نے گھر کے اخراجات کے علاوہ، بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام کیا۔

۱۸۸۸ء میں شوکت علی حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے۔ یہاں وہ سات سال رہے۔ اور کالج کی اقامتی زندگی سے پوری طرح فیض یاب ہوئے۔ یہیں انھوں نے تقریر کی مشق بہم پہنچائی۔ اور ۱۸۹۴ء میں "کیمبرج اسپیکنگ پرائز" حاصل کیا۔ انھیں کھیل کود سے بھی خصوصی دل چسپی تھی۔ ہاتھ پاؤں کے مضبوط تھے اور کرکٹ کے رسیا۔ چنانچہ کالج کرکٹ ٹیم الیون کی کپتانی ان کے حصے میں آئی۔ صحت اچھی تھی، اور ہاضمہ قوی! کھیلتے کھیلتے بھوک لگ جاتی تو انٹرویل میں علی گڑھ کی چار ڈبل روٹیاں مکھن لگا کر کھڑے کھڑے چٹ کر جاتے۔ خوب کھاتے تھے اور خوب کھیلتے تھے۔ ایک بار ایسی ہٹنگ کی کہ گیند کرکٹ کے وسیع میدان سے گزر کر مدرسۃ العلوم کی جامع مسجد کے گنبد سے جا ٹکرائی۔ شوکت علی کو اتنی خوشی ہوئی کہ وہ بعد میں مزے لے لے کر اس واقعہ کا ذکر کرتے رہے۔ دورِ طالب علمی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی آدمی کو کتنی عزیز ہوتی ہیں! شوکت علی بھی اس معاملے میں اوروں سے الگ نہ تھے۔

انھوں نے ۱۸۹۵ء میں ایم اے او کالج سے بی اے کی ڈگری لی۔ اور محکمہ افیون میں ایک معقول عہدے (ASST. OPIUM AGENT) پر فائز ہوگئے۔ ملازم ہوجانے کے بعد بھی مدرسۃ العلوم سے ان کا رابطہ برقرار رہا۔ وہ اسے اپنا گھر سمجھتے رہے، اور یہاں کے ہر طالب علم کو اپنا چھوٹا بھائی! علی گڑھ برادری کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ شوکت علی چھٹیوں میں علی گڑھ آتے تو طلبا انھیں گھیر لیتے۔ کسی کو ان کی کوئی چیز پسند آ جاتی تو وہ اٹھا لے جاتا۔ پیچھے بعد دیگرے سارا سامان صاف ہو جاتا! رفتہ رفتہ پیسے بھی ختم ہو جاتے۔ روانگی کی گھڑی آتی تو صاحب چند لڑکوں کو ساتھ لے کر، کرائے کے لیے کمرے کمرے جا جاکر چار چار آٹھ آٹھ آنے چندہ کرتے۔ اور مسکرا کر کہتے جاتے کہ "بدمعاشوں نے ہمیں لوٹ لیا!" ہر سال اسی طرح کھیلا جاتا۔ وہ آتے، رہتے، سامان لٹواتے، آخر میں چندہ کرکے رخصت ہو جاتے۔

یہ سلسلہ پندرہ سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ... میں مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی بنانے کی مہم شروع ... تو شوکت علی نے ملازمت سے طویل مدت کی رخصت لی اور سر آغا خاں کے سکریٹری کی حیثیت سے اُن کے ساتھ گھوم کر چندہ اکٹھا کرنے لگے۔ آخر کار ۳۵ لاکھ کی خطیر رقم جمع ہوگئی۔

اب شوکت علی نے قوم کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ سترہ سال تک حکومت کے ملازم رہنے کے بعد انھوں نے قبل از وقت پنشن لے لی اور بقیہ زندگی مسلمانوں کے نام کر دی۔

دسمبر ۱۹۱۲ء میں "انجمن خدّام کعبہ" کے نام سے ایک کمیٹی بنی۔ جس میں مولانا عبدالباری خادم الخدام، شوکت علی خادم کعبہ، مشیر حسین قدوائی معتمد خادم الخدام منتخب ہوئے۔

"خادم کعبہ" کی حیثیت سے شوکت علی نے بمبئی کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور حجاج کرام کی حتی الامکان خدمت کی۔ بمبئی کے مخیر حضرات کو ترغیب دلا کر دو بڑے بڑے مسافر خانے حاجیوں کے قیام کے لیے تعمیر کرائے۔ اور اس طرح ایک کمی اور اہم ضرورت پوری کر دی۔

۱۹۱۳ء میں شوکت علی نے عالمی کانفرنس کی تنظیم کے
ے اسلامی ممالک کا دورہ کیا۔[۱۴]

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک وہ مدرسۃ العلوم کی اولڈ بوائز
سوسی ایشن کے اعزازی سکریٹری بھی رہے[۱۵]

مئی ۱۹۱۵ء میں انھوں نے ترکی کی حمایت میں، پہلی
قید وبند کا مزا چکھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نومبر
۱۹۱۱ء میں ترکی عالمی جنگ میں اتحادیوں کے خلاف نہ صرف
کہ خود شریک ہوا بلکہ اس نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے
سلام اور خلافت کے نام پر مدد چاہی۔ اس اپیل کے اثر کو
کرنے کے لیے حکومت برطانیہ کی طرف سے یہ اعلان جاری
یا گیا کہ خلیفۃ المسلمین سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دراصل
ارا مقابلہ ترکی کے وزراء سے ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس بیان
سچ سمجھا۔ لیکن محمد علی جوہر نے اپنے اخبار "کامریڈ" میں
انس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھ
یہ ثابت کر دیا کہ جرمنی کا ساتھ دینے کے سوا، ترکی کے
منے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "کامریڈ" کی اشاعت
پابندی لگا دی گئی۔ اور محمد علی کے ساتھ شوکت علی بھی
ظر بند کر دیے گئے۔ ان کی گرفتاری کے خلاف پُر زور احتجاج
ا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ تار وائسرائے کے نام بھیجے گئے۔ اور علی
دران کو رہا کرنے کی مانگ کی گئی۔ وائسرائے نے یہ تجویز
سی کہ دونوں بھائی حکومت سے وفاداری کا تحریری وعدہ
یں تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا۔ ایک افسر اس قسم کے
مضمون پر مشتمل ایک تحریر لے کر علی برادران سے ملنے آیا۔
ھوں نے کہا کہ ہمیں دستخط کرنا منظور ہے مگر اس شرط پر
اگر احکام اسلام کا تقاضا ہوا تو یہ وفاداری برقرار
رہ سکے گی۔ ابھی گفت وشنید جاری تھی کہ شوکت علی
والدہ بھی آ پہنچیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے بیٹے حکومت
باغی نہیں ہیں۔ لیکن جہاں مذہب کی بات آئے گی، وہ
سلام ہی کا ساتھ دیں گے۔ خواہ گورنمنٹ ناراض ہی کیوں
نہ ہو۔ اگر میرے بیٹوں نے حکومت سے دب کر اپنے ضمیر کا سودا
کرلیا تو اللہ میرے جھرّیوں بھرے ہاتھ میں طاقت دے گا کہ
میں ان دونوں کا گلا گھونٹ سکوں"[۱۷]

علی برادران نے پہلے ہی، غیر مشروط معاہدے پر دستخط
کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماں کے حوصلہ افزا کلمات نے ان
کے ارادوں کو مزید استحکام بخشا۔ جس کے نتیجہ میں ان کی نظر
بندی کا زمانہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ دونوں بھائیوں کو پہلے
رام پور، پھر مہرولی، دہلی، لینڈواں، چھندواڑہ اور آخرکار
بیتول جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں انھیں قید وبند سے چھٹکارا ملا۔ اور وہ
سیدھے امرت سر پہنچے۔ جہاں کانگریس اور خلافت کمیٹی کے
جلسے ہو رہے تھے۔ یہاں خاص وعام نے ان کا شاندار
استقبال کیا[۱۸]

ملک کی سیاست میں اُن دِنوں گاندھی جی نئے
نئے ابھرے تھے۔ اور لوگوں کے دِلوں میں تیزی سے جگہ بنا
رہے تھے۔ شوکت علی سے بھی جلد ہی اُن کی گاڑھی چھننے
لگی۔ شوکت صاحب اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ گاندھی
جی تو میری جیب میں ہیں"[۱۹] وہ خلافت تحریک کے
عروج کا زمانہ تھا۔ علی برادران کا گھر گھر چرچا تھا۔ ان کی والدہ
بی اماں کے نام سے مشہور ہو چکی تھیں اور شرعی پردہ میں
رہ کر عوام سے خطاب بھی کرنے لگی تھیں۔

ہر طرف یہی شور تھا ـــ

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو!

گاندھی جی بھی خلافت تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور شوکت
علی کے ساتھ مل کر پورے ملک کا دورہ کرنے لگے۔ شوکت
علی نے ان کے ایما پر باریک کپڑا پہننا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اپنی
تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی پسند کا ایک ریشمی
موزہ رکھ چھوڑا ہے، جب پھانسی ہوگی تو اسے پہن کر تختۂ دار پر

پڑھوں کا نشہ[۲۰]

وہ شوکت علی کی زندگی کے سنہرے دن تھے۔ ان کی شہرت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کے ترجمان اور خلافت تحریک کے روح رواں بن چکے تھے۔ انھیں فروری ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا[۲۱]

۹ر جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی کے ایک اجلاس میں، یہ طے پایا کہ وائسرائے کو متنبہ کر دیا جائے کہ اگر ایک ماہ کے اندر خلافت کے مسئلہ کو حل نہیں کیا گیا تو ہم ترک موالات پر مجبور ہوں گے۔ وائسرائے سے بات چیت کے لیے ایک چار رکنی وفد مرتب ہوا، جس میں مظہر الحق، یعقوب حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ شوکت علی بھی شامل تھے یہ وفد وائسرائے سے جون کے آخری ہفتے میں ملا۔ اور اس نے زور دے کر کہا کہ اگر معاہدہ صلح ترکی میں مناسب ترمیم نہ کی گئی تو ہم یکم اگست ۱۹۲۰ء سے ترک موالات کی تحریک جاری کریں گے۔ بہ قول شخصے ——— "یہ تھا پہلا الٹی میٹم جو حکومت عالیہ کی وفادار رعایا نے اول بار اپنے آقاؤں کو دیا"[۲۲]

جنوری ۱۹۲۱ء میں شوکت علی دوبارہ خلافت کمیٹی کے اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے[۲۳]

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۱ء تک وہ گاندھی جی کے ہمراہ ترک موالات کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ملک کا دورہ کرتے رہے۔ اور پھر وہ جیل چلے گئے۔ گاندھی جی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اور جب یہ لوگ قید سے چھوٹے تو کانگریس اور تحریک خلافت کے لیڈروں کی راہیں الگ الگ ہو چکی تھیں ملک میں جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے، اور ہر فریق دوسرے فریق کو الزام دے رہا تھا۔ ایسی صورت میں بھائی چارے کی وہ فضا جو خلافت تحریک نے پیدا کی تھی، خاصی متاثر ہوئی[۲۴] پھر خود خلافت تحریک بھی بہ وجوہ ختم ہو گئی ———

یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے وحیدالدین خاں کو ہٹا کر سلطان عبدالمجید کو خلیفہ نامزد کیا۔ اور ملک میں ایک مغربی طرز کی جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی۔

۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، ترکی سے خلافت کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

ہندوستان میں اس کا زبردست ردعمل ہوا۔ کوشش کی گئی کہ مصطفیٰ کمال اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ لیکن یہ نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ ملک کے مختلف حصوں میں جو خلافت کمیٹیاں کام کر رہی تھیں، آہستہ آہستہ ان کے جوش و خروش میں کمی آتی گئی۔ ۱۹۲۵ء تک سارا معاملہ سرد ہو گیا البتہ شوکت علی اب بھی بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کو مرنے سے بچائے ہوئے تھے۔ مگر کب تک؟

شوکت صاحب نے جس تحریک کو خونِ جگر سے سینچا تھا، وہ عملاً دم توڑ چکی تھی۔ لیکن اس تحریک نے بلاواسطہ طور پر ہندوستان کو بہت کچھ دیا۔ اس نے جنگ آزادی میں روح پھونک دی، ہندو مسلمان دونوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا۔ گاندھی جی نے اس تحریک کے خاتمہ پر کہا تھا ——— "اگر میں جانتا کہ خلافت کا یہ انجام ہوگا۔ جب بھی خلافت تحریک میں اسی جوش کے ساتھ حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی ہے"[۲۵]

اسی دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے شوکت علی کی نجی زندگی میں خاصی تلخی پیدا کر دی ——— ۱۹۳۰ء کے آخر میں وہ اپنے بھائی محمد علی کے ساتھ پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے۔ وہاں انھیں وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے ایک ٹائپسٹ گرل دی گئی تھی۔ بعد میں انھوں نے اس لڑکی کو ہندوستان بلا کر "خلافت ہاؤس" میں رکھ لیا، اور پھر اسے مسلمان کر کے شادی بھی کر لی[۲۶] اس وقت شوکت صاحب کی عمر ساٹھ سال تھی۔ ان کی پہلی بیگم تقریباً بائیس سال قبل، ۱۹۱۰ء کے آس پاس، اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ اور تین بیٹے زاہد علی، عابد علی

اور شاہد علی اور چند بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑ گئیں تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد سے ہنوز شوکت علی نے تجرد کی زندگی گزاری تھی۔ اب جو انھوں نے دوسری شادی کی تو لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ خود اس عورت سے شوکت علی کی نبھ نہ سکی۔ اس وقت تک انھوں نے احتجاجاً اپنی پنشن وصول نہ کی تھی۔ گول میز کانفرنس کے بعد جب کہ مفاہمت کی گنجائش نکل آئی تو وہ اپنی پچیس سال سے رکی ہوئی پنشن قبول کرنے پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ تقریباً چالیس پچاس ہزار روپے انھیں یک مشت ملے۔ بیوی نے اس رقم کا مطالبہ کیا۔ شوکت علی نے کہا کہ ایام اسیری میں جن رشتہ داروں نے میری مالی امداد کی تھی، یہ رقم ان کے لیے ہے۔ انگریزی قانون اس کے لیے کسی طرح تیار نہ تھی۔ بات بڑھی اور نوبت علاحدگی کی آ گئی۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھا بجھا کر سفر خرچ دے کر لندن واپس بھیجا گیا۔

شوکت علی بوڑھے ہو چلے تھے لیکن حوصلوں نے ابھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ دل میں اب بھی دین پر مٹنے کی بے شمار تمنائیں مچل رہی تھیں۔ وہ حتی الامکان اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء ہندوستان اور اسلام پر امریکہ میں تقریریں بھی کیں۔

آخری ایام میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر مرکزی مجلس قانون ساز کے ممبر ہو گئے تھے۔ اور سیشن کے زمانہ میں دلی آ کر رہنے لگے۔ یہیں ۲۶ر نومبر ۱۹۳۸ء کو ایک مختصر سی علالت کے بعد، ان کا انتقال ہو گیا۔ جنازے میں خلق خدا کا اژدحام تھا۔ جامع مسجد کے سامنے، سرمد کے مزار کے قریب شوکت علی کی آخری آرام گاہ تیار تھی۔ چاہنے والوں نے بہ چشم نم جسد خاکی کو سپرد خاک کیا۔ اور گھروں کو لوٹ گئے۔

اب شوکت علی نہ تھے، بس ان کی یادیں رہ گئیں تھیں!

شوکت علی ایک اچھے انسان تھے ـــــ زندہ دل اور چاہے جانے کے قابل! ان کی پُرلطف گفتگو سننے سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ عمدہ اور چٹ پٹے کھانوں کے شوقین تھے۔ اور اس معاملے میں بعض اوقات اپنی صحت کا بھی خیال نہ رکھتے تھے۔ صادق الخیری نے اس ضمن میں ایک مزے دار واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار علی برادران ان کے گھر آئے۔ تھوڑی دیر میں ایک خوانچہ والا ادھر سے گزرا۔ شوکت صاحب کے منہ میں پانی بھر آیا، چاٹ مسالہ کھانے پر تیار ہو گئے۔ محمد علی جوہر نے بہت سمجھایا کہ آپ کو نزلہ ہے نقصان ہوگا۔ لیکن وہ نہ مانے۔ بالآخر سودے والے کو بلایا گیا۔ آپ سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اور خوب کھٹا اور مرچیں ڈلوا کر کھانے لگے۔ یہاں تک کہ سب خوانچہ صاف کر دیا۔ خیر یہ تو جوانی کی باتیں ہیں، بعد میں جب انھیں ذیابطیس کا مرض ہو گیا تو پرہیز بھی کرنے لگے تھے۔ لیکن اس زمانے میں بھی دوسروں پر اپنی خوش خوراکی کا رعب ڈالنے میں انھیں بڑا مزا آتا تھا۔ جتنا کھاتے اس سے زیادہ ڈھنڈورا پیٹتے۔ لیم شحیم، چوڑے چکلے چھ فٹ دو انچ لمبے شوکت علی کو دیکھ کر ویسے بھی لوگ مرعوب ہو جاتے تھے۔ پھر جب وہ رازدارانہ انداز میں میزبان کو بتاتے کہ آج کل میری خوراک کافی بڑھ گئی ہے تو وہ بے چارہ واقعی سچ سمجھتا۔ کبھی کبھی تو یہی بات دوسروں پر کہہ دیتے۔ اور کھلانے والا پریشان ہو جاتا کہ کھانا کم نہ پڑ جائے۔ لیکن کبھی اس کی نوبت نہ آئی۔

شوکت صاحب دعوتوں کے رسیا تھے۔ بسا اوقات فرمائش کرکے خود کو مدعو کراتے۔ اور اپنی پسند کے کھانے پکواتے۔ ہر سال شروع برسات میں "آم کی دعوت" کا گشت کیا کرتے تھے۔

وہ تقریر کے مرد میدان تھے، دوران گفتگو داغ یا آتش جیسے شعراء کے اشعار بھی استعمال کرتے تھے۔ محمد علی کی طرح طول کلامی سے احتراز کرتے تھے۔ ان کی مختصر تقریریں ان کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہوا کرتی تھیں۔

ایک تقریر ملاحظہ ہو ــــ

" میں نے ایک عہد کیا تھا کہ جس وقت کعبہ پر مصیبت آئے گی، اس وقت اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔

میں نظربند ہو گیا۔ اور جب کعبہ پر مصیبت آئی تو کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میں خطاوار ہوں۔ جو خطائیں نے کی ہے، اس کی سزا مجھے مل رہی ہے اور ملے گی۔

ہم نے اپنے لیے جو کچھ کیا، اپنے ہاتھوں کیا۔ کیوں کہ ہم نے مصلحت وقت کو رسول کے احکام پر ترجیح دی۔ ہمیں جو کچھ سزا ملی اس کی بدولت تھی۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ ہم اس سے بہت زیادہ سزا کے مستحق تھے میں سچ کہتا ہوں کہ میں پھانسی کا مستحق تھا، اور مجھے صرف نظربندی ملی۔

میں ایک سوال پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس طرز عمل سے کیا بہتری حاصل کی ــ؟

اگر آپ دنیوی اقتدار کے لیے خدا اور رسول کے احکام کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہیں تو میرا اور آپ کا ساتھ نہیں۔

اس وقت کام یہ ہے کہ تمام عالم جمع ہو کر احکام شرعی پر غور کر کے فیصلہ کرے کہ آپ کا فرض کیا ہے۔ ریزولیشن پاس کر دینا کچھ مشکل نہیں ــ

میں نے ایک فقرہ اپنے بھائی معظم علی کو لکھا تھا، جس پر مجھ سے سوال کیا گیا تھا۔ وہ فقرہ یہ تھا کہ کوئی مسلمان ایسا نہ ہو گا جو ترکوں کی فتح کا خواہش مند نہ ہو۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ اس کا جواب دینے سے قبل میں ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہے تو ہر مسلمان یہ کہے گا۔ اور اسے کہنے کا حق ہے۔

ہمیں ملک معظم اور وائسرائے کے پاس وفد روانہ کر کے ان سے کہہ دینا چاہیے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو ہمارے لیے دو صورتیں ہیں ــــ

ہجرت یا جہاد!

ہمارا وفد خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں جانا چاہیے، جس میں معذرت کی جائے کہ ہم نے اپنے فرض کو پس پشت ڈالا" ــ [۳۳]

شوکت علی کو اپنے بھائی محمد علی سے بڑی محبت تھی۔ ان کی وفات کے بعد وہ ٹوٹ سے گئے۔ ہر وقت انہیں یاد کیا کرتے تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی انہوں نے کبھی اپنے ملی فرائض سے روگردانی نہیں کی۔ حسب دستور تحریک کے لیے کام کرتے رہے۔ بھائی کی موت کے فوراً بعد، ان کا لندن سے لکھا ہوا ایک خط، اُن کے دلی جذبات کا عکاس ہے، لکھتے ہیں

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عزیزم جعفر صاحب! السلام علیکم

میں نے دفتر کے تمام کارکنوں کے نام خطوط لکھے تھے، تاکہ کسی کو شکایت باقی نہ رہے۔

آپ کا نمبر آج آیا ہے۔ اور یہ خط میں خون جگر سے لکھ رہا ہوں۔ تاکہ کسی کو شکایت باقی نہ رہے۔

تم کو سلام کیا لکھتا۔ ہر ہفتہ تمہارا خط آتا تھا۔ اور حالات معلوم ہوتے تھے۔ اوروں کو سلام لکھتا یا اس کو جو دفتر میں بہت سے کاموں کا ذمہ دار تھا۔ آج کے خط سے تمہاری شکایت دور ہو جاوے گی۔ مگر میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ میں جب خلافت کے لیے خط لکھتا ہوں تو وہ

خط سب خلافت کے حامیوں کے لیے ہوتا ہے۔
اب چند خطوط میں لکھا اور آئیں گے۔ اس کے بعد
میں خود بمبئی اور ہندوستان میں ہوں گا۔ اور
کولھو کا بیل پھر کام میں لگ جائے گا۔ اور اب
انشاء اللہ پہلے سے زیادہ طاقت اور کامیابی
کے ساتھ۔ کیوں کہ خدا بہت سے نئے کام کرنے
والے پیدا کر رہا ہے۔ آج محمد علی کا جنازہ
پانچ دن کفن دوزوں کے مکان پر آرام کر کے
ٹلبری بندرگاہ کو گیا۔ اور ۳ بجے جہاز "نرکنڈہ"
اس کو لے کر بیت المقدس کو روانہ ہو گیا۔
۱۶ جنوری کو بیگم محمد علی، زاہد اور میں اسی
جہاز پر مارسیلز سے روانہ ہوں گے۔ اور ۲۱ کی
صبح کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ جہاں مصر، شام
فلسطین اور عراق کے عرب بھائی اس کو مسجد
اقصیٰ میں دفن کریں گے۔ میرا بھائی کہو، بیٹا
کہو، سردار کہو، غلام کہو، عاشق کہو یا معشوق،
مجھ سے رخصت ہو گیا۔ اور اب میں اکیلا رہ گیا۔
بے دست و پا ہوں مگر خدا پر بھروسا ہے۔ اور وہ
ایک محمد علی کی جگہ دین مقدس کی خدمت کے
لیے ہزار محمد علی پیدا کر دے گا۔ میں تم سے دور
ہوں، پھر بھی خوب جانتا ہوں کہ اس موت
سے مسلمان بجائے کمزور ہونے کے کمر ہمت باندھ
کر کھڑے ہو جائیں گے۔ خیر جو کچھ ہوا اسلام کا یہ
مخلص سپاہی میدان جنگ میں ایک زبردست
ڈنکے کی چوٹ مار کر سپاہی کی موت مر گیا[۱]

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شوکت علی محمد علی جوہر کے
اشاروں پر چلتے تھے، خود ان میں سوجھ بوجھ کی کمی تھی۔ ایسی
بات نہیں ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ درجہ کی تنظیمی صلاحیتوں کے
مالک تھے۔ بہ قول قاضی عدیل عباسی۔ "جس طرح وہ کسی تحریک
کو منظم کر سکتے تھے، وہ صرف ان کا حصہ تھا غالباً ہندوستان
میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا"[۲] مگر ان کی سب سے بڑی خوبی
یہ تھی کہ وہ ایک باہمت انسان تھے۔ انہیں کامیابیاں بھی ملیں
اور ناکامیاں بھی! ان کی شان میں نعرے بھی لگے اور ان کے
خلاف الزامات بھی تراشے گئے۔ لیکن وہ ہر حال میں خوش
رہے۔ جو راہ ایک بار اپنے لیے چن لی، ساری زندگی اسی پر
چلتے رہے، اور چلتے چلتے اس دنیا سے گزر گئے۔

تحریک خلافت جس کا بوجھ وہ کئی سال تک اپنے
مضبوط کاندھوں پر لیے رہے تھے، ان کی زندگی میں ہی عملاً
ختم ہو گئی تھی۔

جنگ آزادی میں انھوں نے جو کردار ادا کیا تھا، وقت
کی گرد اسے بھی دھندلا دینے کی فکر میں ہے۔

ممکن ہے نئی نسل انہیں بالکل ہی فراموش کر دے
لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اُن کی یہ خدمت کبھی بھلا
نہیں سکتی کہ انھوں نے اس کے لیے آغا خاں کی معیت
میں ملک کا طوفانی دورہ کر کے چھتیس لاکھ کی رقم فراہم کی
مادر درسگاہ شوکت علی بی۔ اے علیگ کو یاد کرتی
ہے! یاد کرتی رہے گی! وہ منتظر ہے ایک اور شوکت علی کی
دوسرا شوکت علی کب پیدا ہوگا؟
کوئی جواب دے!

حواشی

[۱] عبدالماجد دریابادی، معاصرین (ترتیب حکیم عبدالقوی دریابادی)، صفحہ ۵۴، سنہ اشاعت ۱۹۷۹ء، ناشر، ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ۔

[۲] خورشید علی مہر، سیرت محمد علی، صفحہ ۱۱۔ ۱۴۱ طبع اول، ناشر، رسالہ نئی روشنی و قریشی بک ڈپو، دہلی

[۳] سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۹ سنہ اشاعت ۱۹۷۸ء ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی

۵۴ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۱۳
سنہ اشاعت ۱۹۷۸ء، ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی

۵۵ نریش کمار جین، مسلمس ان انڈیا، حصہ دوم صفحہ ۱۵۴ -
سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء منوہر پبلی کیشنز، نئی دہلی

۵۶ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ۔ صفحہ ۱۳

۵۷ نریش کمار جین، مسلمس ان انڈیا۔ صفحہ ۱۵۴

۵۸ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت صفحہ ۱۷۱
ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی سنہ اشاعت ۱۹۷۸ء

۵۹ عبدالماجد دریا بادی، معاصرین، صفحہ ۴۷

۶۰ خورشید مصطفیٰ مہر، سیرت محمد علی، صفحہ ۳۱

۶۱ نریش کمار جین، مسلمس ان انڈیا۔ صفحہ ۱۵۴

۶۲ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۲۱۹

۶۳ شاہ معین الدین، حیات سلیمان صفحہ ۱۷۵؛ ذیلی حاشیہ؛
بحوالہ، قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت صفحہ ۳۸

۶۴ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۲۱۹

۶۵ جدید ہندوستان کے معمار، مرتبہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل
ریسرچ، نئی دہلی (اردو ترجمہ، احمد) صفحہ ۷۵
سنہ اشاعت ۱۹۷۹ء۔ ناشر ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی

۶۶ نریش کمار جین، مسلمس ان انڈیا، صفحہ ۱۵۴

۶۷ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت صفحہ ۷۱ - ۷۲

۶۸ ایضاً۔ صفحہ ۱۰۳

۶۹ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۲۲۲

۷۰ ایضاً۔ صفحہ ۷

۷۱ نریش کمار جین، مسلمس ان انڈیا، صفحہ ۱۵۴

۷۲ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت صفحہ ۱۵۵

۷۳ نریش کمار جین، مسلمس ان انڈیا صفحہ ۱۵۴

۷۴ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ ۲۲۲-۲۲۴

۷۵ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت، صفحہ ۲۵۴

۷۶ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۲۲۵

۷۷ ایضاً۔ صفحہ ۲۱۹

۷۸ ایضاً، صفحہ ۲۲۷

۷۹ جدید ہندوستان کے معمار (اردو ترجمہ، احمد) صفحہ ۷۵

۸۰ سید محمد ہادی، علی برادران اور ان کا زمانہ صفحہ ۲۲۸

۸۱ صادق الخیری، آسماں کیسے کیسے، صفحہ ۲۴۳
سنہ اشاعت ۱۹۸۱ء، شہناز بک کلب کراچی

۸۲ عبدالماجد دریابادی، معاصرین؛ صفحہ ۴۷

۸۳ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت، صفحہ ۱۲۴-۱۲۵

۸۴ صادق الخیری، آسماں کیسے کیسے، صفحہ ۲۴۲

۸۵ عبدالماجد دریا بادی، محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند
ورق (حصہ دوم) صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱
سنہ اشاعت ۱۹۵۶ء معارف پریس اعظم گڑھ

۸۶ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت، صفحہ ۱۲۴

مولانا محمد علی جوہر

ڈاکٹر مُشرّف علی

ماہرینِ علم نفسیات نے انسان کو ان کے مزاجِ طبعی
کے اعتبار سے تین مختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا ایسے
لوگوں کا زمرہ ہے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے کسی کام کو
کرنے سے پہلے کسی خاص صورتحال کے واقع ہونے کے متمنی
رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے لوگوں کا یہ نظریہ رہتا
ہے کہ "کاش ایسا ہو جاتا تو ہم ایسا کرتے"۔ ایسے لوگ
دنیا میں شاید ہی کچھ کر پاتے ہیں بلکہ خود بھی دھوکے میں
رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے میں رکھتے ہیں
اور تمام زندگی انتظار و دھوکے میں گذار دیتے ہیں
دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو بغیر اپنے اطراف میں
واقع پذیر حالات سے متاثر ہوئے اپنا کام کرتے رہتے
ہیں۔ یہ انسانوں کی وہ جماعت ہے جن کا مزاج و نظریہ
اس مختصر خیال پر مبنی ہوتا ہے کہ "اپنا کام کیے جاؤ
جو کچھ ہو رہا ہے ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے"۔ تیسری اور
آخری قسم دل کی ہے جو ان دونوں سے مختلف ہی
نہیں بلکہ متضاد ہے۔ انسانوں کی یہ وہ قسم ہے جو تاریخ
بناتا اور بگاڑتا ہے۔ سماج میں معاشرے میں تمدن یہاں
تک کہ مذہبی اعتقادات میں جو کچھ مروج ہوتا ہے اس کو
ناپسند کرکے اپنے نظریہ و خیال کے اعتبار سے سماج کی
ملک یا معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ لوگ حالات
و سماج سے ٹکراتے رہتے ہیں اور جب تک اپنے خیالات
کے اعتبار سے ان کو کامیابی نہیں ہو جاتی ٹکراتے رہتے
ہیں اور اس کشمکش میں کبھی فنا ہو جاتے ہیں اور کبھی
کامیاب مگر دونوں اعتبار سے تاریخ میں اپنا نام چھوڑ
جانے کے علاوہ دنیا کو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ مولانا
محمد علی جوہر بھی اسی زمرے کی نمایاں شخصیت ہیں
جنھوں نے اپنے آہنی عزم و استقلال اور کارہائے
نمایاں سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب
کو جنم دیا۔ مولانا موصوف ہندوستان کی جنگ آزادی
کے ایک دلیر اور بہادر مجاہد، انتہائی بلند اور اعلیٰ
صحافی و مقرر، سیاست داں، حق گو، شاعر، ہمدرد اور
مرنجانِ مرنج کی صفات کے حامل تھے۔ اپنی زندگی کو قومی
و ملی فلاح و بہبود اور راحتوں کے لیے وقف سمجھتے تھے۔
یوں تو مولانا کی شخصیت مختلف صفات سے مرصع تھی
مگر اُن کی انتہائی بلند معیار صحافت اور سامعین پر
چھا جانے والی تقریری صلاحیتیں پوری زندگی بہت
زیادہ نمایاں اور امتیازی رہیں۔ صحافت کا یہ معیار
تھا کہ مولانا کا رسالہ کامریڈ، انگریز انگلستان اپنے دوستوں
کو بھیجتے تھے اور تقریر اتنی موثر اور انگریزی کے
موزوں و برمحل الفاظ سے آراستہ رہتی کہ جس سے

انگریز سامعین بھی بغیر متاثر ہوئے نہ رہتے۔ اور مولانا کے انداز اور معیار کی تعریف کرتے۔ انگلستان کا شہرہ آفاق مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز کا مولانا کے متعلق یہ بیان تھا کہ "محمد علی نیپولین کے دل، مکالے کے قلم اور بروک کی خطابت کا جامع تھا" مولانا کا انگریزی زبان پر عبور جو صحافت و تقریر میں ظاہر ہوتا تھا وہ ہندوستان میں بے مثال ہونے کے ساتھ انگریز اہل قلم اور مصنفین کے لیے موجب رشک ہوا کرتا۔ مولانا کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کی تربیت کے گہوارے سب سے پہلے ان کی والدہ ماجدہ کا سایہ تھا، دوسرا دارالعلوم مسلمانان ہند جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے معروف ہے اور تیسرا مرکز تربیت آکسفورڈ تھا۔ ان تین گہواروں سے علم و دانش اور زندگی کی اعلیٰ صفات کی تربیت سے تعمیر کیا ہوا انسان مولانا محمد علی جوہر تھا

مولانا کا آبائی وطن نجیب آباد تھا جو ضلع بجنور کا ایک مشہور و معروف شہر ہے۔ آپ کی ولادت ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء میں رام پور میں ہوئی جہاں ان کے والد بسلسلہ ملازمت آ گئے تھے۔ ابھی مولانا کی عمر دو سال کی بھی نہ ہو پائی تھی کہ مولانا کے والد ہیضہ کی بیماری میں مبتلا ہوئے اور دنیا سے چل بسے۔ انتقال کے وقت ان کے والد کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی والدہ کی عمر ۲۷-۲۸ سال کی۔ بچوں میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ سب سے بڑے والد کے انتقال کے وقت تیرہ سال کے تھے اور سب سے چھوٹے خود مولانا تقریباً دو سال کے تھے۔ کیا کنبہ ساتھ چھوڑا۔ ایسے کمزور حالات میں اگر بچے انتہائی سعادت مند لائق اور شہرہ آفاق صلاحیتوں کے حامل نکلیں تو یقیناً والدہ کی جفاکشی، ایثار اور فہم و ذکا کی دلیل ہے۔

مولانا جوہر کے والد کا نام عبدالعلی خاں اور والدہ کا نام عابدی بانو بیگم تھا جو بعد میں بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ مولانا کے پانچ بھائیوں میں سے دو بڑے بھائی بندے علی خاں اور نوازش علی خاں کم سنی ہی میں رحلت کر گئے تھے۔ باقی تین بھائی ذوالفقار علی خاں، شوکت علی خاں اور مولانا خود جو سب سے چھوٹے تھے نے بی اماں کے زیر سایہ پرورش پائی۔ بی اماں نے سوائے قرآن مجید کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ متوسط اور دینی ماحول کی پروردہ خاتون تھیں۔ مگر اس کے باوجود اپنے بچوں کی ایسی پرورش کی کہ مولانا موصوف اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی کو زندہ جاوید بنانے کے ساتھ خود بھی زندہ جاوید ہو گئیں۔ یہ دونوں بھائی "علی برادرس" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی، بین الاقوامی سیاست میں ایسے معاون اور شریک رہے کہ طوطی بولتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت و ایثار، قومی و ملی ہمدردی کا جذبہ قربانی کے لیے ہمہ وقت تیار، انتہائی شفاف لباس کا شوق، تعلیم کا اعلیٰ ذوق و صلاحیت، اخلاق و حسن سلوک کی ساری صفات جو دونوں بھائیوں میں رچی بسی تھیں وہ بی اماں کی تربیت کا ثمر ہیں۔ والدہ کی تربیت کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی جوہر کو سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے اپنے بڑے بھائی کی خصوصی توجہ اور نگرانی بھی حاصل رہی۔ شوکت علی جن کے نام کے ساتھ بھی مولانا کا لقب وابستہ رہا اپنے بھائی محمد علی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ بیشتر مولانا شوکت علی نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔ مولانا نے اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا کہ "علاوہ اس فیض گرانمایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت و نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا۔ میں جو کچھ بھی ہوں یا جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب خداوند کریم نے میری والدہ محترمہ کے ذریعہ مجھے

پہنچایا ملا یہ مسلہ حقیقت ہے کہ بی اماں نے جس ضبط و ایثار کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش کی ہوگی اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ شوہر کے انتقال کے وقت کیسا کچا ساتھ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے، خود بھی زیادہ عمر کی نہ تھیں۔ پورا شیرازہ ایک گرتی ہوئی بوسیدہ دیوار کی طرح تھا جس کو سہارا دینا تو درکنار دور سے ہر شخص اپنے کو بچاتا ہے۔ ایسی بوسیدہ وکچی دیوار کو قوم و ملک کے یہ مضبوط و مستحکم ستون بنا دینا والدہ محمد علی کی قابلیت و صلاحیت کی غماز ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ خود ناخواندہ مگر بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم دلائی جب کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کے مخالف ہی نہیں تھے بلکہ متشدد مسلمان اس کو غیر اسلامی اور کفر کی حد تک سمجھتے تھے۔

مولانا کی تعلیم کا سلسلہ اپنے وطن کے ایک مدرسے سے شروع ہوتا ہے۔ اِس مدرسہ میں دینی تعلیم کے ساتھ مڈل تک پڑھنے کے بعد بریلی کے ایک انگریزی اسکول جہاں مولانا کے بڑے بھائی شوکت علی پڑھتے تھے، داخل کرایا گیا۔ مولانا شوکت علی جب یہاں سے میٹرک پاس کر کے ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ آئے تو اپنے بھائی محمد علی کو بھی ساتھ لے آئے۔ علی گڑھ پہنچ کر محمد علی کا نیا رُخ ہوا۔ کچھ ہی دن میں انتہائی مقبول و معروف طلبہ میں شمار ہونے لگے۔ پڑھائی پر توجہ بس امتحان قریب آنے پر دیتے مگر اس کے باوجود کامیاب ہو جاتے۔ سال کا زیادہ وقت کھیل کود اور تفریح و تعلقات میں گذارتے۔ میٹرک کا امتحان پاس کر کے مولانا کالج کی یونین میں دلچسپی لینے لگے۔ سید سجاد حیدر یلدرم آپ کے ساتھیوں میں تھے جن کی صحبت سے شعروشاعری کی رغبت ہوئی۔ مولانا نے داغ دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ علی گڑھ کی زمانہ طالب علمی کے دوران مولانا کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا گیا جنہوں نے یقیناً مولانا کو عام مقبولیت عفت و عظمت عطا کی۔ مولانا کا انقلابی ذہن تصنیف و تقریر کی صلاحیتیں، جسارت، شعروسخن سے دلچسپی جنہوں نے مولانا کو ہندوستان کی عظیم شخصیت بنا دیا سب علی گڑھ کے ماحول کی دین ہے جس میں وقت کے گذرنے کے ساتھ جلا ہوتی رہی۔

مولانا کی شخصیت انتہائی جذباتی اور متضاد تھی مولانا علی گڑھ آئے اور انگریز استادوں سے انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ بتدریج یہ مخالفت اتنی بڑھ گئی کہ ان کو انگریزوں سے تعلیم حاصل کرنا اور انگریزوں کا ہندوستان میں حکمراں رہنا قطعی گوارہ نہ تھا۔ انگریزوں کی شدید مخالفت اور ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا جوش و جذبہ مولانا میں علی گڑھ سے ہی پیدا ہوا۔ مولانا کا انگریز استادوں سے بے تعلقی اور مخالفت بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ جو طلبا انگریز استادوں کی حمایت کرتے ان سے مولانا کا تصادم ہوا کرتا اور اس تصادم میں زخمی بھی ہو جاتے۔ علی گڑھ کالج جس کا نام محمڈن اورینٹل کالج تھا کے شدید مخالف ہوتے گئے۔ مولانا کی مخالفت میں شدت روز بروز بڑھتی گئی اور لڑکوں سے لڑائیوں کا سلسلہ بڑھتا گیا تو کالج کے انتظامیہ کو فکر ہوئی اور ایک مقام یہ آیا کہ مولانا کو بذریعہ پولیس کالج کے ہوسٹل سے نکالا گیا۔ کالج کے اِس رویّے سے مولانا انگریزوں کے باغی تو تھے ہی کالج کے بھی باغی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے کچھ لڑکوں کی حمایت سے علی گڑھ کالج کے متوازی ایک درسگاہ کی علی گڑھ ہی میں جامعہ ملیہ کے نام سے بنیاد ڈالی۔ یہ تاریخی واقعہ مستحکم اور مستند ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد علی گڑھ میں پڑی اور اس کے بانی

مولانا محمد علی جوہر تھے۔ مولانا کی زندگی کا یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے نظریات اور طریقۂ کار ایک سیاست داں اور انگریزوں کی ہندوستان سے وابستگی کی مخالفت کے جذبات سے مضبوط ہو رہے تھے۔ درحقیقت مولانا کی سیاسی زندگی کا آغاز علی گڑھ ہی سے ہوتا ہے یہاں کے ماحول میں انگریزوں کا وجود اور اس کے ردِ عمل سے پیدا جذبات مولانا کی سیاسی زندگی کی تعمیر کے ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے ایک دلیر سپاہی کو جنم دے رہے تھے، ایک رئیس الاحرار کو جنم دے رہے تھے اور تقریر و تصنیف و شاعرانہ رجحان کے اثرات سرزمین علی گڑھ سے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ درحقیقت مولانا کی بنیادی تربیت بی اماں کے ہاتھوں کے ہونے کے بعد زیادہ تر تعلیم و تربیت اور ذہنی رجحان علی گڑھ میں ہوا جس پر مولانا کی ساری زندگی کے کارہائے نمایاں درخشاں اور تابندہ ہیں۔

مولانا کو علی گڑھ کالج سے بددلی کا احساس صرف اس وجہ سے ہوا کہ سرسیدؒ نے تعلیم و تدریس کے لیے انگریزوں کو ملازمتیں دیں اور جو کالج کے بیشتر انتظامیہ میں بھی شریک تھے۔ انتظامیہ میں ہونے سے انگریزوں کے فیصلے جو لڑکوں کی دلچسپیوں کے خلاف ہوئے اس سے مولانا کو زبردست اعتراض ہوتا۔ یہ اعتراض اتنا شدید ہوتا کہ اس کا مظاہرہ کرتے اور پھر ان کے خلاف کارروائی ہوتی۔ مولانا کے ساتھ اس قسم کے کئی مرتبہ واقعات ہوئے۔ آخر مولانا کی مقبولیت اور حمایت اس طریق کار اور خیالات سے لڑکوں میں پائیدار و مستحکم ہو چکی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر مولانا نے علی گڑھ کالج کے مقابلے میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈال دی۔ جب بنیاد پڑ گئی تو جوشیلے نوجوان لڑکے اور کچھ اساتذہ بھی اس میں شریک

ہوئے اور مختلف معتبر تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ درختوں کے نیچے بغیر کسی فرنیچر کے درجے ہوتے جس میں استاد پڑھاتے اور لڑکے پڑھتے۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ یہ پودا جو ضد و جوش میں بنایا ہوا گھروندا آج یقیناً علی گڑھ یونیورسٹی کا متوازی ادارہ ہوگا۔ اس بات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کام کی نوعیت کیسی بھی ہو اگر خلوص و ایثار کے ساتھ شروع کیا جائے تو اس کا استحکام، اس میں مضبوطی و پائداری اور مقصد کا تحفظ یقیناً قائم رہتا ہے۔

مولانا محمد علی کا علی گڑھ تعلیمی ادارے سے انگریزوں کی وابستگی کی بنا پر مخالفت ایک سطحی نظریہ تھا۔ سرسید نے انگریزوں کو اپنے کالج سے محض اس لیے شامل کیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کے معاشرے میں رہن سہن، کھانے پینے کے طریقوں میں تبدیلی آئے۔ انگریزی تعلیم سے مسلمان اس لائق ہو سکے گا کہ سائنس اور جدید مضامین کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ انگریزوں کی معاشرت کا اثر ہوگا اور معاشرتی تبدیلی آئے گی۔ سرسید یقین کے ساتھ سمجھتے تھے کہ یہ تبدیلی مسلمانوں میں آنا وقت کا تقاضہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی انفرادی ترقی اور سماجی و اجتماعی وقار کا انحصار اسی تبدیلی ذہن و تعلیم پر ہے۔ مولانا موصوف کے علاوہ سرسید کے ان نظریات کی ہندوستان میں سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے مسلمان قوم کی نبض پکڑ لی تھی اور مرض کی تشخیص کر لی تھی وہ سمجھتے تھے کہ یہ قوم اگر مزید فرسودہ خیالات میں مبتلا رہی اور اس نے مذہبی و معاشرتی کوتاہ نظری کو ذہن سے ہلکا نہ کیا تو اس قوم کا مرض بڑھتا ہی جائے گا اور اس کا معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی اعتبار سے مفلس ہو جانا لازمی نتیجہ ہوگا۔ سرسید کی ثابت قدمی اور ان کے نظریات و ارادوں کی پختگی نے "علی گڑھ تحریک" کو اپنے نصب العین کے رخ پر قائم رکھا۔ محمڈن اورینٹل کالج

کا قیام سرسید کی تحریک کی پہلی کڑی ہے۔ اس کالج کے قیام کے کچھ ہی سال کے بعد بالخصوص بیسوی صدی کے شروع میں جن مسلمانوں نے جنگ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائض ہوئے۔ تالیف و تقریر میں امتیازی مقام کے حامل رہے۔ زیادہ تر تعداد ان مسلمانوں کی ہے جو اس کالج کے ممتاز طلبہ تھے۔ انہیں ممتاز شخصیتوں میں مولانا محمد علی جوہر خود بھی ہیں۔

مولانا محمد علی نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی۔اے اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اس وقت محمڈن اورینٹل کالج الہ آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا اور راجپوتانہ اور دوسرے دُور دراز کے کالج اس کے تعلیمی احاطے میں آتے تھے۔ ان تمام کالجوں کے امتحانات ساتھ ہوتے تھے۔ اس میں اوّل مقام حاصل کرنا یقیناً مولانا جیسے کھیل و تفریح، شعر و شاعری اور لیڈری و کالج کی سیاست سے وابستہ طالب علم کے لیے انتہائی تعجب کی بات تھی مگر مولانا ان سب مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ باوجود دیگر مصروفیات کے اپنے پڑھنے اور امتحان کی تیاری کے لیے ضرور وقت نکال لیتے اور امتحان میں محض کامیاب ہی نہیں ہوتے بلکہ امتیازی و مخصوص طریقے سے کامیاب ہوتے۔

مولانا کا اتنی امتیازی حیثیت سے بی۔اے۔ پاس کر لینے کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو اپنے چھوٹے بھائی کو انگلستان بھیجنے اور وہاں سے آئی۔سی۔ایس کرانے کا خیال ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ مصارف کا تھا۔ اس کا انتظام کیسے ہوا، علی گڑھ سے کس طرح رخصت ہوئے۔ احباب پر کیا تاثرات قائم ہوئے اور اساتذہ نے کیا کیا؟ اس کے متعلق بہترین بیان محمد علی کے ہم جماعت سید سجاد حیدر کی تحریر ہے۔

"وہ علی گڑھ کی طالب علمی اس چمک دمک کے سا[تھ] ختم کرنے کے بعد محمد علی علی گڑھ سے رخصت ہوئے، مگ[ر] کس طرح؟ پرنسپل خوش تھے کہ ایک جھگڑالو طالب علم جا رہا ہے۔ عام طلبہ کو رنج تھا کہ ایسا خوش گپیاں کرنے والا، بذلہ سنج، مگر ساتھ ہی موقع پڑنے پر لڑائی میں ان کی سرداری کرنے والا، اور ان کے لیے پرنسپل سے بے دھڑک اور بے جھجک لڑنے والا جا رہا ہے۔ علم دوست اور لائق طالب علم حیران تھے کہ محمد علی سے کیوں دور رہتا تھا بلکہ وہ کیوں اُن کی ہنسی اڑ[اتا] تھا۔ انگلینڈ روانہ ہونے سے قبل وہ علی گڑھ آئے ا[ور] احباب نے انہیں ایک رخصتی ڈنر دیا"

انگلستان میں قیام کے مصارف کے لیے مولانا کے عاشق زار بھائی شوکت علی نے جو اُس زمانے میں ریاست رام پور کے محکمۂ افیون کے افسر تھے ا[س] طرح حل نکالا کہ خود تو دورے کے سفر خرچ میں ا[پنا] گذر کریں اور اپنی پوری تنخواہ محمد علی کو دیں۔ اس [طرح] محمد علی کا ولایت جانا ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے سچ فرما[یا] "شوکت علی نے اپنے بھائی کے ساتھ وہ کام کیا جو کم لوگ اپنی اولاد کے لیے بھی کرتے ہیں۔" مولانا بڑے شو[ق] و ولولے کے ساتھ ولایت پہنچے۔ آکسفورڈ کے لنکز [کالج] میں داخل ہوئے۔ چونکہ طبیعت پر علمی ذوق طار[ی] تھا اس لیے اُن مضامین سے دلچسپی لیتے رہے جو [ان کی] افتادِ طبع کے موافق تھے اور جن مضامین سے دلچ[سپی] نہ تھی اُن کی طرف مطلق التفات نہ کیا جس کا نتیج[ہ] یہ ہوا کہ جس مقصد یعنی۔ آئی۔سی۔ایس کا امتحان د[ینے] گئے تھے۔ اس میں ناکام ہوئے۔ مولانا شوکت علی نے یہ خبر جب انگریزی کے اخبار پانیر میں پڑھی تو اُن [کو] دلی صدمہ ہوا۔ اُن کی افسردہ حالی کو دیکھ کر اُن کی وا[لدہ]

بی اماں نے ان کو ڈھارس دی اور فرمایا محمد علی کو بلا لو، بہتیر
بیٹھی ہوئی ہے شادی کر دو، پھر دیکھا جائے گا۔ چنانچہ محمد علی
۱۹۰۲ء میں ہندوستان واپس آ گئے۔ اور اسی سال ان کے
ایک عزیز عظمت اللہ خاں کی صاحبزادی جن کا نام امجدی
بیگم تھا کے ساتھ شادی کر دی گئی۔ مولانا کی آئی سی ایس
میں ناکامی کی ایک اور خاص وجہ یہ بھی رہی کہ مولانا
علی گڑھ میں ایک خاص طرز کی زندگی گذار چکے تھے۔ لیڈری
کا چسکہ ان کو علی گڑھ کی فضا میں پڑ چکا تھا، لہذا ایسی
معروفیات وہاں بھی طبیعت پر غالب رہیں۔ تقریری
مقابلوں میں حصہ لیتے جس سے ایک انتہائی سود مند اور
زبردست فائدہ یہ ہوا کہ مولانا کو تقریر اور انگریزی
زبان پر کافی عبور حاصل ہو گیا۔

شادی کے بعد مولانا پھر ۱۹۰۲ء ہی میں انگلستان گئے۔
اب اس ارادے سے گئے کہ بی۔اے کا امتحان دیں چنانچہ
انہوں نے پورے انہماک سے تیاری کی اور بی۔اے
(آنرز) جدید تاریخ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بی۔اے
کرنے کے بعد مولانا ہندوستان واپس آ گئے۔ ہندوستان
پہنچنے پر ریاست رام پور کے ہائی اسکول کے پرنسپل اور
پھر ریاست کے چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ مولانا
نے اپنی اس مختصر مدت میں بہت سی تعلیمی اصلاحات
نافذ فرمائیں۔

مولانا محمد علی رام پور کی ملازمت سے مطمئن نہ تھے اگرچہ
اختیارات و وقار حاصل تھے۔ اسی دوران ملازمت میں
نواب صاحب ریاست بڑودہ اور سلطان جہاں بیگم والیٔ
بھوپال نے اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کی۔ مولانا کا مزاج اور
رجحان میں آزاد خیالی تھی، قوم و ملت کی قیادت کا جذبہ تھا۔
بہرحال ریاست بڑودہ کی پیشکش قبول کر لی مگر کچھ عرصے
کے بعد یہاں کی ملازمت سے بھی سبکدوشی حاصل کر کے مولانا
نے ملک و قوم کی خدمت کے خیال سے ایک انگریزی اخبار کی
اشاعت کا ارادہ کیا۔ اس منصوبے میں مولانا کو اپنے دوست
عبدالرحمن صدیقی کا تعاون حاصل ہوا اور کلکتہ میں 'کامریڈ'
رسالے کی اشاعت کی بنیاد پڑی۔ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو اس
ہفتہ وار رسالے کا پہلا شمارہ شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا۔
مولانا نے اپنے رسالے کامریڈ کی اشاعت کے لیے کلکتہ
اس لیے منتخب کیا کہ کلکتہ اس وقت ہندوستان کا دارالسلطنت
تھا اور سیاسی نقل و حرکت کا گہوارہ تھا۔ انگریزوں کی
تعداد بھی یہاں زیادہ تھی۔ اگرچہ مولانا نے بظاہر کامریڈ
کے نام سے ایک انگریزی پرچے کی اشاعت کی مگر
درحقیقت ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء مولانا کی سیاسی زندگی کا
آغاز تھا اور حبّ الوطنی۔ انگریزی سامراجیت کی مخالفت،
قوم و ملت کی خدمت کے جذبات کا پہلا مظاہرہ تھا۔
کامریڈ کی اشاعت سے انگریزی داں حلقہ انتہائی متاثر
ہوا۔ اس کی صحافت اور معیار اتنا بلند تھا کہ انگریزوں سے
بھی نہ رہا گیا انہوں نے بھی اس کی ممبرشپ اختیار
کر لی اور بیشتر اس کے شمارے انگلینڈ اپنے دوستوں
کو بھیجتے۔ مولانا اور ان کے دو قریبی دوست مسٹر ولایت
حسین بھوتی جو بارہ بنکی کے رہنے والے تھے اور دوسرے
راجہ غلام حسین ایک نہایت قابل پنجابی دوست تھے
تینوں مل کر اس رسالے کے لیے مضامین لکھتے اور انگریزی
سامراجیت پر سخت نکتہ چینی کرتے۔ اگرچہ کامریڈ کو
مقبولیت حاصل رہی اور معیار بھی قائم رہا مگر مولانا
محمد علی کی سیاسی جدوجہد، معروفیات جس میں ہندوستان
میں مختلف جگہوں کے دورے و تقریریں شامل تھیں
سے 'کامریڈ' کی صحافت و معیار اور توجہ پر کافی اثر پڑا۔
اسی دوران مولانا پریس ایکٹ کے تحت بند بھی ہوئے۔
اس کے ساتھ ہی کامریڈ کی اشاعت بھی بند ہو گئی۔ مولانا
کے رہا ہونے پر رسالے کا پھر نکلنا تو ہوا مگر وہ پہلا
جیسا معیار نہ آ سکا۔ اس کی خاص وجہ مولانا کی سیاسی معروفیات

تھیں مولانا سارے ہندوستان میں دورہ کرنے اور
انگریز حکومت کے خلاف فضا تیار کرنے میں تقریریں
کرتے۔ اِس نقل وحرکت میں مولانا کا سیاسی شعور اور
جذبات میں شدت آتی گئی۔ یہ وہ زمانہ یعنی ۱۹۱۱ء سے
تقریباً ۱۹۲۰ء تک کا ہے جب حکومت ترکی کے سیاسی اثرات
اتنے مستحکم ہو رہے تھے کہ وہ تمام مسلمان حکومتوں کی قیادت
کر رہا تھا اور ہر اندرونی و بیرونی معاملات میں رہبری
کر رہا تھا۔ لہٰذا مولانا کا رجحان ترکی سیاست پر بھی
رہا اور اس کی سیاسی پالیسیوں کو قبول کرتے رہے،
ان تمام مصروفیات نے کامریڈ کی اشاعت پر خاص
اثر ڈالا۔ کامریڈ کا دوسرا دور انتہائی غیر استحکامی حالات
میں گذرا۔ جب ۱۹۱۲ء میں پایہ تخت کلکتہ سے منتقل ہوکر
دہلی آیا تو مولانا بھی اپنے اخبار کا دفتر دہلی میں کوچہ
چیلان میں لے آئے۔ یہیں موصوف کا رہائشی مکان، یہیں
دفتر اور پریس بھی تھا۔ اور بیرسٹر آصف علی کے مکان سے
بالکل ملحق تھا۔ ۱۹۱۴ء میں کامریڈ کی ضمانت ضبط ہو گئی
اس کے بعد اس کا نکلنا بند ہو گیا۔ اگرچہ فروری ۱۹۱۳ء
میں "ہمدرد" اردو روزنامہ کا دہلی سے آغاز ہو چکا تھا
کامریڈ کا کوئی شمارہ پھر نہ نکل سکا مگر یہ حقیقت ہے کہ
اس پرچے کی اشاعت کے بند ہونے کے بعد اس جیسا
معیاری پرچہ مسلمانوں میں نہ نکل پایا۔

"ہمدرد" مولانا کی کوششوں کا اردو میں دوسرا
پرچہ تھا جو دہلی میں شائع ہوا مگر کچھ عرصہ بعد یہ
بدعنوانیوں کا شکار ہو گیا اور مولانا کو اس کو بھی بند
کرنا پڑا۔ اگرچہ مولانا نے اپنے دائرے احباب میں سے
مختلف حضرات جس میں بدایوں کے محفوظ علی صاحب
سید جالب دہلوی، قاضی عبدالغفار مراد آبادی عبدالرحمٰن
صدیقی جوار د صحافت اور انتظامی صلاحیتوں کے حامل
تھے سے "ہمدرد" کی اشاعت میں مدد لی مگر مولانا کی اپنی
ذاتی توجہ سے یہ پرچہ بھی مولانا کی توجہ سے محروم رہا۔
ان دونوں پرچوں سے مولانا کی شخصیت عوام کے
نظروں میں خاص نمایاں ہو گئی اور مولانا کے رجحانات
کا عوام کو احساس ہوا۔ مولانا کے دوستوں میں انگریز بھی
تھے اور بیشتر ایسے تھے جو مولانا کے ساتھ آکسفورڈ میں
ہم جماعت یا ہمعصر تھے۔ مولانا نے بہت سے ملی اور قومی
مسائل ان انگریز حکمرانوں سے محض اپنے تعلقات اور
ذاتی اثر سے حل کرائے۔

مولانا اپنی ذہانت اور حاضر جوابی میں زمانہ
طفلی ہی سے مشہور رہے۔ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے ماحول
نے اس میں اور جلا پیدا کر دی۔ حاضر جوابی موقعہ و
محل کے لحاظ کے ساتھ انتہائی لطیف طنز اور مزاح سے
بھرپور ہوتی۔ جس سے محظوظ ہونے کے ساتھ حقیقت
اور اصلاح کا بھی پہلو ہوتا۔ مولانا کی برجستگی و حاضر
جوابی کی مثال اور لطیفے آج بھی بیان ہوتے ہیں۔
مولانا کے چند لطیفے قارئین کی خدمت میں پیش ہیں

ایک روایت کے مطابق مولانا ایک موقعہ پر
سیتاپور اپنے کسی ہندو دوست کے مہمان ہوئے۔
جب کھانا کھانے سب بیٹھے تو سب نے کھانا کھانا شروع
کر دیا مگر مولانا ہاتھ باندھے بیٹھے رہے۔ جب میزبان
نے دیکھا کہ مولانا کھانا نہیں کھا رہے ہیں تو پوچھا کہ آپ
کیوں نہیں کھا رہے ہیں۔ مولانا خاموش بیٹھے رہے مکرر
پوچھنے پر مولانا بولے، "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں رام پور
کا رہنے والا سیتاپور لڑکی کے گھر کیسے کھا سکتا ہوں۔
مولانا کی اس بات پر سب نے خوب لطف لیا۔ مولانا اپنے
انگریز دوستوں کو اعلیٰ عہدے داران کو بھی نہ بخشتے۔
حکومت ہند میں ایک زمانہ میں سر ڈینس برے (S
(DENNIS BRAY) ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار کامریڈ
میں مولانا نے لکھا، کون کہتا ہے کہ اسمبلی میں گدھے نہیں

ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے۔ کیا تم نے اسکو (BRAY) یعنی ہنکتے ہوئے نہیں سنا؟ "یہ مذاق لندن ٹائمز میں بھی نقل ہوا۔ ایک مرتبہ حکیم اجمل خاں کی رہائش گاہ پر مولانا ایک مشاورتی جلسہ میں شریک ہوئے۔ حکیم صاحب کسی ضرورت سے زنان خانہ تشریف لے گئے۔ اسی درمیان ایک شخص آموں کی سینی لایا جس میں ایک پرچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ شرکا جلسہ کا فوراً خیال گیا کہ پرچہ پہلے پڑھا جائے۔ مولانا سے نہ رہا گیا اور برجستہ بولے پرچہ پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ ترکیب استعمال کا پرچہ ہے۔

حکیم صاحب کا مکان اور پرچہ ترکیب استعمال کتنا موزوں اور برمحل تھا۔ مولانا کو آم بہت پسند تھے بلکہ ان کی کمزوری تھی۔ ذیابطیس کے مریض ہونے کے باوجود آم کھانا نہ چھوڑتے۔ ڈاکٹروں نے سخت تاکید کی تو ایک آم کھانے کی اجازت لے لی مگر کہنے کو تو وہ گنتی میں ایک آم ہوتا مگر وہ ایک آم بھی دو تین آموں کے برابر ہوتا۔

مولانا کی ذہانت اور حاضر جوابی کا ہر شخص قائل تھا اور یہ صفات ان کی مثالی تصور کی جاتی تھیں۔ مولانا خود ذہین تھے اور ویسے ہی ذہین اور حاضر جواب لوگوں کی قدر کرتے تھے۔ ایک واقعہ ہے کہ "ہمدرد" رسالے کے آخری زمانہ میں مولانا کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت ہوئی۔ ایک صاحب جن کا نام عبدالسمیع خاں جو ہوشنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ اس سلسلے میں ان سے ملنے گئے۔ مولانا نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ سمیع صاحب نے جواب دیا، سی پی (صوبجات متوسط) کا رہنے والا ہوں۔ مولانا متحیر ہوکر بولے کہ کیا سی پی میں بھی آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ سمیع صاحب نے برجستہ کہا "آرٹسٹوں کو چھوڑیے سی پی میں موتی پیدا ہوتے ہیں"۔ مولانا پھڑک گئے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انھیں فوراً رکھ لیا اور عمر بھر اس لطیفے کو نہیں بھولے۔ جب سمیع صاحب کا کسی سے تعارف کراتے تو کہتے کہ یہ سی پی کے موتی ہیں مولانا اسمبلی جاتے تو سمیع صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے تاکہ وہ مختلف ممبران کی نشست و برخاست کے انداز کو دیکھ کر اسکیچ بنائیں۔ یہ اسکیچ اخبارات میں چھپتے تھے۔

مولانا اپنے قلمی مخالفین سے نظریاتی تفاوت کے باوجود جذبۂ خدمت و خلوص رکھتے تھے۔ متعدد ایسے واقعات مولانا کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے رہے جو مولانا کی وسیع القلبی اور احترام کی مثال ہیں۔ ایسے چند واقعات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں،

مضامین محمد علی میں ڈاکٹر اقبال کے خلاف چند مضامین ملتے ہیں۔ ان کے لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے صوبہ کی کونسل میں دوران تقریر کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ انہیں ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں ہے اس لیے پنجاب میں انگریز افسروں کو زیادہ سے زیادہ مقرر کیا جائے۔ مولانا محمد علی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ پھر انہوں نے ڈاکٹر اقبال کی طویل نظموں کے اقتباسات کو پیش کرکے پوچھا کہ "اقبال تمہارے علم و عمل میں یہ تفاوت کیوں ہے۔؟" مولانا کا انداز تخاطب اور طرزِ نگارش انتہائی شائستہ اور جامع تھا جو اس بات کو واضح بھی کرتا ہے کہ باوجود مخالفت کے احترام و لحاظ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ڈاکٹر اقبال بھی مولانا کا غیر معمولی احترام کرتے تھے، "اسیری" اور وفات پر علامہ اقبال نے جو لافانی نظمیں لکھی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کو مولانا کا کس قدر احترام کرتے تھے۔

ایک دوسرا واقعہ خواجہ حسن نظامی سے ہوا۔ مولانا

اور خواجہ صاحب موصوف ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ دونوں میں زبردست قلمی جنگ چلا کرتی۔ مخالف اخبارات میں مولانا پر گندگی اچھالی جاتی مگر مولانا نے اپنے مضامین میں انتہائی متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھا۔ اس جنگ و مخالفت کے باوجود دہلی میں جب خواجہ حسن نظامی پر گولی چلی اور اتفاقاً اُن کے خسر اس میں شہید ہو گئے۔ پولس نے تحقیقات میں بڑی لیت ولعل سے کام لیا۔ اس پر احسان الحق جو مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں کے دوست تھے۔ مولانا کے پاس آئے اور صورت حال سے واقف کرایا۔ مولانا ساری مخالفت کو بالائے طاق کرکے دہلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پر ایک گھنٹہ تک گفتگو کی اور ساری تفصیل بتا کر زور دیا کہ اس قتل کی پوری تحقیقات کی جائے اور مجرموں کو سزا دی جائے۔ مولانا کا یہ ردِ عمل مولانا کے کیرکٹر وضع داری اور بلند خیالی کی ایک انتہائی اعلیٰ مثال ہے۔

مولانا محمد علی ایک سیاست داں، مجاہد آزادی، صحافی اور مقرر کے اوصاف کے حامل ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ اگرچہ مولانا نے چند ہی نظمیں وغزلیں کہیں مگر جو کہیں ان سے آج بھی ادبی ذہن متاثر ہے۔ اور اُن کی شاعری میں شادابی وتازگی کا احساس پوری طرح موجود ہے۔ مولانا کا مقام بحیثیت شاعر وہ نہیں ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے اس کی وجہ واضح ہے کہ مولانا کی سخن گوئی مولانا کی سیاسی مصروفیات اور انگریزی اخبار کی صحافت ونگرانی کی نذر رہیں مگر اس کے باوجود مولانا کا شعری مزاج انتہائی باشعور اور اپنے وقت سے ہم آہنگ ہے۔ شاعرانہ مزاج حالات زندگی اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لہٰذا مولانا کی شاعری بیشتر انگریزوں کا ہندوستان میں تسلط، جیل خانوں کی اسیری، اپنی والدہ سے جدائی، اپنی بیٹی سے والہانہ محبت اور ان کا غم مفارقت کا محور رہی۔ مگر ان تمام حالات زندگی کے ساتھ مولانا کی شاعری میں قنوطیت ہر اس ومایوسی کے بجائے مولانا کا جذبہ ولیت، عزم کی پختگی حوصلہ وایثار ہمیشہ موجود رہا۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

فیض سے تیرے ہی آئے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے دَر کھلے

....

کہہ دو رضواں سے نہیں سایہ طوبیٰ درکار
اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں میں تلواروں کی

ان اشعار سے اور ایسے ہی متعدد اشعار ہیں جن سے مولانا کے جوش اور شدت سرفروشی کی تابناکی اور کیفیت اتنی مدت گذر جانے کے باوجود تروتازہ ہیں۔ مولانا اپنی سیاسی تقریروں وتحریروں کے نتیجے میں کئی مرتبہ قید خانے گئے۔ دورِ اسیری میں مولانا کے اشعار اپنے ملک اور اپنی بیٹی آمنہ سے والہانہ محبت کے غماز ہیں مولانا بیجاپور جیل کی کال کوٹھری میں قید ہیں، قید بھی کیسی قیدِ تنہائی تصورات کو جنم دے کر احساسات وخیالات کے پرواز کا باعث ہوتی ہے۔ مولانا تنہائی وتاریکی کے باوجود تصورات اور احساسات کو منور کر لیتے اور خلوت میں جلوت بنا لیتے۔ دیکھئے جیل کے کال کوٹھری اور مولانا اس کو آسان وروشن کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مولانا کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ لڑکا کوئی نہ تھا۔ چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی صاحبزادی آمنہ شادی شدہ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی۔ جب اس کی اطلاع مولانا کو ہوئی۔ دل پر کیا کچھ نہ بیت گئی ہو گی جیل کی بلند فصیل ہے، ماں، بھائی اولاد، رفیقہ حیات سب کو چھوڑ کر انتہائی دلیری سے وطن و قوم کی آزادی و فلاح کے لیے ان فصیلوں میں گرفتار اور شب و روز کی کلفتوں کو عزیز کیے مولانا اپنے رب العلمین سے اپنی بیٹی کی صحت کے لیے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اس مجبوری، بے بسی اور اسیری کے باوجود مولانا کا آہنی عزم اس شعر سے ملاحظہ فرمائیے۔

امتحاں سخت سہی، پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

اپنی بیٹی آمنہ کی صحت کے لیے روتے اور گڑگڑاتے ہیں اور اپنے رب سے دعا میں عرض کرتے ہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت کم نہیں
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

صاحبزادی کی حالت نازک ہوتی گئی اور جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو کیا کلیجہ شکن شعر کہا ہے

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

جب جیل سے باہر آئے تو صاحبزادی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

مولانا محمد علی کا پورا عرصۂ حیات انتہائی پُر آشوب کا زمانہ رہا۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم انہیں کے زمانے میں ہوئیں۔ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سازشیں اور سیاسی چالوں سے مسلمان حکومتیں زد میں آ رہی تھیں اور عبادت گاہوں پر بھی تسلط کی کوششیں تھیں۔ مصر انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ افریقہ کی بیشتر شمالی ریاستیں فرانس کے پنجۂ استبداد میں تھیں۔ مختصر یہ کہ ساری دنیا کے مسلمان اور اسلامی ریاستیں ایسی ہیجانی کیفیت میں تھیں کہ اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ مولانا کو اپنے ملک کی آزادی کے ساتھ دنیا کے اسلام کے غم کی فکر میں ہلکان کیے تھیں۔ اس کے ساتھ ہندوستان کے مسائل، کانپور، دہلی کلکتہ، امرت سر، ہر جانب مولانا کے جذبات بکھرے پڑے تھے جو اپنے اشعار میں ان تمام جگہ واقع حادثات کا ذکر کرتے ہیں اور جس پر وہ انتہائی دردمندانہ دل سے اشکبار ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۳ء کا کلکتہ کا خلفشار اور ہنگامی حالات سے برطانی حکومت تشدد پر اتر آئی۔ ادھر کانپور میں مسجد مچھلی بازار جو مسٹن روڈ پر واقع ہے کے سلسلے میں حادثات ہوئے اور ان گنت مسلمان شہید ہوئے۔ ان دونوں جگہ کے حادثوں سے مولانا کے جذبات کی عکاسی ان اشعار سے ہوتی ہے۔

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شان کلکتہ
روح رسولؐ آج ہے مہمان کلکتہ
مسرور خلد میں ہیں شہیدان کانپور

ہوکے شریک بزم شہیدان کلکتہ

۱۹۲۲ء میں مولانا بیجاپور جیل میں قید تھے۔ قید
ھی ایسی قید کہ نہ اخبار ملتا نہ ملاقات کی اجازت تھی۔
یک روز مولانا کو نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ نعروں
کے جوش و خروش سے مولانا نے قیاس کر لیا کہ ترکوں
ور یونانیوں کی جنگ میں جو اس وقت ہو رہی تھی،
ترکوں کی فتح ہوئی۔ اس قیاس پر مولانا کے جذبات ان کی
س غزل سے عیاں ہیں۔

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
اِک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی
اِک گھر ترا یہاں بھی تو ہے، اس کے باب میں
کب لامکاں سے ہوگی مشیت مکین کی
ہیں سب عرب میں شام، فلسطین۔ اور عراق
ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک دین کی
بہر خدا۔ یہود و نصارا کو دو نکالے
یہ ہے وصیت اُس کے رسولِ آمین کی

مولانا کی شعر گوئی اور اسیری کا زمانہ تقریباً
یک ہی تھا۔ باالفاظ دیگر مولانا کا مجموعہ کلام کا بڑا
حصہ اس زمانے کا ہے جو ۱۹۱۵ء سے شروع ہو کر
۱۹۲۲ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ مولانا
محمد علی نے آزادیٔ وطن کی خاطر جان کی بازی لگائی۔
اور عزیز، اقربا، گھربار، دوست۔ اخبار سب ہی کچھ
قربان کر رکھا تھا اور صرف ایک ہی دھن تھی کہ ملک
آزاد ہو جائے اور انگریزوں کی غلامی سے نجات ملے۔
مجموعی طور پر یہ امر مسلم ہے کہ مولانا کی تمام تر شاعری
ہندوستان کی محکومی اور انگریزوں کے تسلّط کا محور
رہی۔ مولانا کا تخلص جوہر تھا لہذا مولانا موصوف اپنے
نام اور تخلص سے ہی سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا کا دینی رجحان بھی انتہائی مستحکم تھا۔ جیل میں
قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور وعظ و دینی تلقین
کرتے۔ چھندواڑہ جیل میں مسلمانوں کو باضابطہ
تلقین کیا کرتے۔ ذکر و عبادت میں اپنا کافی وقت صرف
کرتے جس کے اثر سے موصوف نے اپنی ظاہری وضع
قطع بھی متشرع کر لی اور سوٹ ٹائی کے بجائے خالص
اسلامی لباس اختیار کر لیا۔ سفید بال دار ٹوپی لباس
میں شامل ہوگئی۔ حالانکہ ابتدائی دور میں مولانا
کا لباس کوٹ پتلون ہی تھا۔ اپنی تبدیلی لباس
اور دینی شغف سے اکسفورڈ کے گریجویٹ محمد علی
مولانا محمد علی بن گئے۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی مولانا
کے جذبۂ حبّ الوطنی میں بھی شدت آتی گئی۔ مولانا
آزادی کو اسلام کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے۔ ان کا
خیال تھا کہ ایک سچا مسلمان ایک سچا محب وطن ہوتا
ہے۔ دراصل ہندوستان کی آزادی کے لیے مولانا کی
دلیرانہ اور والہانہ جدوجہد مولانا کو اسلام ہی
کا عطیہ تھا۔ مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے مگر انہوں
نے ہندوستان کی آزادی اور ہمسایہ قوم کو علیحدہ
نہیں سمجھا۔ ہندوستان کی آزادی کے تعلق سے مولانا
نے جب بھی نمائندگی کی کبھی اس میں فرقہ پرستی
کا شائبہ بھی نہ آنے دیا۔ اس طرح مولانا محمد علی جوہر اپنے
فکر و عمل میں جہاں ایک سچے مسلمان تھے وہیں ایک
سچے محب وطن (نیشنلسٹ) بھی تھے۔ ۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء
کی گول میز کانفرنس جو انگلینڈ میں ہوئی مولانا کی تقریر
حب الوطنی اور قوم کے سچے سپاہی کی دلیل ہے جو
ہندوستان کی سیاست میں ایک قیمتی سرمایہ ہے۔
مولانا کی اس تقریر کا اقتباس توجہ کا مستحق ہے۔

"میں اپنے ملک کو اُسی وقت جاؤں گا جبکہ میرے

ہاتھ میں پروانۂ آزادی ہو۔ نہیں تو میں غلام ملک
میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں کسی بیرونی آزاد ملک
میں مرنا پسند کروں گا۔ اگر تم نے ہندوستان کو
آزادی نہیں دی تو مجھے یہاں تمہیں میری قبر کے لیے
جگہ دینی پڑے گی ،،

مولانا فرقہ واریت کے خلاف اور سخت دشمن
تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندو مسلم تعلقات
کبھی خراب نہ ہونے پائیں۔ اور ہندو مسلمان پر اور مسلمان
ہندو پر اعتماد کریں۔ لہٰذا ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے
جلسہ جس کی صدارت ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری نے کی تھی
مولانا نے اپنی تقریر میں کہا کہ ” ہندوؤں کو مسلمانوں
پر اور مسلمانوں کو ہندوؤں پر اعتماد ہے لیکن برطانوی
حکومت پر نہیں ،،

ہندو مسلم تعلقات خراب ہو جانے پر گاندھی
جی نے ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اپنا برت شروع کیا۔ اور یہ برت
انہوں نے مولانا محمد علی ہی کے مکان پر شروع کیا۔ ان کا
خود کہنا تھا کہ جس قدر خلوص و محبت انہوں نے مولانا
محمد علی کے یہاں دیکھا اور کہیں نہیں دکھائی دیا۔ گاندھی
جی نے ”ینگ انڈیا“ میں لکھا کہ ” ایسے کسی تین آدمی
کو میں نہیں جانتا جن کے دل آپس میں ایسے ملے
ہوں جیسے کہ علی برادران اور میرے دل ہیں “۔ مولانا
کی شروع کردہ مختلف تحریکیں مثلاً تحریک خلافت،
تحریک ترک موالات جنھوں نے ہندوستان کی
تحریک آزادی کو جہاں زبردست طاقت عطا کی
وہاں ہندو مسلم اتحاد کا ناقابل فراموش دور پیدا
کیا۔ جس کے نتیجے میں متحدہ طاقت کی شکل میں ہندو
اور مسلمان برطانوی حکومت پر پوری طرح اثر انداز
ہو ہو کر اس کی جڑوں کو اکھاڑنے لگے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۳ء
میں کاکی ناڈا میں کانگریس سیشن کی صدارت کرتے
ہوئے مولانا نے ایک طویل خطبۂ صدارت میں زیادہ
زور قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد پر دیا اور
تحریک ترک موالات کے تعلق سے انہوں نے کہا

” میں چیلنج کرتا ہوں کہ تاریخ عالم میں ایسی کوئی
مثال نہیں ملتی جہاں کروڑوں لوگ آزادی کیلئے
کھڑے ہوں جس میں مختلف فرقے، مذاہب اور
خیالات کے لوگ شامل ہوں اور وہ تحریک
پرامن ہو ،،

ہندوستان کی آزادی کے لیے جو کاوشیں اور ایثار مولانا
نے کیں وہ اپنی جگہ خود مثال ہیں اور تاریخ سیاست میں
روشن رہیں گی۔ مولانا آزادی کے لیے کوششوں کے
ساتھ اپنے ربّ العلمین سے دعائیں کرتے، روتے اور
گھنٹوں مسجد میں پڑے رہتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ
جو مفتی فلسطین امین الحسینی صاحب نے بیان فرمایا، قابل
توجہ ہے۔ محمد علی شرکت موتمر کے لیے جب حجاز تشریف
لے گئے تو ایک روز رات کو بہت دیر کے بعد امین الحسینی
صاحب کا مسجد الحرام کے اندر خانہ کعبہ کے پاس گذر
ہوا، تو دیکھتے کیا ہیں کہ رات کی اس تاریکی میں غلاف
کعبہ پکڑے ہوئے ایک شخص خانہ کعبہ میں صاحب خانہ
سے معروف راز و نیاز ہے“۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے
گریہ گلوگیر ہے، گردن سجدہ میں جھکی ہوئی ہے اور وہ
گڑگڑا کر، رو رو کر عرض کر رہا ہے کہ ”اے کارساز عالم
مجھے تو جہنم میں جھونک دے، میری کسی آرزو کو پورا
نہ کر لیکن ایک بار ان آنکھوں کے سامنے احیاء خلافت
راشدہ کر کے وہ مبارک و مسعود زمانہ پھر واپس لادے
جس کو کانوں نے سنا ہے مگر آنکھیں اب تک محروم
ہیں۔ ہندوستان کو آزادی عطا فرما تاکہ وہ پنجۂ اغیار
سے آزاد ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے ،،

رئیس احمد جعفری ندوی، سیرت محمد علی، میں لکھتے

ہیں کہ مفتی صاحب کا بیان ہے کہ "میں حیرت سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اس شخص نے اپنی پیشانی سجدہ سے اٹھائی تو دیکھتا کیا ہوں وہ تو زعیم شرق محمد علی ہے جس کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔"

سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کی غرض سے گاندھی جی اور لارڈ اروِن (Lord ERWIN) وائسرائے ہند کے درمیان ایک معاہدہ ہوا کہ لندن میں ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے جس میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے رہنما شرکت کریں۔ ان زعمائے کرام میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بھی شامل تھا۔ اس وقت مولانا محمد علی اگرچہ بے حد کمزور تھے۔ ان کو فکروں۔ سفر اور رات دن کی مشقتوں نے جو جسمانی طور پر کمزور تو کر ہی دیا تھا اس کے ساتھ ذیابطیس کے مرض نے ان کے جسم کو کھوکھلا کر کے تقریباً لب گور کر دیا تھا۔ ان کے قلب پر بھی اثر تھا، آنکھوں سے بھی کم دکھائی دینے لگا تھا۔ پاؤں پر ورم رہتا۔ غرضیکہ مولانا کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ ملک چھوڑتے اور سفر کرتے کیونکہ وہ اس کے بالکل متحمل نہ تھے۔ مگر اس نازک حالت کے باوجود وہ گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس سفر میں ان کی بیگم امجدی بانو بھی ساتھ گئیں۔ مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم نے جب مولانا محمد علی سے پوچھا کہ ایسی حالت میں آپ اتنا طویل سفر کیوں اختیار کر رہے ہو تو آپ نے مسکراہٹ سے جواب دیا "مرنے کے لیے"۔ مولانا محمد علی اپنی حالت بخوبی جانتے تھے کہ میرا ہر لمحہ موت کی گرفت سے خالی نہیں مگر وہ اپنے ان آخری لمحات کو قوم و ملت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے سفر کرنا مقدم سمجھے۔ لہذا باوجود ڈاکٹروں کی سخت ہدایت اور آرام کرنے کے مشوروں سے وہ ہمہ وقت مصروف رہتے اور نازک حالت میں بھی مولانا اپنی کارگذاری اور عملی قوت کا برابر ثبوت دیتے رہے،

مولانا کی ایسی حالت نہ تھی کہ وہ اپنے پیروں پر جا سکتے لہذا۔ ملک و ملت کا یہ فدائی اور اخلاص و ایثار کا یہ متحرک مجسمہ دوسروں کے کندھوں پر لدکر جہاز پہنچایا گیا اور انگلستان کے لیے روانہ ہوگیا۔ روانگی کا نظارہ انتہائی رقت انگیز تھا۔ جس وقت آپ کو اسٹریچر پر لٹا کر ساحل بمبئی سے وائسرائے آف انڈیا جہاز پر سوار کرایا گیا۔ اس وقت تمام حاضرین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، گویا زندہ جنازہ جا رہا ہے۔ جب مولانا پیرس (PARIS) پہنچے تو ان کی حالت اور خراب ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں ڈاکٹروں نے لندن جانے سے منع کر دیا لیکن ڈاکٹروں کے علاج سے کچھ دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی اور ڈاکٹروں کی دبی دبی رائے سے فائدہ اٹھا کر مولانا لندن چل کھڑے ہوئے اور لندن پہنچ گئے۔

لندن پہنچ کر مولانا بجائے اپنی فکر کرتے اور علاج کے لیے کسی ہسپتال یا شاہی نرسنگ ہوم میں داخل ہوتے، سیدھے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس پر جا کر جم گئے اور جب انہیں تقریر کا موقعہ دیا گیا تو عالمی انداز پر انہوں نے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا۔ بیماری نے اتنا لاغر کر دیا تھا کہ کھڑے ہوکر بولنے کی سکت نہیں تھی لہذا تقریر کرسی پر بیٹھ کر شروع کی مگر تھوڑے ہی عرصے بعد کھڑے ہوگئے اور شیر کی طرح دھاڑنا شروع کر دیا اور اعلان کیا۔

"یہ میرا عزم ہے کہ میں ہندوستان جاؤں گا تو آزادی کا پروانہ لے کر واپس جاؤں گا۔ اور اگر برطانیہ کا پوتا ہندوستان کو آزادی نہیں دینا چاہتا تو مجھے میری قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔"

مولانا نے یہ الفاظ کہنے میں اپنی آخری سانسوں کو قوم و آزادی کے لیے استعمال کیا اور ان کو بھی قربان کرکے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا محمد علی کی زندگی میں تو ہندوستان آزاد نہ ہوسکا اور وہ آزادی کی آرزو دل میں لیکر چلے گئے مگر مولانا کی عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور شیر دل لیڈری نے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو کمزور کیا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کی سرپرستی سے نکال کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ہمت دلائی، اُن میں آزادی کی روح پھونکی جس کا نتیجہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کی شکل میں حاصل ہوا۔

مولانا کے انتقال کی خبر آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی۔ مولانا کی موت کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی "گنجہائے گرانمایہ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ولادت سے تو مادر زاد ہوتے ہیں لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی!
عام طور پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے۔ محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا! اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو برگزیدہ حقیقت بنا دیا۔ ارفع وارجمند"

مولانا کی تقریر کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ موت کی خبر ملنے پر اس وقت کے برطانوی سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کرنل ویجوڈ بین نے اعلان کیا کہ "آج ہم میں سے بے مثال عزیمت کا ایک شخص چلا گیا" انگلستان کے مشہور اور شہرہ آفاق مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز کا مولانا محمد علی کے سلسلے میں یہ بیان تھا کہ "محمد علی نپولین کے دل، میکالے کے قلم اور برک کی خطابت کا جامع تھا" اور علامہ اقبال نے ایک نظم کہی جس کا ایک شعر مولانا کی شخصیت کی جامع عکاسی کرتا ہے۔

کہاں آباد ہستی میں یقین مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

بیگم محمد علی جو مولانا کے ساتھ گئیں تھیں تاکہ مولانا کی دیکھ بھال کریں مگر لاکھ کوشش کے باوجود مولانا کی مصروفیات کم نہ ہوئیں۔ وفات سے پیشتر وہ رات بھر کام کرتے رہے۔ بیگم موصوف ایک خط میں اپنے مرحوم شوہر مولانا محمد علی کے آخری دن کی کیفیات بیان کرتے ہوئے اپنی بیٹی زہرہ جو دہلی میں مقیم اپنے باپ کی واپسی اور روزانہ بھیجے خطوط کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ لکھتی ہیں۔

"پیاری زہرہ میں زندہ ہوں لیکن مُردوں سے بدتر نہ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی۔ جن کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھکو اور تم کو تنہا چھوڑکر چلے گئے۔ اس کا ہر وقت خوف رہتا تھا اور وہ سامنے آکر رہا۔ میری ایک بھی دعا قبول نہ ہوئی۔ اُن کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ جب پروگرام ہو جائے گا اُس کے بعد پیرس (PARIS) جاؤں گا۔ اور علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا۔ میں یہ سن کر اور اُن کی کمزوری دیکھ کر گھبراتی تھی۔"

اپنے پیارے باپ کی خبر سُن کر بیٹی زہرہ پر کیا نہ بیتی ہوگی جو باپ کے ساتھ نہ جا سکی تھی اور دہلی میں بیٹھی مولانا کی واپسی کی منتظر تھی۔ اس وقت انسے اپنی محرومی پر کتنی حسرت، کتنا تاسف اور کتنا ناقابل برداشت صدمہ ہوا ہوگا کہ وقت آخر بھی وہ اپنے رفیق و محب باپ کی زیارت نہ کرسکی۔

مولانا شوکت علی جو مولانا مرحوم سے بڑے تھے ان کی دلی کیفیت کیا ہوئی ہوگی۔ جس کا وہ دست راست تھا دل کی طاقت تھا۔ دونوں بھائیوں کی داستان محبت کتنی مشہور تھی۔ مولانا شوکت علی نے سچ کہا کہ محمد علی ان کا بھائی تھا۔ بیٹا بھی۔ عاشق بھی تھا اور معشوق بھی!

اس بڑے بھائی نے اپنی زندگی میں اپنی زندگی کی قیمتی
کمائی کو لٹتے دیکھا مگر افسوس، صبر اور خاموش رہنے کے
سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد اب زیر بحث مسئلہ
یہ تھا کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو۔ بعض احباب کا خیال
تھا کہ تدفین لندن میں ہونی چاہیئے۔ بیگم محمد علی انہیں
ہندوستان لیجانا چاہتی تھیں۔ ہندوستان سے مختلف
مقامات مثلاً رام پور، لکھنؤ، اجمیر، کلکتہ، علی گڑھ
اور دہلی سے پیش کش کے تار گئے۔ اور ان مقامات کے
لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا کا جسد خاکی ہندوستان
لایا جائے اور ان کے شہر کو مولانا کے دفن کا حق دیا جائے۔ ادھر
بیت المقدس کی دعوت تھی کہ مولانا محمد علی ایسے فرزند عظیم
اور عاشق رسول ہیں کہ جن کی گوشہ عافیت سرزمین یمن
کے سینے میں ہے۔ یہ اس مقام کے لیے دعوت اور آرزو مندانہ
درخواست کی جا رہی ہے جہاں کے دفن ہونے کی بڑے بڑوں
نے آرزو اور تمنا کی۔ جو حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ
کا قبلہ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا قبلہ اور خود ہمارے نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا قبلہ رہ چکا ہے۔ یعنی بیت المقدس
کیا موت ہے اور کیا قابل رشک رتبہ ملا۔ یہ وہ زمین
پاک ہے جس کے متعلق میرانیس نے کہا۔

یاں کی زمیں سے مرتبہ پست آسماں کا ہے
کہتے ہیں جس کو عرش وہ فرش اس مکاں کا ہے

سرزمین اقدس کی دعوت منظور کر لی گئی اور مولانا کے
دفن کے انتظامات ہونے لگے۔ جس ہوٹل میں مولانا مقیم
تھے وہاں سے مولانا کا جسد خاکی رات کے ۱۲ بارہ بجے
لفٹ سے نیچے لایا گیا۔ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو شوکت علی،
عبدالرحمن صدیقی اور مظفر نے غسل دیا اور شام کے چھ بجے
حسب اعلان لیڈیگٹن ہال میں نماز جنازہ ادا کی گئی جس
میں اراکین گول میز کانفرنس، سفراء ایران، مصر، کابل وزیر ہند

لارڈ سینکے، وزیر اعظم کا نمائندہ اور دیگر معززین
شریک تھے۔ مولانا کا جنازہ بذریعہ ٹارکنڈا جہاز
ٹیلبری بندرگاہ سے بیت المقدس روانہ کیا گیا جہاں
سے ۲۱ جنوری کو پورٹ سعید پہنچا۔ شاہ مصر کے
نمائندے وزیر اعظم نے جنازے کا استقبال کیا۔ مسجد
عباس میں نماز جنازہ پھر ادا کی گئی۔ مصری پولیس نے
سلامی دی اور جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ شہزادہ
محمد علی نے مولانا محمد علی مرحوم کے لیے غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا
تابوت پر رکھنے کے لیے مرحمت فرمایا۔ مولانا کا کفن خالص
کھدر کا تھا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا مرحوم کا تابوت
یروشلم پہنچا۔ ہزاروں کی تعداد میں مختلف ممالک کے
لوگ اس جلوس میں شریک تھے۔ تمام عربوں، مسلمانوں،
عیسائیوں اور یہودیوں کی دوکانیں شہید ملت کے
اعزاز میں بند تھیں۔ مولانا شوکت علی نے اعلان کیا کہ
میرے عزیز بھائی کا یروشلم میں دفن ہونا مشرقی ممالک کے
ابدی اور مستحکم اتحاد پر دلالت کرتا ہے۔ جلوس میں مولانا
شوکت علی اور یروشلم کے مفتی اعظم پیش پیش تھے اور ان
کے پیچھے ہزاروں ——— ماتم کرنے والے ساتھ ساتھ تھے۔
قاہرہ عمان۔ ٹیونس وغیرہ ممالک سے آئے ہوئے احباب
نے پُر درد مرثیے پڑھے۔ جب تابوت بیت المقدس
پہنچا تو مجمع اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت مشکل سے
تابوت گاڑی سے باہر نکالا جا سکا۔ مسلمانوں، عیسائیوں
اور خواتین کے وفود بیگم صاحبہ محمد علی کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور تعزیت کی۔ دو لاکھ سے زیادہ مردوں اور
عورتوں کا مجمع تھا جو جلوس کی صورت میں اسٹیشن سے
حرم شریف تک تابوت کے ساتھ آیا۔ تقریباً تین
گھنٹہ میں یہ سفر طے ہوا۔ سب قوموں کے معززین،
برطانوی حکومت کا نمائندہ، امیر عبداللہ اور شاہ حسین
کے قونصل اور شہر کے پروٹسٹنٹ اور گریک چرچ کے

بی پیشوا اس وقت موجود تھے اور سب نے تعزیت کی
ت صخرہ شریف کے سامنے رکھا گیا اور تمام مشہور
لمانوں نے تقریریں کیں۔ اور اس طرح بالآخر ہندوستان
پ سپوت ہمیشہ کے لیے سپرد خاک بیت المقدس میں
ایا کیسی قابل رشک موت ملی۔ جیسی زندگی ویسی موت
راتنی ہی تقدیس و کوثر کی ابدی آرام گاہ۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

بیت المقدس کے برآمدے میں مولانا مرحوم کی قبر ہے۔
رآمدے کی دیوار پر لکھا ہے کہ یہ مجاہد اعظم جوہر مرحوم کی
ر ہے جن کی وفات ۴ شعبان کو لندن میں ہوئی۔ اور رمضان
کے پانچویں جمعہ کو بیت المقدس میں دفن ہوئے (۱۳۴۹ھ)
مولانا کے پہلو میں مجاہد اعظم عبدالقادر الجزائری کی قبر ہے۔

مولانا محمد علی جوہر نے کل باون ۵۲ سال کی عمر پائی
لیکن اس مختصر سے عرصہ حیات میں کوئی ایسا شعبہ نہیں بچا
جس میں مرحوم نے درجہ کمال اور اختیار حاصل نہیں کیا۔
سیاست کے ساتھ دوسرے مشاغل کو ہم آہنگ رکھنا
بہت مشکل ہو جاتا ہے مگر تین نام ایسے ملتے ہیں جنہوں نے
اپنی قومی، ملی اور وطنی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری
اور ادبی خدمات کو بھی دوش بدوش رکھا۔ ان میں مولانا
حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خاں اور تیسرے خود مولانا
محمد علی جوہر۔

مولانا محمد علی کی ایسی پروقار اور پرشوکت وفات
ان کے خلوص اور حق گوئی کے ساتھ قوم ملت کی
خدمات اور کارہائے نمایاں کی مقبولیت کی دلیل ہے۔
مولانا کے حالات کو پڑھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم میں
بہتر سے بہتر اور لائق سے لائق شخص، ابھی کتنا پیچھے ہے۔
درحقیقت مولانا جوہر میں جو اجزا جواہر بن کر نمایاں
ہوئے وہ اُن کا خلوص، ایثار اور صاف گوئی تھیں
آج باوجود ساری کاوشوں کے ان اجزا کا فقدان ہے۔

مولانا کی زندگی ہمارے موجودہ سماج اور آئندہ
نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے اور ہمارے ملک کی تاریخ کا
قیمتی سرمایہ ہے۔ ہمیں اپنی نسلوں کو ایسی شخصیات کے
تعارف کے لیے اور ان کی یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے
سالانہ جشن یا یادگاری جلسوں کا اہتمام کرنا لازم ہے تاکہ
ہندوستان کے افق سے ابھرا ہوا یہ مرد مجاہد اپنی پوری
تابناکی کے ساتھ نسلوں کے دل و دماغ میں منور رہے
اور ہمیشہ ان کے عظیم کارناموں سے آئندہ نسلوں کو
رہنمائی ملتی رہے۔

راجہ غلام حسین

ضیاء الدین احمد برنی

راجہ غلام حسین پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہ مشہور اس وقت ہوئے
رطھ میں زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے اسٹرائک میں حصہ لیا۔ اس
ھوں نے وہیں سے ڈگری لی اور "کامریڈ" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن
زمانہ میں مسلمان صحافیوں کا اس قدر قحط تھا کہ راجہ غلام حسین کے
بعد مولانا محمد علی کو سارے ہندوستان میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی
ن نہ مل سکا جو صحیح معنوں میں ان کا جانشین بنتا۔ جب تک راجہ
ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے مولانا کو ایک گونہ اطمینان تھا۔
نے سب کام سنبھال رکھے تھے۔ ان کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ ان کی
پر خود مولانا کی تحریروں کا گمان ہوتا تھا۔ میر محفوظ علی بدایونی جو ابتدا
حیثیت سے "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے وابستہ تھے۔ مولانا اور راجہ
انشا پردازی کا "آفتاب و مہتاب" کہا کرتے تھے ان پڑھ لوگ راجہ
مریٹ" کہا کرتے تھے "بڑے کریٹ" محمد علی تھے۔

اجہ کی عادت تھی کہ وہ دفتر میں آتے ہی پہلے تو مختلف اخبارات کا
تے پھر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دفتر ہی میں آرام کرسی پر دراز ہو کر سو
ٹھنے کے بعد وہ ایڈیٹوریل اور نوٹ لکھتے ۔ کبھی کبھار وہ نوٹ
ل سنانے کے لیے "ہمدرد" کے عملہ کے دوستوں کو بھی بلا لیتے تھے۔ مجھے
واقع بہاں کی زبان سے ان کے لکھے ہوئے مضامین سننے کا اتفاق

۱۹۱۵ء میں میں تین دن تک چھندواڑہ میں مولانا محمد علی کا مہمان
صد یہ تھا کہ میں انھیں اپنی انگریزی کتاب کا مسودہ دکھاؤں جو
ن کی زندگی پر لکھی تھی۔ اس سلسلہ میں انگریزی کا ایک مضمون جس کا
اقتباس میں نے اپنی کتاب میں دیا تھا زیر بحث آگیا۔ خود مولانا آخر وقت تک
یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ آیا وہ مضمون اُن کا ہے یا راجہ غلام حسین کا۔ ان دونوں کی انشا
پردازی میں درحقیقت بہت کم فرق تھا۔

جب مولانا کی نظربندی کے بعد "کامریڈ" بند ہو گیا تو راجہ غلام حسین
نے لکھنؤ سے اپنا ہفتہ وار پرچہ "نیو ایرا" نکالا یہ پرچہ "کامریڈ" کی طرز کا تھا
اس کا پہلا شمارہ ۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو نکلا۔ اس کا مسلک بھی وہی تھا۔ اور چونکہ
قوم "کامریڈ" کو ترس گئی تھی اس لیے یہ پرچہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے
لکھنے والوں میں بھی وہی نہرنگ تھے جو "کامریڈ" میں لکھا کرتے تھے۔ ان میں
ایک صاحب ولایت علی تھے جو "بمبوق" کے نام سے "گپ" کے کالم لکھا کرتے
تھے۔ کبھی کبھی وہ نوٹ اور ایڈیٹوریل بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ جو رفاقت "بمبوق"
نے راجہ کے ساتھ برتی اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آئے گی۔ ڈاکٹر اقبال
بھی کبھی کبھار اس میں لکھا کرتے تھے مولانا محمد علی کی نظربندی پر میرا ایک
طویل مراسلہ، ۱۹۱۷ء میں "نیو ایرا" میں شائع ہوا تھا۔

راجہ غلام حسین ملک کی آزادی کے زبردست علم بردار تھے۔ انھوں نے
مسز بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کو زور شور سے چلایا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان
آزادی کی جنگ میں پیش پیش رہیں، انھوں نے جھوٹے، خطاب یافتہ،
نمائشی اور خود غرض لیڈروں کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
وہ مولانا محمد علی کی طرح بت شکن واقع ہوئے تھے۔ وہ بے حد محنتی تھے، وہ
بیوروکریسی (بدیشی حکمران ٹولی) کے شدت سے مخالف تھے۔ وہ مسلمانوں کو
یہی تعلیم دیتے تھے کہ اسلام اور آزادی توام ہیں۔ اور اس لیے مسلمانوں کو ہر
تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینا چاہیے۔ وہ خوش پسند انسان تھے اور چاہتے

ہے کہ قوم کو منظم کریں اس لیے کہ کوئی شورش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی پشت پر تنظیم نہ ہو۔ وہ یہ جملہ بار بار دہرایا کرتے تھے کہ اسلام توقع ہے کہ ہر مسلمان اپنا فرض منصبی ادا کرے گا۔" افسوس اس بات کا ہے کہ 'نیو ایرا' کے ذریعہ صرف چند مہینے تک اعلائے کلمۃ الحق کر سکے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے موجودہ لیڈر ہمیں مایوس کر دیں گے تو اسلام میں اتنی سکت موجود ہے کہ وہ بے غرض، ایماندار اور جری لیڈر ان کی جگہ پر پیدا کر دے۔

راجہ غلام حسین مولانا محمد علی کی طرح پیدائشی جرنلسٹ تھے۔ ان دونوں نے اس فن میں کہیں تعلیم و تربیت نہیں پائی تھی۔ مگر اس کے باوجود محض اپنی غیر معمولی خداداد ذہانت اور قومی درد کی بنا پر ان کا شمار چوٹی کے جرنلسٹوں میں ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ "پین اسلام" پر میرا ایک مضمون "ایفریکن ٹائمز اینڈ اورینٹ ریویو" (لندن) میں شائع ہوا۔ یہ اخبار دیوس محمد کی ادارت میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ راجہ نے اس مضمون کو بے حد پسند کیا اور فرمایا کہ میں اسے "کامریڈ" میں شائع کر دوں گا۔ یہ ۱۹۱۳ کا واقعہ ہے۔

راجہ کی شادی دہلی میں ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ شادی انھیں راس نہیں آئی۔ جو بیوی انھیں ملی وہ شیخ سعدی کی بیوی کی وضع کی تھی، اور اس وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی ہر وقت ضیق میں رہتی تھی۔ اس غریب کو ان کی عظمت کا مطلق احساس نہ تھا۔

ان کا انتقال اس طرح ہوا کہ ایک سہ پہر کو وہ اور "ایڈووکیٹ" لکھنؤ کے ایڈیٹر رنگا آیر ہوم رول لیگ کے جلسہ سے واپس آرہے تھے کہ اتنے میں وہ دونوں ایک گھوڑے کی زد میں آگئے جو پیچھے سے سرپٹ بھاگا چلا آرہا تھا رنگا آیر تو خیر کسی طرح بچ نکلے مگر راجہ کے سر میں دو تین جگہ شدید زخم آئے ڈاکٹروں نے تو دو زخموں کا آپریشن کر دیا مگر تیسرے بند زخم پر ان کی نظر نہ گئی۔ اور وہ ان کی توجہ سے یکسر محروم رہا۔ یہی اندرونی زخم بالآخر ان کی موت کا باعث بنا۔ ان کی تاریخ وفات ۲۵ر اگست ۱۹۱۷ء ہے۔ مرتے وقت انھوں نے آیر سے کہا: "کوشش کرتے رہو، فتح قریب آگئی ہے۔ (نصرٌ من اللہ وفتح قریب)

حادثہ کے دو تین دن کے بعد ڈاکٹر انصاری بھی لکھنؤ پہنچ گئے اور ان سے جو کچھ بن پڑا انھوں نے اپنے دوست کے لیے کیا۔ بیماری کے زمانہ میں "الناظر" کے ایڈیٹر ظفر الملک (اسحاق علی)، چودھری خلیق الزماں اور شعیب قریشی ہر وقت راجہ کی خدمت کے لیے موجود رہتے تھے۔ بھوق بھی دیکھنے کے لیے بار بار آئے تھے۔ راجہ غلام حسین بلرام پور ہسپتال میں رکھے گئے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹروں کی جو جماعت ان کے علاج میں مصروف تھی اس نے انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، مگر وہ بچ نہ سکے۔

ان کے مرنے پر سارے ہندوستان میں ماتم کیا گیا۔ مسز اینی بسنٹ نے ان کی بیوی بچوں کے لیے امدادی فنڈ کھولا اور جب اس میں معقول رقم جمع ہو گئی تو اسے راجہ کی بیوی کے پاس بھیج دیا۔

ان کے انتقال کے بعد "نیو ایرا" بند کر دیا گیا۔ اگرچہ کچھ دنوں تک بھوق اور شعیب قریشی نے اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی مگر یہ انتظام محض عارضی تھا" کامریڈ کی طرح جو نقش اس اخبار نے پبلک کے دل پر چھوڑا ہے اسی کا اثر ہے کہ آج بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنے دور کا بہت اچھا اخبار تھا اور اگر کبھی مسلم صحافت کی تاریخ لکھی گئی تو اس میں اس اخبار کی خدمات سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔

جس زمانہ میں راجہ "نیو ایرا" نکال رہے تھے ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ حیدرآباد دکن کے وزیر مالیات سر اکبر حیدری کے پاس سے بڑی تنخواہ کی پیش کش آئی۔ حیدری انھیں حیدرآباد میں بلانا چاہتے تھے، مگر راجہ نے انکار میں جواب بھیج دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اخبار کے ذریعے ملک و ملت کی خدمت کے کام کو زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔ وہ پرندے کی سی آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔

راجہ فطرتاً بہت شریف الطبع انسان تھے۔ دہلی کی ہر قسم کی سوسائٹی انھوں نے دیکھی تھی۔ وہ دہلی کی تہذیب اور کلچر کے انتہائی مداح تھے۔ دہلی اور دہلی والوں سے انھیں قلبی محبت تھی۔ ان کا دل قومی درد سے معمور تھا۔ مگر وہ قدرے شرمیلے واقع ہوئے تھے۔ ویسے وہ بے حد جری تھے اور زبردست صاحب قلم۔

دو تین سال کی رفاقت کے دوران میں نے کبھی ان کے منہ سے کسی کے بارے میں کوئی برا لفظ نہیں سنا۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔

مولانا عبدالرزاق کانپوری

سعیدہ بانو

مولوی عبدالرزاق صاحب کی ولادت ۱۸۶۳ء میں بمقام انبالہ
آپ کے والد منشی الٰہی بخش اپنے وقت کے نامور منجم اور روشن
بزرگ تھے انگریزی میں کافی دست گاہ تھی شعر و شاعری سے
ذوق تھا، نسباً صدیقی اور قدیم یوپی کے باشندے تھے۔

مولانا محترم کا دادھیال کانپور اور ننھیال قصبہ فتح پور تھا
کی والدہ محترمہ زیادہ تر اپنے میکے میں رہتی تھیں لہٰذا ابتدائی
و تربیت فتح پور ہی میں ہوئی۔ گیارہویں سال آپ کے "علامہ فضیلت"
گیا، اس کے بعد بھی فقہ و حدیث کی تعلیم مختلف عالم دین سے حاصل
تے رہے۔

اٹھارہویں سال تعلیمی مراحل سے فارغ ہو کر اپنے چچا منشی نثار علی
چیف ریڈر کی ماتحتی میں "اہلمد" اور پھر پیشکار ہوئے۔
سی سال مولانا موصوف کی شادی اپنی بنتِ عم سے ہو گئی۔ محترمہ
علاوہ اردو فارسی زبان جاننے کے حافظ قرآن بھی تھیں اور
اس زمانے کی بہت قابل عورتوں میں شمار تھا۔ حدود رجہ سخن فہم
اور تمام پرانے شعراء کا کلام خوب یاد تھا۔ برجستگی بے ساختگی
اپنا جواب نہ تھا۔ رحم دل، فیاض اور خوش مزاج تھیں۔ اتنی
اور ہم مذاق رفیقۂ حیات کو مولانا محترم نے ہمیشہ اپنی خوش
سمجھا اور دونوں کی نسبت خاندان میں لاثانی بن گئی۔

ادبی زندگی کا آغاز، شادی کے بعد ہی آپ کا علمی ذوق
گیا اور اس زمانہ سے اپنے ذاتی دارالمطالعہ کی بنیاد ڈالی۔
کتابیں جمع کرنے کا شوق تو کمسنی ہی سے تھا اپنی آمدنی کا تقریباً
نصف حصہ کتابوں پر اور زندگی کے بیش قیمت اوقات علمی، ادبی
و تاریخی مطالعۂ کتب میں صرف کرنے لگے۔ اور اسی ابتدائی دور
میں ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر ادبی مجالس میں شرکت کرنے لگے
اور یہیں سے حالی، شبلی اور سر سید احمد خاں صاحب مرحوم سے تعلقات
پیدا ہوئے جس کا ذکر خود موصوف نے اپنی کتاب "یادِ ایام" میں
تفصیل سے کیا ہے۔ کانپور میں نامی پریس کے مالک رحمت اللہ صاحب
لکھنؤ میں عبدالحلیم شرر سے خاص مراسم تھے۔

کانفرنسوں کے سالانہ اجلاس میں مولانا بڑھ چڑھ کر حصہ
لیتے تھے خاص طور پر اسلامی تعلیم کے موضوع پر نہایت زور دیتے
تھے بارہا اس سلسلہ میں سر سید سے بھی معرکہ رہا محسن الملک نے
ایک دفعہ آپ کی تقریر کے بعد خوب پیٹھ ٹھونکی اور
بہت تعریف کی۔ مولانا کی تقریر اور تحریر دونوں سے سر سید
مرحوم بہت متاثر تھے۔ انہیں کی ہمت افزائی سے "البرامکہ" کی
تالیف کا آغاز ہوا۔ چنانچہ "البرامکہ" جیسی عظیم تخلیق میں بھی سر سید
مرحوم کی تحریک شامل ہے۔ جنہوں نے نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ
اپنے ذاتی کتب خانہ سے بھی استفادہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔
مولانا کے احباب :- مولانا کا دائرہ احباب کافی علمی تھا اور اپنے
وقت کے جملہ اکابرین یعنی سر سید احمد خاں، حالی، شبلی، محسن الملک
نذیر احمد سے مراسم تھے۔ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مہدی
اندازہ

ایت بے تکلفی تھی. مولانا آزاد خاص طور سے آپ کی نکتہ سنجی
یخ دانی کے معترف تھے اور کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھانے
لے مولانا سے مشورہ ضرور لیتے تھے. دو دو تین تین ماہ کتب
ں قیام رہتا تھا. لکھنؤ سے شرر صاحب آجاتے گورکھپور سے
اسن صاحب خوب محفلیں جمتیں. مولانا بڑی دلچسپی سے ان ادبی
ں کا تذکرہ فرماتے تھے. یاد ایام کا ہر صفحہ ان واقعات سے
، ہے.

پنجاب کے سابق جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں، مولانا ظفر علی
، اور ملک برکت علی سے برادرانہ تعلقات تھے.

ملک غلام محمد مرحوم سابق گورنر جنرل پاکستان بھی دوران
بھوپال میں اکثر آیا کرتے تھے. بعد کے احباب میں سر راس مسعود، جناب
ب قریشی، سابق وزیر مہاجرین پاکستان مرزا محمد عسکری. محمد اصغر
یٹو سکریٹری ڈاکٹر تیموری قابل ذکر ہیں.

سیاسی مسلک :- مولانا کو عملی سیاست سے کوئی لگاؤ نہ تھا
وہ سرسید کی "تعلیمی تحریک" اور جداگانہ قومیت کے پرجوش حامی
اسی سلسلہ میں آپ کا کردار واقعی عدیم النظیر ہے میں صرف ایک
ل پر اکتفا کرتی ہوں.

وہ "مولانا آزاد" جو مولانا محترم کو سب سے زیادہ عزیز تھے وہ
یں اپنا دوست ہی نہیں قوم کا عظیم سرمایہ سمجھتے تھے. وہی آزاد جب
وادب سے کنارہ کش ہو کر عملی سیاسیات میں کانگریس کے پلیٹ
م سے داخل ہوئے. تو مولانا محترم کو سخت رنج ہوا اور مولانا آزاد
دم سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی ترک کر دیا. چنانچہ یاد ایام میں
تے ہیں.

"ی زمانہ کانگریس کے صدر اعظم میرے قدیم رفیق دوست
لانا ابو الکلام آزاد ہیں جن کی نسبت قوم کو یقین تھا کہ ایک دن
م غزالی و رازی" کے پیکر میں نظر آئیں گے. مگر وہ محض گاندھی جی
چیلے نظر آتے ہیں." حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎
بیڑا جس نے ساتوں سمندر ؛ دہانے میں گنگا کے ڈوبا وہ جاکر
دکلی :- تالیف البرامکہ کے بعد ریاست بھوپال میں تحصیلداری

پر مامور ہوئے. علم وادب کی محفلیں اجڑ گئیں مال گذاری اور فوجداری
کے مقدمات پیش نظر رہنے لگے اس وقت تحصیل دار مجسٹریٹ بھی
ہوتا تھا. دن میں مقدمات کا فیصلہ ہوتا اور رات میں مطالعہ اور
تصنیف وتالیف کا کام بقول مولانا مرحوم راتوں کو جاگ جاگ کر
نظام الملک طوسی کی تکمیل ہوئی.

اب سرکار عالیہ بیگم بھوپال نے آپ کو "تاریخ اسلام"
لکھنے پر مامور کیا تھا. نظام الملک بھی شائع ہو چکی تھی. اور مولانا کی
شہرت نصف النہار پر تھی. چنانچہ نواب وقار الملک کی تحریک پر
پھر ریاست حیدرآباد میں تصنیف وتالیف کے شعبہ کے لیے بارہ
سو روپے ماہوار کی پیش کش ہوئی. مولانا نے بھی لکھا (ملاحظہ ہوں
مکتوبات حالی) آپ اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں اور فوراً حیدرآباد چلے
جائیں آپ یہ خطوط اور پروانہ تقرری لے کر بیگم بھوپال کی خدمت
میں حاضر ہوئے. اور رخصت کی اجازت چاہی سرکار نے فرمایا.
مولانا کیا آپ ایک بیوہ کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں. میں آپ کو صرف
دو سو روپیہ ماہوار دیتی ہوں. وہ بڑی ریاست ہے آپ کا دل
چاہے تو جا سکتے ہیں. سرکار سلطان جہاں کے جواب سے آپ
بے حد متاثر ہوئے اور نظام دکن کو معذرت نامہ لکھ دیا کیا
آج کی دنیا میں ایسے ایثار کی نظیر مل سکتی ہے.

بھوپال کے حالات :- نواب نصر اللہ خاں ولی عہد ریاست
بھوپال کو جب معلوم ہوا کہ "البرامکہ" کا نامور مصنف ان دنوں
بھوپال میں ہے تو انہوں نے اپنی والدہ مکرمہ نواب سلطان
جہاں سے دریافت کیا جواب ملا "ہاں میں نے ان کو بلا لیا ہے اور
وہ آج کل تحصیل بیگم گنج جو اس زمانہ میں "سیوانس" کے نام سے
مشہور تھی) کے تحصیل دار ہیں. نواب صاحب نے مسکرا کر فرمایا سرکار اماں
یہ عہدہ ان کے لیے موزوں نہیں ہے آپ تو ان کو مجھے دیدیجئے.
فوراً موصوف بلائے گئے اور ولی عہد بہادر کے سپرد کر دیئے گئے.
جہاں وہ کچھ عرصہ تک ان کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے
کام کرتے رہے.

اسی دوران بیگم صاحبہ کے منجھلے صاحبزادے نواب عبید اللہ

ب سے ملاقات ہوئی وہ بھی مولانا کے گرویدہ ہو گئے اور
یا کہ آپ دادا بھائی! ولی عہد بہادر سے اجازت لے کر
اجداد کی تاریخ لکھنا شروع کر دیں یہ ریاست پر آپ کا
ان ہوگا. چنانچہ موصوف ہمہ تن تاریخ بھوپال لکھنے میں معروف
ریخ بھی کئی جلدوں میں تھی. تاریخ اسلام کی طباعت کا
زیر غور تھا کہ روبکاری علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم
ں جلدیں غائب کرادی گئیں. مفتی ریاست کا اس میں ہاتھ تھا
ن کتابوں کے تلف ہونے کا بے حد قلق تھا. مفتی صاحب کے
ہ بعد یہ کتابیں ان کے لڑکوں سے میں نے حاصل کرائیں. ان
کے مل جانے سے مولانا محترم کو بے حد مسرت حاصل ہوئی
پریس میں ان کی طباعت کا انتظام کیا. لیکن مولانا کی علالت
ہ معاملہ ٹلتا ہی رہا.

شکلات :۔ مولانا ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار رہے ۱۹۰۵ء
ں انہوں نے اپنی اکلوتی صاحبزادی کریم النساء بیگم کی شادی
عمر بھر کا سرمایہ جہیز میں دے دیا اور ایسی اولوالعزمی دکھائی کہ
نواب بھی دیکھتے رہے. اس زمانہ کے اخبار البشیر نے اس شادی
نقیدی نظر ڈالی اور موصوف پر طعن کی کہ قوم کے مصلح بن کر
یہ فضول ضائع کیا. اس شادی کے بعد ہی موصوف ترک
ور ہوئے اور اپنی عزیز رفیقۂ حیات کو لے کر بھوپال چلے آئے.
لے کر ۱۹۴۸ء تک کا یہ طویل دور کبھی سکون سے نہ گذرا آمدنی
اخراجات وسیع رفیقۂ حیات حد درجہ فیاض مزاج. ساتھ کنبہ
ن کا ایک بڑا حصہ عزیزوں کی تقاریب اور تحفہ تحائف کی
نا تھا. پھر خاندان کی بیوہ اور یتیم بھی قابل اعانت رہے.
اپنی بیٹی جو اس وقت کثیر الاولاد تھیں اور قلیل معاش
سوں اور نواسیوں کے لیے بھی ماہ بماہ کا منی آرڈر جاتے
۔ مولانا موصوف کی شادی کے ایک سال بعد پہلا بچہ مرا ہوا
ہوا جس کا اہل خاندان کو بے حد صدمہ ہوا. دو سال بعد ایک
ن کریم النساء بیگم پھر پیدا ہوئیں (میری والدہ محترمہ جو اس
للہ کے فضل سے زندہ ہیں) تیسری اولاد صاحبزادہ محبوب میاں تھے

جو والدین کی آنکھ کا تارا بنے تھے. ان کا خاندانی نام عبدالحمید تھا. لیکن وائے
قسمت تین سال کی عمر میں یہ ہونہار بچہ داغ مفارقت دے گیا.

یہ پہلا صدمہ تھا جو تیر بن کر محترم کے سینہ میں لگا اور ان کے غم میں
نہ صرف سوگوار بلکہ چھ ماہ تک بیمار رہے. اور اخیر عمر میں بھی اپنے
محبوب میاں کا ذکر کر کے آب دیدہ ہو جاتے تھے اور اولاد نرینہ نہ ہونے
پر تاسف کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ افسوس کوئی جانشین نہ بن سکا.
چند سال بعد آپ کی چوتھی اور آخری اولاد ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں
جنہوں نے اپنی معصوم باتوں سے غم زدہ والدین کو بہلا لیا اور بہت
حد تک بیٹے کا غم بھول کر بیٹی سے مانوس ہو گئے. مگر قسمت کو یہ بھی
منظور نہ تھا یہ آخری بچی بھی دنیا سے رخصت ہو گئی.

زمانہ زخم بھرتا گیا. آپ کی اکلوتی صاحبزادی کی شادی ہوئی اور
پھر میری پیدائش ہوئی تو والدین نے مجھے ان کو یہ کہہ کر دے دیا کہ لیجئے
یہ وہی امۃ الحبیب واپس آگئی ہے. اور کچھ میں اپنی خالہ سے مشابہ بھی
تھی. حضرت قبلہ نے بسم اللہ کہہ کر لے لیا پیشانی پر بوسہ دیا اور سعیدہ
بانو نام تجویز کیا. اور فرمایا کہ "بے شک یہ تو ہو بہو میری امو ہے"
سنتی ہوں میرے ماموں مرحوم نے زبان کھلتے ہی حضرت قبلہ کو
"باپ" کہا تھا. وہی اثر مجھ میں آیا اور میں نے بھی زبان کھلتے ہی "باپ"
کہا تھا. باپ سمجھا اور تا قیامت سمجھوں گی.

بہت نہ سہی، مجھے تو ان کی ادنیٰ کنیز ہونے پر فخر ہے. مجھے ناز ہے کہ
میں نے ایک عظیم انسان کی جو میرے باپ تھے. خدمت کی ہے. اور یہاں
تک کہ ایک بھیانک رات میں جب کہ صرف میں تھی وہ پیارا مقدس
سر میرے زانو پر تھا اور دم آخر ہو رہا تھا.

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میرے شعور نے آنکھیں کھولیں اور اپنے
ماحول اور آس پاس کا جائزہ لیا تو ایک عجیب احساس ہوا. گھر میں
محترمہ اماں (نانی صاحبہ) تھیں اور میں چھوٹی سی دو ایک خادمائیں
تھیں. بڑا سا مکان تھا...... جس کا ایک کمرہ باہر کی طرف
تھا یہی کمرہ نشست گاہ، دارالمطالعہ، آفس خوابگاہ تھا یعنی قبلہ
موصوف کی پوری دنیا اسی کمرے میں. گھر میں میز کرسیاں وغیرہ سب
تھیں لیکن ایک کمرہ میں بیکار پڑی رہتی تھیں اور خود ہمیشہ فرش پر

تے تھے اور مجھے اکثر شرم آتی تھی جب آپ کے پاس میرے نظریے سے
لگ "بڑا آدمی" آجاتا تھا اور قبلہ بے تکلفی سے اسی فرش پر برابر سے
بٹھا لیتے تھے تب میں کبھی یہ عرض کرتی۔ دیکھئے باپ اب کرو کا یہ حلیہ
رہنا چاہیئے، میں یہاں کرسیاں ڈلوا دونگی۔" مسکرا کر جواب دیتے
"معاشرت نہیں بدلتے بیٹا"

دارالمطالعہ میں کتابوں کی الماریاں بھری ہوتی تھیں نیچے فرش
تھا ایک کونے پر مسند بچھی اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا تھا اسی مسند کے بھی
دونوں جانب کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا ۔۔۔۔ سامنے کی طرف وہ منشی
صاحب بیٹھے رہتے تھے اور گاؤ تکیہ سے ٹیکے ہوئے حضرت قبلہ بیٹھے
ہوتے تھے۔ سامنے ایک بڑا حقہ ہوتا تھا جس کا مصرف اتنا تھا کہ نگالی
منہ سے لگی رہے اور قلم چلتا رہے ورنہ وہ حقہ تو نہ جانے کب کا
بجھ کر راکھ ہو چکا ہوتا تھا۔

میں اکثر آپ کے گاؤ تکیہ کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتی تھی اور
دیکھا کام ہوتا دیکھتی رہتی کیونکہ گھر کے اندر کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا
نہ ماحول .. اماں بھی لیٹی ہوئی کتاب پڑھا کرتی تھیں۔ کسی باہر کی لڑکی
کے ساتھ کھیلنے کا حکم نہ تھا۔ جب قبلہ محترم کا انہماک ٹوٹتا تو بڑے
پیار سے کہتے ..... "شیطان یہاں چھپی کیا کر رہی ہے" اس پر ایک
ت اللہ یاد آگئی۔ نہ جانے کیا لکھا جا رہا تھا، باپ بولتے جا رہے تھے
اتب صاحب لکھ رہے تھے کہ اچانک ایک شعر کا پہلا مصرعہ بھول
جانے پر قبلہ رک گئے اور فرمایا... اماں منشی جی وہی کہ ایک مدت
سے ضیا رہے" ... یاد ہی نہیں آ رہا ہے..... اور فوراً پیچھے سے
میں بول تو سنیئے.....

ایک مدت پائے منا ہے، ایک مدت گلخن تابی کی
برسوں ہوتے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی

منشی جی نے فرمایا کمال کیا بی بی نے دیکھا مہتمم صاحب یہ شاعرہ نکلے گی
اور قبلہ موصوف نے منہ بنا کر فرمایا۔ "کبھی خدا نہ کرے میری بچی کو تو
اور ہی بننا چاہیئے۔" وہ مجھے کس قدر عزیز رکھتے تھے۔ یہ میں کیا
اور اس وقت یہ سطور لکھ رہی ہوں لیکن میرا دل قطعی بے قابو
ہو چکا ہے۔ آنکھیں اشکوں سے لبریز ہیں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا
ہے کہ میرے نہایت پیارے، بھولے، سیدھے، معصوم، نیک سیرت
فرشتہ خصلت باپ اس مسند پر بیٹھے ہیں سامنے بیٹھی ہوئی کچھ لکھ
رہی ہوں..... ذرہ آفتاب کی کیا تعریف کر سکتا ہے۔ قبلہ موصوف
شاعر تو نہ تھے لیکن وقت پڑنے پر خوب شعر کہتے تھے۔ نواب نصر اللہ
و عبید اللہ صاحب کے مرثیے لاجواب تھے جو بالکل یاد نہیں ہیں کیونکہ
یہ واقعہ میرے بچپن کا تھا شاعری کے سلسلہ میں ذکر چھڑا، تو مولانا کا
ایک قطعہ یک بہ یک ذہن میں آگیا۔ خواجہ اکرم صاحب آئی جی پولیس
نے قلعہ گنور کے دو طوطے مولانا کے لیے بھجوائے۔ چپراسی غلطی سے کہیں
اور دے آیا۔ جب خواجہ صاحب کو معلوم ہوا تو دوبارہ منگوا کر ہمارے
یہاں بھیجے۔ قبلہ نے اس وقت چپراسی کو ایک پرزہ پر یہ شعر مجھ سے
لکھوا کر دے دیئے۔ یہ مجھے ہنوز یاد ہیں۔

عنایت سے خواجہ کی از دست رفتہ ٭ دوبارہ ملے طائران خجستہ
چھٹے قید سے بعد قید دو ہفتہ ٭ اڑے رنگ چہرے کے بازو شکستہ
مکاں پر پہنچ کر کھلا آب و دانہ ٭ چہکنے لگے اور ہوئے وہ شگفتہ

آخری ایام۔ یوں تو مولانا کی زندگی میں کئی حادثے گذرے لیکن
سب سے بڑا المیہ آپ کی رفیقۂ حیات کی موت ہے۔ محترمہ مکرمہ ماہ
رمضان کی ۲۰ویں، ۲۰ رمضان، جمعۃ الوداع کے دن چند روز کی معمولی
سی بیماری میں اس جہان سے رخصت ہو گئیں، میری مشفق و رفیق ماں! اس
صدمۂ عظیم نے موصوف کو پلنگ پر گرا دیا۔ اور یہیں سے دنیوی زندگی
ختم ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی یہی کنیز ان کی خدمت میں تھی
جو خود صدمے سے نڈھال ہونے کے باوجود ان کی دل جوئی میں لگی
رہتی تھی۔ زمانہ گذرتا گیا زخم بھرتے گئے۔ مولانا اپنی پچھلی زندگی کی طرف
لوٹے۔ تصنیف و تالیف پر نظر ڈالی۔ تصانیف کا انبار۔ لیکن بیکار۔
جس سرزمین پر انہوں نے خون پانی کر کے تاریخ اسلام جیسی
بیش بہا تاریخ مرتب فرمائی وہاں سے ان کو کیا ملا؟ ملکی دشمنوں نے"
ایک غیر ملکی مصنف کی تصانیف کو منظر عام پر آنے نہ دیا۔ اور وہ خود
مالی مشکلات میں مبتلا رہے۔

تنہا ذات پہ اتنی ذمہ داریوں نے قبل از وقت کمزور اور
بوڑھا بنا دیا تھا اور اختلاج قلب کے مستقل مریض بن گئے تھے [illegible]

بل تھی اور میں اب نہیں چاہتی تھی کہ اس بیمار دماغ سے
میرا لڑکا بھوپال سے میٹرک کر چکا تھا اور وہاں اس زمانہ
نہ تھا۔ قبلہ باپ کو اس کی تعلیم کا بے حد خیال تھا۔ چنانچہ ہم کو
آئے۔ جہاں حکیم محمود صاحب ماہر قبلہ کے معالج رہے۔ لڑکے
کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور کسی نہ کسی طرح زندگی کے ایام بسر
گئے۔

چند سال گزرے تھے کہ انقلاب آگیا۔ اس وقت ہم دریا گنج
پر مکان لیے ہوئے تھے اور سامنے ہی "اخبار" "ڈان" "چنگاری"
کے دفاتر تھے جس وقت دریا گنج پر حملہ ہوا تو ہم لوگ بھاگ
ہی کے دفتر میں آئے تھے اور پھر مسلسل بھاگتے چھپتے رہے
ہمارا سب دریا گنج والے مکان میں رہا۔ فساد کے پورے ایک
لوگ بھوپال پہنچے۔ لیکن بالکل اجنبی کی طرح نہ ہمارا گھر تھا
ن .... خیر یہ باتیں قطعی فالتو ہیں۔ اس وقت قبلہ
بیمار تو نہ تھے۔ لیکن دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی تھی۔
بھول جاتے تھے۔ کئی کئی بار پوچھتے تھے بیٹا یہ سب ہنگامے
.... ؟
پاکستان بن گیا ہے اور اب ہندو ہمیں بھگا رہے ہیں، میں
بھائی ..... تب فوراً آپ کو پرانی یادیں آجاتیں اور فرماتے

...... تم نے سرسید مرحوم کے لیکچر پڑھے ہیں جو فلاں فلاں رسالوں میں
شائع ہوئے تھے۔ کتنے سال پہلے انہوں نے اپنے نظریہ سے پاکستان
بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔

رحلت۔ ۱۱ر فروری ۱۹۴۹ء کی رات تھی۔ تقریباً ایک بجے قبلہ
محترم کی آنکھ کھلی ..... مجھ سے پانی مانگا میں نے پیش کیا .....
ایک دم گردن ڈھلک گئی۔ میں نے اپنے سینے سے سہارا دیکر گردن
گود میں لے لیا۔ پیشانی پسینہ سے تر تھی اور لب بند کوئی دوسرا
عزیز پاس نہ تھا۔ آج صبح یعنی میں یتیم لاوارث، یا جو کچھ بھی سمجھئے
ہو چکی تھی ..... دنیا تاریک، زمانہ دشمن، انقلاب اور کتنا تہی دست
ہر طرف سے یہ پکار کہ پاکستان چلو۔ لیکن میں اب بھوپال چھوڑنا
نہیں چاہتی تھی۔ میری مقدس ہستی یہاں محو خواب تھی۔

تصنیفات۔ نظام الملک طوسی، البرامکہ، سفرنامہ، ناصر خسرو،
یادِ ایام، فاروقِ اعظم، تاریخ اسلام ۲ جلد، تاریخ عہد
جاہلیت، تاریخ یمن، تاریخ افغان، تاریخ بھوپال، مامون
الرشید، اس کا مسودہ ہندوستانی اکیڈمی میں ہنوز موجود ہے۔
اوّل چار کتابوں کے علاوہ باقی ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ علاوہ
ازیں بیش بہا علمی مقالے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع
ہو چکے ہیں ایسے مقالات کی کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

”ہم کو خدا نے دنیا میں اس لیے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔
برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام۔ ہم کو اپنا دل، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے۔
بدوں اور بد طینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے
آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ برا کہنے والے ہیں ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل
چاہیئے اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کو دور کرنے میں کوشش لازم ہے۔ اگر
نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ وہ برائی ہم میں نہیں ہے۔“

سید

مولانا ظفر علی خان

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

ا گڑھ کے جن فرزندوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نام
اور اپنے کارناموں سے مادرِ درس گاہ کی شہرت میں چار چاند
اِس کی وقعت و توقیر میں اضافہ کیا اُن میں مولانا ظفر علی خاں
صوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ مولانا ایک بلند پایہ صحافی بے مثل
ـلہ بیان خطیب اور صف اول کے سیاسی رہنما تھے۔
لانا پنجاب کے موضع کوٹ مہرتھ (ضلع سیالکوٹ) متصل
ٹیشن سوہدرہ تحصیل وزیر آباد میں ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے
ے نام خداداد خاں رکھا لیکن دادا مولوی کرم الٰہی نے تاریخی نام
۱۲) نکالا۔ مولانا اس تاریخی نام سے اتنے مشہور ہوئے کہ اصلی
فا میں چلا گیا۔ اور اب عام طور پر یہ بات لوگوں کو معلوم ہی نہیں
اصل نام ظفر علی خاں نہیں خداداد خاں تھا۔ مولانا راجپوت
نجوعہ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان صدیوں سے دارالپو
) میں آباد تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں جب پنجاب میں
، شورش بڑھی تو اس خاندان نے بھی دارا پور سے کوچ کیا اور
راہ لی اور قریب ہی موضع مہرتھ میں آباد ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد
الٰہی خاں نے خود ایک گاؤں بسا لیا اور اس کا نام اپنے نام پر
ا۔ مولانا کے والد سراج الدین خاں کا شمار متبحر عالموں میں ہوتا
بی اور فارسی میں بے مثال مہارت رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ
ادب کا ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا۔ علم میں یہ فضیلت ان کو
الٰہی سے ملی تھی اور باپ دادا کی یہ وراثت پوری طرح مولانا

ظفر علی خاں کی طرف منتقل ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے بزرگوں
کے سایۂ عاطفت میں حاصل کی۔ یہاں انہوں نے عربی، فارسی اور اسلامی
علوم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد وزیر آباد کے مشن اسکول میں داخل ہوئے
ثانوی تعلیم پٹیالہ میں حاصل کی اور وہیں مہندر سنگھ کالج سے انٹرنس
کا امتحان پاس کیا۔ اس کالج میں آپ کے رشتہ کے بزرگ مولوی عبداللہ
خاں عربی کے پروفیسر تھے۔ ان ہی کے مشورے اور اصرار پر ظفر علی خاں
کو علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ مولانا کے والد مولوی سراج الدین خود بھی سرسید کی
تحریک سے متاثر تھے۔ ان کا ایک طویل خط بہ شکل مضمون[له] سرسید کے
تہذیب الاخلاق میں بھی شائع ہوا تھا۔ ظفر علی خاں نے ۱۸۹۴ء میں
علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ یہاں اُن
کے اساتذہ میں علامہ شبلی، پروفیسر آرنلڈ اور مارلین جیسے دانشور
اور ماہرین تعلیم شامل تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین، مولوی محفوظ علی بدایونی
مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کالج میں آپ کے معاصرین میں تھے۔ اس
طرح ظفر علی خاں کو علی گڑھ میں بہترین ادبی اور علمی ماحول ملا۔ مولانا نے
اپنی ذہانت اور فطری ذکاوت سے اس ماحول سے بھرپور فائدہ اٹھایا
اور جلد ہی یہاں کی ادبی فضا پر چھا گئے۔ یہاں مولانا نے اپنے ذوق شعری
کو پروان چڑھایا اور یہیں انہوں نے فن خطابت میں بھی مہارت حاصل کی۔
آپ طلبا کی یونین کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے۔ گویا طالب علمی کا زمانہ
ہر لحاظ سے کامیاب اور قابلِ رشک رہا۔ مولانا کی طالب علمی کے زمانے
میں کالج میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں مولانا نے سرسید کی شان میں

ایک قصیدہ پڑھا جس کو حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ خود سرسید اس سے
اتنے خوش ہوئے کہ فرطِ مسرت میں انہوں نے مولانا کو گلے سے لگا لیا
اس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مسخر کرد نظم کشورِ جادو بیانی را — بدام آورد طبعم صید وحشی معانی را
ببیں آں سید احمد کہ از ہمتش محکم — کہ ماہر ہست یکسر چارۂ دردِ نہانی را
ریاض قوم آب از اشک ماہی چشم او یابد — فلک چشم تو گاہے دیدہ است ایں بے خوابی را

علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد مولانا نواب محسن الملک کے سکریٹری بن گئے۔ نواب صاحب اُس وقت بمبئی میں مقیم تھے۔ خواجہ غلام الثقلین نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ لیکن کسی سبب سے انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔ علامہ شبلی کی سفارش پر نواب صاحب نے ظفر علی خاں کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال چلا۔ اس دوران نواب صاحب نے اُن کی ذہنی تربیت کی اور علمی و ادبی سرپرستی فرمائی۔ یہیں مولانا نے انگریزی مصنف جان ولیم ڈریپر کی کتاب کا ترجمہ "معرکۂ مذہب و سائنس" کے نام سے کیا اور اسی مناسبت سے اس کا انتساب نواب محسن الملک کے نام کیا۔ محسن الملک کی یہ کوشش رہتی تھی کہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل زیادہ سے زیادہ حیدر آباد پہنچیں اور سلطنتِ نظام سے وابستہ ہو جائیں۔ اس طرح اُن کے خیال میں حیدر آباد اور علی گڑھ میں تعلقات استوار ہوں گے جس سے سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو فائدہ پہنچے گا۔ اسی پلان کے تحت نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کی تحریک پر ظفر علی خاں کو حیدر آباد جانے کا مشورہ دیا۔ اس زمانہ میں وہاں نواب افسر الملک سپہ سالار افواج نظام تھے۔ شبلی کی سفارش پر ظفر علی خاں کو ان کی ماتحتی میں ملازمت مل گئی۔ لیکن محکمہ فوج کی ملازمت مولانا کے فطری رجحان سے میل نہیں کھاتی تھی۔ چنانچہ جلد ہی اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہاں کے ہوم آفس میں مترجم کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ یہاں مولوی عزیز مرزا اس محکمہ کے معتمد اعلیٰ تھے۔ انہوں نے ظفر علی خاں کی صلاحیتوں کو پہچانا اور ان کی ہر طرح سے سرپرستی فرمائی۔ خاص طور سے انہوں نے ان کی ترجمہ کرنے کی صلاحیت کو اُبھارا۔ اور یہ صرف مولوی عزیز مرزا کی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ ظفر علی خاں اپنے عہد کے بہترین مترجم مانے جاتے تھے۔ مولانا نے اپنے فرائض منصبی بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اس کے نتیجہ میں اُن کو ترقیاں بھی خوب ملیں۔ پہلے ترقی دے کر انہیں مجلس مقننہ کا رجسٹرار بنایا گیا۔ اُس وقت اُن کی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھی جو اُس زمانے کے لحاظ سے ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد مولوی عزیز مرزا نے آپ کو اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کر دیا۔ اب ان کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ ہو گئی۔ کچھ عرصہ انہوں نے ولیعہد بہادر میر عثمان علی خاں کی اتالیقی کے فرائض بھی انجام دیے۔

حیدر آباد کا قیام اُن کی ادبی زندگی کے لیے بڑا اہم رہا۔ یہاں آپ کو تصنیف و تالیف اور ترجمے کے خوب مواقع ملے۔ یہیں آپ نے لارڈ کرزن Lord Curzon کی کتاب Gardens of Persia کا اردو میں ترجمہ 'خیابان فارس' کے عنوان سے کیا۔ اس ترجمہ کو ان کا زبردست کارنامہ تصور کیا گیا۔ اس پر نظام سادس میر محبوب علی خاں نے تین ہزار روپے پیش کیے۔ اور پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو روپے بطور انعام دیے۔ اس کے علاوہ خود لارڈ کرزن نے ایک چاندی کے دستے کی چھڑی انھیں نذر کی۔

۱۹۰۲ء میں مولانا نے حیدر آباد سے ماہنامہ 'افسانہ' جاری کیا یہ ایک تاریخی، ادبی اور علمی پرچہ تھا۔ لیکن اس کی عمر زیادہ نہ ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا نے 'دکن ریویو' جاری کیا تو افسانہ کی اشاعت منقطع ہو گئی۔ دکن ریویو کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۰۴ء کو منظرِ عام پر آیا۔ یہ دو سال تک جاری رہا۔ دسمبر ۱۹۰۵ء کو اس کا آخری پرچہ شائع ہوا۔ اس کے بعد مولانا بمبئی چلے گئے۔ وہاں بھی نومبر ۱۹۰۶ء میں دکن ریویو جاری کیا۔ لیکن جلد ہی مولانا پھر حیدر آباد منتقل ہو گئے تو دکن ریویو بھی حیدر آباد آ گیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۰۷ء سے یہ دوبارہ حیدر آباد سے نکلنے لگا۔ یہ رسالہ ہر لحاظ سے معیاری تھا۔ کتابت، طباعت اور مواد و مندرجات سب اعلیٰ درجہ کے ہوتے۔ اس کے قلمی معاونین میں مولوی عزیز مرزا، علامہ شبلی، مولانا طباطبائی، عزیز لکھنوی، نواب ذوالقدر جنگ، مرزا سلطان احمد، عبدالحلیم شرر لکھنوی، اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے صاحبِ طرز ادیب، انشا پرداز اور شاعر شامل تھے۔

میں اس زمانہ میں جب حیدرآباد میں مولانا کی علمی اور صحافتی سرگرمیاں
رج کو پہنچ رہی تھیں اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں ایمانداری اور
و محنت کے چرچے عام ہو رہے تھے، مولانا درباری سیاست کا
گئے۔ دراصل اس زمانہ میں مولوی عزیز مرزا کا ستارہ گردش میں
ا اور چونکہ یہ ظفر علی خاں کے مربی اور سرپرست تھے اس لیے ظفر علی
ان کے مخالفین کا نشانہ بن گئے۔ مولانا پر مختلف الزامات لگائے
ن میں خاص یہ تھا کہ یہ ولیعہد بہادر میر عثمان علی خاں کو انگریزوں کے
بھڑکاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مولوی عزیز مرزا کے ساتھ حکومت کے
سازش کرتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے یہ اپنا
رچہ دکن ریویو نکال رہے ہیں۔ اس وقت سر مائیکل اوڈائر ریاست
رزیڈنٹ تھے۔ انھیں ظفر علی خاں کے سیاسی خیالات پسند نہیں
ن سے انھیں بغاوت کی بو آتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولانا کے
سخت رویہ اپنایا۔ مولانا نے گلوخلاصی کے لیے پہلے دکن ریویو کی ادارت
عفیٰ دیا پھر اس کی ملکیت سے بھی دستکش ہو گئے۔ اس کی اطلاع انہوں
رچ ۱۹۰۹ء کے شمارے میں ان الفاظ میں دی:

"دکن ریویو کو معرض وجود میں آئے ہوئے کچھ اوپر پانچ
سال ہوئے ہیں اور جو کچھ بری بھلی خدمت اردو زبان
کی اس سے ہو سکی اس نے انجام دی۔ بشکر ہے کہ ملک نے
اس کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اس عرصہ میں
اس کو طرح طرح کی مشکلات اور عوارض کا سامنا ہوا۔
کبھی یہ تاخیر اشاعت کے مرض میں مبتلا ہوا۔ کبھی اس نے
چار چار پانچ پانچ نمبر ایک ساتھ نکالے۔ ایک دفعہ ایسا
بھی اتفاق ہوا کہ بوجہ ہماری علالت اور ہندوستان سے
باہر چلے جانے کے ہمیں اس کی اشاعت سات آٹھ مہینے
تک ملتوی کر دینی پڑی۔ لیکن باوجود ان تمام اسقام اور
عیوب اور لغزشوں کے اس کے قدر دان و ناظرین نے
اسے اپنا مطمح نظر بنائے رکھا۔ ہمیں بھی ان تمام خوبیوں کے
باوجود یہ یقین تھا کہ دکن ریویو ایک زندہ اور ہمیشہ سرسبز
رہنے والی تحریک ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتی اور جو قبر تک
ہمارے ساتھ جائے گی۔ اس لیے ہم نے ان تمام نقصانات
کو جو ہمیں اس کی وجہ سے علی الاتصال برداشت کرنے
پڑے، ماتھے پر بل لائے بغیر اٹھایا۔ ہم نے اپنا اور اپنے
بال بچوں کا پیٹ کاٹا لیکن اس کا رخ بھرا آئینہ میں ہمیں
اپنی پریشان اور متوحش صورت ہر روز دیکھنی پڑے
لیکن ہم نے ہرگز گوارہ نہ کیا کہ اس کے سرورق کی زیبائش
اور رعنائی اس تصویر کے نہ ہونے سے کم ہو جائے جو ہر
پرچہ میں ناظرین کو ہدیۃً پیش کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کس
لیے تھا، محض اس لیے کہ ہمیں اس کے ساتھ محبت تھی
اور ہم نے عہد کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو اسے اسی شان
کے ساتھ برابر نکالے جائیں گے لیکن ہم نہایت دلی رنج
کے ساتھ بلا کسی مزید تمہید کے ناظرین کو یہ اندوہناک
خبر سناتے ہیں کہ یہ پرچہ دکن ریویو کا آخری نمبر ہے جس کی
ایڈیٹری کی خدمت ہم انجام دیتے ہیں۔ جس چیز نے ہمیں
دکن ریویو سے تعلق ایڈیٹری قطع کرنے پر مجبور کیا وہ سرمایہ
کی کمی نہیں بلکہ وقت کی کمی ہے۔"

لیکن اس سے بھی کام نہیں بنا۔ ان کے خلاف سازشوں کا سلسلہ چلتا
رہا اور بالآخر نظام دکن میر محبوب علی خاں کی طرف سے انھیں چوبیس
گھنٹے کے اندر ریاست چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ لاچار مولانا لاہور چلے گئے،
جہاں ان کے والد مولوی سراج الدین سخت علیل تھے۔ ڈاکٹروں کے
مشورہ سے انہیں ان کے وطن کرم آباد منتقل کر دیا گیا جہاں ۹ نومبر ۱۹۰۹ء
کو وہ واصل بحق ہو گئے۔

مولوی سراج الدین ۱۹۰۳ء سے ایک ہفتہ وار اخبار "زمیندار"
نکال رہے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد، جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے،
زمینداروں کے کاز کو آگے بڑھانا اور ان میں اصلاح کی کوشش کرنا تھا۔
اس کے ساتھ وہ ان قوانین کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند
کرتا تھا جو وقتاً فوقتاً کسانوں کے سلسلہ میں نافذ کیے جاتے تھے اور جن
سے ان کے مفادات مجروح ہوتے تھے۔ مولوی سراج الدین کے انتقال
کے بعد ان کی وصیت کے مطابق مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کو سنبھالا،

جانفشانی، لگن اور محنت سے اُسے آسمانِ صحافت کا ایک درخشندہ ستارہ بنا دیا۔ ابتدا میں وہ اسے کرم آباد سے ہی نکالتے رہے تقریباً ایک سال بعد دوستوں اور مخلصوں کے مشورے سے وہ لاہور لے گئے یہاں ترقی کے امکانات زیادہ تھے۔ چنانچہ ہوا بھی مولانا نے اس کے مقاصد کا دائرہ وسیع کیا اور خالص زمیندارہ مفادات پیش کرنے کے بجائے اب یہ پوری مسلم قوم کے جذبات کا ترجمان بن گیا اور اس طرح جلد ہی پنجاب کی پوری سیاسی فضا پر چھا گیا بقول دیگر جتنے اخبار تھے اس کے سامنے اُن سب کی آب و تاب ماند پڑ گئی بہ قول بشن کا شمیری،

۱؎ ان دنوں لاہور سے کئی ہفت روزہ اخبار نکلتے تھے۔ جن میں پیسہ اخبار اور 'انتخاب لاجواب' بہ ادارت مولوی محبوب عالم، 'وطن' بہ ادارت مولوی انشاءاللہ خاں، 'اخبار عام' بہ ادارت پنڈت گوپی چند، 'ہندوستان' بہ ادارت لالہ دینا ناتھ اور 'کشمیری میگزین' بہ ادارت محمد دین فوق کا شہرہ تھا۔ مولانا نے زمیندار کی نیو اٹھاتے ہی صحافت کی کایا پلٹ دی۔ وہ نہ صرف ایک پختہ کار ادیب اور شاعر تھے بلکہ مجتہد صحافی ثابت ہوئے۔ دیکھتی آنکھوں زمیندار کہیں سے کہیں نکل گیا۔ اب تک اخبار نویسی کا کوئی معیار اور وقار نہ تھا۔ زمیندار نے وہ رنگ باندھا کہ گویا ؎

انگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

مولانا نے معاصرین سے ادبی شعری مجادلے کی طرح ڈالی جس کسی نے سر نکالا وہ ہٹ گیا۔ جو خم ٹھونک کر نکلا مقابلہ میں بہت ہی بازی ہارا ۔۔۔ قلم کی لپیٹ میں آ گئے ؎

مولانا کی شعلہ بیانی اب پورے شباب پر تھی۔ ان کی تنقید کا نشانہ خصوصیت سے حکمراں طبقہ ہوتا۔ ظاہر ہے حکومت اپنے اوپر تنقید اور زمیندار کی روز افزوں مقبولیت کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے پریس ایکٹ کے شکنجہ میں جکڑنا شروع کر دیا۔ اور اس سے طرح طرح کا تنگ کرنا ہی سلسلہ شروع کر دیا جس کی تاب لانا اس کے لیے مشکل ہو گیا لیکن مولانا ہار ماننے والے نہ تھے۔ ہر مرحلہ پر ثابت قدم رہے اور ہر بار سرخرو ہوئے۔ اسی زمانہ میں مولانا نے انگلستان کا دورہ کیا۔ مقصد تھا پریس ایکٹ کے خلاف وہاں کے عوام اور خواص کی رائے ہموار کرنا۔ اس سلسلہ میں وہاں کے اخبارات میں مولانا نے مضامین بھی لکھے اور بااثر حضرات و ارکانِ پارلیمان سے ملاقاتیں بھی کیں اور ان پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ اسی دوران انھیں یہاں کی معاشرت اور عوام کے طرزِ زندگی کو بغور دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اپنے ان مشاہدات کی بنا پر ایک طویل مضمون بھی قلم بند کیا۔ عنوان تھا ؎

چار چیز است تحفۂ ملک لندن۔ مہرِ غیر و ابر و روزنامہ و زن

اس عنوان کی روشنی میں مضمون کے تیور کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ نتیجہ بھی صاف ظاہر ہے۔ انگریز حکومت اپنی قوم پر اتنے زبردست حملہ کو کیوں کر برداشت کرتی۔ چنانچہ اس نے زمیندار کی ضمانت ضبط کر لی اور مزید دس ہزار کی ضمانت طلب کی۔ عوام نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ لاہور میں حکومت کے اس اقدام کی مذمت کرنے کے لیے عظیم الشان جلسہ ہوا اور اسی میں مطلوبہ رقم جمع ہو گئی۔ اس طرح عوام نے حکومت کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنا دیا۔

۱۹۱۰ء میں جنگِ طرابلس چھڑ گئی اس کے بعد ۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگِ بلقان شروع ہو گئی۔ یہ دونوں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں تھیں جو پیش خیمہ بنیں پہلی عالمگیر جنگ کا۔ اس سے ہندوستانی مسلمان سخت بے چین ہو اٹھے۔ ان میں ہیجان برپا ہو گیا۔ جگہ جگہ مظلومین طرابلس و بلقان کے لیے جلسے ہوئے اور چندے جمع کیے گئے۔ ظفر علی خاں نے اس میں تا مقدور عمل ادا کیا۔ زمیندار نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کے نتیجہ میں اس کی مقبولیت میں فقید المثال اضافہ ہوا۔ اب یہ ہفت روزہ سے روزنامہ ہو گیا اور اس کی اشاعت تیس ہزار یومیہ تک پہنچ گئی۔ مولانا کی انقلابی تقریروں اور جادو بھری تحریروں نے خفتہ عوام میں جذبۂ بیداری پیدا کیا۔ ترکی کے مظلوم عوام کے لیے زمیندار فنڈ کا اعلان ہوا تو کچھ ہی مدت میں تقریباً چھ لاکھ کی رقم جمع ہو گئی۔ اسے فوری طور پر ترکی بھیج دیا گیا۔ زمیندار نے

ربھی شایع کیا۔ جسے عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن ارباب اقتدار کی
یں یہ کانٹا بن کر چبھا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا نے ترکی کا دورہ کیا۔ وہاں
سلطانِ ترکی محمد خامس کے دربار میں شرف باریابی حاصل ہوا۔
یمت میں مولانا نے زمیندار کا بلقان نمبر پیش کیا۔ اسی کے
ں کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ بھی نذر کیا۔ سلطان ان
سے بے حد مسرور ہوئے۔ انہوں نے ان تحائف کو شرف
بخشا اور ہندوستانی مسلمانوں کے نام ہدیۂ تشکر بھیجا۔ ترکی
مانا کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ان کے اعزاز میں متعدد جلسے اور
ں ہوئیں۔ وہاں آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے
سکتا ہے کہ وہاں کے ایک مشہور سیاستداں نے ان سے اپنی
ہزادی کے عقد کی پیش کش کی یہ دوسری بات کہ مولانا نے
نے الجمیل اسے ٹال دیا۔ ترکی سے مولانا جب ہندوستان واپس
یہاں بھی ان کا بڑا پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ آپ کا نام ہر اک کی نوک
تھا۔ سب سے پہلے آپ بمبئی پہنچے۔ وہاں بڑا شاندار استقبال ہوا
آئے تو یہاں کے عوام نے وہ عظیم الشان جلوس نکالا جس کی مثال
ل ہے۔ اس بے پناہ ہجوم میں ایک ضعیفہ کا اکلوتا بیٹا دب کر جاں
گیا۔ لیکن اس نے انتہائی بلند حوصلگی سے اعلان کیا کہ اگر اس
ں بیٹے ہوتے اور سب اسی طرح ظفر علی خاں پر قربان ہو جاتے
غم نہ ہوتا۔ مولانا دلی سے لاہور پہنچے تو ایک محتاط اندازہ کے
ایک لاکھ لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ مولانا حالی نے بھی اپنی
سالی کے باوجود ۲۴ اشعار کی ایک خیر مقدمی نظم کہی تھی جس میں
ں خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا
ے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لک دفترِ زمیندار اے نازشِ قوم و فخرِ اقران
رح و روانِ جمعِ احباب اے چشم و چراغِ بزمِ اخوان
یں کے امتحاں میں جانباز اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں
رقِ صفا کی زندہ تصویر اے شیر دل، اے ظفر علی خاں
نے بھیرتے تجھ میں جو گن جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں
ہ و برتری پہ تیری قایم کوئی نہ ہو سکی برہان
پر وقت کی تاک میں برابر ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ اٹھا ستم و جفا کا طوفان
ہمدردیِ اہلِ دیں نے آخر جوہر ترے کر دیے نمایاں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں
نازاں ہے وہ درس گاہ تجھ پر تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں
کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند جو قوم کے درد کے ہوں درماں
جو ملک و وطن کے ہوں فدائی جو قوم کے نام پر ہوں قرباں
پنجاب کو تجھ پر ہے اگر فخر ہے اس کو یہ فخر و ناز شایاں

زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

زمیندار میں حکومت، تاجِ برطانیہ اور مسلم ممالک میں برٹش گورنمنٹ کی مداخلت کے خلاف جو مضامین شایع ہو رہے تھے اور عوام میں جو غیر معمولی مقبولیت اسے حاصل ہو رہی تھی حکومت اسے کس طرح برداشت کر سکتی تھی لہٰذا اس کا عتاب نازل ہونا شروع ہو گیا۔ چنانچہ اس سے ایک ایک ہزار کی دو ضمانتیں مانگی گئیں۔ ایک ہفت روزہ ایڈیشن سے اور دوسری روزنامہ ایڈیشن سے اور اس پر حسبِ ذیل فردِ جرم عاید کی گئی:

۱۔ زمیندار کا لہجہ نہایت غیر معتدل اور قابلِ اعتراض ہے۔
۲۔ زمیندار نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے کہ اس کا روزنامہ ایڈیشن باقاعدہ ہفت روزہ ایڈیشن کے محض ضمیمے کی حیثیت رکھے گا اور اس میں صرف تار برقی کی خبریں شایع ہوں گی

اس طرح پریس ایکٹ کے شکنجہ میں پھنس کر زمیندار کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کا ماتم مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کی ۲۱ر جنوری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں کیا:

"زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی صرف طبقۂ خواص تک محدود تھی اور عام بیداری و احساس کے پیدا ہونے میں یہ ایک ایسا مانع عظیم تھا جس کی وجہ سے کوئی تحریک اور کوئی آواز عام قوت و اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ جنگِ طرابلس نے قوم کے

تمام طبقات کو خبروں کا شائق بنا یا اور زمیندار کی عام مقبولیت شروع ہو گئی۔ اس کی اشاعت بیس بیس ہزار روزانہ تک پہنچی اور اس کی ارزانی اور عام فہم ہونے نے اسے عام دکانداروں اور بازار کے بیٹھنے والوں تک پہنچا دیا۔ ہر شخص جو اردو عبارت پڑھ سکتا تھا علی الصباح اس طرح زمیندار کے لیے خواہشمند ہوتا تھا گویا یورپ اور امریکہ کا ایک تعلیم یافتہ عادتاً صبح کے وقت مطالعۂ اخبار کے لیے بے قرار ہے۔ اس نے گو ابتداً ہندوستان کے معاملات کے متعلق کچھ نہ لکھا اور مسلمانوں کی سیاسی حالت پر بھی کوئی توجہ نہ کی (یہ مولانا ظفر علی خاں کے عنانِ ادارت سنبھالنے سے پہلے کا ذکر ہے۔ جب آپ کے والد ماجد مولانا سراج الدین احمد مرحوم مرتب کرتے تھے) اس وقت یہ اخبار صرف زمینداروں اور کسانوں کا پرچم تھا تاہم اس نے جن امور پر لکھا آزادی و جرأت کے ساتھ لکھا اور اپنے پڑھنے والوں میں یقیناً زندگی کی روح پیدا کر دی۔ اس کے بعد حالات میں مزید تغیرات ہوئے اور زمیندار نے بیرونِ ہند کے اسلامی معاملات کے علاوہ ہندوستان کے سیاسی مسائل پر بھی لکھنا شروع کر دیا۔ گو اس سے بے اعتدالیاں ہوئیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے ہمیشہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی سعی کی۔ وہ روزانہ تھا اور متفرق فروخت ہوتا تھا ایک یا دو پیسہ دے کر ہر شخص اسے خرید سکتا تھا گزشتہ دو سال کے تغیرات و حالات نے خود بخود اسے مقبول عام بنا دیا تھا۔ قوم کے ہر طبقہ میں روزانہ پڑھا جاتا تھا۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑی قوت تھی جو حسن اتفاق سے پیدا ہو گئی تھی۔ اور ایک ایسا وسیلۂ وحید تھا جس کے ذریعہ ہر روز ہزاروں مسلمانوں کے اندر بیک وقت زندگی پیدا کی جا سکتی تھی۔ اس قسم کے وسائل ہر وقت حاصل نہیں ہو سکتے اور نہ تغیرات و حوادث کا موسم ہمیشہ رہا کرتا ہے۔ پس زمیندار کا بند ہونا مسلمانوں کے لیے ایک عظیم ترین ضائعات ملیہ میں سے ہے اور تمام عند اللہ اُس غفلت کے لیے جواب دہ ہیں جس نے حریف قوی پنجہ کو ایسا کرنے کی جرأت دی اور پھر اس کے لیے بالکل خاموش ہو گئے اور مُردوں کی سی بے حسی گوارہ کر لی۔"

یہ صرف ابوالکلام کے خون کے آنسو نہیں ہیں بلکہ ایک معاصر اخبار کی شہادت بھی ہے جو زمیندار کے فقید المثال قبول عام، اس کی حق گوئی و بیباکی اور خلوص نیت کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کی اہمیت اس پس منظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس زمانے میں دیگر اخبارات معاصرانہ چشمک میں گرفتار اور زمیندار کی زبردست مقبولیت سے حسد کا شکار ہو گئے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں نے حالات سے مغلوب ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے جلد ہی زمیندار کو حکومت کے چنگل سے نکال لیا۔ عوام نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لوگوں نے چندہ کر کے ضمانت کی رقم پوری کی اور اس طرح زمیندار کی جاں بخشی کرا دی۔ اور ایک بار پھر یہ اُسی شان سے نکلنے لگا۔ لیکن اربابِ اقتدار مولانا کو چین سے کیونکر بیٹھنے دیتے۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ اتنے میں ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ حکومت کو بہانا مل گیا۔ اس نے قانون تحفظ ہند نافذ کر دیا۔ اس کے تحت بہت سے ہندوستانی لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا بھی اس کی زد میں آ گئے۔ ان کو ۱۰ / اکتوبر ۱۹۱۴ء تا اختتام جنگ کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ فطری طور پر زمیندار بھی بند ہو گیا۔ نظر بندی کی یہ مدت بہت طویل تھی۔ مولانا کے لیے اتنے عرصہ تک خاموش بیٹھنا مشکل ہو گیا چنانچہ انہوں نے حکومت کو درخواست بھیجی کہ میں اب سیاست سے کنارہ کش ہوں اور آئندہ بھی اس سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا لہذا صرف اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر ایک غیر سیاسی اور خالص علمی و ادبی رسالہ نکالنا چاہتا ہوں۔ کافی رد و قدح کے بعد حکومتِ پنجاب نے انھیں اجازت دیدی۔ چنانچہ انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ 'دائرۃ المعارف' قائم کر کے

ہفت روزہ پرچہ "ستارۂ صبح" جاری کر دیا۔ اس کا پہلا شمارہ
ت ۱۹۱۷ء کو منظر عام پر آیا۔ اس کے سرورق پر یہ شعر درج ہوتا تھا:

من آں ستارۂ صبحم کہ در محل طلوع
ہمیشہ پیش رو آفتاب می باشم

اس کا رنگ پھیکا سا۔ اس میں وہ چمک نہ آ سکی جو زمیندار میں تھی اس کا
ی سبب یہ تھا کہ اب اس کا ہر مضمون شایع ہونے سے پہلے سنسر
تھا۔ ایسے میں لطف کیسے آتا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ مولانا نے حکومت
ریف کرنی شروع کر دی اس سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ "ستارۂ صبح"
نت روزہ سے روزنامہ بنانے کی اجازت مل گئی۔ وہاں یہ نقصان بھی
عوام میں اس کی مقبولیت اور بھی کم ہو گئی۔ ان کی مثبت انداز کی
یروں میں لطف کہاں سے آتا۔ ، وہ تو منفی انداز کی تحریروں کے
ناہ تھے اور عوام بھی اس کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اخبار کی مقبولیت
کمی ہونا ایک فطری امر تھا۔ آخر کار انہوں نے اپنا اصلی رنگ اختیار
لیا۔ لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ حکومت پر تو تنقید کر نہیں سکتے تھے
علمائے سوء پر برسنا شروع کر دیا اور بالخصوص قادیانیوں کے پیچھے
تہ دھو کر پڑ گئے۔ اب ان کے اصلی جوہر پھر نکھرنے لگے۔ نظم و نثر دونوں
یں وہ معرکہ آرائی کی کہ توبہ ہی بھلی: اسی کے ساتھ انہوں نے نام نہاد
نشینوں اور پیروں کا بھی پردہ چاک کرنا شروع کر دیا اور حسب عادت
میں بھی حد اعتدال سے آگے بڑھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے ہر طبقہ
طرف سے ان کی مخالفت ہونے لگی۔ مجبوراً مولانا کو ستارۂ صبح بند
دینا پڑا اور پھر خود پنجاب چھوڑ کر دکن جانا پڑا۔ لیکن جلد ہی حیدرآباد
ڑنے پر بھی مجبور ہو گئے۔ ان حالات پر روشنی خود مولانا نے ان
فاظ میں ڈالی ہے:

"سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کی ستم پیشہ
ملوکیت نے زمیندار کو سیندور کھلا رکھا تھا اور
مجھے نیم نظر بندی کی حالت میں اپنا ادبی شوق پورا
کرنے کے لیے روزنامہ "ستارہ صبح" کی ادارت کے فرائض
کی انجام دہی کی اجازت دے رکھی تھی۔ سیاست ان
ایام میں شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی تھی اور ستارۂ صبح کے
اوراق صرف غیر سیاسی مضامین کے لیے وقف ہونے
پر مجبور تھے۔ تاریخ، فلسفہ، معاشرت، مذہب اور
ادب لطیف وہ موضوع تھے جن سے میں اپنا دل پرچا
کر سکتا تھا۔ میں نے ان کو بھی غنیمت سمجھا اور ارباب
ذوق سلیم کے لیے علم و حکمت کی ایک ایسی بستی بسا دی
جس کے بام و در کتاب و سنت کی روشنی میں جگمگا
اٹھے۔ نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول ستارۂ صبح
میں کچھ اس طرح کھولا گیا کہ دنیائے طریقت کے برخود
غلط رہنما چیخ اٹھے۔ چنانچہ میرے خلاف ان بزرگوں نے
ایک وسیع پیمانہ پر سازش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی
طرح میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں۔ پہلے تو لاہور
میں ایک دھوم دھام کا جلسہ کیا جس میں مجھ پر کفر کا فتویٰ
لگایا گیا جواب تک واپس نہیں لیا گیا۔ اس پر بے اختیار
میرے منہ سے نکلا ؎

کوئی ترکی لے گیا اور کوئی ایراں لے گیا
کوئی دامن لے گیا کوئی گریباں لے گیا
رہ گیا تھا نام باقی اک فقط اسلام کا
وہ بھی ہم سے چھین کر حامد رضا خاں لے گیا

اس کے بعد ایک میمورنڈم تیار کیا گیا جس پر طول و عرض
ہند کے پیروں، صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے دستخط
ثبت تھے۔ اس میمورنڈم میں حکومت پنجاب سے استدعا
کی گئی ہے کہ کسی طرح میرا منہ بند کیا جائے۔ یہ اسی میمورنڈم
کا نتیجہ تھا کہ مجھے پنجاب چھوڑنا پڑا اور کچھ عرصے کے لیے
حیدرآباد جا کر میر عثمان علی خاں کے دامن دولت میں
پناہ لینی پڑی۔ اگرچہ حیدرآباد میں بھی حریفوں نے
پیچھا نہ چھوڑا اور مجھے اس گوشۂ عافیت کو بھی چھوڑ کر
پنجاب کا رخ کرنا پڑا جہاں نئی بلائیں میرا استقبال کو موجود
تھیں۔"

بالآخر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں مولانا کو نظر بندی سے رہائی ملی لیکن ابھی،

رہا ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں ملک کے دفاعی قانون کے تحت ۲۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کو پھر گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا نے رہائی کے بعد زمیندار کو پھر جاری کر دیا تھا۔ لیکن اس گرفتاری کے بعد یہ پھر بند ہو گیا۔ مولانا کو منٹگمری جیل میں رکھا گیا تھا۔ اس بار وہ پانچ سال قید میں رہے۔ اور جب ۱۹۲۶ء کے وسط میں رہا ہو کر لاہور پہنچے تو عوام نے بڑے جوش وخروش سے ان کا استقبال کیا اور رات بھر آپ کا جلوس نکالا۔ اس کے بعد جب آپ امرتسر گئے تو وہاں کے لوگوں نے بھی آپ کا فقید المثال جلوس نکالا۔ اب مولانا کی شہرت اور ہر دلعزیزی بام عروج پر تھی۔ اور اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست اور صحافت دونوں میں ایک صحت مند تثلیث بن گئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں ۔۔ اور الہلال، ہمدرد اور زمیندار
لیکن یہ زمانہ ہندوستان کے لیے اچھا نہیں تھا۔ پوری سیاسی فضا پر بے چینی، بدامنی اور انتشار کے سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ خلافت تحریک ناکام ہو چکی تھی، ہندو مسلم اتحاد پاش پاش ہو چکا تھا، شدھی سنگٹھن وجود میں آ چکی تھی اور اپنی تمام تر مسلم دشمنی، ملک دشمنی اور انسانیت دشمنی کے ساتھ تخریبی کارروائیوں میں سرگرم تھی۔ مولانا کانگریس میں شامل تھے اور اسی کے جھنڈے تلے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت خود کانگریس اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ ادھر خلافت کمیٹی کے اکابر ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ ایسے میں مولانا کے لیے کام کرنا بڑا مشکل تھا۔ وہ خود جذباتی انسان تھے۔ اور جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس پر ڈٹے رہتے تھے۔ مصلحت بینی اور دوراندیشی ان میں نہیں تھی۔ وہ سمجھوتہ کی حکمت عملی میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے اپنے بھی ان سے خفا رہتے تھے اور بیگانے بھی ناخوش۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان کے ہم نواؤں کی تعداد کم ہوتی گئی اور مخالفین کی زیادہ۔ ایک زمانہ میں مولانا خلافت کمیٹی کی پنجاب شاخ کے روح رواں تھے۔ لیکن جب آل انڈیا خلافت کمیٹی کے ارباب اقتدار سے اختلاف ہوا تو انہوں نے اس سے ناطہ توڑ لیا اور مجلس احرار بنائی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سے اس مرحلہ پر اختلاف ہو گیا تو ان سے برسرپیکار ہو گئے۔ اور ان کی شان میں نظمیں کہہ ڈالیں۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ شروع کی۔ ان کی رہنمائی میں جگہ جگہ لوگوں نے نمک بنا کر اس قانون کی خلاف ورزی کی۔ مولانا ظفر علی خاں بھی اس کے پرجوش حامیوں میں تھے۔ اور جب اس تحریک نے زور پکڑا تو حکومت نے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ کانگریس کے تقریباً سبھی چوٹی کے لیڈر گرفتار ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی ان میں شامل تھے اُن پر باغیانہ اور اشتعال انگیز تقریریں کرنے کا الزام تھا چنانچہ دفعہ ۱۲۴ کے تحت ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا نے عدالت کی کارروائی کا مقاطعہ کیا۔ عدالت نے آپ کو تین سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی۔ آپ کو گجرات جیل میں رکھا گیا۔ آپ کے ساتھ اسی جیل میں ملک کے دوسرے مقتدر رہنما بھی رکھے گئے تھے۔ ان میں پنڈت موتی لال نہرو، بیرسٹر آصف علی، بیرسٹر مشتاق احمد، سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیسی نادر روزگار شخصیات شامل تھیں۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدہ کے تحت ایک سال کے اندر ہی تمام سیاسی قیدی رہا ہو گئے۔ مولانا بھی ان ہی میں شامل تھے۔

۱۹۳۵ء میں لاہور کی مسجد شہید گنج کا قضیہ کھڑا ہوا۔ مولانا اس تحریک کے پُرجوش قائد تھے۔ اس مسئلہ پر ان کا مجلس احرار کے اکابر سے بھی اختلاف ہوا۔ چنانچہ اس سے قطع تعلق کر کے انہوں نے مجلس اتحاد ملت قائم کر لی۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں نہ صرف حکومت اور سکھ قوم کو مطعون کیا بلکہ مجلس احرار کے اکابر کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ حکومت نے نقض امن کی آڑ لے کر انھیں پھر کرم آباد میں نظربند کر دیا۔ مولانا نے اس نظربندی پر حسب ذیل اشعار قلم بند کیے ؎

حق کے اظہار کی پاداش میں انگریزوں نے
کرم آباد میں پھر مجھ کو نظربند کیا
جرم یہ تھا کہ مساجد کی نگہبانی کو
میں نے کیوں تابع آئین خداوند کیا
کاش دیتے وہ سزا مجھ کو باندازہ جرم

جسم سے قطع نہ کیوں روح کا پیوند کیا
اب تو ملت کا ہر اک فرد یہی کہتا ہے
کہ مرا مرتبہ سرکار نے دہ چند کیا

بالآخر یہ تحریک ناکام ہوئی۔ مولانا کے دل و دماغ پر اس ناکامی کا بڑا اثر ہوا لیکن اس کے باوجود ان کی حق گوئی اور بے باکی میں کوئی فرق نہ آیا جس بار وہ تقریباً دو سال تک نظر بند رہے۔ اس کے بعد وہ کانگریس سے ناراض ہو گئے۔ اب ان کے پاس مسلم لیگ کی حمایت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ وہ باقاعدہ طور پر اس میں شامل ہو گئے اور اپنی مجلس اتحاد ملت کو بھی اس میں مدغم کر دیا۔ یہاں بھی وہ اتنے ہی جوش و خروش سے کام کرنے لگے جیسا کہ کانگریس میں کرتے تھے چنانچہ جلد ہی وہ مسلم لیگ کے صف اول کے رہنماؤں میں شامل ہو گئے۔ خود مسٹر جناح ان کو اپنے معتمدین میں شمار کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو شاہی مسجد لاہور کے ایک جلسہ میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا:

"مجھے آپ اپنے صوبہ میں ظفر علی خاں جیسے دو چار بہادر آدمی دیدیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر کوئی مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتا۔"

مسلم لیگ کو موثر، فعال اور عوامی تنظیم بنانے میں مولانا ظفر علی خاں نے اہم رول ادا کیا۔ ویسے تو وہ ملک گیر شہرت کے مالک تھے، لیکن جہاں تک صوبۂ پنجاب کا تعلق ہے وہ یقیناً مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقبول اور سربرآوردہ لیڈر تھے۔ انہوں نے لاہور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ تقسیم ملک کے بعد بھی وہ وہیں رہے لیکن آخر میں وہ اپنے وطن کرم آباد چلے گئے تھے اور وہیں کس مپرسی کے عالم میں ۸۴ برس کی عمر پاکر، ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ اس ۸۴ سال کے عرصہ میں انہوں نے مجموعی طور پر تقریباً چودہ برس قید میں گزارے گویا عمر عزیز کا چھٹا حصہ جیل کی نذر ہوا۔

مولانا کے کارنامے بڑے وسیع اور متنوع ہیں۔ سیاست، صحافت، شاعری، ادب سب میں وہ امتیازی شان رکھتے تھے۔ اسی طرح فن خطابت میں بھی انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ البتہ ان کا مزاج سیمابی تھا جس کے باعث وہ کسی ایک راستے پر زیادہ عرصہ تک نہ چل سکے۔ وہ منزل کی جانب چلتے، لوگ ان کے ساتھ ہو جاتے اور ایک زبردست قافلہ بن جاتا لیکن جلد ہی وہ اس قافلہ سے ناراض ہو جاتے اور دوسری طرف اپنا رخ موڑ لیتے اور یہ ہر جذباتی انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بار کہا تھا،

"وہ کوئی تحریک مہینوں کے بجائے ہفتوں میں اٹھانا چاہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو وہ بہت تمام عمارت کھڑی کر دیں گے لیکن عمارت تیار ہو جائے تو انھیں فوراً نکال دو کیونکہ وہ بنانے کے بعد ڈھانے لگتے ہیں"

مولانا بڑے جذباتی انسان تھے۔ مزاج میں تلون بہت تھا۔ ان کے یہاں دریا کی سی روانی نہیں، بلکہ طوفان کی سی کیفیت تھی جو چڑھتا بھی تیزی سے ہے اور اترتا بھی اتنی ہی سرعت سے ہے۔ مولانا جس سے خوش ہوتے اُسے فرشتہ بنا دیتے اور جب ناراض ہوتے تو فوراً اسے ابلیس قرار دے دیتے۔ چنانچہ جب وہ کانگریس میں تھے تو اسے دنیا کی سب سے اچھی جماعت تصور کرتے اور اس کی مدمقابل جماعت مسلم لیگ پر پھبتیاں کستے۔ چنانچہ لاہور مسلم لیگ کے متعلق یہ اشعار اب بھی نیشنلسٹ حضرات کے کانوں میں رس گھولتے ہیں ؎

کون کہتا ہے کہ بیکار ہے لاہور کی لیگ
ملک سے برسرِ پیکار ہے لاہور کی لیگ
جتنے اس خطہ کے ٹوڈی ہیں مبارک ہو انھیں
کہ غلامی کی طلب گار ہے لاہور کی لیگ
جس سے پنجاب میں انگریز کا جلتا ہے دیا
آج اسی تیل کی اک دھار ہے لاہور کی لیگ
سائمن اس کا خداوند ہے اس کی لونڈی
غازۂ عارض سرکار ہے لاہور کی لیگ
فتنہ پردازی اگر مستحقِ مدحت ہو
تو ستائش کی طلب گار ہے لاہور کی لیگ
جنس ہشتاہہ بازار ادب میں ارزاں
مہر و سالک کی خریدار ہے لاہور کی لیگ

جان اور دل سے ہے قربان مسلمانوں پر
فقط اسلام سے بیزار ہے لاہور کی لیگ
عشوئی لندن سے اگر آئے تو قبل از مغرب
روزہ کھلوانے کو تیار ہے لاہور کی لیگ
صدر کیا کہیے یہی قوم کے غداروں کو
کہ حکومت کی وفادار ہے لاہور کی لیگ

اس زمانہ میں فخریہ انداز میں کہا کرتے تھے ؎

کانگریس کی میں سفارت بھی کیا کرتا ہوں

لیکن جب اس سے ناراض ہوئے تو اسے مسلمانوں کی دشمن جماعت
سمجھنے لگے اور کانگریسی مسلمانوں کے متعلق یہ پھبتی کسی ؎

گنبد کانگریس میں آج گونج رہی ہے یہ صدا
نیشنلسٹ ہے وہی ضد ہو جسے نماز سے

اس کے بعد وہ اسی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جس کو وہ اسلام سے
بیزار اور حکومت کا سیس بتایا کرتے تھے۔ اسی طرح جب وہ کانگریس
میں تھے تو گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کے فلسفہ کو عین اسلامی تعلیمات
کے مطابق بتایا کرتے ہیں۔ اس کی تشریح انہوں نے زمیندار میں ان
الفاظ میں کی تھی،

"شارحین لغت نے ستیہ کا مفہوم سچائی بیان کیا ہے
اور اہل السنہ کے نزدیک اہنسا کے معنیٰ ہیں عدم تشدد
گاندھی جی نے تحریک عصیان مدنی (سول نافرمانی) کو اہنسا
کے ہتھیار سے مسلح کر کے اس سقف نیلی کے نیچے فی الواقعہ
ایک نہتی قوم کے عروق مُردہ میں زندگی کی حرارت دوڑا
دی ہے۔ لیکن گاندھی جی کا یہ فلسفہ مستعار ہے محمد عربی
صلی اللہ علیہ وسلم کے ابراہیمی اسلام سے جس کا فانوس
خلیل اللہؑ نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھتے ہوئے ذبیح اللہ
کے اسوۂ ایثار سے روشن کیا تھا۔ جب ہم تیرہ سو برس
پہلے مکہ کی گلیوں میں بمقابلہ قریش حضور خواجہ کیہانؐ
کی سیرت طیبہ کے نقش و نگار دیکھتے ہیں تو ہمیں اس میں
عدم تشدد کی جھلکیاں صاف صاف نظر پڑتی ہیں

گویا اس کائنات کی ساری نیکیاں حضور رحمۃ للعالمین
کے اسوۂ حسنہ ہی کی خوشہ چین ہیں"

اور جب گاندھی جی سے ناراض ہوئے تو اسی فلسفہ کو وہ ہندوستان
میں "ہندو راج" قائم کرنے کا وسیلہ بتانے لگے۔

"ستیہ و اہنسا ہندو سنسکرتی کے دو معنوی سپوت
ہیں جو اس دور کے سب سے بڑے سامری گاندھی نے
اپنے سیاسی فلسفہ کی کوکھ سے پیدا کئے ہیں۔ بظاہر
گاندھی جی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں لیکن فلفتہً
بڑے ہی کائیاں واقع ہوئے ہیں۔ ان کا سیاسی
منشا راس کماری سے لے کر سرینگر تک اور طورخم
سے لے کر کلکتہ تک ہندو راج کا قیام ہے جس کا
عرف رام راج ہے"

ایک زمانہ تھا کہ وہ گاندھی جی کو ہندوستان کا نجات دہندہ تصور کرتے
تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی نظم "اعلان جنگ" ہے جو انہوں نے
کانگریس کی تحریک ترک موالات کی حمایت میں کہی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادی حیات کا سامان کر دیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
پروردگار نے کہ وہ ہے آدمی شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

اور جب ناراض ہوئے تو اسی گاندھی کو وہ ہندوستان کی سب سے
بڑی آفت اور مکر و فریب کا طوفان بتانے لگے ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

اور ؎

اے سامری وقت کہ گاندھی ہے تیرا نام

کہتے ہیں نصاریٰ کا تجھے بندۂ بے دام
ہندو کو مسلماں سے لڑانا ہے ترا کام
ہم کو نظر آتا ہے جو ہوگا ترا انجام
اے دشمن اسلام

جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ہمنوا تھے تو ان کو اس منصب جلیلہ
ز کہا ہے

جہاں اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوگئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

ب ان سے ناراض ہوئے تو اپنے قلم کی جولانی اس طرح
ائی ہے

ابوالکلام آزاد سے پوچھتے ہیں دل جلے
آج کل تم پیشوائے امت مرحوم ہو
کٹ کے اپنوں سے ملے ہو جاکے تم اغیار سے
پھر یہ کہتے ہو کہ ہم ظالم ہیں تم مظلوم ہو

علی برادران مولانا کے زمانۂ طالب علمی کے دوست تھے سیاست
دان میں بھی مدتوں تک ایک دوسرے کے ہم رکاب رہے۔
جب ان سے اختلاف ہوگیا تو ہاتھ دھوکر ان کے پیچھے پڑ گئے ہے

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ
ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کو ضد

مولانا محمد علی کے انتقال پر انھیں بہت شاندار انداز میں
عقیدت پیش کیا ہے

دلکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی
رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی
ذوق سلیم جس کے مزے بھولتا نہیں
شیرینی اس سخن کی محمد علی سے تھی
زنداں کو جس نے مطلع انوار کر دیا
تابانی اس کرن کی محمد علی سے تھی
اغیار کی گرفت سے امید مخلصی
شیخ اور برہمن کی محمد علی سے تھی
توحید کے اصول کی حرمت کے ساتھ ساتھ
ذلت ہر ایک دشمن کی محمد علی سے تھی

ایک بار کسی سیاسی مسئلہ میں علامہ اقبال سے اختلاف ہوگیا۔ پھر کیا تھا۔ ان کی بھی، ہجو لکھ ڈالی۔ اور ان کو ہندوستان کی آزادی کا سب سے بڑا دشمن قرار دیدیا ہے

مانگ کر اجابت رجعت پسندی کا گدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے آج
قوم کی لٹیا ڈبودی کس نے؟ سر اقبال نے

لیکن بعد میں غالباً کچھ احساس ہوا یا علامہ سے ناراضگی ختم ہوگئی تو اس میں انہوں نے ترمیم کردی اور "کس نے سر اقبال نے" کی جگہ "لیڈران قوم نے" کر دیا۔ اس کے بعد علامہ کے سانحۂ ارتحال پر بھی اُن کا پُردرد مرثیہ کہا اور ان کی وفات کو ملت اسلامیہ کے لیے زبردست سانحہ قرار دیا۔ فرماتے ہیں ہے

گھر گھر یہی چرچا ہے کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پہ ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صف ماتم
اس غم میں سیاہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا
سو سال کے سوتے ہوئے جذبوں کو ابھرنا
ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہی درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا
ملت کو نئی زندگی اقبال نے بخشی
ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا

غرض مولانا کے قلم کی انی سے کوئی ہوگا جو بچ گیا ہوگا۔ ان میں اپنے بھی ہیں، بیگانے بھی۔ ان میں افراد بھی ہیں، تحریکات بھی اور سیاسی جماعتیں بھی۔ جب کسی کے ہمنوا ہوئے تو اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے اور جب ناراض ہوئے تو فوراً اس کی ہجو کہہ ڈالی اور اسے ملک و ملت کے لیے فتنۂ عظیم قرار دیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے

باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا خلوص کے پیکر تھے۔ اخلاص عمل، اخلاص نیت اور اخلاص جذبہ ان کا خاصہ تھا اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ان کے خیالات اور رائے سے اختلاف ممکن ہے، بلکہ بہت زیادہ گنجائش ہے۔ لیکن ان کے ہر عمل اور خیال کے پس منظر میں جو جذبہ اور خلوص کارفرما ہوتا تھا اس کی صداقت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مولانا کو اسلام سے گہری عقیدت تھی۔ اسی کے ساتھ انہیں وطن عزیز سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ ان کے دل میں مسلم قوم کا بھی بہت درد تھا۔ اسی لیے وہ کوئی ایسی بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جن سے کسی طرح بھی اسلام پر ضرب پڑنے کا خدشہ ہو یا مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اسی طرح ہندوستان کی غلامی بھی ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ ہر ایسی تحریک میں دل و جان سے شریک ہو جاتے تھے جس کا مقصد ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانا ہوتا۔ وہ ملک کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس راہ میں جو قربانیاں انہوں نے پیش کیں۔ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انھیں اپنے مذہب، پیروان مذہب اور اپنے وطن سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی اور یہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ وہ کسی ایسی بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس سے اس 'تثلیث' کی کسی ایک اکائی پر بھی ضرب پڑتی ہو۔ اسی لیے ان کے پاس دار و گیر اور گرفت و مواخذہ کا معاملہ بہت سخت تھا۔ اس میں اپنے اور بیگانے کی تفریق نہیں تھی۔ جس شخص سے بھی اس راہ میں ان کے نزدیک لغزش ہوتی وہیں وہ اس کی گرفت کر لیتے۔ جس کا واحد مقصد اس کو راہ راست پر لانا ہوتا۔ مجموعی طور پر مولانا بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہیں ؏

وہ اپنی مثال آپ تھے اور بے مثال تھے۔

حواشی

۱؎۔ الدعاء والاستجابہ۔ خط بنام سر سید احمد خاں۔ تہذیب الاخلاق۔ جلد ۲ شمارہ ۱۱ یکم شعبان ۱۳۱۳ھ۔ ص ۱۸۶۔ ۱۹۲

۲؎ John william Draper: Conflict between Religion and Science

۳؎ ظفر علی خاں از شورش کاشمیری۔ ص ۴۴۔ ۴۸

۴؎ بحوالہ: ظفر علی خاں از شورش کاشمیری۔ ص ۶ ط

میر محفوظ علی بدایونی

شمس بدایونی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اپنی جن ادبی شخصیتوں پر ناز ہو سکتا ہے۔
وکت علی خاں فانی بدایونی اور سید میر محفوظ علی کے نام بھی اہم ہیں۔
لوگوں کے نام جتنے اہم ہیں ان پر کام اتنا ہی مختصر ہے۔ باوجود اس کے
بیں ان کا اعلیٰ مقام تمام ہی نقادوں اور ادیبوں نے تسلیم کیا ہے۔
بھی ان کی سوانح حیات مکمل کرنے کی سعی بلیغ نہیں کی۔ فانی پر
قی کام کافی آگے بڑھا اور گو یہ پیش رفت اس حد تک تو نہیں پہنچی
سوانح مکمل ہو جاتی تاہم یہ پیش رفت اتنی کم بھی نہیں کہ اسے
وجہ اور نا قابلِ تحسین قرار دیا جائے۔ میر محفوظ علی پر اب تک اتنا کام
ہو سکا ہے۔ میر صاحب پر اب تک صرف دو سوانحی مقالے شائع ہوئے
یک مولوی سبطین احمد کا مقالہ علی گڑھ میگزین ۱۹۳۹ء میں اور دوسرا
علی (فرزند میر موصوف) کا طنزیات ومقالات میں۔ کچھ تاثراتی مضامین
ر رسالوں اور کتابوں میں بھی شائع ہوئے۔ پروفیسر ضیاء احمد کا تاثراتی
ئ ذکر میر' اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے پروفیسر ضیا احمد کے اس
، کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے مضامین
موعیت کے حامل ہیں جو بالترتیب ماہنامہ معارف (دسمبر ۱۹۴۳ء)
وار صدق (۸ ستمبر ۱۹۴۳ء) میں شائع ہوئے۔ تحقیق وجستجو کی کمی
کوئی بھی سبب رہا ہو، بہر حال یہ مقالے اور مضامین اتنے جامع نہیں
ں میر صاحب سے متعلق تمام حقائق پر محیط سمجھا جائے۔ زیر نظر مضمون
ر صاحب سے متعلق کچھ مزید نئے انکشافات اور نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔
میر صاحب بدایوں کے ایک خوش حال گھرانے میں ۸ مئی ۱۸۷۰ء
ا ہوئے۔ خاندانی وجاہت ورثہ میں پائی تھی۔ آپ کا سلسلہ نسب

سترہ واسطوں سے امروہہ کے مشہور بزرگ مخدوم سید شرف الدین رح
شاہ ولایت امروہہ (ولادت ۶۳۶ھ) تک پہنچتا ہے، زاں بعد ۹ واسطوں سے
امام اہلبیت حضرت علی نقی ؑ (ولادت ۲۱۲ھ شہادت ۲۵۴ھ) تک جا پہنچتا ہے۔
میر صاحب کے جد امجد سید محمد امین اٹھارویں صدی کے اوائل میں امروہہ
ضلع مراد آباد سے نقل مکان کر کے بدایوں آ گئے تھے۔ ان کے بیٹے سید محمد علی
کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ کٹر شیعہ تھے اور نواب اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔
بکسر کی لڑائی میں نواب پر جاں نثار کی۔ جب آصف الدولہ ۱۷۷۳ء میں بسولی (تحصیل
ضلع بدایوں) آئے تو سید محمد علی کا یتیم بچہ سید مراد علی (جس کی عمر اس وقت آٹھ نو
سال بتائی جاتی ہے) حاضر خدمت ہوا اس نے اپنے باپ کی قربانی وجاں نثاری
کا حال بیان کیا۔ اس پر آصف الدولہ نے اسے جاگیر معافی میں دے دی یہ جاگیر
دو مواضعات پر مشتمل تھی جو اس خاندان کی ملکیت میں ۱۹۵۲ء تک رہی اور خاتمہ
زمینداری ایکٹ کے نفاذ پر ختم ہو گئی۔ سن شعور کو پہنچ کر اس بچہ (سید مردان علی)
نے انتہائی کوشش کی کہ اس کی اولاد امامیہ مذہب پر قائم رہے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

بدایوں میں میر صاحب کے خاندان کے مذہبی خیالات کے متعلق جو غلط
فہمیاں تھیں وہ دراصل اسی آبائی مذہب سے انحراف کا نتیجہ تھیں مگر میر صاحب
کی سنجیدگی اور بزرگی نے ان غلط فہمیوں کو زبان پر آنے سے روکے رکھا۔ پروفیسر
ضیاء احمد لکھتے ہیں:

> "ان کے عقائد پر بعض ناواقف کار لوگ خواہ مخواہ کی بدگمانیاں
> کرتے تھے میں اپنے ذاتی علم وبصیرت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ
> وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔"

میر صاحب کے مورثِ اعلیٰ کے متعلق ایک خیال غلط یا صحیح یہ بھی ہے کہ

انہوں نے ایک دھوبن سے نکاح کر لیا تھا جو اہلِ سادات کی سیادت پہ ایک بدنما
ہے جیسا کہ میر صاحب کے ایک معاصر مزاح گو علی حاتم بدایونی (۱۸۷۵ء-
۱۹۱۱ء) کے اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

سبط احمد کے عقد کی خاطر لوگ ہر ہر تلاش میں نکلے
میر صاحب نہا کے دھوبن کے استری کی تلاش میں نکلے

عالمین بدایونی اس قطعہ کی شانِ نزول یوں رقم کرتے ہیں:

> کبھی در پردہ کبھی منظرِ عام پہ کہنے والے علی حاتم اس صنف کے مانے ہوئے مردِ میداں تھے۔ ان کی شوخیِ تخیل اور تیز رنگ قلم سے شاید ہی بدایوں کی کوئی درخورِ اعتنا ہستی بچی ہو۔ حتیٰ کہ میر محفوظ علی صاحب جیسے ثقہ بزرگ اور معزز ہستی اس کی زد سے نہ بچ سکی۔ بات یہ ہوئی کہ میر صاحب کے ایک دیرینہ دوست اور ساتھی مولوی وزیر احمد ٹونک والا (یہ بدایوں کے پہلے گریجویٹ مسلمان تھے) ان کے پوتے سبط احمد کے لیے رشتہ درکار تھا۔ اس سلسلہ میں میر صاحب نے کچھ سعی فرمائی، علی حاتم کو بہانہ ہاتھ آیا۔ میر صاحب خود رعایت لفظی کے امام تھے لیکن اس بارے میں علی حاتم نے ان کی شان میں جو گستاخی کی اس میں ذو معنویت کا حق ادا کر دیا۔"

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ دھوبن والا معاملہ محض خیالی ہے۔ علی حاتم نے رعایت لفظی کے پیشِ نظر لفظ "دھوبن" استعمال کیا۔ یعنی دھو، بن (دبن) ٹھور کر) لیکن ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۵۹۵ء) سے منسوب ہجو کا یہ شعر دھوبن والے معاملہ کی تائید ہی کرتا ہے۔

سید احمد شہدی از صنف جو دھریاں کہ ہست
نازی دیہہ منونہ اصل دھوبن را سلام

سید احمد کا نام میر صاحب کے شجرہ میں ساتویں واسطے پر موجود ہے۔ سید احمد ان کے بھائی تھے نام کے ساتھ شہدی کا اضافہ شجرہ میں نہیں ہے۔ کیونکہ شجروں میں عام طور سے اصل نام ہی تحریر کیا جاتا ہے۔ منونہ ضلع بریلی کا ایک گاؤں ہے جو بدایوں سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر فاصلے پر آباد ہے اس ہجو (جسے سلام رخصتی بھی کہتے ہیں) کے شروع کے دو اشعار اور دیکھیے۔

اے صبا از من بہ اہلِ بداؤں را سلام دوستانِ صادق و پر کینہ و دشمن را سلام
اہلِ زہد و اہلِ فسق و ہم شریف و ہم وضیع
عہد باشد یا دلِ شاد و حزن را سلام

اس ہجو کو طبقات الاولیا میں درج کیا گیا ہے جو شیخ سعد اللہ نصیر ملتانی کی تالیف ہے اس کا تکملہ ان کے بھائی شیخ کرامت اللہ بصیر نے کیا تھا۔ اس لیے "جامع نصیر بصیر" کے نام سے مشہور ہے۔ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

تجلیات سخن از نظامی بدایونی (نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۳۰ء) میں ضمیمہ کے طور پر ملا عبدالقادر کے حالات مع سلام رخصتی درج ہیں۔ اس میں یہ تمام اشعار مختلف متن کے ساتھ درج ہوئے ہیں۔ دھوبن والے مسئلے سے متعلق جو شعر اوپر درج ہوا ہے وہ اس کتاب میں اس طرح ہے۔

سید احمد شہدی از صنف چودھریاں کہ ہست
نازل شہرِ بدایوں از مہابن را سلام

مصرعہ دوم مؤلف کتاب نے خود لگایا ہے کیونکہ ملا کے عہد میں بدایوں، بداؤں کہلاتا تھا جیسا کہ انھوں نے خود اس سلام کے آغاز میں کہا ہے "اہلِ بداؤں را سلام۔"

یہ سلام یوں تو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے لیکن یہ طبقات الاولیا کے سوا کہیں بھی تحریری طور پر نہیں ملتا۔ لہٰذا پرانے اشخاص کی بیاضوں یا حافظوں میں جو شعر اس سلام کے محفوظ رہ گئے وہ تحریف و تنسیخ کے ساتھ صفحات پر جگہ پاتے رہے۔ لہٰذا "تجلیات سخن" میں بھی یہ کلام اسی طور پر محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ عبارت دیکھیے:

> اس سلام کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک ہزار اشعار تھے لیکن مجھے باوجود کوشش کے ۳۹ اشعار سے زیادہ دستیاب نہ ہو سکے۔ جز احصہ نظامی صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ کچھ اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے۔ کچھ مختلف بیاضوں میں ملے۔ ان سب کو جمع کر کے یہ تعداد پوری ہوگئی۔"

میر صاحب کے والد میر کاظم علی ابتدا میں منصفی سہسوان (بدایوں) میں منصرم رہے۔ بعد ازاں مختلف مقامات پر رہ کر شاہجہانپور سے ۱۸۸۷ء میں پنشن لے کر بدایوں آگئے۔

میر صاحب کی حسبِ رواج چار برس، چار مہینے اور چار دن کی عمر میں رسم بسم اللہ ہوئی۔ بعد ازاں ابتدائی تعلیم مولوی عبدالحق سے ان کے گھر

اور مولانا امتیاز احمد سے فارسی پڑھی۔ گھر کا ماحول خالص
سید تحریک کے اثرات بہت سرعت سے پھیل رہے تھے اور مغربی
اد کو بہرہ ور کرنے کے لیے لوگ قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے
نے بھی ۱۸۸۶ء میں مشن ہائی اسکول بدایوں سے مڈل کا امتحان
میں بریلی اور بغرض تحصیل علم گئے۔ یہاں شوکت علی و محمد علی کا
ء میں انٹرنس پاس کیا، پھر ایف۔ اے۔ کیا۔ ۱۸۹۳ء میں
م کیا۔ ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ ایم۔ او۔ کالج سے بی۔ اے۔ کیا۔
ں و محمد علی سے خاص روابط ہوگئے۔ ان کے ہم جماعتوں میں
ین شیخ عبداللہ، مولوی عبدالحق، ظفر علی خاں، حافظ محمد
ے نام اہم ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔
۔ء میں جسٹس سید محمود کی سفارش پر ریاست خیرپور (سندھ) میں
، کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ کچھ عرصہ جوڈیشنل سکریٹری اور ریونیو
ینت سے بھی کام کیا۔ یہاں وہ اپنی دیانت داری فرض شناسی
ہ سبب، چند ہی سال میں نائب وزیر ہوگئے مگر جلد ہی اس عہدے
ء میں بدایوں آگئے۔ یہاں سے پھر حیدرآباد گئے جہاں کچھ دن
، یہاں مترجم کے فرائض انجام دئے۔
۔آباد میں اس وقت عزیز مرزا (ف ۱۹۱۲ء) ہوم سکریٹری تھے۔
لی خاں ان کے دفتر میں مترجم۔ ظفر علی خاں کی تحریک اور عزیز
ت پر ہی میر صاحب حیدرآباد آئے تھے۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ
یے قمر الدین احمد نے اس طرح نقل کیا ہے۔
حفوظ علی بدایونی کو ہنکنس صاحب کی طرح نکتہ رس نے اپنے
جم بنالیا تھا۔ میر صاحب فرماتے تھے کہ ایک دن میں دفتر میں بیٹھا
دکنی ہنگ دستار و بگلوس (درباری لباس) میں آئے اور مجھ کو
حب کا خاص آدمی سمجھ کر کہنے لگے حضرت! ایک عرضی ہے میں
تر میں تھا۔ لوگوں نے غلط مشورہ دیا یا میری بدقسمتی کہ اس مشورے
یہاں کی ملازمت چھوڑ کر ایک درخواست نظم (رشتہ نظم و جمعیت)
جس میں خزانے کی حفاظت کے واسطے بالعموم عرب بھرتی ہوتے
، نوکری لی نہیں اور یہاں پولس کے دفتر کی بھی جاتی رہی۔
ری دستگیری فرمادیں تو میں روزی سے لگ جاؤں۔"

میر محفوظ علی ایک نو وارد ہندوستانی حیدرآباد کی اس "نظم" کی اصطلاح
سے واقف نہیں تھے۔ سمجھے درخواست گزار ایک بے عمل اور بدعقل شخص
ہے۔ اس لیے شاعرانہ دھن میں نثر کے بجائے نظم میں درخواست لکھی ہے۔
اس کو عہدہ دار متعلقہ نے مہمل سمجھ کر رد کردیا۔ درخواست گزار سے میر صاحب
نے فرمایا۔ "تم نے خود غلطی کی جو نظم میں درخواست دی۔ نثر میں دیتے تو کچھ
مطلب کھلتا اور کام بنتا۔" ہنکنس صاحب بازو کے کمرے میں تھے
ایک بے اختیار قہقہہ کی آواز آئی۔ میر صاحب خالی الذہن سمجھے نامعلوم بیٹھے
بیٹھے صاحب کو کیا خیال آیا جو اندر سے اس زور کا قہقہہ لگایا۔ شام کو ہنکنس
کورٹ پر ہنکنس نے ظفر علی خاں سے کہا۔ آپ کے دوست میر محفوظ علی
صاحب کے نظم و نثر والے اس لطیف فقرے نے مجھے بے اختیار ہنسا دیا
جب ظفر علی خاں نے دوسرے دن میر صاحب سے اس بیان کردہ لطیفہ
کا ذکر کیا تو میر صاحب سمجھے کہ نادانستگی میں فقرا کیا چست ہوگیا تھا۔"
اس واقعہ کو سید ابن علی نے بھی نقل کیا ہے لیکن اس واقعہ میں مسٹر ہنکنس کی جگہ
انھوں نے ماجہ رائے رایاں بہادر کا ذکر کیا ہے۔
۱۹۰۱ء میں میر صاحب کا تقرر "بربرہ" سومالی لینڈ میں بحیثیت جج ہوگیا۔
۱۹۰۵ء میں وہ بمبئی واپس آئے اور ظفر علی خان کی شرکت میں ایک کاروبار شروع
کیا۔ میر صاحب اس کاروبار میں کیوں ملوث ہوئے۔ (سید) ابن علی بدایونی نے اس
پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔
"اوائل ۱۹۰۸ء میں ایک نظم "ورکر نامہ" لکھنے کے سلسلے میں مولوی ظفر
علی خاں صاحب ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے برطرف اور شہر بدر کردیے
گئے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۸ء میں وہ قبلہ گاہی صاحب مرحوم کے پاس صومالی لینڈ
(افریقہ) پہنچ گئے اور دکن ریویو بند ہوگیا۔ دوستی کے تعلقات کا کچھ ایسا اثر
ہوا کہ والد مرحوم نے اولاً چھ ماہ کی رخصت حاصل کی بعد ملازمت کو خیرآباد
کہہ کر حق دوستی کی خاطر اپنے دس ہزار روپے کے سرمایے سے بمبئی میں کاروبار شروع
کردیا۔ کالوا دیوی روڈ بمبئی میں ایم۔ اے۔ "ظفر اینڈ کو" کے نام سے دکان کھولی
گئی۔ ظفر علی خاں صاحب شریک کاروبار تھے لیکن ظفر علی خاں کو دکن ریویو کی
یاد بے چین کیے تھی۔ چنانچہ انھوں نے بمبئی سے اس کا اجرا کیا . . . میری
سات پشت میں کسی نے کاروبار نہیں کیا تھا اور حضرت قبلہ کے جاننے والوں
کو معلوم ہے کہ تجارت تو درکنار وہ اپنے آبائی پیشہ یعنی زمینداری کے کام کو بھی

انجام دیتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کا دفتر زمینداری باقاعدگی، نفاست
کے اعتبار سے کسی سرکاری دفتر سے کم نہ تھا۔ ان کا ذوق تو صرف علمی اور
ادبی تھا اسی میں ان کو بیٹھیں تر وقت گزرتا تھا۔ ایسی حالت میں بمبئی کی تجارت
شر ہوا جو ہونا چاہیے تھا "بشیر اینڈ کو" ختم ہو گئی۔ دس ہزار روپے کا نقصان اٹھانے
حضرت قبلہ بدایوں آ گئے۔"

۱۹۰۹ء میں میر صاحب کی اہلیہ نے وفات پائی۔ اس وقت گو آپ کی عمر
اڑتالیس سال تھی مگر پانچ بچے سید آل علی، سید ابن علی، سید سبط علی اور
صاحبزادیوں کی پرورش کی خاطر میر صاحب نے کبھی عقد ثانی کا ارادہ نہ کیا۔
ان کی شادیاں کیں اور لڑکوں کو ملازمتیں مل گئیں۔

۱۹ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو جب مولانا محمد علی جوہر کامریڈ کا دفتر لے کر کلکتے
سے آئے تو وہ میر صاحب کو بدایوں سے دہلی کھینچ لے گئے۔ میر صاحب نے
آ کر اس کے انتظامات سنبھالے۔ اس سلسلے میں وہ تقریباً دو سال
رہے۔ دہلی سے کامریڈ کا پہلا شمارہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا
اس وقت تک ہمدرد کا اجرا عمل میں نہیں آیا تھا البتہ نقیب ہمدرد کے نام
سے ایک مختصر سا روزنامہ نکلنے لگا۔ نقیب ہمدرد کا پہلا یک ورقہ شمارہ ۲۳ر
فروری ۱۹۱۳ء کو معرض وجود میں آیا یہ عارضی اخبار تھا جس پر جلد کی جگہ
"سلسلہ خاص" لکھا ہوتا تھا۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کو میر صاحب کے مشورہ سے
مکمل اخبار "ہمدرد" (جو پورے آٹھ صفحات پر مشتمل تھا) کا اجرا عمل میں آیا۔
ہمدرد اور کامریڈ دونوں کے ایڈیٹر اور مالک محمد علی تھے۔ میر صاحب ایک مددگار
اور مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے اور ہمدرد میں ملا علی کاتب بودھا
سوئی کے نام سے "تجاہل عامیانہ" (مستقل عنوان) کے تحت فکاہی کالم
لکھتے تھے۔ "تجاہل عامیانہ" کے لکھنے والے کئی ارباب قلم تھے۔ محمد فاروق
دیوانہ گورکھپوری، حاجی بلغ العلیٰ، شیخ ولایت علی بمبوق لیکن ان میں
سرفہرست نام میر صاحب ہی کا آتا ہے۔ محمد محی الدین بدایونی لکھتے ہیں:

"مولانا محمد علی جوہر نے جب ہمدرد کا ڈول ڈالا تو یہ شروع میں
طے ہو گیا تھا کہ اس میں ایک فکاہی کالم بھی ہوگا "تجاہل
عامیانہ" اس کا عنوان تجویز ہوا دراصل یہ سید میر محفوظ علی
بدایونی کی اختراع تھی۔ چنانچہ یہ کالم انھیں کے سپرد کیا گیا۔"

۱۹۱۵ء میں میر صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس غم نے انھیں نڈھال
کر دیا۔ پھر تو وہ ساری زندگی بدایوں ہی میں رہے۔ یہاں ان کو علم و ادب
سے شغل رہا۔ فراغت کے اوقات میں زمینداری کے معاملات کی نگرانی
بھی کرتے رہے۔

۱۹۱۹ء میں شیخ وحید احمد مسعود (وفات ۱۹۷۷ء) نے ان کی سرپرستی
میں رسالہ نقیب کا اجرا کیا نقیب میں میر صاحب نے فرضی ناموں کے
نقاب چہرے پر ڈال کر مضامین لکھے لیکن چونکہ یہ پرچہ مقامی تھا اس
لیے تاڑنے والے تاڑ گئے اور میر صاحب کا حسن تحریر سات پردوں میں
رہ کر بھی بے پردہ ہو گیا۔ آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے:

"میر محفوظ علی کی نقاب پوش شخصیت تو صرف نقیب کے صفحات
میں ہی بے نقاب ہوئی"

نقیب آغاز سے ہی سنجیدہ و مزاح کی آمیزش اپنے اندر رکھتا تھا اور میر صاحب
کی سعی سے اس نے جلد ہی سنجیدہ مزاح میں اپنا مقام بنا لیا۔
۱۹۲۸ء کے بعد میر صاحب کی مضمون نگاری تقریباً بند ہو گئی۔
فروری ۱۹۳۳ء میں حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اس وقت آپ کے
دو بیٹے اور دو بیٹیاں صاحب اولاد تھیں۔ حج سے واپسی کے بعد ان کی
زندگی خالص دینی بن گئی۔ کام کاج سے کوئی رخصت نہ تھی۔ اوراد و وظائف
تلاوت قرآن اور نماز وغیرہ ہی ان کے شب و روز کے معمولات و مشاغل
بن گئے۔ درس قرآن کا سلسلہ بھی انھیں ایام میں قائم ہوا اور یہ تقریباً
دس سال تک جاری رہا۔
۱۹۳۳ء کے اواخر یا ۱۹۳۵ء کے اوائل میں میر صاحب نے ایک اسلامیہ
پرائمری اسکول اپنے محلہ سید باڑہ (بدایوں) میں قائم کیا۔ اس کے جملہ
اخراجات میر صاحب خود برداشت کرتے تھے۔ یہ اسکول صبح و شام
دونوں وقت چلتا تھا، یعنی صبح کے وقت بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی
اور شام کو تعلیم بالغاں کے کلاس لگتے تھے جس کی فیس لی جاتی تھی
مینجنگ کمیٹی میں مولوی محمد سلیمان، چودھری محمد یحییٰ (وکیل) اور فضل علی
وغیرہ شامل تھے۔ اسکول میں چار مدرس تھے۔ ماسٹر اشتیاق حسین
ماسٹر الطاف حسین، حفیظ الدین صدیقی اور ماسٹر ضیاء الدین، یہ اسکول
۱۹۴۰ء میں ختم ہو گیا۔
انتقال سے دو سال قبل اپنے صاحبزادے سید ابن علی کے

پاس حیدرآباد تشریف لے گئے، جہاں ڈیڑھ سال قیام کیا اور پھر بدایوں آ گئے
یہاں ان پر پے درپے فالج کے تین حملے ہوئے۔ تیسرے حملے کے بعد سرسامی
کیفیت پیدا ہو گئی اور بے ہوش ہو گئے۔ تقریباً ایک ہفتہ تک یہی حالت
رہی۔ آخر ۲۰/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ مولوی
ظفر الملک نے غسل دیا اور مفتی محمد ابراہیم فریدی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اپنے
خاندانی قبرستان واقع درگاہ سید احمد میں دفن ہوئے۔

میر صاحب کے سیاسی نظریہ پر اب تک کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔
دراصل میر صاحب سیاسی آدمی نہ تھے تاہم ان کا میلان طبع کسی حد تک
کانگریس کی طرف تھا شاید اس لیے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا
محمد علی و شوکت علی وغیرہ کے رفیق اور شریک کار تھے لیکن مسلم لیگ کے
وجود میں آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ملی مفاد کے پیش نظر
مذبذب ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ضلعی صوبائی الیکشن ہوئے۔ ان میں بدایوں سے
کوئی مسلمان لیگ کے مقابلہ میں انتخاب لڑنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ خان بہادر
مولوی فصیح الدین کے بیٹے مسٹر اقتدار الدین (ایم۔ آئی۔ جی) مسلم لیگ کے
ٹکٹ پر کھڑے ہوئے اور میر صاحب کے دیرینہ دوست مولوی محمد سلیمان کانگریس
کے ٹکٹ پر۔ فضا کانگریس کے خلاف تھی کیونکہ مسلمان کا کانگریس پر سے اعتماد اٹھ
چکا تھا اور مسلم لیگ کی کامیابی ہی میں انھیں اپنا مفاد نظر آتا تھا اس لیے وہ
مسلم لیگ کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ میر صاحب کو بھی مسلم لیگ ہی مسلمانوں
کے مفاد کی محافظ اور ان کی تنہا اور واحد نمائندہ جماعت نظر آئی اس لیے وہ
مسلم لیگ کے حامی بن کر انتخابی میدان میں کود پڑے۔ نتیجہ کانگریس کی شکست
اور مسلم لیگ کی کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ واقعہ میر صاحب کے ملی
مفاد سے خلوص کا مظہر ہے کیونکہ انھوں ملی مفاد کے سامنے مولوی سلیمان
سے اپنی دوستی کی بھی پروا نہ کی اور مولوی سلیمان ان سے کچھ عرصہ کبیدہ
خاطر رہے۔ آخر خود آ کر اپنے خلوص کی بنا پر ان سے صلح کر لی۔ میر صاحب
کے خاص احباب میں وہ اہم مقام رکھتے تھے[۱۸]

ڈاکٹر محمد ایوب قادری (ف ۱۹۸۳) کو مولوی محمد سلیمان کی خدمت
میں نیاز حاصل تھا۔ مختلف اوقات میں وہ جو گفتگو فرماتے تھے۔ قادری مرحوم
اسے قلم بند کر لیتے تھے۔ اس گفتگو میں میر صاحب سے متعلق بعض کارآمد
باتیں بھی آ گئی ہیں، جنھیں یہاں درج کیا جاتا ہے[۱۹]

(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مرتبہ مولانا محمد علی کے متعلق کہا:

معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس مطابق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

میر محفوظ علی بدایونی نے فوراً کہا:

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(۲)

میر محفوظ علی کے دو مسودے ضائع ہونے کا بڑا افسوس ہے۔ میر
صاحب نے ایک مفصل اور جامع مضمون لکھا جس میں عجمیوں کی سرگرمیوں
کا جائزہ تھا جو انھوں نے مسلم حکومتوں کو مٹانے کے لیے کی تھیں۔ قرامطہ
اور باطنیوں کی سرگرمیوں پر اچھوتا مواد تھا۔ تان میر جعفر اور میر صادق کے
کردار پر ٹوٹی تھی۔ یہ بہت مدلل تاریخی اور تحقیقی مضمون تھا۔ میں نے خود دیکھا
اور پڑھا۔ روہیلکھنڈ میں حافظ رحمت خاں کی بربادی اور شجاع الدولہ کی
سرگرمیوں کا حصہ بڑا جاندار تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد علی نے ہمدرد کے
انتظام و انصرام کے لیے میر صاحب کو دہلی بلایا۔ مولانا نے جب وہ مضمون
دیکھا تو میر صاحب کی تحقیق کی داد دی مگر پھاڑ کر پھینک دیا کہ ان جھگڑوں
کو چھوڑو۔

اس طرح علامہ شبلی کی کتاب "شعرالعجم" پر میر محفوظ علی بدایونی نے
بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ایما پر جامع تنقید لکھی تھی۔ جب مولانا ظفر علی
خاں کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کا ذکر مولانا شبلی سے کر دیا۔ مولانا شبلی نے
میر محفوظ علی سے وہ مضمون مانگا۔ میر صاحب نے پیش کر دیا۔ علامہ شبلی نے
مضمون پڑھا اور کہا شعرالعجم پر تنقید کی ضرورت نہیں ہے اور غالباً واپس
نہیں کیا۔ یہ تنقید خاص طور سے فردوسی والے حصہ پر تھی

(۳)

مولانا محمد علی کو بدایوں کے دو حضرات مولانا عبدالماجد بدایونی اور
میر محفوظ علی صاحب سے بڑا تعلق خاطر تھا اور ان دونوں حضرات نے بھی حق
رفاقت خوب ادا کیا ..... میر محفوظ علی تو ان کے اسکول کالج کے ساتھی تھے
بریلی میں ساتھ رہے۔ علی گڑھ میں ساتھ رہے۔ مولانا محمد علی میر صاحب سے

تر معاملات میں مشورہ لیتے تھے۔ بعض سیاسی معاملات میں بھی میر صاحب کی
رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ کبھی یہ معاملات خط و کتابت سے طے ہوتے تھے
اور کبھی کسی آدمی کے ذریعہ۔ کبھی کبھی میر صاحب کو دہلی جانا پڑتا تھا۔ میر صاحب
بڑی اصابت رائے کے مالک تھے۔[۲۱]

(۴)

ترک موالات کا زمانہ تھا۔ موافق اور مخالف فتوؤں کی گرم بازاری
تھی۔ ایک موقع پر مولانا محمد علی، میر محفوظ علی سے مصروف گفتگو تھے۔۔۔۔ موضوع
گفتگو فتوے تھے۔ مولانا محمد علی بار بار "تھانیدار صاحب"۔۔۔ "تھانیدار صاحب"
کہہ کر کسی کا ذکر کر رہے تھے۔ بھرپور طنز کے ساتھ اس میں احترام بھی
تھا۔ میں نے چپکے سے مولانا عبدالماجد سے پوچھا یہ تھانیدار صاحب کون ہیں؟
انھوں نے بتایا۔ آپ کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔[۲۲]

(۵)

جب میر محفوظ علی بریلی میں پڑھنے کے لیے گئے تو وہ شروع میں نواب
عزیز میاں کے ایک مکان (گلی نوابان) میں رہتے تھے۔ اس مکان میں بجائے
پر کئی صندوق رکھے رہتے تھے۔ جن میں کتابیں بھری پڑی تھیں میر محفوظ علی کا
بیان ہے کہ بہت سی کتابیں ہم لوگ لے آئے۔ اسی ذخیرہ کا گلستانِ رحمت
کا (قلمی) نسخہ میر صاحب سے مجھے (محمد سلیمان بدایونی) ملا۔ میر صاحب کہتے تھے
کہ پھر ہم بورڈنگ میں رہنے لگے۔ محمد علی کا کمرہ میرے کمرے سے دوسرا یا تیسرا تھا۔[۲۳]

میر صاحب قدیم شعراء میں ذوق کو بہت پسند کرتے تھے اور اپنے
معاصرین میں فانی کے مداح تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ مولوی
امیر احمد ٹونک والا کے یہاں ایک شعری نشست کی صدارت بھی کی تھی۔

میر صاحب کی دعوت، دعوت شیراز تھی۔ ان کے یہاں ذی مرتبہ
احباب آتے تو وہ اس موقع پر اپنے مخصوص شاگردوں اور دیگر قریبی
احباب کو مدعو کر لیتے اور نہایت خلوص و محبت سے ان سب کی تواضع کرتے۔

میر صاحب کی محفلیں بڑی سادہ ہوتی تھیں۔ عموماً بے مقصد گفتگو سے
پرہیز کیا جاتا تھا۔ سنجیدہ ظرافت البتہ اہم درجہ رکھتی تھی۔ میر صاحب نے
رنگا رنگ مزاج پایا تھا۔ وہ علماء میں بڑے عالم اور شیوخ میں شیخ طریقت
نظر آتے۔ عابد و زاہد تو تھے ہی مگر جوانوں میں جوان اور بچوں میں معصوم
بچہ بن جاتے۔ وہ اکثر محفلوں میں ایسے پر لطف قصے بیان کرتے کہ بچے بوڑھے
جوان ان سے اپنے اپنے مزاج کے مطابق لطف اندوز ہوتے۔ وہ بیک وقت
سب سے تعلق رکھتے تھے میر صاحب کا ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ جو کتابیں
ان کے پاس ان کے احباب بغرض تبصرہ بھیجتے، ان کو اوّل وہ خود پڑھتے
پھر اسے اپنے حلقۂ احباب میں مطالعہ کے لیے باری باری تقسیم کرتے اور اپنے
اطمینانِ قلب کے لیے ان سے سوالات کر کے یہ دیکھتے کہ آیا انھوں نے کتاب
پڑھی یا نہیں۔

میر صاحب شہرت و ناموری سے قطعی بے نیاز تھے۔ رشید احمد
صدیقی لکھتے ہیں:[۲۴]

"ان کی یہ صفت سب سے اونچی تھی کہ انھوں نے اس زمانے
میں بھی شہرت نہ چاہی جب شہرت بڑی مشکل سے حاصل
ہوتی تھی لیکن وہ بڑی آسانی سے مشہور ہو سکتے تھے۔"

نام و نمود سے اس فطری بے نیازی ہی نے فرضی ناموں سے لکھنے
پر مجبور کیا۔ ان کے قلمی نام ایک دو نہیں بلکہ متعدد تھے۔ ایک سے جب مشہور
ہو جاتے تو دوسرا اختیار کر لیتے مگر ع

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

چنانچہ ہمیشہ اپنی بلندیٔ قامت سے پہچانے گئے۔ انھوں نے مختلف ادبی
رسائل کے لیے لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر لکھا ہے لیکن نام کے
اخفاء کے سبب بہت سی تحریریں ابھی پردۂ خفا میں رہیں۔ کچھ کا تو علم ہو گیا
مگر ابھی کتنی ہی اور ہوں گی جو ان کے مختلف ناموں کی بھول بھلیّوں میں پھنسی
ہوئی ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ان کے فرضی ناموں میں بھی رعایت لفظی
کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کا مندرجہ ذیل ناموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) ملائے سومالی، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سومالی لینڈ میں قجی کے عہدے پر
فائز رہے۔ اس نام سے انھوں نے "دکن ریویو" میں مضامین لکھے۔

(۲) ملا علی کاتب بودھاموئی، اس نام سے وہ ہمدرد میں "تجاہل عارفانہ"
کا فکاہی کالم لکھتے تھے۔ مشہور حنفی عالم ملا علی قاری کے نام کی مناسبت
سے ملا علی کاتب نام اختیار کیا۔ بودھاموئی سے مراد بدایونی ہے۔
بدایوں کا قدیم نام بودھا موئی تھا۔

(۳) ملا علی آق سقال، آق سقال ترکی میں ریش سفید کو کہتے ہیں اور مراد
اس سے مرد بزرگ و محترم ہے۔ میر صاحب کی داڑھی بڑی خوشنما تھی۔

اہل محلہ چھٹی داڑھی والے ملا علی کہتے تھے۔ اسی رعایت سے یہ نام رکھا۔ اس نام سے انھوں نے نقیب (بدایوں) میں مضامین لکھے۔

سمعب ۔ یہ ان کے نام کا مخفف ہے یعنی س: سید، م محفوظ، ع علی، ب، بدایونی

مصئون العلی، مصئون معنی محفوظ، مصئون العلیٰ: محفوظ علی۔

شمع بے نور: نور بروزن قول معنی پھول۔ مراد شمع کے تین نقطے جو پھول کے ہمشکل ہوتے ہیں۔ شمع سے نقطے ہٹا دیجیے تو سمع رہ جاتا ہے جو ان کے نام سید محفوظ علی کے تینوں الفاظ کے پہلے حروف کا مرکب ہے۔ اس نام سے علی گڑھ میگزین اور الناظر لکھنؤ میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔

نقاش۔ ابن علی بدایونی لکھتے ہیں[۲۵]: "جاننے والے جانتے ہیں کہ قبلہ و کعبہ مولوی سید محفوظ علی صاحب نے اپنے نام سے لکھنے کے بجائے اکثر فرضی ناموں سے مضامین لکھے چنانچہ دکن ریویو میں بھی کئی مضامین اپنے نام سے اور بیشتر مضامین "نقاش" اور دوسرے ناموں سے لکھتے رہے۔

، جناب خاموش: اس نام سے ایک مضمون رسالہ نقیب اپریل ۱۹۲۲ء میں لکھا۔

کبھی کبھی اپنے ناموں کے ساتھ یہ رعایتیں بھی ایزاد کر دیتے تھے۔

بنۃ السادات: (سید باڑہ کا معرب ہے۔ اس محلہ میں میر صاحب کی رہائش تھی) بودھامئو (مراد بدایوں۔ بدایوں کا قدیم نام ہے)

بنۃ الاولیاء (بدایوں کا لقب ہے)

میر صاحب نے اپنے اصل نام (سید محفوظ علی۔ بی۔ اے) سے بھی چند مضمون لکھے مثلاً

محمد علی کی یادیں ـــــ ہفتہ وار "سچ" لکھنؤ ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء

محمد علی بچپن اور شباب ـــ " " ۱۱ ستمبر ۱۹۳۱ء

محمد علی بچپن اور شباب (دوسری قسط) " ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء

اس طرح بیگم صفدر کی کتاب "عورتوں کی انشاء" پر انھوں نے اصل نام سے ہی تبصرہ لکھا جو مذکورہ کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کا ٹائٹل پھٹ جانے کے سبب یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب اور کہاں سے شائع ہوئی تاہم قیاس یہی ہے کہ اسے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا کیونکہ کتاب کے اندرونی صفحات پر ایک جگہ اس ایجنسی کا نام درج ہے۔ یہ تبصرہ میر صاحب کی اب تک دریافت شدہ تحریروں میں ایک اضافہ ہے۔ میر صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں مختلف لوگوں کی ترتیب سے شائع ہوئیں۔

۱۔ خطاب: از ملا بودھامئو۔ ایک رسالہ کی صورت میں ترک موالات کے زمانہ میں شائع ہوا جس میں تحقیق و تلاش سے انگریزی خطابات کی اہمیت و نوعیت اور اس کی ابتدائی تاریخ کو درج کر کے اس امر کو نمایاں کیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو ان خطابات کا قبول کرنا اور لوازم خطابات کو اپنے عمل میں لانا شدید گناہ ہے۔ جتنے انگریزی خطابات ہیں وہ سب فروغ عیسائیت کے لیے ہیں لہذا خلاف مذہب ہیں۔ دیباچہ ظفر الملک علوی کے قلم سے الناظر بک ایجنسی نے شائع کیا۔

۲۔ انتخاب نقیب: میر صاحب کے تین مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کے عنوانات یہ ہیں: (۱) شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں (۲) بلبلان اسیر کی رہائی۔ (۳) مسٹر صاحب دین۔ یہ مضامین نقیب (بدایوں) میں ملا بودھامئو کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ انتخاب رسالہ نقیب کے بند ہو جانے کے بعد مدیر نقیب شیخ وحید احمد کی اجازت سے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔ سنہ اشاعت درج نہیں شروع میں "گذارش" کے عنوان سے ظفر الملک علوی نے دو صفحات تحریر کیے ہیں۔

۳۔ مضامین میر محفوظ علی، مرتبہ مولوی عبد الحق۔
اس مجموعہ میں میر صاحب کے ۱۹ مضامین شامل ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس مجموعہ کو شائع کیا تھا۔

۴۔ طنزیات و مقالات: مؤلف محمد محی الدین بدایونی۔ بی۔ اے ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۷ء اس کتاب میں میر صاحب کے ۴۴ مضامین شامل ہیں۔ میر صاحب کی سوانح پر سید ابن علی کا مقالہ، مقدمہ کے طور پر پروفیسر ضیاء احمد کا مضمون "ذکر میر" اور "حرفے چند" جمیل الدین عالی اور "حرف آغاز" مولف کے قلم سے۔ "حدیث دیگراں" کے عنوان سے حسب موضوع اردو

ندین کی تحریروں کے اقتباسات (جو میر صاحب کی شخصیت
ہیں) ہر مضمون کے شروع میں دیے گئے ہیں۔ مضامین کی
ن کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

بہ مسعود علی نقوی (نبیرۂ میر صاحب)

ذکرہ خاندان میر محفوظ علی۔ شائع کردہ۔ ا۔ دارالامان ہاؤسنگ
ی کراچی۔

حواشی

ۓ احمد (ف ۱۹۷۱ء) کا مقالہ میر صاحب نے خود سنا تھا اور جابجا
اضافے بھی کرائے تھے۔ سبطین احمد میر صاحب کے ایک دوست
امر کی حیثیت رکھتے تھے۔

حب کے مضامین کا مجموعہ۔ مرتبہ محمد محی الدین۔ انجمن ترقی اردو
ن ۱۹۷۴ء۔

ن ماہنامہ "سنگم" کانپور (ستمبر ۱۹۴۸ء) میں شائع ہو چکا تھا جسے
"طنزیات ومقالات" نے مقدمہ کی جگہ شامل کتاب کیا۔ مؤلف
پنے قارئین کو یہ باور کرانے کی سعی بھی کی کہ یہ مضمون بطور خاص
مذکورہ کتاب ہی کے لیے پہلی مرتبہ لکھا گیا ہے۔ تحقیق میں اس
ی غلط بیانی بعض اوقات مغالطوں اور غلط فہمیوں کا باعث بن
رتی ہے۔

مردان علی کے چار فرزند ہوئے۔ سب سے چھوٹے میر کاظم علی
جو میر صاحب کے والد بزرگوار تھے۔

سنگم کانپور: ستمبر ۱۹۴۸ء

ت ومقالات ص۔ ۷۰ - ۷۱

ناب کا خطی نسخہ آل احمد آوج بدایونی (مقیم کراچی) کے پاس
ہے۔ یہ نسخہ جناب محمد طیب بخش (ساکن محلہ سوتھہ بدایوں) کے
دہیں رہا ہے۔ انھوں نے اس خطی نسخہ سے ملّا کا سلام ورخصتی نقل
اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ یہ نقل آج بھی ان کے ذاتی کتب خانہ
فوظ ہے۔ راقم الحروف کے پیش نظر یہی نقل رہی ہے۔

ات سخن از نظامی بدایونی، نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۰ء (ضمیمہ) ص ۵۷

۹ یہ مولوی عبدالباقی چشتی مصنف "باقیات الصالحات" کے فرزند
تھے۔ طلبا کو درس دیتے تھے خاص طور پر شاہنامہ، سکندر نامہ
اور گل کشتی کا۔ آخر عمر میں بصارت میں فرق آگیا تھا مگر شغل درس
میں فرق نہیں آیا (ذوالقرنین، بدایوں نمبر ۱۹۵۶ء ص ۹)

۱۰ یہ بھی شہر بدایوں کے اچھے مدرس تھے۔ سر پر گنج تھا۔ لہٰذا طلبا
"گنج مشتو" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مجذوبانہ زندگی بسر کی
بدایوں کے نامور ادبا و شعرا نے ان سے فارسی کی تحصیل کی۔
طالب علم کی استطاعت کے مطابق اس پر توجہ دیتے تھے۔ علی حاتم
کا ایک قطعہ ان کے متعلق بھی ہے جس کا ایک شعر حافظہ میں رہ گیا ہے۔

گنج مشتو سے پائی تھی تعلیم
اس لیے تیسرا کلاس ملا

(بہ روایت مظہر عباسی مرحوم)

۱۱ مولوی امتیاز احمد تاثیر ولد مولوی احسان اللہ وکیل، عربی وفارسی
کے فاضل تھے۔ میر صاحب کی تحریک پر ریاست خیرپور (سندھ) میں
مفتی مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ ان کی مرتبہ شرح "گل
کشتی" یادگار ہے جو مطبع نسیم سحر بدایوں سے شائع ہوئی۔ (العلم
کراچی۔ جنوری ۱۹۵۷ء شذرہ)

۱۲ ہینکنس۔ انسپکٹر جنرل پولس۔ ایک یورپین عہدیدار تھے۔ اردو
زبان پر کامل قدرت تھی۔ مطالعہ بھی وسیع تھا۔ تمکین کاظمی نے ان
کی بابت لکھا ہے:

اردو فارسی اچھی طرح جانتے لکھتے پڑھتے اور بولتے تھے
مقامی زبانوں سے بھی واقف تھے اور ادب سے بھی لگاؤ تھا۔
اس لیے انھوں نے ...د علی کو اپنی پیشی میں رکھا اور
خوب آؤ بھگت کرنے لگے۔ (نقوش لاہور اگست ۱۹۶۱ء)

قمرالدین احمد بدایونی نے بھی محفل عزیز (حیدرآباد ۱۹۶۲ء) میں ان کی
اردو شناسی سے متعلق دو واقعات تحریر کیے ہیں۔

۱۳ محفل عزیز۔ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۶۲ء ص: ۱۵۶

۱۴ طنزیات ومقالات ص: ۳۳

۱۵ کچھ دکن ریویو کے بارے میں مشمولہ ہماری زبان علی گڑھ یکم اگست ۱۹۶۳ء۔

۱۶ؔ مسٹر واکر ریونیو سکریٹری تھے۔ ان کی ہجو ظفر علی خاں نے "واکر نامہ" کے عنوان سے لکھی جس کی پاداش میں حیدر آباد سے شہر بدر کر دیے گئے' لیکن کچھ عرصہ بعد مولوی عزیز مرزا کی کوشش سے یہ عتاب دور ہوا اور وہ بمبئی کی تجارت پر خاک ڈال کر پھر حیدر آباد چلے گئے۔ محی الدین لکھتے ہیں ــــــ

"مولانا ظفر الملک نے ایک تصنیف "کتاب الاشرار" کے نام سے شائع کی جس کے پہلے باب میں سید محفوظ علی اور مولانا ظفر علی خاں کے تجارتی اشتراک اور پھر ظفر علی خاں کا سید محفوظ علی کو چھوڑ دینے کا تذکرہ تھا۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں جب مولانا محمد علی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا ظفر علی خاں میں ایک ادبی اور سیاسی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ "کتاب الاشرار" کے اس باب کو ایک مختصر اور اضافی تمہید کے ساتھ "پولٹیکل گرگٹ" کے عنوان سے مولوی عبدالحق کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق ہاپوڑی نے شائع کر دیا۔ اس کا دیباچہ ـــــ خواجہ حسن نظامی نے "غلام نظام الدین نظامی پریمی" کے فرضی نام سے لکھا تھا جس کا راز مولانا محمد علی جوہر نے دلائل کے ساتھ فاش کیا تھا۔

(طنزیات و مقالات حاشیہ ص ۳۶)

۱۷ؔ مولانا محمد علی جوہر، ایک صحافی۔ مشمولہ "برگ گل"، مجلہ وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی ۱۹۸۰ء ص ۱۰

۱۸ؔ کاروان رفتہ از ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ مکتبہ اسلوب کراچی ص؛ ۹۶

۱۹ؔ باتیں ان کی یاد رہیں گی۔ مشمولہ "برگ گل" (جوہر نمبر ۱۹۸۰ء ص؛ ۲۱۵

۲۰ؔ ایضاً ص : ۲۱۷

۲۱ؔ ایضاً ص؛ ۲۱۸

۲۲ؔ ایضاً ص؛ ۲۱۹

۲۳ؔ ایضاً ص؛ ۲۱۹

۲۴ؔ طنزیات و مقالات ص؛ ۱۹

۲۵ؔ کچھ دکن ریڈیو کے بارے میں۔ ہماری زبان علی گڑھ، یکم اگست ۱۹۶۲ء۔ مطبوعہ ماہنامہ جامعہ دہلی اکتوبر ۱۹۸۲ء

"ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات
میں منصف ہو، بات کا پکا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، صاحبِ استقلال ہو
اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے" اس تعریف
میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھا دی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسید کے حق
میں جامع و مانع ہو گی۔ جو اختیار کہ یہ شخص اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر
شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں
ہوتا۔ جس قدر اس کے دوست اور ملنے والے تھے سب اس کے مداح اور
ثناخواں تھے، سب اس سے محبت رکھتے تھے، سب کو اس پر اعتبار تھا اور
سب کو اس کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا ہی شاق گذرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں
کو اپنے مربّی اور سرپرست کا مر جانا شاق گذرتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص
کے حسنِ اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اس کی اخلاقی
عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اس کو اپنے مقاصد میں ہوئی۔ کیونکہ
لیاقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں جب تک ان کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاق
نہ ہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔"

حالیؔ

مُقتدیٰ خاں شروانی

مالک رام

پڑھے لکھے حضرات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کی اردو مطبوعات
یل زمانہ سے یہ چھپا ہوا پڑھتے آئے ہوں گے: باہتمام محمد مقتدیٰ خاں
ِانی. افسوس ان مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی کا ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ء
اگڑھ میں انتقال ہو گیا. انہوں نے اس مطبع سے اور بعد کو اپنے ذاتی مطبع
ِانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے ذریعے سے اردو کی طویل خدمت
وہ خود بھی مصنف اور مؤلف تھے. اگرچہ انہیں اس سے کوئی شہرت
ل نہیں ہوئی. ہم ان کے حالات قلمبند کرکے جہاں ایک طرف ان کی
ات کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں وہیں،

نام نیک رفتگان ضائع مکن.

مصداق سمجھتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اس قابل ہیں کہ ہمارے نوجوان
کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں.

ہندوستان کے مشہور شروانی پٹھان خاندان کی ایک شاخ بلونہ
ع علی گڑھ) میں مقیم ہے، ان کے مورث اعلیٰ یوسف ساکن راجموئے تھے. اس
دان کے اکثر افراد بلونہ سے نقل مکان کرکے دوسری جگہوں میں جا کر بس
. یوسف خاں کی ساتویں پشت میں رشید خاں (بن دلیل خاں) تھے،
لونہ ہی میں رہے. خدا نے ان کی اولاد میں بہت برکت دی. درحقیقت
ا بلونہ کا خاندان شروانی انہیں کے اخلاف پر مشتمل ہے.

انہیں رشید خاں کی چوتھی پشت میں محمد مستجاب اللہ خاں تھے.
یں باپ سے جو کچھ ترکے میں ملا انہوں نے اس میں اپنی سلیقہ مندی سے
افہ کیا اور نیل سازی کی کوٹھی بھی قائم کی. نواحی علاقوں میں ان کے معاملا
داد و دہش کی شہرت تھی. اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور اپنے نام کی مناسبت سے
مقبول تخلص کرتے تھے. داغ سے اصلاح لیتے تھے. "پیام یار" کی پرانی جلدوں
میں ان کا کلام ملتا ہے. کچھ نثری مضمون بھی "ریاض الاخبار" میں شائع ہوئے
تھے. ملکی سیاست سے بھی دلچسپی تھی، کانگریس کے رکن تھے. ان کی دوربینی کا
ثبوت یہ ہے کہ آج سے ستر برس پہلے ۱۹۱۰ میں انہوں نے ایک ہندو پنڈت
کو ملازم رکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی (امۃ الغنی) کو ہندی پڑھائی. ۱۹۱۷ میں
رحلت کی. انہیں محمد مستجاب اللہ خاں کے اکلوتے بیٹے محمد مقتدیٰ خاں
شروانی مرحوم تھے.

محمد مقتدیٰ خاں شروانی ربیع الاول ۱۲۹۷ (فروری/مارچ ۱۸۸۰)
میں پیدا ہوئے. محمد مقتدیٰ خاں ان کا تاریخی نام ہے جس سے (۱۲۹۷) برآمد
ہوتے ہیں، فارسی، عربی کی تعلیم نجی طور پر ہوئی. باقاعدہ انگریزی تعلیم
ڈھولنہ (ضلع علی گڑھ) کے اسکول سے شروع ہو کر ۱۸۹۹ء میں ایم اے او.
اسکول علی گڑھ تک پائی یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ پنڈت اندر من
مرادآبادی علی گڑھ اسکول میں ان کے ہم جماعت تھے. وہ ان سے عربی
اور یہ ان سے سنسکرت پڑھتے تھے. میرے خیال میں نہ انہیں عربی آئی
نہ انہیں سنسکرت،

شروانی صاحب کو نہ خاندانی جائداد کی دیکھ بھال سے کوئی دلچسپی
تھی، نہ زمینداری اور کاشتکاری سے، وہ شروع سے اخبار بینی کے
رسیا تھے. اسی سے مضمون نویسی کا چسکا پڑا. یہی شوق انہیں لاہور لے گیا
اور وہ ۱۹۰۲ء میں جب ان کی عمر بمشکل ۲۲، ۲۳ برس کی تھی، منشی محبوب عالم

کے روزانہ "پیسہ اخبار" کے ادارہ تحریر سے منسلک ہو گئے۔ اس اخبار کے علاوہ
لاہور کے کئی دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے مضمون چھپتے رہے
اس سے نہ صرف لکھنے کی مشق حاصل ہوئی، بلکہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد پیدا
ہوا، اور بہت حد تک ان کی صلاحیتوں کا رجحان اور مستقبل کا پروگرام
بھی طے ہو گیا۔

۱۹۰۹ء کے آخری مہینوں میں وہ لاہور سے علی گڑھ واپس آ گئے
یہ وقار الملک (ف جنوری ۱۹۱۷ء) کی سکتری کا زمانہ تھا۔ مولوی وحیدالدین
سلیم پانی پتی (ف جولائی ۱۹۲۸ء) نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے چھٹی لے
لی تھی۔ اس پر مقتدی خاں قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ دو سال بعد یعنی
۱۹۱۱ء میں وہ مشہور خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس کی ملازمت
اختیار کر کے اس کے مقامی نامہ نگار بن گئے۔ اس عہدے پر وہ چودہ برس
کی طویل مدت (یعنی ۱۹۲۵ء تک) رہے۔

۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اب اس کا
پریس (جہاں گزٹ چھپتا تھا) مسلم یونیورسٹی پریس کہلایا۔ محمد مقتدی خاں
شروانی اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اب تک اس میں صرف لوہے کے چھاپے کا انتظام تھا
شروانی صاحب نے اس میں پتھر کے چھاپے کا اضافہ کیا۔

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (ف جون ۱۹۲۶ء)
نے کلیات امیر خسرو کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی داغ بیل ڈالی تھی
اس سلسلے کی سرپرستی حضور نظام دکن میر عثمان علی خاں (ف فروری ۱۹۶۷ء)
نے قبول فرمائی تھی۔ اس مجموعے کی مختلف کتابیں ترتیب و تدوین کے لیے
متعدد اصحاب علم میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ خمسہ خسروی کی پہلی مثنوی مطلع
الانوار کی تصحیح محمد مقتدی خاں شروانی ہی نے کی تھی۔ افسوس کہ یہ کام پایۂ
تکمیل کو نہ پہنچا اور صرف آٹھ جلدیں چھپ سکیں۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا
تو علم و ادب کی بہترین خدمت ہوتی وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْم۔

یہاں غالباً ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔

یہ کتابیں بہت اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ بہترین کتابت، چکنا قیمتی
کاغذ اور چھپائی مسلم یونیورسٹی پریس کی جس کے کرتا دھرتا شروانی صاحب
خود تھے۔ سارا کام خود ان کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اور نتیجہ اتنا شاندار رہا کہ
جس نے بھی یہ مجموعہ دیکھا عش عش کر اٹھا۔ نواب عماد الملک مرحوم قدردانِ
علم و فن تھے۔ یہ منصوبہ بنا ہی ان کی تجویز پر تھا اور انہیں کی سفارش پر نظام
دکن نے اس کی سرپرستی منظور فرمائی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں کتابیں چھپ کر آئیں
تو انہوں نے حضور نظام کی طرف سے شروانی صاحب کو نظام، عماد، خسرو
تمغہ دلوایا۔

طباعت میں مہارت کے باعث انہیں تین اور تمغے بھی ملے تھے: اول
سلیمان اشرف المبین تمغہ (۱۹۲۹ء) پروفیسر مولانا سلیمان اشرف نے اپنی
کتاب المبین کی حسن و خوبی طباعت پر دیا۔ دوم، سرور جنگ کارنامہ تمغہ
(۱۹۳۳ء) نواب سرور الملک بہادر استاد نواب محبوب علی خاں نظام دکن
نے اپنی سوانح عمری کارنامۂ سروری لکھی تھی۔ یہ کتاب شروانی صاحب کی
نگرانی میں بڑی آب و تاب سے چھپی۔ اس پر مصنف کے صاحبزادے نواب
ذوالقدر جنگ نے یہ تمغہ دیا۔ سوم، مزمل، سلیمان، بشریٰ تمغہ (۱۹۳۸ء)
مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (ف ۱۹۰۳ء) اپنے عہد کے یگانہ عالم تھے۔
سرسید کے بھی ان سے گہرے تعلقات تھے انہوں نے چالیس کی تحقیق اور
تجسس کے بعد ایک کتاب بشریٰ تصنیف کی جس میں تورات اور عہد نامہ
قدیم سے صداقت رسول صلعم و السلام ثابت کی گئی تھی۔ سر شاہ محمد سلیمان کی
جو ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، دلی خواہش تھی
کہ کتاب چھپ جائے۔ چونکہ اس میں عبرانی کے بہت سے اقتباسات تھے
اس لیے کتاب کا ہندوستان میں چھپنا بہت دشوار تھا، لیکن شروانی
صاحب نے یہ مہم سر کر لی اور کتاب طبع کر دی۔ اسی پر نواب مزمل اللہ خاں
نے یہ تمغہ دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ ایم اے او کالج کی پچاس سالہ جوبلی منائی
ہوئی اس موقع پر اردو کانفرنس اور مسلم پریس کانفرنس بھی منعقد کی
گئی تھیں۔ پہلی کے صدر نواب صدر یار جنگ مرحوم (ف اگست ۱۹۵۰ء)
دوسری کے مولوی بشیر الدین مدیر البشیر اٹاوہ (ف جون ۱۹۵۶ء) ان
دونوں کانفرنسوں کی استقبالیہ مجلسوں کے صدر محمد مقتدی خاں شروانی تھے

۱۹۳۶ء میں کسی وجہ سے یونیورسٹی نے اپنا پریس فروخت کر دیا
شروانی صاحب کو اس کام کا جو تجربہ تھا اب اس سے مستفید ہونے کا ایک
ہی طریقہ تھا کہ کوئی اور مطبع قائم کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے شروانی
پرنٹنگ پریس کے نام سے اپنا ذاتی مطبع جاری کر دیا جو بدستور ان کی

نگرانی میں اعلیٰ معیار کی کتابیں چھاپتا رہا۔

مرحوم کو اردو مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کا ہوکا تھا بے حد زود نویس تھے، اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قادر تھے، شعر بھی کہتے اور اپنے نام (مقتدیٰ) کی رعایت سے کبھی کبھی رہبر تخلص کرتے تھے۔ مزاج کے تلون کے باعث کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کب مدح سے قدح پر اتر آئیں۔ اس لیے یہ واقعہ ہے کہ سب ان سے خائف رہتے تھے۔

میری ان سے ملاقات نواب صدر یار جنگ مرحوم کی وساطت سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت لطف سے پیش آتے تھے۔ علی گڑھ جانا ہوتا تو حتی الامکان سلام کو ضرور حاضر ہوتا۔ ایک دن باتوں باتوں میں، نہ معلوم کیسے مشہور صوفی شاعر صاحب لمعات و عشاق نامہ حضرت فخر الدین عراقی ہمدانی (ف ۱۲۸۹ء) کا ذکر چل پڑا۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہے جس کا مطلع ہے

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

میں نے کسی مناسبت سے یہ شعر پڑھا، تو غالباً قافیے کی وجہ سے ان کا ذہن میرے نام کی طرف منتقل ہو گیا، اس پر فوراً شعر کہا۔

بے وحشت کہ اندر جام کردند ☼ ز مالک رام، گویم وام کردند

چھوٹی موٹی کوئی درجن بھر کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ مضامین کی بھی خاصی تعداد مختلف رسالوں میں منتشر پڑی ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ مصنف کے دست راست رہے جس کا اعتراف مولوی سید احمد نے کیا ہے ——— شب جمعہ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بعمر ۸۸ سال (قمری ۹۱ سال) علی گڑھ میں انتقال کیا اور وہیں قبرستان شاہ جمال میں سپرد خاک ہوئے۔

"سرسیّد کی انشاپردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر نا ممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا، جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔

فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے، سعدی رزم کے مرد میدان نہیں، نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچے سے آشنا نہیں، ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے سید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔"

شبلی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

پروفیسر خورشید الاسلام

ہمارے اندر جہاں اور خوبیاں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ہم ان لوگوں کو ذرا مشکل سے معاف کرتے ہیں جو مرنے میں کسی قدر عجلت سے کام لیتے ہیں اور خاص طور سے اس صورت میں جب کوئی دنیا دار ادیب ان کا سجادہ نشین بھی نہ ہو۔ ہم ثبوت ۱۲ نشان کے زیادہ قائل ہیں، خلوص نیت اور کارکردگی کے کم۔ ڈاکٹر بجنوری ان ہی لوگوں میں سے ہیں جن کی روح کو بدن کی موت کے بعد یہ ذائقہ چکھنا پڑا۔ وہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں وفات پا گئے، یعنی انھیں قدرت نے صرف ۳۳ سال کی مہلت دی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان قاضیوں کا معروف خاندان ہے، جو صدیوں تک دولت اور علم دونوں میں ممتاز رہا ہے۔ ان کے والد خان بہادر نورالاسلام سفیر قندھار تھے انھیں فارسی سے عشق تھا، وہ انگریزی سے بخوبی واقف تھے اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کے نانا مولوی ریاض الدین صاحب ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ مزاج میں قناعت اور جلال تھا اور وہ ساری عمر دنیا سے گریزاں رہے۔ ڈاکٹر بجنوری کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی کوئٹہ سے ہائی اسکول پاس کیا اور ۱۹۰۲ء میں ایم۔ اے او کالج میں داخل ہوئے۔ جو اس دور میں تہذیب اور تعلیم کا مرکز تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاق، آداب اور محفل آرائی اور بذلہ سنجی اور شعر و شاعری سے تعلق خاطر میں کوئی دوسرا ادارہ اس کا حریف نہیں تھا۔ فن تقریر اور تحریر میں یہاں کے طلبہ نے مغرب سے جو کچھ سیکھا وہ سیاست اور ادب کی تاریخ کا ایک خاص باب ہے۔ ڈاکٹر بجنوری سادہ اور متین طالب علم تھے۔ لیکن جہاں انھوں نے چھوٹی چھوٹی برکتیں اپنے دامن میں سمیٹیں، وہاں انگریزوں کی مصلحت کے خلاف، مشرقی اور مغربی علوم سے ایسا شغف پیدا کیا کہ ان سے پہلے تو کیا، بعد میں بھی شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو۔ ان کا حلقہ اثر غیر معمولی تھا اور ان کا زاویۂ نظر مذہب، سیاست اور تعلیم میں دوسروں سے اس قدر آزاد اور مختلف اور متحرک تھا کہ انگریز اساتذہ انھیں شک اور خطرہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنی مستقل مزاجی کو قائم رکھا۔ ان باتوں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ باقیات بجنوری میں ان کے ذہنی رویوں اور ان کے علم کی وسعتوں کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ بی اے ایل۔ ایل بی کے بعد ۱۹۰۷ء میں وہ یورپ گئے اور وہاں کئی سال تک رہے۔ جرمنی سے انھوں نے ڈاکٹر آف جورس پروڈنس کی سند حاصل کی جو قانون کی اعلیٰ ترین ڈگری ہے ۱۹۱۱ء میں وہ ہندوستان آئے، دو سال بیرسٹری کی۔ لیکن وہ آمدنی کی اس سبیل کو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھتے رہے آخر بیگم بھوپال نے انھیں، بھوپال میں مشیر تعلیمات کے منصب پر بلا لیا۔ علمی اور منصبی کاموں کے علاوہ انھوں غیر معمولی محنت سے، مسلم یونیورسٹی کا دستور مرتب کیا۔ لیکن

سرکار انگریزی نے اس میں ایسی کاٹ چھانٹ کی کہ خود بجنوری کے لیے اس کا چہرہ پہچاننا مشکل ہو گیا اور انھیں اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ قومی مقاصد اور مغرب کی علمی ترقیوں کی روشنی میں انھوں نے ایک نئی یونیورسٹی قائم کرنے کا مکمل نقشہ تیار کیا، جس کے لیے خود بیگم بھوپال اور نظام حیدر آباد نے بھی گراں قدر عطیہ دینا منظور کر لیا۔ لیکن یوپی کے لفٹننٹ گورنر سر جیمز میسٹن اور ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر ڈیلافوز نے اس کی مخالفت کی۔ اور بقول ان کے ایک عزیز دوست "یہ تجویز ان کے ساتھ ہی لال گھاٹی میں دفن ہو گئی"

۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں انفلوئنزا کی ایسی وبا پھیلی کہ شاید ہی کوئی خاندان اس سے محفوظ رہا ہو۔ ڈاکٹر بجنوری اسی وبا کی نذر ہو گئے۔ نواب حمید اللہ خاں کی پیہم سعی اور ڈاکٹر انصاری کی مستحکم تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری کا تنقیدی کارنامہ، موت کے ہاتھوں سے محفوظ رہا۔

مقدمہ شعر و شاعری ایک عہد آفریں کارنامہ تھا۔ حالی نے اردو کو تنقید کے نئے اصول دیئے اور خود تنقید کو ایک نئی فرہنگ اور ایک نئی سمت عطا کی۔ اس کتاب کی اشاعت نے ہماری شاعری میں حرکت پیدا کی اور اسے زندگی اور زمانے کے مسائل سے آنکھیں چار کرنا سکھایا۔ لیکن مقدمہ شعر و شاعری کے بعض پہلو ایسے تھے، جن میں زبان کا مبالغہ تو نہیں تھا، البتہ معنی کا مبالغہ ایسا تھا جس نے عرصہ تک ذہنوں کو متاثر رکھا۔ اور اس کا اثر آج بھی ہماری تنقید اور چند نقادوں کے ذہنی رویہ میں کارفرما نظر آتا ہے۔ انھوں نے مدلل اور بظاہر معروضی طریقے سے ہمیں یہ تو بتا دیا کہ جسمانی سطح پر جینے کے آداب کیا ہوتے ہیں لیکن روح کے خساروں کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا۔ وقت کے سیل کے ساتھ خود کو بہانے کی خواہش اور کاوش کا سب سے بڑا المیہ یہی ہوتا ہے کہ زندگی یک رخے معیاروں اور مصلحتوں کی بندی ہو جاتی ہے اور جہد حیات میں مصروف ذہن کو بہت دیر بعد یہ خبر ہوتی ہے کہ کبھی کبھی کمال و زوال مترادف اور نرقی ترقیٔ معکوس کا عکس بھی بن جاتی ہیں۔ حالی نے جن کا اعتدال تقریباً ضرب المثل ہو گیا ہے۔ بڑی نرمی اور خاموشی سے زوال کی غزل یا لکھنؤ کی غزل کو، اس دریائے مواج کے مترادف قرار دے دیا جس کا سلسلہ سعدیؔ سے لے کر خود ان تک پھیلا ہوا تھا۔ مثنوی کی مافوق الفطرت عناصر پر زور دے کر اس کی قدر و قیمت کو گھٹا دیا۔ غزل کے استعاروں کو سماجی حالات، ادبی روایات اور ان کے اپنے نشو و نما کی داستان سے علیحدہ کر کے مصنوعی قرار دے دیا اور یہ جانتے ہوئے یا شاید قطعاً نہ جاننے کے باعث کہ ہمارے سماج میں محبت کی آزادی نہیں ہے اور کئی پیچیدہ اسباب کی بنا پر ہماری شاعری میں تذکیر کا صیغہ استعمال ہوتا رہا ہے۔ نیز یہ جاننے کے باوجود کہ سچے غزل گویوں کا محبوب اکثر و بیشتر عورت رہی ہے اور مضمون کی فضا قاری کو از خود اپنے موضوع کی طرف لے جاتی ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خدا ہو یا خودی، حالی نے غزل کے محبوب کی ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ ہوش مندوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ سارا عمل لب و لہجہ کی ایسی معصومیت اور نیت کے ایسے خلوص کے ایسے خلوص کے ساتھ کیا گیا کہ اس دور کے روشن خیال حضرات میکالے کے اس قول پر آمنا و صدقنا پکار اٹھے کہ انگریزی ادب کا ایک شیلف ایشیا کے پورے ادب پر بھاری ہے۔

زمانہ سخت ذہنی کشمکش کا تھا۔ سرسید کی تحریک نے جہاں لوگوں کی آنکھیں کھولی تھیں، وہاں ان کو خیرہ کرنے کا سامان بھی مہیا کر دیا تھا، انگریزی تعلیم نے اپنی روایت سے حجاب اور اپنے حال پر خندہ یا گریہ سکھانے کے ساتھ ساتھ مغرب سے ایسی مرعوبیت پیدا کر دی تھی کہ کالیداس کا نام کیٹس کے سامنے اور غالب کا نام براؤننگ کے سامنے لینا گستاخی اور جہل سے بڑھ کر کفر کے درجہ میں آگیا تھا۔ "یادگار غالب" حالی کی فراست اور ان کے ذہنی تضاد کا ایک واضح مظاہرہ ہے۔ وہ غالب کی شخصیت کی مردانہ ہمہ رنگی سے

شرماتے ہیں اور ان کی عظمت کی شراب کو پانی میں ملاکر اور اس
کی تاثیر کو ہلکا کر کے انھیں ذوق، مومن سے بہتر اور عرفی و کلیم
کا تقریباً ہم سر قرار دیتے ہیں۔ غالب کے تعارف کے طور پر یہ
کتاب اس زمانے میں بڑی قدر و قیمت رکھتی تھی اور آج بھی
اس کا فائدہ مسلّم ہے۔ "یادگار غالب" کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ
اس میں شاعر کے سوانح کو پہلی بار تنقید میں اہمیت دی گئی
ہے۔ اگرچہ شاعر کی زندگی کے واقعات اور واردات کو اس
کے کارنامے سے مربوط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔
اور اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں غالب کی اردو اور
فارسی نظم و نثر پر علیحدہ علیحدہ مختصر تبصرہ اور اس کی مناسب
وضاحت کر دی گئی ہے لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ وہ کل کو
بہ حیثیت کل کے گرفت میں نہیں لاتی۔ لیکن زمانہ کو دیکھتے ہوئے
حالی سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

بہرحال حالی کا ذہنی عمل کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک طرف
وہ حال کے جبر کو جانتے اور مانتے ہوئے نئی تحریک کے حق میں
ایک محدود ادبی نظریہ کی تلقین کرتے تھے۔ یعنی ادب کے ہنگامی
اور وقتی ضرورتوں کے تابع ہونے پر اصرار کرتے تھے۔ ماضی
کے ادب سے کافی شرمندہ تھے۔ لیکن پھر کسی مجبوری کے
باعث جس پر ان کے علم، ان کے ذوق اور تہذیبی میراث کے
احترام کا سایہ تھا، کچھ ایسے افراد کی جستجو میں رہتے تھے۔ جنھیں
چاہے مغرب کے سامنے پیش نہ کر سکیں لیکن کم سے کم جدید
نسل کے سامنے ضرور پیش کر سکیں۔ ان میں ایک غالب تھے
حالی اس کوشش میں ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن
جس شخص نے غالب کو دہلی کے تنگ کوچوں سے نکال کر
اور ذوق و مومن کی صحبت اور کلیم و عرفی کی ہم نوائی سے
رہا کر کے اس مقام پر پہنچایا جو اس کا تھا۔ اور جس کی بدولت
نئی نسل میں غالب محترم اور اپنی ادبی روایت قابل ذکر بھی
جانے لگی، وہ بجنوری تھے۔ بجنوری اپنے اوضاع و آداب
میں مشرقی تھے۔ اپنی معاشرت کے ذی ہوش پرستار تھے
اور جاپانی علوم پر نگاہ رکھتے تھے اور اس میں تو کوئی شک ہی
نہیں کہ وہ اپنے تمام معاصرین سے کہیں زیادہ، مغرب اور اس
کی معاشرت اور اس کی ترقی کے اسباب کو جانتے تھے۔ وہ جدید
علوم سے غیر معمولی شغف اور ان میں سے چند میں غیر معمولی دستگاہ
رکھتے تھے۔ عربی و فارسی کے علاوہ وہ ترکی زبان و ادب سے
بھی آشنا تھے۔ انگریزی پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔
اور فرانسیسی، اطالوی اور جرمن جانتے تھے۔ فلسفہ ان کا خاص
مضمون تھا اسلامی فقہ پر انھیں عبور حاصل تھا۔ قانون کی انھوں
نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فن مصوری کے رمز شناس تھے۔
ادب ان کا شغلہ تھا اور تعلیم کا شعبہ ان کی معاش کا وسیلہ تھا۔

بجنوری، غالب اور سرسید کے بعد گویا سب سے زیادہ
جامع اوصاف شخص تھے سیاسی اعتبار سے وہ قوم پرست
تھے۔ ان کی یہ جامعیت اور قوم پرستی "محاسن کلام غالب" کی
شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ محاسن کلام غالب کی
کہیں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ مبالغہ ایک بڑی
صداقت کو مرعوبیت کی فضا میں دلوں اور دماغوں میں
اتار دینے کا ایک حربہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ بجنوری نے تنقید میں
کیا کیا اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟۔ بجنوری کی سب سے
بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شخص کے حصے نہیں کرتے۔ وہ غالب
کے کارنامے کو کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں یعنی وہ اس کو ہر پہلو
سے دیکھنے ہر زاویہ نظر سے پرکھنے، دوسرے شعرا یا مختلف
کارناموں کا پہلو بہ پہلو رکھ کر آزمانے، اور خود اس کے
مختلف پہلوؤں میں جو ربط ہے اسے دریافت کرنے کے
بعد ایک غیر معمولی اعتماد کے ساتھ پہلا جملہ لکھتے ہیں:

" ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس
وید اور دیوان غالب"

اور انھیں اس کا یقین ہے کہ وہ قاری سے اپنی بات منوالیں گے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جملہ میں مبالغہ ہے، لیکن یہ
مبالغہ اس سچائی کو ظاہر کرنے کے لیے لایا گیا ہے کہ ہندوستان

کی تہذیبی میراث قابل قدر اور قابل احترام ہے اور اس پس منظر میں سر کیا گیا ہے جب بجنوری کے الفاظ میں "تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہوگئے ہیں۔ . . . ."
اس جملہ کے بعد، تنقید کا انداز بیک وقت منطقی اور وجدانی تجزیاتی اور تعبیری اور اسلوب بیک وقت حکیمانہ اور شاعرانہ، پرجوش اور ترغیبی نظر آتا ہے۔ اس جملہ کی تفسیر اور اس کا جوازیہ ہے کہ :

"لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن
کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو
اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ
موجود نہیں ہے"

غالباً اس دعوے سے اختلاف تو مشکل ہو گا جب بچے مبالغے کے بعد احتیاط سے کام لے کر "بیدار یا خوابیدہ" کی شرط بھی لگا دی گئی ہو۔ اس کے بعد بجنوری ایجاز کے ساتھ شاعری کی تعریف کرتے ہیں جس کا تعلق ایک طرف تو خود ان جملوں سے ہے جو ابھی نقل کئے گئے ہیں اور دوسری طرف وہ بجنوری کے اس معیار کو پیش کرتی ہے جس پر انھوں نے غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

بجنوری جہاں غالب کے معانی کی تعبیر کرتے ہیں وہاں ان سے چند مقامات پر مبالغہ سرزد ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حالی نے "یادگار" میں غالب کے اشعار کی وضاحت پر اکتفا کیا ہے جبکہ بجنوری نے "محاسن" میں غالب کے ذہن کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ بجنوری ان کے نظریہ حیات وکائنات پر زور دیتے ہیں یعنی بجنوری کی نظر میں ایک نقاد کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کسی شاعر کے کلام میں حیات کا کوئی تصور ملتا ہے یا نہیں؟ مظاہر میں ربط دریافت کرنے کی سعی ملتی ہے یا نہیں؟ انسان اور انسانیت کے منصب اور منتہا کے بارے میں کوئی بصیرت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ غالب کی اردو شاعری

اور نثر کے ساتھ ساتھ جن لوگوں نے ان کے فارسی کلام کا مطالعہ بھی کیا ہے اور جو ایران کی شاعری سے بھی واقف ہیں، وہ غالب کو اس وصف خاص میں بھی کسی سے کم نہیں پاتے۔ فارسی قصائد اور مثنویاں، وحدت الوجود کی فکری اور حسی تعبیرات کا گنجینہ ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مقامات پر عطار اور جامی بھی پیچھے رہ جاتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ غالب کے یہاں وہ یقین نہیں ہے جو کسی خاص مذہب کی زمین سے پھوٹا ہو، دوسرے یہ کہ ان کا دراک اور شفاف ذہن آنے والے دور کو بھی دیکھ لیتا ہے اور وحدت الوجود کی دیواروں میں کہیں کہیں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں پر بجنوری اپنے منفرد انداز میں تبصرہ کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں :

"جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہے
مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہے"، "مرزا غالب بھی کسی
ارضی مذہب کے پابند نہیں بلکہ انھوں نے سب میں
شرکت کی خاطر تمام کی ظاہری رسوم کو جو باعث
امتیاز ہیں ترک کر دیا ہے۔"

"وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف سے مخصوص نہیں معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہے غیلان دمشقی و اصل ابن عطا عمرو بن عبید مادہ، روح اور خدا تینوں کو ازلی اور ابدی خیال کرتے ہیں۔"
ان جملوں میں بجنوری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالب اگر صوفی نہیں ہیں تو ان کے کلام میں ان تجربات کو دریافت کرنا جو صوفیا سے متعلق سمجھے جاتے ہیں، مناسب نہیں ہے۔ نہ انھیں کسی محدود اور مخصوص مذہب کا تابع یا اس سے منحرف ثابت کرنا ضروری ہے ہمیں اس بات پر قائم رہنا چاہئے کہ انھوں نے کائنات کے مسائل پر غور کیا ہے وہ مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود مذہب سے آزاد ہیں۔ ان کے نظریۂ کائنات کے خمیر میں مذہب کے چند بنیادی اصول اور ان کی شاعری کے سیل میں فکر کے مختلف چشموں کی سوتیں شامل ہیں انھیں آپ ذہنی طور پر صوفی بھی کہہ سکتے ہیں اور معتزلی بھی۔ آگے چل کر

بجنوری لکھتے ہیں کہ :

" وحدت الوجود فلسفۂ جدید و قدیم میں معرکتہ الآرا مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے" اور " جدید ترین فلسفہ اور حکمت کی تحقیقات بھی وحدت الوجود کی طرف مائل ہے" گویا غالب نے جہاں یہ زاویہ نگاہ ماضی سے اخذ کیا ہے وہاں غور و فکر کی مدد سے اسے حال کی ضرورتوں کو مناسب بھی بنا لیا ہے اور چونکہ وہ مستقبل کے شاعر بھی ہیں اس لیے ان کو آنے والے دور کے تصورات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں کہہ دینا ضروری ہے کہ بجنوری نے فارسی اشعار کا سہارا نہیں لیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ ان کے اردو کلام سے بحث کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے ایک غلطی یہ کی کہ مشرق و مغرب کے فلسفیوں سے ان کے خیالات کا موازنہ کر دکھایا جو ناواقف لوگوں کے لیے غلو سے پُر اور واقف لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم نقص ان کی تنقید کے اس حصہ میں یہ ہے کہ وہ بلا سبب ان اشعار کو بھی جو خالص مجاز کی غمازی کرتے ہیں، حسن مطلق سے منسوب کر دیتے ہیں اور حکمت کے بعض تصورات کو جن کی ایک ہلکی سی جھلک آج سے سینکڑوں سال پہلے کے بعض شعرا کے یہاں بھی مل جائے گی غالب کے اشعار میں پاکر اسے غیر ضروری اہمیت دے دیتے ہیں۔ یہ گویا ان کی قوم پرستی کا ایک کرشمہ ہے۔ بجنوری نے غالب کے ذہنی اور جذباتی رویوں کا جائزہ بھی لیا ہے اور اس میں بعض اہم باتیں کہی ہیں۔

"گوئٹے کی نگاہ اشیا کے خارجی پہلو سے گزر کر داخلی کیفیت تک پہنچتی ہے۔ غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدے سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہے"

" مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے"

" مرزا کا جی شہر کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی یا خوش وقتی یا افسردگی، خوشی یا خاموشی خود ان کے اپنے احساسات کی خارجی تصویریں ہیں"

" مرزا غالب ان تابوت بردوش فلسفیوں میں نہیں ہیں جو زندگی کو ماتم خانہ اور اصل دنیا کو جنازہ سمجھتے ہیں"

" مرزا غالب موت کے مقابل ہیں۔ وہ ان میں نہیں ہیں جو جس قدر موت کے خیال سے خالی الذہن ہونا چاہتے ہیں اتنا ہی خیال مرگ انھیں ستاتا ہے"

" غالب کی طبیعت میں رحم ہے وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں"

" لیکن مرزا کبھی بلند آواز سے نہیں ہنستے، گاہ گاہ زیر لب تبسم ضرور کرتے ہیں، ان کا تبسم تمسخر نہیں بلکہ مزاح (Humour) کا انداز رکھتا ہے۔ یہ ابہام معشوق کے کسی خلاف عادت کام سے یا اپنے خلاف عادت ارادے یا واقعے سے پیدا ہوتا ہے"

" مرزا غالب کی معشوقہ مریم نہیں جو خیال غیر سے پاک اور جنس مقابل سے بالا ہے، بلکہ زلیخا ہے ان کے معشوق کی تصویر رافائیل نہیں کھینچ سکتا، یہ روبنس کا کام ہے" "ہومر نے صرف دو جگہ اتنا لکھا کہ ہیلن کی بانہیں گوری تھیں۔ اور اس کے بال خوشنما تھے۔ غالب نے بھی کل دیوان میں زلف سیاہ یا چشم سیاہ سے زیادہ اپنے معشوق کا پتہ نہیں بتایا"

اب ایلسن کے ڈرامہ " وارثان تخت" کا یہ اقتباس دیکھیے جو بجنوری نے نقل کیا ہے اور جو غالب کی شخصیت، شاعری اور ان دونوں کی نسبت زمانہ کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی بجنوری کے نازک تنقیدی احساس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

" بادشاہ تم کس طرح مغنی ہو گئے تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنی۔ جہاں پناہ! فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ۔ نہیں؟!

مغنی۔ نہیں۔ میں نے یہ خداداد کمال غم کے ہاتھوں پایا ہے۔

بادشاہ۔ تو کیا مغنی ہونے کے لیے غم کی ضرورت ہے۔!

مغنی۔ مجھ کو غم سے یہ دولت ملی بعض کو مسرت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے۔ اور....

بادشاہ۔ اور....

مغنی۔ تیقن سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے...

بادشاہ۔ شک سے بھی....؟

مغنی۔ جو ایمان کے درجہ تک ہو، ناقص نہ ہو۔

بادشاہ۔ ناقص شک کس کو کہتے ہیں؟

مغنی۔ جہاں پناہ! جس میں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو یہ شفق ہے جو نور اور ظلمت اور رات اور دن دونوں سے محروم رکھتی ہے۔"

"مرزا غالب اپنے شک میں کامل ہیں" یہ لطیف بصیرت بجنوری کا ہی حصہ ہے "محاسن کلام غالب" کے علاوہ بجنوری نے اقبال اور ٹیگور پر مضامین لکھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کو یورپ سے اور ٹیگور کو اردو سے روشناس کرانے کا کام بجنوری ہی نے انجام دیا۔ اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" پر جو مضمون انھوں نے لکھا اس کے حوالے ڈاکٹر نکلسن نے "اسرار خودی" کے انگریزی ترجمے میں دیے ہیں۔ یہ ایک جامع مضمون ہے اور عجیب بات ہے کہ نصف صدی سے زیادہ گذر جانے پر بھی اقبال کے فلسفہ کے اس بنیادی پہلو پر اس سے زیادہ عالمانہ مضمون نہیں لکھا جا سکا ہے۔ بجنوری ۳۲ برس کی عمر میں مر گئے محاسن ۳۲ برس کی عمر میں لکھی گئی۔ لیکن چند خامیوں سے قطع نظر وہ آج بھی فاضلانہ، جامع اور منفرد تنقیدی کارنامہ ہے۔

بجنوری نے حالی پر اضافہ کیا۔ انھوں نے ادب کو خالص ملی اور ملکی اور ہنگامی اغراض کے تابع ہونے سے بچانے کی کوشش کی اور اسے بیک وقت آفاقی اور قومی تہذیب کی روشنی میں پرکھنے پر زور دیا۔ اس کے ساجی مقصد کے ساتھ اس کی فلسفیانہ گہرائی اور جمالیاتی پیکر کو گرفت میں لانا۔ سادہ اصطلاحوں سے تنقید کو آزاد کیا اور ادب کو ایک مجموعی کل کی حیثیت سے دیکھنے کا رجحان پیدا کیا۔ محض وضاحتی تنقید کے بجائے شاعر کی ترجمانی کی اور تعبیری تنقید کی رکھی۔ تقابلی مطالعہ کو اس کا مناسب مقام دیا اور پہلی بار اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ادب ایک آفاقی مظہر ہے اور کسی بھی ادب کو صرف اسی کے حدود میں رہ کر سمجھنا ممکن نہیں۔

بجنوری نے تہذیب سے زبان کا صحیح رشتہ قائم کیا۔ ... کی عہد بہ عہد تجدید کو لازمی قرار دیا۔ نہ صرف ادب ... معاشرت کی ترقی اور نمو کے لیے ادب میں غور و فکر کے عناصر سے بڑھ کر ایک ایسے زاویہ نظر کی موجودگی کی اہمیت جتائی جو انسان اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے اور ادب کو بارآور اور بلیغ بنانے میں معاون ہو۔

حالی جدید تنقید کے رہنما ہیں، بجنوری صحیح معنوں میں پہلے جدید نقاد ہیں۔ حالی سادہ ہیں، بجنوری بلیغ ہیں۔ حالی کی نظر محدود اغراض پر ہے، بجنوری کی نظر انسانی تہذیب کی وسعت اور اس کے پیمانوں پر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا اسلوب اردو کے چند منفرد اسالیب میں سے ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ادب کے حسن، توانائی اور تہ داری کو پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر طاری کر دیتا ہے۔

نواب احمد سعید خان چھتاری

الطاف حسین ندوی

مغربی اتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں لعل خانیوں کی جو زمینداریاں اور جاگیریں قائم تھیں اُن میں چھتاری کا بڑا نام اور چرچا تھا۔ ۱۸۰۶ء میں ستھاکر دوندے خاں کی ہزیمت اور بلند شہر پر انگریزی تسلط کے بعد ٹھاکر مردان علی خاں نے چھتاری کے تعلقے کو مزید ناموری عطا کی اور اس میں بہت سے نئے علاقے شامل کیے۔ ٹھاکر مردان خاں کے پوتے نواب محمود علی خاں کے دور میں اس کے دائرہ وسعت اور استحکام میں اور بھی اضافہ ہوا اور یہ انقلاب زمانہ کے ساتھ ترقی کرتے کرتے ایک اہم اور بڑی زمینداری کا مرکزی مقام بن گیا۔ نواب محمود علی خاں کے زمانے میں اس کا رقبہ بلند شہر، علی گڑھ، احمد گڑھ، مینڈو، ڈھکولی، کول، داؤدن، فتح گڑھی۔ سدہ گڑھی اور ہردوا گنج کے بہت سے دیہاتوں پر مشتمل تھا اور مالگزاری کے لحاظ سے اسے برطانوی علاقے کی کئی دوسری ریاستوں پر فوقیت حاصل تھی۔ ۱۹۳۳ء یا اس کے آس پاس جب اس ریاست میں کاشتکاروں کے لگان میں آخری حد تک تخفیف کر دی گئی تھی اور مینڈو اور طالب نگر کے علاقے اس سے علیحدہ ہو چکے تھے اُس وقت بھی تخفیف مال گذاری اور ادائے مال گذاری کے بعد اس کا خالص منافع دو لاکھ پینسٹھ ہزار تھا۔[1] نواب محمود علی خاں کے پوتے سعید الملک نواب سر احمد سعید خاں اسی ریاست کے آخری رئیس اور تعلقدار تھے۔ ان کا شمار علی گڑھ اور بلند شہر کے چوٹی کے رئیسوں میں ہوتا تھا اور ملک میں ان کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے بڑے چچا (تایا) نواب لطف علی خاں بھی بڑی آن بان کے مالک تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ہی چھتاری کے رئیس ہوئے۔ سر سید احمد خاں کے دل میں ان کی بڑی عزت تھی اور یہ ان کے خاص دوستوں میں گنے جاتے تھے۔[2] ایم اے او کالج کے قیام اور سر سید تحریک کے فروغ میں ان کا اشتراک و تعاون قابلِ ذکر ہے۔ نواب لطف علی خاں حکومت کی نگاہ میں بھی نہایت معزز تھے۔ وہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک عرصہ تک ریاست رام پور کے مدار المہام[3] رہے اور اس کی ترقی اور بہبودی کے بہت سے کام انجام دیے۔

نواب احمد سعید خاں کی نسل گرامی راجپوت ہے اور صنف جسے ہندی میں گوت کہتے ہیں بڑگوجر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد نے شاہجہاں کے عہد میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اپنے نسلی تشخص کو اس کے بعد بھی انھوں نے برقرار رکھا۔ اس تشخص اور امتیاز کے تحفظ کی خاطر ہی انھوں نے باہمی رشتہ و پیوند کا سلسلہ محض راجپوتوں تک محدود رکھا۔ نواب احمد سعید خاں نے بھی بزرگوں کی اسی راہ کو اپنایا اور جب کبھی کسی غیر راجپوت گھرانے میں شادی بیاہ کی بات آئی تو یہی کہا کہ ہم لوگ راجپوت ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود شادی بیاہ صرف راجپوتوں میں کرتے ہیں۔[4] اس سلسلے کی دوسری کڑی راجپوتوں کی انجمن کا قیام ہے۔ اس انجمن کا پہلا جلسہ اپریل ۱۹۱۱ء کو نواب موصوف کی صدارت میں نواب صاحب ہی کی کوٹھی پر علی گڑھ میں ہوا۔ اس میں انھوں نے خطبۂ صدارت پیش کرنے کے علاوہ تین ہزار روپیہ کا چندہ بھی عطا کیا۔ خطبۂ صدارت کے وقت شرکا میں نواب وقار الملک، نواب عزیز اللہ خاں

منشی پیرس اور ساجد صاحب محمود آباد جیسے طبقۂ اشراف کے لوگ موجود تھے بات دراصل یہ ہے کہ نسل تفاخر اس زمانے کے اشراف کا شیوہ تھا اور یہ وصف خاص نہ صرف اہل ثروت بلکہ بعض دیندار گھرانوں میں آج تک پایا جاتا ہے اس پہلو سے قطع نظر جہاں تک نواب صاحب کے مزاج کا تعلق ہے وہ خالص مذہبی تھا۔ ان کے دادا نواب محمود علی خاں بڑے متقی اور خدا ترس بزرگ تھے۔ وہ سنت کے انتہائی پابند تھے اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہی کے اثر سے ان کے گھر میں دینداری کا ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا جس میں مذہبی احکام کی پابندی اور دینی اقدار سے وابستگی کا رجحان عام تھا۔ نواب محمود علی خاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید تھے۔ انہوں نے ان تمام مشرکانہ رسوم اور غیر اسلامی اطوار کو موقوف کر دیا تھا جو ان کے خاندان میں پہلے سے رائج تھیں۔ وہ اس اسلام کے پابند تھے جو سنت نبوی سے ثابت ہے اور اس میں کمی و بیشی ناپسند کرتے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت و ارادت اور دیوبندی مکتب فکر سے براہ راست قربت و تعلق کی بنا پر ہی وہ انگریزی تعلیم اور طرز معاشرت سے سخت بیزار تھے اور سرسید احمد خاں کے کٹر مخالف تھے۔ چنانچہ ایک بار سرسید نے بھوس کی خریداری کے لیے اپنے کچھ آدمی ریاست چھتاری بھیجے تو نواب محمود علی خاں نے ان کے ہاتھوں بھوسہ بیچنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ میں اس میں آگ لگا دوں گا لیکن سرسید کو نہیں دوں گا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر انہوں نے سرسید کی اعانت کی یا کالج میں چندہ دیا تو انھیں عذاب جہنم سے دو چار ہونا پڑے گا۔ نواب صاحب مرحوم اخیر عمر میں ہجرت کر کے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔

نواب محمود علی خاں کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے نواب لطف علی خاں تھے جو پرانی تہذیب اور کلچر کا بہترین نمونہ تھے اور شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کا تخلص مائل تھا وہ اکبر الہ آبادی کے بڑے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ ان سے چھوٹے بیٹے کنور عبد العلی خاں تھے جنہوں نے سنہ ۱۹۰۵ء میں اپنے والد کے پاس مکہ معظمہ میں انتقال کیا اور وہیں کے قبرستان جنت المعلٰی میں دفن ہوئے۔ تیسرے بیٹے نواب یوسف علی خاں تھے جنھیں پینڈرہ کا علاقہ وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے ایک طویل علالت کے بعد سنہ [illegible] رحلت فرمائی۔ وہ رحلت سے قبل اپنے دو مواضعات شیخو پور اور ... پورا اپنے چھوٹے بھائی نواب عبد الصمد خاں کو ہبہ کر گئے تھے اور نینی تال کی کوٹھی "پراسپکٹ لاج" بھی انہی کو دے دی تھی۔ چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے نواب عبد الصمد خاں تھے جن کے حصے میں طالب نگر کا علاقہ آیا اور جن کا انتقال سنہ ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ ان چاروں بیٹوں میں نواب محمود علی خاں کو اپنے منجھلے بیٹے کنور عبد العلی خاں سے غیر معمولی محبت تھی اور یہی ان کے سب سے چہیتے بیٹے تھے۔ اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ مکہ معظمہ ہجرت کرنے سے پہلے چھتاری اور اس کے قریب کا حصہ انہوں نے نواب لطف علی خاں کے بجائے کنور عبد العلی خاں کو ہبہ کیا۔(۶)

کنور عبد العلی خاں کی دو شادیاں ہوئیں پہلے محل سے حافظ محمد سعید خاں پیدا ہوئے جن کا مدینہ منورہ میں عنفوان شباب ہی میں انتقال ہو گیا۔ دوسرے محل سے حافظ احمد سعید خاں پیدا ہوئے جو آگے چل کر برصغیر ہند و پاک کے اہم اور نامور فرزندوں میں شمار ہوئے۔ ان کی ولادت ان کے ماموں راؤ خورشید علی خاں نواب باغپت (میرٹھ) کے وہاں ۱۱ر جنوری سنہ ۱۸۸۸ء کو ہوئی۔ ان کے بچپن کا تقریباً سات سالہ معصوم اور مسرور و مطمئن زمانہ باغپت ہی میں گزرا اور یہیں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ شروع میں انھیں انگریزی اسکول بھیجا گیا لیکن جب ان کے دادا حجاز سے واپس آگئے تو انھیں اپنے پاس چھتاری بلا لیا اور ان کی انگریزی تعلیم کا سلسلہ فوراً روک دیا۔ اس کے بعد ان کی مشرقی تعلیم شروع ہوئی اور سب سے پہلے حافظ حمید اللہ خاں کی نگرانی میں قرآن مجید حفظ کیا۔ انھوں نے قرآن کریم دادا کی زندگی ہی میں حفظ کر لیا تھا اور چوبیس پارے تک انھیں نوافل میں سنا بھی دیا تھا۔ نواب احمد سعید خاں کے حافظ ہونے سے ان کے دادا کو بے حد مسرت ہوئی۔ وہ بیماری کی حالت میں تام جھام میں بیٹھ کر جامع مسجد گئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہاں مسلمانوں کے مجمع میں پوتے سے ایک رکوع سنا اور حاضرین میں شیرینی تقسیم کرائی۔ قرآن مجید انھیں اللہ کے فضل سے آخر تک یاد رہا اور ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک ان کی کوئی محراب ناغہ نہ ہوئی۔(۷) عمر کے آخری حصے میں جب کھڑے ہوکر

نہ رہی تھی تو وہ بیٹھ کر محراب سنانے لگے تھے۔ حافظِ قرآن ہونے
ہوں نے فارسی پڑھنا شروع کی اور اس کے لیے قدیم فارسی کے
م منشی وزیر خاں ان کے استاد مقرر ہوئے۔ منشی وزیر خاں سچے
ر ایک شفیق استاد تھے۔ ان کا طریقۂ تعلیم ایسا فنکارانہ تھا جو
لم کو زبان و ادب کی باریکیوں سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ
رت اور بصیرت بھی عطا کرتا تھا۔ یہ منشی وزیر خاں ہی کا فیض تھا کہ
مد سعید خاں کو قدیم فارسی پر ایسا عبور حاصل ہو گیا تھا کہ وہ
ردوسی اور نظامی جیسے کلاسیکی شعرا کے کلام کو بلا وقت پڑھ لیتے
اس کے معانی و مطالب کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ اسی زمانے
ی اور انگریزی کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ عربی تو انہوں نے
مدرسے میں پڑھی جو میزان اور منشعب کی گردانوں تک
ہی لیکن انگریزی میں وہ اس سے آگے تک گئے اور علم مجلسی انہوں نے
نصیح الدین سے سیکھا۔

والدین کی وفات کے بعد نواب احمد سعید خاں کے سرپرست
دادا تھے۔ نو برس کی عمر میں دادا کا انتقال ہوا تو گورنمنٹ نے
ریاست کورٹ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ان کے تایا نواب لطف علی
زندگی تک تو اس ارادے کی تکمیل نہ ہو سکی مگر ان کی آنکھ بند
ہی ریاست کورٹ کر لی گئی۔ اس زمانے میں ان کی چھتاری کی
کچھ اچھی نہ تھی۔ ان کا تمام وقت باز، بہری اور شاہین کے پالنے
کی ادویات تیار کرنے میں صرف ہوتا تھا اور اکثر بیکار اور
لڑکوں کے ساتھ صحبت رہتی تھی۔ انہیں تاش اور چوسر کا بھی
ہو گیا تھا اور بٹیر بازی میں بھی کافی دسترس ہو گئی تھی۔ ایسی
ان کی تعلیم کا معقول انتظام ضروری تھا۔ چنانچہ کورٹ آف
س نے یہ طے کیا کہ انہیں علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخل کر دیا
۔ ان کے چچا نواب عبدالصمد خاں اور چھتاری کے بیشتر لوگ
فیصلے کے حق میں نہیں تھے لیکن ان کے دوسرے چچا نواب یوسف
ں جو نہایت دور اندیش اور ذہین تھے، ان کی انگریزی تعلیم کے
تھے۔ لہٰذا ۱۹۰۰ء میں انہیں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ پرشین وارڈ میں
خلہ ہوا۔ اس کے بعد انہیں میکڈانل ہاؤس (آفتاب ہال) منتقل

کر دیا گیا اور پھر وہاں سے وہ انگلش ہاؤس چلے گئے۔ کھانے پینے کا
انتظام ہر جگہ ان کا اپنا ہی رہا اور ایک اتالیق بھی ان کے ساتھ رہا
ان کے اسکول کے اساتذہ میں میر ولایت حسین اور ہم جماعتوں میں سر سکندر
حیات اور خواجہ ناظم الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نواب احمد سعید خاں متوسط درجے کے طالب علم تھے۔ کلاس میں
وہ کبھی فرسٹ نہیں آئے لیکن اردو اور فارسی میں وہ ہمیشہ ممتاز رہے
اور نتیجے کے لحاظ سے ان کا نام جماعت کے پہلے پانچ طلبہ میں رہا۔ شہنشاہ
جارج پنجم ان کے زمانۂ طالب علمی ہی میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔
جب وہ انگلش ہاؤس گئے تو ان کا خیر مقدم کرنے والوں میں نواب صاحب
بھی تھے۔ اسی زمانے میں شاہِ کابل امیر حبیب اللہ خاں کا ورودِ مسعود بھی
علی گڑھ میں ہوا۔ ان کی آمد ایم۔ اے۔ او کالج کے لیے بڑی اہم اور تاریخی ثابت
ہوئی۔ امیر کابل چونکہ پہلے سے سر سید اور کالج کے بارے میں ہندوستانی
علما اور مذہبی رہنماؤں کے خیالات سے واقف تھے اس لیے جب
انہیں کالج کے اربابِ حل و عقد کے ساتھ ٹھہرانے کی دعوت دی گئی
تو انہوں نے نواب محسن الملک (سکریٹری کالج) سے فرمایا کہ میں یہاں کے
طلبہ کی مذہبی تعلیم اور ان کے اسلامی عقائد کی طرف سے مطمئن ہونے
کے بعد ہی ان کے ساتھ کھانے میں شرکت کروں گا۔ اس مقصد کے لیے
انہوں نے مختلف درجات کا معائنہ فرمایا۔ وہ دینیات کے درجے میں
بھی تشریف لے گئے اور دو تین طلبہ سے ان کی دینی معلومات اور شرعی
مسائل سے واقفیت کے سلسلے میں کچھ تنقیدی سوالات کیے۔ ان طلبہ
میں نواب احمد سعید خاں چھتاری بھی شامل تھے۔ امیر موصوف نے
نواب صاحب سے جو کچھ پوچھا اس کا انہوں نے صحیح اور تشفی بخش جواب
دیا۔ ان سے جو سوالات دریافت کیے گئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر
کوئی بے وضو ہو یا اسے غسل کی ضرورت لاحق ہو اور وہ بلا ارادہ دریا میں
گر جائے یا پاکی کی نیت کے بغیر غسل یا وضو کر لے تو اس کا غسل اور
وضو ہو جائے گا یا نہیں۔ اس کا جواب انہوں نے اثبات میں دیا اور کہا
بلا نیت کے بھی غسل اور وضو ہو جائے گا۔ اس جواب کی روشنی میں امیر
موصوف نے ارشاد فرمایا کہ اگر اسی طرح کوئی نیت کے بغیر تیمم کر لے تو
کیا وہ پاک ہو جائے گا؟ اس کا جواب نفی میں تھا کیونکہ تیمم میں نیت کا

ہونا ضروری ہے۔ اس پر امیر موصوف نے فرمایا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ نواب صاحب نے جواب دیا کہ پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی لیکن مٹی صرف طاہر ہے۔ مطہر نہیں ہے۔ اسے محض حکماً اور ضرورتاً مطہر بنالیا گیا ہے۔ اس لیے اس میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ نیت کے بغیر وہ پاک نہیں کر سکتی۔ اس برجستہ اور صحیح جواب سے امیر موصوف بہت خوش ہوئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ مخالفین نے یہاں کے بارے میں جو باتیں مشہور کر رکھی ہیں وہ سب غلط اور سب جھوٹ[9] ہیں۔ کلاس سے باہر نکلنے کے بعد نواب محسن الملک نے بھی انہیں بہت داد دی اور کہا کہ تم نے آج ہماری لاج رکھ لی۔ یہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے۔ نواب صاحب ابھی نویں جماعت ہی میں تھے کہ ان کی ریاست کورٹ سے واگذار ہو گئی اور وہ ۱۹۰۹ء میں چھتاری واپس چلے آئے۔ وقتی طور پر انہیں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے سے خوشی بھی ہوئی۔ جسٹس سلام الدین صاحب چھتاری میں ان کے ساتھ رہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے جسٹس صاحب سے انگریزی کی تعلیم اور محمد تقی صاحب سے ریاست کے انتظامی امور کی تربیت حاصل کی۔ یہ ان کی نوجوانی کا دور تھا اس لیے تعلیمی اور ریاستی کاموں سے انہیں کوئی خاص رغبت نہ تھی ان کا زیادہ تر وقت شکار گھوڑے کی سواری اور کرکٹ و ٹینس میں گذرتا تھا۔ مگر خوبی یہ تھی کہ ان میں خود رائی اور انانیت کی بو نہیں تھی۔ اس لیے دیرینہ اور تجربہ کار مشیروں اور ملازموں کے مشوروں پر عمل کرتے رہے اور ریاست کے معاملات و مسائل میں انہیں کسی وقت اور پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اب ایک زمیندار کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا تھا وہ کسی حد تک گھر کا کام کاج دیکھتے تھے۔ حکام کی خوشنودی حاصل کرتے تھے اور اپنی شہری و دیہاتی جائداد کے اضافے کے لیے کوشاں رہتے تھے اسی زمانے میں انہوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائیوں کی جائداد کا بیت ساحصہ خریدا اور ریاست میں اضافے کا کام شروع کر دیا انہیں ریاست بڑھانے کی شروع ہی سے بہت خواہش تھی۔

چھتاری کا ایک آزاد اور خود مختار زمیندار بنے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ۱۹۱۰ء میں نواب احمد سعید خاں کو بلند شہر کا درجہ سوم کا اعزازی مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔ اس زمانے میں نواب وقار الملک مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے سکریٹری تھے۔ ان کی کوشش اور عنایت سے جنوری ۱۹۱۱ء میں یہ کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے اور اس کے فنڈ میں پانچ ہزار روپے کا چندہ جمع کیا۔ کالج کا ٹرسٹی بننے سے انہیں بہت خوشی ہوئی۔ ایسی ہی مسرت انہیں مئی ۱۹۱۱ء میں خصوصی مجسٹریٹ بننے کے بعد ہوئی تھی۔ اسی سال دسمبر کے مہینے میں دہلی میں شاہی دربار منعقد ہوا جس میں شہنشاہ جارج پنجم اور ان کی بیگم نے شرکت کی اس دربار میں نواب صاحب بھی شریک ہوئے انہیں اس کے نظارہ سے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں اپریل کا مہینہ ان کے لیے ایک اور بڑی خوشی کا پیغام لایا۔ یہ پیغام ان کی شادی خانہ آبادی کا تھا ان کے چچا نواب عبدالصمد خاں بہادر نے بڑے اہتمام اور احتشام کے ساتھ بھتیجے کا بیاہ کیا۔ ان کی ازدواجی زندگی بالعموم پرسکون گذری۔ انہوں نے اسباب کا برابر خیال رکھا کہ ان کی آمدنی اور خرچ میں صحیح تناسب قائم رہے اور ان کے تعلقات حکام رعایا اور اہل خانہ سے خوشگوار رہیں اور ہوا بھی ایسا ہی۔ وہ اپنی خانگی زندگی پر قانع اور مسرور تھے کہ جون ۱۹۱۵ء میں انہیں گورنمنٹ کی طرف سے نوابی کا خطاب عطا ہوا کم عمری ہی میں نوابی کا خطاب عطا ہونے پر انہیں اور ان کی بیوی کو بے حد مسرت ہوئی۔ دراصل معاملہ یہ تھا کہ چھتاری کا موروثی خطاب تو ان کے چچا کے پاس تھا اور یہ چھتاری پر قابض ہونے کے باوجود نواب کے خطاب سے مخاطب نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اس بنا پر سن و سال کا خیال کئے بغیر انہیں نوابی کے خطاب سے نوازا گیا۔ چند برسوں میں ان کا یہ خطاب موروثی کر دیا گیا۔ جون ۱۹۱۵ء میں ان کے اعزاز میں اسٹریچی ہال (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں ایک جلسہ منعقد ہوا اور انہیں اس کی مبارکباد پیش کی گئی۔[10] ۱۹۱۸ء میں انہیں کنگس کمیشن دیا گیا اور وہ سکنڈ لفٹننٹ ہو گئے۔ مدرسۃ العلوم (یونیورسٹی) علی گڑھ کے ساتھ ان کا عملی تعاون ۱۹۱۱ء سے شروع ہو چکا تھا ۱۹۱۴ء میں یونیورسٹی کے ابنائے قدیم کی عمارت (OLD BoYS LoDGE) کی تکمیل ہوئی اس کا ڈرائنگ ہال انہی کی اعانت سے تعمیر ہوا جس کا نام سعید منزل رکھا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ہندوستانیوں کو انتظامی معاملات میں شریک رکھنے کی غرض سے عام انتخابات کا اعلان ہوا کانگریس اور لیگ نے ان میں حصہ لینے سے انکار کیا لیکن نواب صاحب

ے دوستوں نے انتخاب میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ نواب
یو پی کی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے لیے بلند شہر حلقے سے
ہوئے اور بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ مجلسِ قانون ساز میں پہنچ کر
ں نے اردو میں تقریر شروع کی لیکن بعد میں صدر مجلس سر
ن کے مشورہ سے وہ انگریزی میں تقریر تیار کر کے دینے لگے
لسلے میں انہیں سب سے زیادہ فائدہ مسٹر گوکھلے کی تقاریر سے پہنچا۔
ل وجہ یہ تھی کہ گوکھلے فقط اعتراض نہیں کرتے تھے بلکہ یہ بھی بتاتے
راستہ کیا ہے! ان کی تقاریر میں تعمیری پہلو بہت زیادہ ہوتا
دہ انتظامی مشکلات کو سامنے رکھ کر ہی رہنمائی کرتے تھے (۱)
ھلے کی طرح چونکہ نواب صاحب بھی صلح پسند، معتدل مزاج اور تعمیری
مالک تھے اس لیے گوکھلے سے ان کا متاثر ہونا فطری تھا۔ اسی سال
، او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو یہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہو گئے
۱۹۲۳ء میں اپنی نیک مزاجی اور صلح پسندی کی بنا پر ہی وہ ضلع بورڈ
رکے پہلے غیر سرکاری چیئرمین ہوئے حالانکہ مقابلہ سخت تھا۔
ابی سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔

بسا اوقات انسان اپنی خاکساری، کم اندیشی اور جلد بازی
سے ایسے کاموں میں پھنس جاتا ہے جو اس کے مقام سے فروتر ہوتے
ہ موقعوں پر قدرت اکثر اس کی دستگیری کرتی ہے اور اسے
ا تک پہنچا دیتی ہے۔ ضلع بورڈ کی چیئرمینی کے بعد ان کا بھی یہی حال
ں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی پہلی میٹنگ کے لیے مئی ۱۹۲۳ء کی کوئی
ر کی تھی کہ پنڈت جگت نرائن ملا اور سی، وائی چنتامنی نے
ولیم میرس سے ایک معاملہ کیا اختلاف کی بنا پر یو پی کی صوبائی وزارت سے
ے دیا۔ گورنر نے نواب احمد سعید خاں کو بذریعہ تار طلب کیا
ہ میٹنگ ملتوی کی اور نینی تال گورنر کے پاس جا پہنچے۔ گورنر نے
کھتے ہی کہا کہ میری خواہش ہے کہ تم وزیر ہو جاؤ۔ انہوں نے
انکساری کا اظہار کیا اور کہا کہ میری تعلیم نامکمل ہے اور
ی زندگی کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں انتظامی
ہیں میری ناکامی اور کونسل میں میری غیر معیاری تقریر یا
ے میرے اور آپ دونوں کے لیے بدنامی کا باعث ہوگی۔ لیکن

گورنر نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی اور ۱۹۲۳ء کے وسط میں راجہ
پرمانند کے ساتھ انہیں وزیر مقرر کر دیا۔ اس موقع پر گورنر نے ان
سے یہ بھی دریافت کیا کہ وہ کونسا محکمہ لینا پسند کریں گے۔ انہوں نے نہایت
پُرلطف انداز میں جواب دیا کہ محکمۂ تعلیمات کے علاوہ کوئی بھی محکمہ
دیدیجئے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے بارے میں کہیں کہ یہ ہیں
تعلیم کے غیر تعلیم یافتہ وزیر "(Here Comes an Uneducated Minister of Education)"۔ راجہ پرمانند صاحب کے انتقال
کے بعد یہ راجیشور بلی کے ساتھ بھی وزیر رہے اور اپنے فرائضِ منصبی
بڑی قابلیت، دور اندیشی، وقار اور تدبر کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

عہد وزارت میں ان کے بنیادی اور رہنما اصول حسب ذیل تھے۔

(۱)۔ ہندو اور مسلمانوں میں حتی الوسع تفریق نہ ہونے دی جائے۔
(۲)۔ مسلمانوں کی اس صوبے میں اقلیت ہے۔ ان کے حقوق کی پوری
حفاظت کی جائے تاکہ ان میں مایوسی اور بے اطمینانی نہ ہو۔
(۳)۔ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی جائے اور وزرا
کے ماتحت جو ملازم ہوں انہیں ان پر کامل اقتدار ہو۔
(۴)۔ صوبے کے صنعت کو ترقی دینے کے لیے گورنمنٹ کے محکموں میں
دیسی مصنوعات استعمال میں آئیں۔
(۵)۔ انگریزی اقتدار کی اس حد تک حمایت کی جائے کہ فرقہ وارانہ
کشمکش میں وہ ہر فریق کو اس کے جائز حدود میں رکھ سکے۔
(۶)۔ وزرا کے محکموں میں گورنر کی مداخلت کی سختی سے مخالفت۔

جنوری ۱۹۲۶ء کو گورنر نے انہیں پانچ سال کے لیے ہوم ممبر
منتخب کیا۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں ان کے حسنِ انتظام اور عمدہ کارکردگی
کے پیش نظر ان کی مدت میں توسیع کر دی گئی اس طرح یہ ۱۹۳۳ء تک
ہوم ممبر رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنے مختلف محکموں میں طرح
طرح کی اصلاحات کیں۔ جیل اور پولیس کے محکموں کی طرف یہ سب سے
زیادہ متوجہ ہوئے۔ انہوں نے خاص طور پر قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ
سلوک کو ختم کیا اور جیل کی زندگی کو انسانی زندگی بنایا۔ گورنر میرس سے
ان کے بڑے گہرے دوستانہ مراسم اور بے تکلفانہ تعلقات تھے۔
ان کی میعاد ختم ہوتے ہی جنوری ۱۹۲۸ء میں سر الگزنڈر منڈی من

[illegible] ہوئے۔ وہ ابھی جوان تھے لیکن جون میں اچانک سخت بیمار ہوئے اور تین چار روز کے اندر اندر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت دستور کی رو سے نئے گورنر کے تقرر تک ہوم ممبر ہی گورنر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس قاعدے کے مطابق ۱۱ر جون ۱۹۲۸ء کو نواب صاحب یوپی کے گورنر ہوئے۔ اور ۹ر اگست ۱۹۲۸ء تک اس عہدے پر مامور رہے۔ جب سر مالکم ہیلی گورنر ہوئے تو یہ اپنی پرانی جگہ واپس آ گئے۔ یہ یوپی کے پہلے اور ملک کے دوسرے ہندوستانی گورنر تھے ان سے پہلے لارڈ سنہا بہار کے گورنر رہ چکے تھے۔ برطانوی عہد میں صوبے کا گورنر تقریباً خود مختار ہوتا تھا اور اسے بڑے اختیارات حاصل ہوتے تھے اس لیے اس کی عظمت اور سطوت بہت تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ صوبے کے تمام سرکاری حکام اور انگریز افسران کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اس لیے نواب صاحب کے گورنر ہونے سے نہ صرف ان کے عزیزوں اور دوستوں بلکہ عام ہندوستانیوں کو بے حد مسرت ہوئی۔ انہیں اس اعتبار سے بھی تقویت ہوئی کہ ملک کے نظم و نسق میں ایک ہندوستانی حکمراں کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت سے انگریز اس کے زیر فرمان ہیں اس قومی احساس کے باعث تہنیت کے خطوط اور تاروں کا سیلاب امنڈ آیا۔ ان کے دوستوں اور عزیزوں نے بھی انہیں بے شمار مبارکباد کے پیامات ارسال کیے۔ یہ سارے خطوط اور تمام پیامات خواہ قومی جذبے کے تحت ہوں یا ذاتی تعلق کی بنا پر اُن کے لیے باعث تشکر تھے اور قابل افتخار بھی تھے لیکن، جہاں تک خود اُن کی ذات کا تعلق تھا وہ اپنے موجودہ عہدے سے زیادہ خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جس اعزاز کی بنیاد کسی شخص کی ناگہانی موت پر رکھی گئی ہو وہ حقیقی کامیابی نہیں کہی جا سکتی۔ انہیں سر الگزنڈر کی موت اور اپنی گورنری میں جو رشتہ نظر آتا تھا وہ اُن کے لیے تکلیف دہ تھا۔ سر الگزنڈر کی موت سے چند دن پہلے انہیں 'کے، سی، آئی، ای' کا خطاب ملا۔ سر الگزنڈر کو اس سے خوشی ہوئی۔ خود انہیں اس کی دوگنا مسرت تھی۔ اس لیے کہ اب ان کی رفیقۂ حیات لیڈی کہلائے جانے کی مستحق ہو گئی تھیں۔ حکومت برطانیہ نے حسن خدمات کے صلے میں انہیں ایم' بی، ای، سی، آئی، ای اور بلا سی، وی کے خطابات بھی نوازا لیکن جب مسلم لیگ نے خطابات واپس کرنے کی تجویز منظور کی تو نوابی کے خطاب کے علاوہ انہوں نے سب خطابات واپس کر دیے۔

وہ دو مرتبہ گول میز کانفرنس کے رکن رہے اور انہوں نے اس کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء تا ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء اور دوسرے اجلاس منعقدہ ۷ر ستمبر ۱۹۳۱ء تا ۳۰ر نومبر ۱۹۳۱ء میں لندن جا کر شرکت کی اور اس کے اختتام کے بعد جنوری ۱۹۳۲ء کے شروع میں پیرس ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ لندن سے واپسی کے بعد وہ چند ہفتے کے لیے وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے۔

گول میز کانفرنس کے بعد یوپی کے گورنر سر مالکم ہیلی نے طویل رخصت لی اور غیر سرکاری کام سے انگلستان روانہ ہو گئے۔ ان کی غیر حاضری میں نواب صاحب دوبارہ یوپی کے گورنر مقرر کر دیے گئے وہ اس عہدے پر اپریل ۱۹۳۳ء سے آخر نومبر ۱۹۳۳ء تک فائز رہے اور اس طرح تقریباً نو ماہ بعد اس سے سبکدوش ہوئے۔ اس دفعہ چونکہ ان کا تقرر آئین کا رہین منت نہ تھا بلکہ ان کی صلاحیت و قابلیت اور فرائض منصبی کی بدرجہ اتم ادائیگی سے متاثر ہو کر کیا گیا تھا اس لیے نواب صاحب اور ان کے متعلقین اور متوسلین کا اس سے خوش ہونا بالکل فطری تھا۔ وہ نہایت وضعدار اور مذہبی شخص تھے۔ انہوں نے گورنری کے اعلیٰ عہدہ پر پہنچ کر بھی اپنی وضع اور مذہبی روش کو قائم رکھا۔ وہ ہمیشہ نینی تال کے ٹینس ٹورنامنٹ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ گورنری کے زمانے میں بھی انہوں نے حسب عادت اس میں شریک ہونا چاہا۔ بعض لوگوں نے اسے گورنر کی شان کے منافی سمجھا اور بعض نے اس کی تائید کی لیکن چونکہ وہ خود اپنے معمول سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا وہ ٹورنامنٹ کھیلے اور اس میں فتحیاب ہوئے۔[14] اسی طرح جب تک وہ گورنر رہے شام کے وقت گورنر ہاؤس کے لان میں صفیں بچھواتے رہے اور مغرب کی نماز باجماعت پڑھتے رہے حالانکہ ان کا انگریز سکریٹری اسے ناپسند کرتا تھا اور انہیں اس کا علم تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی وضع ترک نہیں کی۔

اسی سال یعنی نومبر ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا۔ جس دارالعلوم میں ان کی ذہنی اور جسمانی

ری گئی اس کی طرف سے "ڈاکٹر آف لاء" کا اعزاز پاکر انہیں
شادمانی ہوئی۔ انہوں نے اس موقع پر یونیورسٹی کو ہندرہ ہزار کا
پرخلوص تحفہ پیش کیا۔ ۱۹۳۴ء میں سر راس مسعود نے علی گڑھ یونیورسٹی
کی چانسلری سے استعفیٰ دے دیا۔ یہاں کے ارباب حل و عقد
اب مسئلہ یہ تھا کہ وائس چانسلر کون ہو۔ سر فضل حسین جو حکومت
لس انتظامیہ کے رکن تھے اور یونیورسٹی انہی کے شعبے سے متعلق
نواب صاحب سے دریافت کیا کہ کیا وہ علی گڑھ کا وائس چانسلر ہونا
گے؟ نواب صاحب نے ان سے انکار کر دیا لیکن جب سر
(گورنر) نے بھی ان سے کئی بار کہا تو وہ دو شرطوں کے ساتھ
رہ ہو گئے۔ ان کی شرطیں یہ تھیں۔
انتخاب متفقہ ہو اور میں کسی سے رائے کے واسطے نہیں کہوں گا۔
سرے شخص کی تلاش جاری رہے اور ایک سال کے اندر اندر دوسرا
منتخب کر لیا جائے۔
اب صاحب نے یہ شرطیں اس لیے عائد کی تھیں کہ انہیں وائس چانسلری
کاری مل جائے کیونکہ وہ سیاسی میدان چھوڑنا نہیں چاہتے
نے ان کی یہ خواہش پوری کی اور سر ضیاء الدین خاں نواب
نسلر مسلم یونیورسٹی) کے اختلاف کی وجہ سے ان کا تقرر متفقہ
(۱۵)

۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخاب میں مسلم لیگ اور کانگریس کے
ں نے اکثریت حاصل کر لی تھی اس لیے انہیں صوبے میں وزارت بنانے
دی گئی لیکن انہوں نے بعض آئینی قباحتوں اور دستوری
وجہ سے اس سے انکار کیا۔ سر ہیری ہیگ گورنر یوپی نے
نب چھتاری (سابق گورنر) کو دعوت دی کہ وہ وزارت کی تشکیل
ب صاحب نے کہا کہ میری پارٹی (نیشنل ایگری کلچرل) اقلیت
تو میں وزارت کی تشکیل کیسے کر سکتا ہوں۔ مگر سر ہیری ہیگ
رزور دیتے رہے۔ کیونکہ گورنر کی رائے یہ تھی کہ گورنر کی
سے بہتر ہے کہ صوبے میں منتخب شدہ لوگوں کی حکومت ہو
لیت میں ہوں۔ نواب صاحب کا بھی یہی خیال تھا کہ عوام کے نمائندوں
سرکاری ملازمین کی حکومت سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ خاص کر ایسی

صورت میں جبکہ سرکاری ملازمین کا فعال حصہ بدیسی ہو چنانچہ وہ
اس پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے یوپی میں تین اپریل ۱۹۳۷ء کو ایک عارضی
حکومت بنائی اور خود اس کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ ان کی حکومت کے
ممبران حسب ذیل تھے (۱۶)

(۱) احمد سعید خاں (۲) سر جے۔ پی۔ سری واستو (۳) نواب محمد یوسف
(۴) راجہ بیشور دیال سیٹھ (۵) راجہ احمد علی خاں علوی سلیم پور (۶)
راجہ دُرگا نرائن سنگھ (۷) مہاراج کنوار وجے ہا نگرم (وزیر حکومت)

وہ ۱۶ جولائی ۱۹۳۷ء تک اپنے مفوضہ فرائض پوری ذمہ داری
اور مستعدی سے انجام دیتے رہے۔ چند مہینوں کے بعد جب کانگریس
وزارت بنانے پر آمادہ ہو گئی تو انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا
اور اسی جوش و جذبہ اور لگن کے ساتھ حزب مخالف کے قائد کی
حیثیت سے کام کرنے لگے۔ وزارت کے ہنگاموں اور سیاست کی سرگرمیوں
کے ساتھ ساتھ وہ سماجی خدمات میں بھی برابر مصروف رہے۔ سماجی
تحریکات سے تعلق اور تعاون کے پیش نظر ہی گورنر جنرل لارڈ ولنگڈن
جو ہندوستان کے چیف اسکاؤٹ بھی تھے نے انہیں ستمبر ۱۹۳۵ء میں کل ہند
بوائے اسکاؤٹ کا چیف کمشنر مقرر کیا۔ یہ خدمت ان کے لیے اگرچہ
اعزازی تھی مگر تھی بہت دلچسپ۔ یہ تحریک بالکل غیر سیاسی تھی۔ اس کا
مقصد یہ تھا کہ نوعمری کے زمانے ہی سے تہذیب نفس اور خود اعتمادی
کی لگن پیدا کی جائے۔ نوجوانوں میں خدمت خلق کا جذبہ بیدار کیا جائے
اور صاف ستھرے کھیلوں اور تفریحی مشاغل کے ذریعے ان میں وہ صفات
پیدا کی جائیں جن سے وہ خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کریں اور
پھر انہیں خوش دلی کے ساتھ برداشت کریں اور اس کے نتیجے میں
وہ اچھے اور کارآمد شہری ثابت ہوں۔

یکم فروری ۱۹۳۷ء کو نواب صاحب نے کل ہند اسکاؤٹوں
کی جمبوری کا دہلی میں افتتاح کیا اس میں ہندوستان کی دیسی
ریاستوں اور برطانوی ہند کے چار ہزار نوجوانوں نے حصہ لیا وہ کل
ہند بوائے اسکاؤٹ تحریک سے اگست ۱۹۴۷ء تک وابستہ رہے
اور اس کی ترقی و توسیع کی خاطر ملک کے بہت سے حصوں کا دورہ
کیا۔ ان کے دور میں اسکاؤٹ کی تعداد ۲۸۵۰۳ ، ۲ سے بڑھ کر ۴۴۰،۳۳۹

ئی تھی۔ اس کے صلے میں انہیں اپریل ۱۹۳۹ء میں سلور وولف (SILVER WOLF) کا تمغہ بھی ملا جو اس وقت بین الاقوامی بوائے سکاؤٹ کا سب سے بڑا تمغہ سمجھا جاتا تھا۔

حکومت ہند نے ۱۹۶۸ء میں دہلی میں ایک عمارت بنوائی تھی س کا نام ان کے کارناموں کی یادگار کے طور پر چھتاری ہال Chhatari Hall رکھا گیا۔ اس میں اب اسکاؤٹ رہتے ہیں ۱۸

نواب صاحب چھتاری ابتک کے بہت سے چھوٹے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ زندگی میں انہیں جو منصب ملا سے انہوں نے حتی الوسع دیانت، محنت اور فرض شناسی کے ساتھ ا کیا۔ یو پی میں ایک وزیر بنا ایک گورنر اور پھر ایک وزیر اعلےٰ کی حیثیت سے انہوں نے جس سیاسی البصیرت، ہوش مندی، دوربینی، انتظامی صلاحیت اور سخت کوشی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے حاکم و محکوم، اپنے بیگانے ور ملکی و غیر ملکی سبھی معترف و قائل تھے۔ ان کے یہی اوصاف تھے جن کی جہ سے نظام حیدرآباد نواب عثمان علی خاں نے فروری ۱۹۴۱ء میں نہیں اپنی ریاست میں وزیر اعظم کا عہدہ قبول کرنے کی پیشکش فرمائی ں وقت حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس کا رقبہ ور اسی ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ تھی۔ اس کا پنا سکہ اور اپنا ڈاکخانہ تھا۔ ریلوے اور ہوائی سروس بھی اس کی اپنی تھی س کے وزیر اعظم کا تقرر اگرچہ نظام خود کرتا تھا لیکن اس میں ہندوستان ے وائسرائے کا مشورہ ضرور شامل ہوتا تھا۔ نظام کی اس پیشکش کا ماف مطلب یہ تھا کہ نواب صاحب وائسرائے کی نظر میں بھی وزارت ظمیٰ کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔ بہرحال انہوں نے اسے ایک انعام مجھ کر قبول کر لیا جولائی ۱۹۴۱ء میں نظام کی طرف سے ان کے تقرر ا باقاعدہ اعلان ہو گیا اور وہ دہلی میں وائسرائے کے سیاسی ٹیر فرانسس ویلی سے ملتے ہوئے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان ے ماموں زاد بھائی راؤ عبدالحمید خاں منظر نے ان کی روانگی پر یہ ریخ کہی ۱۸

ری تاریخ کی جب فکر منظر ۔ کہا دل نے خدا حافظ و ناصر
۱۹۴۱ء

ابڑی سے بڑی کرسی پر بیٹھے لیکن بیٹھنے سے پہلے یہ عزم ضرور رکھا کہ جب ان میں اس پر بیٹھنے کی اہلیت نہ رہے گی تو وہ اسے چھوڑ دیں گے کرسی سے بلاوجہ چپٹے رہنا اُن کے مسلک میں جائز نہ تھا۔ اس لیے نظام سے پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے عرض کر دیا تھا کہ حضور میں یہاں ملازمت کی وجہ سے نہیں رہوں گا۔ سرکاری طور پر میرے تقرر کا زمانہ خواہ کتنا ہی ہو مگر حضور جب یہ خیال کریں کہ میری موجودگی حیدرآباد کے لیے مفید نہیں ہے تو ارشاد فرما دیں۔ میں استعفےٰ پیش کر دوں گا اور یہی حق مجھے بھی حاصل رہے گا۔ نظام یہ سن کر خاموش رہے اور ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نواب صاحب نے اس گفتگو کے بعد پہلی ستمبر ۱۹۴۱ء کو اپنے عہدے کا جائزہ (چارج) لیا اور سات افراد کی کابینہ ترتیب دے کر ریاست کے نظم و نسق میں لگ گئے۔ انہوں نے وہاں جو کارہائے نمایاں انجام دیے انہیں نظام نے بھی پسندیدہ اور قابل قدر قرار دیا اور خوش ہو کر ان کی تین سالہ تقرری کو پانچ سال کے لیے مستد کر دیا۔ نظام ان کی وفادارانہ خدمات سے آخر تک مطمئن رہے اور ان پر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے جون ۱۹۴۵ء میں اپنی سالگرہ کے موقع پر سعید الملک کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹

ریاست حیدرآباد ایک خوش حال ریاست تھی اور وہاں کے لوگ عموماً مرفہ الحال تھے۔ اس کی مالی حالت دوسری ریاستوں سے زیادہ مضبوط تھی۔ نواب صاحب کے پانچ سالہ دور میں اس کی مجموعی حالت اور زیادہ مستحکم ہوئی اور اس کی ترقی اور توسیع کا دائرہ اور پھیلا۔ مثال کے طور پر حیدرآباد بنک کا قیام سر اکبر حیدری کے زمانے میں ہو گیا تھا لیکن اس کی توسیع اور ترقی ان ہی کے دور میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی سے اور بھی ایسے بہت سے کام کیے جو خاص انہی کا حصہ ہیں اور حیدرآباد کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں (۱) برطانوی حکومت سے سکندرآباد کی واپسی (۲) نظام ریلوے سے برطانوی پولس کے تسلط کا خاتمہ (۳) دہلی، بنگلور اور مدراس کے لیے دکن ہوائی سروس کا اجرا (۴) انگریز کمپنی کے ہاتھوں سے دکن کی کوئلے کی کانوں کی واپسی (۵) مدراس سے تنگ بھدرا کے پانی کے تنازعہ کا فیصلہ (۶) گوداوری کی صنعتی اسکیم کا قیام (۲۰)۔ ان عظیم الشان کارناموں کے بعد وہ جولائی ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد سے لوٹ آئے۔ ان کی جگہ مرزا اسماعیل

صدر اعظم ہوئے لیکن وہ وہاں کے حالات سے اتنے بددل ہوئے
ے اندر اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ نظام نے دوبارہ
سے ایک سال کے لیے وزارت عظمیٰ کی ذمے داری قبول
، نواب صاحب ریاست کے اندرونی انتشار اور خلفشار
ظام کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن دوستوں
حکومت کے دباؤ سے اسے قبول کر لیا اور جون ۱۹۴۷ء میں
کے صدر اعظم ہو گئے۔ اس زمانے میں پورے ملک کا سیاسی
یل ہو رہا تھا حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے اور
مستقبل کے بارے میں حکومت ہند سے بات چیت
ایسی صورت میں نواب صاحب کا پہلا کام صلاح و مشورہ
رآباد سے دہلی اور دہلی سے حیدرآباد آنا جانا تھا یہ کام
تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ دہلی میں جو فیصلہ کر کے جاتے
ب نظام کی مشیر اس پر رضامند نہ ہوتے۔ وہ نئی تجاویز
دہلی لوٹتے تو وہاں بھی ان سے اتفاق نہ کیا جاتا تھا
نر انہوں نے خرابیٔ صحت کی بنا پر استعفیٰ پیش کر دیا اور
ر مہینے گنا کر ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو علی گڑھ واپس آ گئے۔
ی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نواب صاحب کو غیر معمولی محبت تھی
ایک ہی رنگ نظر آتا تھا اور وہ رنگ تھا اس کی اچھائیوں کا
انہیں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ وہ اس کی خدمت کو اپنے
ز اور باعث عزت سمجھتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین
ہ وائس چانسلر ہو کر آئے تو نواب صاحب پرو چانسلر ہو گئے۔
یں وہ راجیہ سبھا کے رکن بھی منتخب ہوئے اور ایک وفد
ر گئے۔ اس وقت سیدنا طاہر سیف الدین یونیورسٹی کے چانسلر
۱۹۶۵ء میں سیدنا کا انتقال ہوا تو وہ چانسلر منتخب ہوئے
ک اسی منصب پر متمکن رہے۔ چانسلر ہونے پر انہوں نے
ہ ہوئے فرمایا۔

پ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا چانسلر بنا کر میری
ی عزت افزائی کی ہے۔ اس سے پہلے مجھے یو پی کا گورنر
نے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت میں یو پی کی تمام
یونیورسٹیوں کا چانسلر بن گیا۔ جب میں حیدرآباد کا
وزیر اعظم ہوا تو عثمانیہ یونیورسٹی کا چانسلر بھی ہو گیا
لیکن ان دونوں اعزازات کا تعلق گورنر اور وزیر اعظم
کے منصب سے تھا لیکن مسلم یونیورسٹی کا چانسلر ہونا
میرے لیے عزت کا باعث بھی ہے اور مجھے فخر بھی ہے کہ میں
اس اعلیٰ تعلیمی ادارے کا ایک طالب علم بھی رہ چکا ہوں۔ اگر
آپ نے مجھے یونیورسٹی کی مسجد کی صفائی کا کام بھی دے
دیا ہوتا تو میں اسے خوشی سے قبول کرتا اور اس پر بہت
ناز کرتا۔"

یونیورسٹی سے ان کی محبت کا اظہار محض زبانی نہیں تھا بلکہ اس کی کچھ
عملی شکلیں بھی ظہور میں آئیں۔ انہوں نے سوئمنگ باتھ کی ارامنی میں اپنے
خرچے سے "چھتاری مینس پویلین" بنوائی۔ میرس ہوسٹل کی تعمیر میں ہاتھ
بٹایا اور چھتل ہوسٹل کی تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے
ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا جس سے ہونہار طلبا کو وظائف دیتے اور غریب
طلبا کی مدد کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے مخیر تھے اور اپنی اولاد
کو بھی اس کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ ہر سال سردیوں میں باڑہ (جاڑا)
بھی تقسیم کرتے تھے۔ باڑہ میں غریبوں کو رضائیاں بانٹی جاتی تھیں اور
نقدی بھی دی جاتی تھی۔ یہ سنت ان کے دادا کے زمانے سے چلی آ رہی
تھی بجز ۱۹۴۷ء کے علاوہ اس میں کبھی ناغہ نہ ہوا۔ انہوں نے اپنے نومبر
۱۹۲۵ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ آج سالانہ باڑہ کی تقسیم تھی۔ نو
سو رضائی اور تین ہزار کے قریب روپیہ تقسیم ہوا۔[۲۱] وہ ہر اچھے اور تعمیری
کام میں لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ انہوں نے بلند شہر کے اسپتال کی تعمیر
میں بھی گیارہ ہزار کا چندہ دیا تھا۔[۲۲]

نواب صاحب عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر ایک
کے دوست تھے اور ہر مکتب فکر میں انہیں یکساں مقبولیت حاصل تھی
وائسرائے ہند کے وہ معتمد علیہ تھے۔ کانگریسیوں نے کبھی ان پر شک نہیں
کیا۔ موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، وائی چنتامنی اُن کی عزت
کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے
وہ دوست تھے اور سیاسی و نظریاتی اختلاف کے باوجود دونوں نواب صاحب

کے بارے میں اتفاق تھا۔ ان کو دین بھی عزیز تھا اور دنیا بھی۔ خلوص و مروت اور اخلاق و وضعداری جو ہمارے اسلاف کی تہذیب کا طرۂ امتیاز تھا ان میں بدرجہ کمال موجود تھا۔ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ قومی اور ملی کاموں کے لیے عموماً ان کی مٹھیاں کھلی رہتی تھیں۔ وہ علی گڑھ اور بلند شہر کے کئی تعلیمی اداروں کے سرپرست تھے اور حسب ضرورت ان کی اعانت کرتے رہتے تھے۔ چھتاری میں عربی کا ایک مدرسہ ان کے دادا مرحوم کے زمانے سے موجود تھا جس میں پڑھنے والے طلبہ کو پورا صرفہ دیا جاتا تھا۔ نواب صاحب نے ایک مرتبہ بتایا کہ بنگال کا ایک طالب علم بارہ سال تک ان کے مدرسے میں پڑھتا رہا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ وطن واپس جانے لگا تو اسے زادِ راہ بھی دیا گیا۔ دینداری اور مشرقیت ان کی سیرت کے دوام اجزا تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں تمام جائداد اپنے بیٹوں اور بیٹیوں میں تقسیم کر دی تھی اور ہر ایک کو اس کے شرعی حصے پر قبضہ دلا دیا تھا۔ ان کا پسندیدہ لباس شیروانی پاجامہ اور ٹوپی تھا۔ انہوں نے سرکاری تقریبات کے علاوہ جہاں "یونیفارم" پہننا لازمی تھا ہمیشہ اسی لباس کو ملبوس کیا۔ (۲۳) انہیں فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی تھی اور وہ شعر و ادب کا ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے شاعری تو کبھی نہیں کی لیکن نثر بڑی صاف اور شستہ لکھی ہے۔ ان کی نثر کا نمونہ ان کی آپ بیتی "یادِ ایام" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کوئی پیشہ ور مصنف نہیں تھے لیکن انہوں نے جو آپ بیتی قلم بند کی ہے وہ اردو زبان کی اس صنف میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ان کے تجربات اور محسوسات اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہیں لیکن انہیں بڑی بےباکی، صفائی اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ (۲۴) زبان کی سلاست، مزاحیہ رنگ اور برمحل اردو فارسی اشعار کے برمحل استعمال نے اسے ایک ادبی شان عطا کر دی ہے۔ ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اسے ایک تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے کیونکہ اس میں ہماری ملی، سیاسی اور سماجی تاریخ سے متعلق کافی اہم اور قیمتی مواد موجود ہے۔

نواب صاحب موجودہ مفہوم میں کوئی زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی طویل زندگی میں جو عظمت و عزت اور نیک نامی حاصل کی وہ ان کی ذاتی صلاحیت، فہم و فراست، خوش معاملگی، خود اعتمادی و عدم اعتمادی اور فضل الٰہی کا نتیجہ تھی۔ انہیں جب بھی کوئی عہدہ ملا تو اسے انہوں نے فضلِ خداوندی سمجھا تاہم اس سے سرِ مو بھی غرور نہیں کیا۔ قد، رعب دار چہرے، راجپوتوں جیسی مونچھوں اور بڑی بڑی عقابی آنکھوں کے ساتھ پورے کر و فر سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ اس عہدے کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی۔ آخری عمر میں ان کا سر و جیا قدرت دے جھک گیا تھا اور کندھوں پر ماہ و سال کا بوجھ نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ ثقلِ سماعت کی شکایت انہیں بہت پہلے سے تھی۔ ضعف کی وجہ سے اب ہاتھ پاؤں بھی تقریباً معذور ہو گئے تھے اور وہ اکثر بیمار بھی رہنے لگے تھے۔ اسی حالت میں انہوں نے ۶ جنوری ۱۹۸۲ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور شام کے سوا پانچ بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اگلے روز یونیورسٹی کے کرکٹ میدان میں نمازِ جنازہ ہوئی اور پھر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ مرحوم کو چھتاری لایا گیا۔ چھتاری میں دوبارہ نماز جنازہ ہوئی اور ان کے خاندانی قبرستان سیدھ پور (چھتاری) میں ان کی تدفین ہوئی۔ شان الحق حقی نے ان کی تاریخ وفات کہی۔

باآں ہمہ وقار سفر کرد از جہاں ٭ نیکو نواب حافظ احمد سعید خاں
(۱۹۸۲)

نواب صاحب مرحوم کی یکے بعد دیگرے تین شادیاں ان کے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں کی صاحبزادیوں سے ہوئیں۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال شروع ہی میں ہو گیا اور ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری بیوی نے ایک صاحبزادی ہاجرہ اور تین صاحبزادے راحت سعید خاں، فرحت سعید خاں اور ابن سعید خاں یادگار چھوڑے۔ دوسری اہلیہ کے انتقال کے وقت ہاجرہ نو سال، راحت پانچ سال، فرحت تین سال اور ابن سعید صرف سوا ماہ کے تھے۔ ان کی تیسری اہلیہ جن کا نام نامی فاطمہ تھا، سے نسیم فاطمہ، عشرت سعید خاں، تنویر فاطمہ، انور سعید خاں اور تزئین فاطمہ پیدا ہوئے۔ نواب صاحب مرحوم کے یہ تمام بچے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہے اور یہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی۔ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔

…بان حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے
…ے ملکوں میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے نیک نامی حاصل
…سیں شعر و شاعری کا اچھا ذوق تھا اور علی گڑھ کے زمانۂ قیام
…ہ شاعری بھی کرتے تھے. ان کی ہمشیرہ تسنیم فاطمہ نے ادب کی
دوسری شاخ افسانہ نگاری کو اپنایا اور اس میں نام پیدا کیا. ان
کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور نقادانِ فن سے خراجِ
تحسین حاصل کر چکے ہیں ان کے افسانے تسنیم سلیم چھتاری کے نام سے سویرا،
اور اردو کے دوسرے معیاری و ادبی رسائل میں چھپتے تھے۔
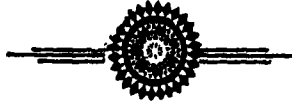
"اس صوبہ میں کیا بلکہ ہندوستان میں ایسے آدمی کم ملیں گے جن کا
تجربہ اتنا وسیع ہوا اور اتنے عرصہ تک اتنے بڑے عہدوں پر رہے ہوں
اور نیک نام رہے ہوں. نواب صاحب کی طبیعت بہت سنجیدہ واقع ہوئی
ہے اور صلح کل کے اصول پر عمل کرتے رہے ہیں. یہاں پر میں صرف
اس قدر لکھوں گا کہ جوں جوں مدت گذرتی گئی آپ کا علمی شوق
بڑھتا گیا اور خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی. آخر کار راؤنڈ ٹیبل
کانفرنس میں ان کے ساتھ کام کرتا رہا وہاں پر جو ہندو مسلمانوں کے
جھگڑے ہو رہے تھے، میں صرف یہ کہوں گا کہ وہاں بجائے آگ لگانے
کے ہمیشہ آگ بجھانے کی نواب صاحب نے کوشش کی.

میں نواب صاحب کو نیک مزاج، شریف، علم دوست
اور ملک کا بہی خواہ سمجھتا ہوں اور میرے دل میں کبھی یہ خیال
نہیں پیدا ہوا کہ وہ کبھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک کو ضرر
پہنچائیں گے۔"

سر تیج بہادر سپرو
۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء

حوالہ جات

۱۔ نواب سر احمد سعید خاں۔ یاد ایام، حصہ دوم۔ صفحہ ۱۸۶

۲۔ شیخ محمد عبداللہ۔ مشاہدات وتاثرات ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۶۵

۳۔ ضیاء الدین احمد علوی۔ مرآۃ الانساب ۱۹۱۶ء صفحہ ۱۸۱

۴۔ نواب سر احمد سعید خاں۔ یاد ایام، پہلا حصہ ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۴۷

۵۔ ایضاً۔ صفحہ ۴۷

۶۔ ایضاً۔ صفحہ ۵

۷۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۳

۸۔ ” ۔ صفحہ ۲۶

۹۔ ایس۔ کے بھٹناگر۔ ہسٹری آف دی ایم۔ اے۔ او کالج ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۳۸

۱۰۔ ایضاً۔ صفحہ ۳۱۱

۱۱۔ نواب سر احمد سعید خاں۔ یاد ایام۔ پہلا حصہ ۱۹۴۴ء۔ صفحہ ۱۷

۱۲۔ یاد ایام۔ حصہ اول۔ صفحہ ۱۱۰

۱۳۔ یاد ایام۔ حصّہ اول۔ صفحہ ۲۲۹

۱۴۔ یاد ایام۔ حصّہ دوم۔ صفحہ ۱۴۳ (۱۵) یاد ایام، حصہ دوم صفحہ

۱۶۔ یاد ایام۔ حصّہ سوم۔ صفحہ ۲۶

۱۷۔ آبگینہ۔ مرتبہ محمد سمیع الدین۔ فروری ۱۹۸۲ء بلند شہر۔ صفحہ ۷

۱۸۔ یاد ایام۔ حصّہ دوم۔ صفحہ ۱۴۸

۱۹۔ یاد ایام۔ حصّہ سوم۔ صفحہ ۱۷۱

۲۰۔ ” ” ” ” ” ۔ ۲۳۶

۲۱۔ ” ” حصہ اول۔ صفحہ۔ ۱۵۲

۲۲۔ ” ” ” ۔ ” ۔ ۱۴۶

۲۳۔ ” ” ” دوم۔ ” ۔ ۱۴۹

۲۴۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ
مشمولہ علی گڑھ تحریک۔ مرتبہ نسیم قریشی۔

مولانا اسلم جیراجپوری

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی

مولانا اسلم کی ولادت ۱۱ جنوری ۱۹۰۲ء میں اعظم گڑھ کے مردم خیز خطہ جیراجپور میں ہوئی۔ اس زمانہ میں بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں نے علمی اور دینی شمع روشن کر رکھی تھی اور ہر جگہ کے علماء ان کی مجلس میں جمع رہتے تھے۔ مولانا اسلم کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب اپنے زمانہ کے مشہور عالم دین اور حدیث اور علوم حدیث کے بہت بڑے ماہر تھے۔ مولانا اسلم کی پیدائش کے وقت وہ حج کے لیے گئے ہوئے تھے جب وہاں سے واپس ہوئے تو ان کو بھی نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال بلا کر مدرسہ وقفیہ کی صدر مدرسی تفویض کی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ سلیمانیہ کا نائب مہتمم بنایا، پھر اسی مدرسہ کے مہتمم اور ریاست کے شعبہ تعلیم کے ذمہ دار بنائے گئے۔ وہ سال میں ایک بار وطن آتے اور ضروری کاموں کی دیکھ بھال اور انتظام کرتے۔

جب مولانا اسلم کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو ان کو اس زمانہ کے رواج کے مطابق مدرسہ میں داخل کیا گیا، اس زمانہ میں ہر گاؤں میں مکتب ہوا کرتے تھے جہاں مسلمان بچوں کی تعلیم کا خاص طور سے انتظام ہوتا تھا۔ مدرسین عام طور سے دینی تعلیم اور حفظ وغیرہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ تعلیم زبان سے زیادہ چھڑی کے ذریعہ دی جاتی تھی جس مکتب میں مولانا کا داخلہ ہوا اس کی روایت بھی یہی تھی وہاں کے ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے خود لکھا ہے کہ،

"ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسی لٹکائے رکھتے جس میں قصوروار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر ان کی ہیٹھوں پر چھڑیاں توڑا کرتے، لڑکے جس قدر ان سے ڈرتے تھے دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔"

لیکن مولانا سلامت اللہ صاحب نے ان صاحب کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو محض مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لیے یہاں لائے ہیں اس لیے ان کے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے ۔ ویسے مولانا اسلم اتنے ذہین تھے کہ اگر یہ ہدایت نہ بھی ہوتی تو بھی غالباً ان کو سزا نہ ملتی، ان کو جو سبق دیا جاتا تھا اسے بہت آسانی سے اور جلد یاد کر لیتے۔ ایک سال کے اندر اندر انہوں نے ابتدائی درس اور قرآن مجید کے تین پارہ یاد کر لیے۔ اسی سال جب ان کے والد چھٹیوں میں گھر آئے تو واپسی پر اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لیتے گیے، بھوپال پہنچنے کے بعد والد نے ان کو سب سے پہلے حفظ قرآن میں لگایا۔

مولانا اسلم چونکہ ذہین تھے اس لیے بہت جلد تقریباً دو سال میں قرآن مجید حفظ کر لیا، اسی دوران میں ان کو شدید بیماری نے تین ماہ گھیرے رکھا جس میں ان کی زندگی کی توقع بہت کم رہ گئی تھی، لیکن والد کی دعاؤں اور والدہ کی دیکھ بھال نے ان کی صحت کو بحال کیا۔ ان کی صحت پر خوشیاں منائی گئیں اور صدقات و خیرات تقسیم ہوئی۔ والدہ نے اپنے سارے زیور ان کی صحت پر خیرات کرنے کی منت مانی تھی وہ پوری کی

مولانا اسلم نے تقریباً نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا، اسی

سال ان کو تراویح میں قرآن مجید سنانے کا حکم ملا، بڑی محنت اور
توجہ سے انہوں نے اسے خوب رواں کیا اور تراویح میں سنانا شروع
کیا۔ ان کی آواز اچھی اور حافظہ عمدہ تھا ساتھ ساتھ قرأت کے
اصولوں کے مطابق پڑھتے تھے اس لیے لوگ بہت پسند کرتے اور
بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ ستائیسویں شب کو ختم کے لیے
منتخب کیا گیا، پوری مسجد سجائی گئی، مٹھائیاں بنیں، نواب صاحب
کی طرف سے کئی بورے بتاشے اور روپے آئے۔ مولانا اسلم نے اس کا
حال تفصیل سے لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔ اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا
گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس
میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ یہ میری بدولت حاصل
ہوئی ہے۔ شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتا اور
پائجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار
کیا تھا۔ اب تک مجھ کو اس کرتے کے رنگ و بوٹے
یاد ہیں، اس وقت مجھ میں عقل نہیں تھی ورنہ اس
کو پیراہن یوسف کی طرح زندگی بھر کے لیے محفوظ کر لیتا۔"

حفظ قرآن کے بعد فارسی زبان کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس زمانہ
میں عام طور پر جو رسائل و کتب اس زبان کے تھے وہ بہت جلد اور
آسانی سے ختم کر لیے گلستاں اور بوستاں جو فارسی کی کلیدی کتابیں
سمجھی جاتی ہیں زبانی یاد کر لیں، اسی کے ساتھ ساتھ فارسی لکھنے
کی مشق بھی شروع کی اور جلد ہی خاصی دستگاہ حاصل کر لی۔ ان
کے فارسی کے استاد مولوی فتح اللہ صاحب تھے، انہوں نے ایک بار
مطالعہ کی اہمیت ظلمات اور آب حیات کے قصے تلمیحی انداز میں بیان
کیے:

"ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آب حیات سے
معانی، جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے وہ
گویا خضر ہے کہ ظلمات سے آبحیات لاتا ہے اور یہ قدرت
صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے
اور جو شخص ہر قدم پر استاد کا محتاج ہے وہ اس سے محروم
رہتا ہے جیسے سکندر کو خضر کی رہنمائی سے بھی آب
حیات اس کو نصیب نہ ہو سکا۔"

اس کا اثر مولانا پر بے انتہا ہوا اور انہوں نے اپنی تعلیمی
زندگی میں اسباق کا مطالعہ اپنے لیے لازمی کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
دوسرے طلبا کے مقابلہ میں ہمیشہ ان کو امتیازی حیثیت حاصل
رہی۔ اسی زمانہ میں فارسی میں شعر بھی کہنے لگے مگر ان کے والد کو یہ
پسند نہ تھا اس لیے انہوں نے منع کر دیا۔

فارسی کے ساتھ ساتھ ریاضی کی تعلیم بھی حاصل کی، اس میں ان
کے پہلے استاد مولوی شاہ محمد صاحب تھے اور دوسرے مولوی محمد اکبر
خاں صاحب۔ اپنی خداداد ذہانت کی بنا پر اس کی ضروری تعلیم بھی
جلد ہی مکمل کر لی۔ اس زمانہ میں انگریزی کا بھی خاصا چلن تھا اور
اس کی تعلیم بھی اہم اور ضروری سمجھی جاتی تھی۔ مولانا نے اسی زمانہ
میں انگریزی بھی پڑھی۔ عربی زبان میں اچھی استعداد پیدا کرنے کے
لیے گرامر میں مہارت ضروری ہوتی ہے اس لیے انہوں نے بھی عربی
صرف و نحو میں اچھی مشق کی، اسی کے ساتھ ساتھ فقہ اور اصول فقہ
کی تعلیم بھی حاصل کی، اسی دور میں فقہی مسائل سے بھی دلچسپی پیدا
ہوئی۔ خاص طور سے مسئلہ حجب سے، ان کے لیے یہ بات بڑی تکلیف
دہ تھی کہ دادا کی موجودگی میں پوتا باپ کی وراثت سے محروم رہے۔
بعد میں انہوں نے اس سلسلہ میں غیر معمولی محنت کی اور پوری چھان
بین اور قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ کے بعد محجوب الارث کے نام
سے ایک رسالہ لکھا جس میں بہت تفصیلی بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ یتیم
اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

منطق فلسفہ اور ادب کی تعلیم انہوں نے اپنے والد سے حاصل
کی، حدیث اور قرآن بھی اپنے والد ہی سے پڑھا۔ ان کے والد مولانا
سلامت اللہ صاحب علمائے اہل حدیث میں ایک اہم مرتبہ رکھتے تھے
حدیث اور اس کے فن پر ان کی گہری نظر تھی، قرآن کے بھی وہ ایک
اچھے عالم تھے اور بہت سی تفسیروں کا مطالعہ کرنے سے اس کے
بہت سے امور سے پوری طرح واقف تھے۔ مولانا اسلم نے ان سے
پوری طرح فیض اٹھایا۔ اس زمانہ میں تعلیم سے زیادہ تربیت پر

یاجاتا تھا۔ آداب درس کے ساتھ آداب محفل کا خیال ضروری
ان کے والد درسی کتب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی
توجہ رکھتے تھے اور مناسب موقعوں پر نصیحت بھی کرتے
تھے۔

مولانا کی زندگی پر دو شخصیتوں کا خاص اثر پڑا ایک مولوی
للہ کا جنہوں نے ان کے دل میں علم کی شمع روشن کی اور دوسرے
سلامت اللہ صاحب جو ان کے والد تھے اور جنہوں نے شمع
روشن رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت اور اخلاقی
ری کے لیے پوری کوشش کی۔ وہ کٹر اہلحدیث تھے مگر دوسرے
ب کے لوگوں کا پورا خیال رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہر شخص ان سے
کرتا تھا اور ان کے وعظ ہر شخص کو پسند آتے تھے۔ مزاج کے اعتبار
بہت نیک ایماندار اور کھرے انسان تھے۔ روپیہ پیسے سے ان کو
ذ نہ تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ غفور و رحیم ہونے کے باوجود بھی
ق عباد کو معاف نہیں کرے گا۔ ۱۹۰۴ء میں ان کا انتقال ہوا اور
پال ہی میں تدفین ہوئی۔

مولانا اسلم کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا اس سے ان کو
بھی فائدہ پہونچا اور ان کے ساتھیوں کو بھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا
استعداد کے طلباء ان سے پڑھنے آجاتے تھے اور کبھی کبھی والد
کوئی طالب علم ان کے سپرد کر دیتے تھے اس سے ان کے علمی
ن کو تسکین ہوتی تھی۔ ان کے مطالعہ کی رفتار تقریباً سو صفحے روز
وہ بھی اس طرح کہ جو پڑھتے اسے پوری طرح یاد بھی رکھتے۔ یہ
العہ مذہب تاریخ اور ادب وغیرہ سے متعلق ہوتا تھا۔ علامہ ابن قیم
تیمیہ اور دوسرے علماء کی کتابیں بہت توجہ سے مطالعہ کرتے تھے،
ریال میں جو کتابیں دستیاب ہوسکیں وہ سب پڑھیں پھر جب
ہور میں قیام ہوا تو وہاں کی پبلک لائبریری اور دوسرے شخصی
ب خانے دیکھ ڈالے پھر علی گڑھ آنے کے بعد علوم مشرقیہ کے کتب
نہ کی طرف توجہ کی، اس کی نگرانی بھی ان کے ذمہ تھی اس لیے مطالعہ
اور بھی زیادہ وقت ملا۔ اتنا زیادہ پڑھنے سے ان کے علم کی گہرائی میں
[illegible]

اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ دنیا میں پڑھنے سمجھنے اور عمل کرنے کے
لیے صرف ایک ہی کتاب ہے جو ہر اختلاف سے مبرا اور ہر تضاد سے
پاک ہے اور جسے اللہ جل شانہ نے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ
علیہ وسلم پر نازل کیا اور جو رہتی دنیا تک ہدایت کا سرچشمہ رہے گا۔
اس خیال کے جاگزیں ہونے کے بعد مولانا کے فکری اور علمی انداز میں
تبدیلی پیدا ہوئی اور انہوں نے قرآن مجید ہی کو اپنی زندگی کا محور
بنایا اور اس کی آیات کو اسی کی روشنی میں دیکھتے رہے ان کا عقیدہ
تھا کہ،

> "قرآن ہی ہے جو زندہ ہے اور زندگی بخش ہے، اسی
> سے مسلمان اپنا مستقبل تعمیر کرسکتے ہیں۔ وہ نور مبین
> ہے جو انسان کے دل و دماغ کو منور کرکے اس کی
> بصیرت کو حقائق کی گہرائیوں تک پہونچاتا اور وسعت
> نظر پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کی تعلیمات کو خود اسی سے
> سمجھنے کی کوشش کی جائے اور روایات کے غلاف
> اس کے اوپر نہ چڑھائے تو امم اسلامیہ میں جس
> قدر تفرقے اشخاص و روایت پرستی سے پیدا ہوئے
> ہیں سب کو مٹا کر ملت کو متحد کرسکتا ہے"

مولانا اسلم کی ملازمت کی ابتدا لاہور سے ہوئی، ۱۹۰۳ء میں
ان کو وہاں اس زمانہ کے مشہور اخبار پیسہ میں مترجم کی حیثیت سے
رکھا گیا، تقریباً دو سال یہاں اخبار نویسی اور اس سے متعلق کاموں کا
تجربہ حاصل کیا، اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں ان کو علی گڑھ کالجیٹ اسکول
میں عربی و فارسی کی تدریس سپرد ہوئی۔ علی گڑھ آنے سے پہلے ہی ان
کو تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوگیا تھا لیکن اس کو جلا یہاں آنے
کے بعد ملی، ان کی جتنی بھی اہم اور مشہور کتابیں ہیں وہ علی گڑھ ہی کے
دوران قیام کی ہیں مثلاً تاریخ القرآن، حیات حافظ، حیات جامی وغیرہ
تاریخ القرآن اور حیات حافظ کو ۱۹۰۹ء کی صوبہ متحدہ آگرہ کی اردو کی
بہترین مطبوعات قرار دیا گیا۔

۱۹۱۲ء میں ان کے علمی ذوق اور عربی و فارسی کی مہارت کے
[illegible]

گیا جس کی دیکھ بھال اور نگرانی انہوں نے بڑی توجہ سے کی اور اس کی ایک جامع فہرست مرتب کی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مدرسۃ العلوم علی گڑھ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۲۰ء تک یہیں رہے، پھر جب اسی سال تحریک ترک موالات کا زور ہوا اور انگریزوں کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں اور آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا تو علی گڑھ ہی میں ایک قومی یونیورسٹی کی داغ بیل جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے پڑی۔ یہ ایک تڑپ تھی، ایک شعلہ تھا، ایک آواز تھی جس نے بہت سے دلوں کو گرما دیا۔ مولانا محمد علی، گاندھی جی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اس کی بنیاد رکھی اور بہت سے نوجوان ان بزرگوں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس بے سروسامان قافلے میں شریک ہوگئے۔ مولانا اسلم بھی اس تحریک کے ہمنوا ہوگئے اور علی گڑھ کی آرام دہ اور خوش کن ملازمت چھوڑ کر محض قومی جذبہ کے تحت جامعہ کے کاموں میں لگ گئے اور عمر کے آخری دنوں تک، تقریباً پینتیس سال کسی صلہ کی پرواہ اور ستائش کی تمنا کے بغیر پوری لگن صدق دلی اور دلجمعی کے ساتھ جامعہ کے مقاصد کی تکمیل میں لگے رہے۔

مولانا اسلم کا مطالعہ بہت وسیع تھا، مسائل کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت خداداد تھی اور مزاجاً وہ تقلید کے قائل نہ تھے ان کے ابتدائی زمانہ میں تحریک اہلحدیث کا زور تھا، ان کے والد خود ممتاز علمائے اہل حدیث میں شمار ہوتے تھے، ان کے پاس آنے جانے والے اور ان کے بہت سے شاگرد بھی اس تحریک کے اہم نمائندے تھے، خود مولانا اسلم بھی اہل حدیث تھے۔ اسی لیے ان کو اس تحریک کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور ان کو اسی جماعت کے طرزِ عمل سے شکایت اور بنیادی مقصد سے اختلاف پیدا ہوا، وہ خود لکھتے ہیں؛

"ابتدا میں یہ جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے جمہوری مقصد کو لے کر اٹھی تھی اور اس نے اپنا کوئی امتیازی نشان قائم کر کے اپنے آپ کو ایک جداگانہ فرقہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن مولانا اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کی کوششوں کی ناکامی کے بعد غیر شعوری طور پر اس کا رخ بدل گیا اور بجائے احیائے ملت کے صرف احیائے سنت مطمح نظر رہ گیا جس کی وجہ سے اس کا تمام تر تعامل دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ اپٹا اور یہ بھی ایک فرقہ بن کر رہ گئی جس کے تمام مقاصد جماعتی ہوگئے"

یہی وہ بنیادی تصور تھا جس نے ان کو جماعت اہل حدیث سے دور کرنا شروع کر دیا اور یہ اس پر غور کرنے لگے کہ کس طرح مسلمانوں کو اس آپسی اختلاف سے نجات دلائیں اور اسلام کی مرکزی کتاب قرآن کو زندگی کا لائحۂ عمل بنائیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں؛

"اس میں کچھ شک نہیں کہ محکومیت میں قومیں بیکار ہو کر بند پانی کی طرح سڑتی ہیں اور باہمی فرقہ بندیوں اور جھگڑوں سے اسی قسم کے فساد کی بو ان میں پیدا ہوتی ہے مگر ایک اہم سبب اس کا قرآن سے غفلت بھی ہے جو حدیثوں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا، یہ قرآن کو پڑھتے ضرور ہیں۔ اس میں غور بھی کرتے ہیں، اس کی تفسیریں بھی لکھتے ہیں، لیکن محض علمی حیثیت یا حدیثوں کی تائید کی غرض سے، انہوں نے اصل دین روایات کو قرار دے رکھا ہے جن کے اوپر ان کے تمام اعمال کا دار و مدار ہے، برامرسیں، روایتی سند کے اس قدر خوگر ہوگئے ہیں کہ تمام تر اپنے آپ کو ماضی سے وابستہ کر لیا ہے پھر آگے کیسے بڑھیں اور تقدم کی صلاحیت کہاں سے لائیں"

مولانا کے مذہبی خیالات بہت سیدھے سادے تھے لیکن ان کے معتقدین نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے انہیں توڑ مروڑ کر پیش کیا، مولانا اختلافات کو مٹانے کے قائل تھے بڑھانے کے نہیں، قرآن کو مرکزی حیثیت دینے کا بھی مقصد یہی تھا کہ دوسری چیزیں تو اختلافی ہو سکتی ہیں۔ مگر کتاب اللہ تو ہر ایک کی اپنی ہے اور یہی وہ مرکز ہے جہاں سب جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ انہوں نے اپنے مذہبی تصورات کی تبلیغ کی یا جماعتی انداز اختیار کیا ان پر بہت بڑی تہمت ہے

، جن باتوں کو اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر درست سمجھتے
ے بلا تردد اسے کہتے اور لکھتے تھے لیکن غالباً ایک مثال بھی ایسی
مل سکے گی جب انہوں نے دوسروں سے بھی اسے منوانے کی کوشش
ی ہو۔ جو لوگ ان کے قریب رہے ہیں اور جن کو ان کی شاگردی کا
فر حاصل ہے میری اس بات کی پوری طرح تائید کریں گے کہ انہوں نے
بھی اپنی کلاس میں یا اپنی مجلسوں میں اپنے عقائد کا پرچار نہیں کیا۔
یکن اس کے باوجود ان کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں
س سلسلہ میں ان کے شاگرد پروفیسر شبیر الحق نے بہت صحیح لکھا ہے:

"اس غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی
کہ ان کے بعض خاص شاگردوں نے بازار میں اپنے
ساکھ پیدا کرنے کے لیے ان کی ذات کو اور ان کے
نام کو بہت غلط طریقے سے استعمال کیا۔ انہوں نے اپنی
قیادت کا سکہ چلانے کے لیے مولانا کو دنیا کے سامنے
ایک داعی ایک مبلغ ایک کنورٹر کی حیثیت سے
پیش کیا حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ مولانا کی سب سے
بڑی خصوصیت یہی تھی کہ وہ اپنے خیال کے مبلغ کبھی
بھی نہیں رہے انہوں نے سوچنے کی دعوت ہر ایک
کو دی لیکن ایمان لانے پر کسی کو مجبور نہیں کیا۔"

مولانا عبد السلام قدوائی صاحب جنھوں نے مولانا اسلم کو
بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا اور برسوں ساتھ کام کیا تھا
ان کے مذہبی عقائد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باہر کے لوگ جنھوں نے مولانا کے مضامین کبھی پڑھے
ہیں اور ان سے زیادہ وہ لوگ جنھوں نے دوسروں
کی زبانی مولانا کے خیالات سنے ہیں وہ ان کے
سمجھنے میں بہت غلطی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ
سنی سنائی باتوں کی بنا پر انہیں اہل قرآن سمجھتے ہیں
اور اہل قرآن سمجھ کر وہ تمام باتیں ان کی طرف منسوب
کرتے ہیں جو عبد اللہ چکڑالوی وغیرہ منکر حدیث
متشدد اہل قرآن کہتے تھے۔ لیکن یہ خیال بالکل صحیح
نہیں ہے انہوں نے جابجا خود اس غلط فہمی کو دور کرنے
کی کوشش کی ہے اور مختلف مضامین میں اپنے عقائد و
خیال کو واضح کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منکرین حدیث
کی طرح وہ اصولاً احادیث کو ناقابل اعتبار نہیں
سمجھتے تھے، رسول اللہ صلعم کو امت کا مقتدیٰ مانتے
تھے اور آپ کے احکام کو واجب الاتباع سمجھتے تھے'
وہ صرف یہ بات کہتے تھے کہ احادیث کی جانچ کے
لیے قرآن مجید کو معیار قرار دیا جائے جو روایات
قرآن مجید کے موافق ہوں انہیں تسلیم کیا جائے اور
جو آیات الہی کے خلاف ہوں انہیں صحیح نہ مانا جائے۔
یہ مسلک کوئی نیا مسلک نہیں ہے، اصول حدیث
کی تمام کتابوں میں یہ بات لکھی ہوئی ہے اور سلف
سے آج تک تمام محدثین کا یہی مسلک ہے، البتہ مولانا
کے دل میں مختلف وجوہ سے یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ احادیث
کی نقل میں راویوں نے احتیاط کم کی ہے اس بنا پر
ان کی نظر میں روایات کا وہ وزن نہ تھا جو جمہور امت
کی نظر میں ہے اسی لیے روایات کو قرآن مجید سے
منطبق کرنے میں جس قدر جمہور کوشش کرتے رہے
ویسی کوشش وہ نہ کرتے تھے اور آسانی سے انہیں نظر
انداز کر دیتے تھے۔ البتہ وہ سنت یا عمل متواتر کے
پورے طور پر قائل تھے، یہی وجہ ہے کہ عام اہل قرآن
کی طرح انہیں اپنی دینی زندگی میں اسلامی تعلیم
پر عمل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہے افسوس
ہے کہ نہ مخالفین نے انہیں صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی
نہ معتقدین نے، بلکہ معتقدین کے خیالات اور افکار نے
تصحیح خیالات کے بجائے اور بھی ان کی طرف بدظنی
میں اضافہ کیا۔ وہ قطعی قول رسول صلعم کے منکر نہ تھے
بلکہ روایات کو رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرنے
میں بڑے محتاط تھے۔"

یہ تو ان کے مذہبی خیالات و عقائد کی بات تھی اب آئیے ان کے علمی و ادبی کارناموں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ جب کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں مولانا کی تعلیم و تربیت علمی فضا میں ہوئی تھی ان کے والد کے پاس مختلف قسم کے علماء آتے رہتے تھے، بھوپال اس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز سمجھا جاتا تھا، کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا مولانا اسلم کو مطالعہ سے شروع ہی سے بہت دلچسپی تھی ہر قسم کی کتاب کو پڑھتے اور خامیوں اور خوبیوں کو پرکھتے۔ علمی و ادبی مباحثوں میں شریک ہوتے اور فیض اٹھاتے۔ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ میں مضامین اور چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھنے لگے تھے اور شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ پھر جب لاہور سے علی گڑھ آئے اور یہاں کی علمی فضا اور کتب خانہ سے استفادہ کا موقع ملا تو علمی تخلیقات منظر عام پر آنے لگیں۔ حیات حافظ، حیات جامی، تاریخ القرآن وغیرہ نے ان کی شہرت اور علمی حیثیت کو مستحکم کیا۔ تاریخ الامت نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا اور آٹھ جلدوں میں اس کتاب نے اسلامی تاریخ کا مکمل احاطہ کر لیا اور بہت مستند اور مقبول سمجھی گئی۔ تاریخ نجد لکھ کر مولانا نے نجدی تحریک (وہابی تحریک) اور وہاں کی پوری تاریخ اور اس تحریک کے بانی شیخ محمد بن عبدالوہاب کی زندگی کے تفصیلی حالات اور علمی و عملی کارناموں کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ اردو زبان میں اس تحریک سے متعلق یہ پہلی کتاب تھی اور اسی کے ذریعہ اردو داں طبقہ کو اس تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملی۔

ان کے علاوہ علوم عرب، خواتین، الوراثت فی الاسلام، سیرت عمرو بن عاص، تعلیمات قرآن، نکات قرآن، عقائد اسلام اور مضامین کے مجموعے مقالات اسلم، نوادرات ہمارے دینی علوم اور نظموں کا مجموعہ جواہر طبع، علامہ اقبال کی بعض نظموں پر تنقیدی مضامین وغیرہ ہیں، علوم اسلامی پر ان کی نظر اور ان کے ادبی کارناموں کے بارہ میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے:

"علوم اسلامی اور عربی و فارسی زبان و ادب پر مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر بڑی گہری تھی، اور قرآن و قرآنی علوم کی تفہیم و تشریح تو ان کی تمام فکر کا علمی سرمایہ تھا۔ تاریخ اسلام کا مضمون بھی ان کی توجہ اور گہری دلچسپی کا موضوع تھا، تاریخ و سوانح پر ان کی تعنیفات اس امر کی شاہد ہیں کہ اگر مولانا نے خاص اسی شعبہ علم کو اپنایا ہوتا تو بڑے مورخین اسلام کی صف میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا۔ قرآن فہمی اور قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کا انہیں ایک خاص سلیقہ تھا اور اس سلسلے میں انہیں ایسا ملکہ حاصل تھا جسے ہم خدا کی دین ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک اور صفت ان کی یہ تھی کہ وہ شاعر بھی تھے اور ان کے فارسی اور اردو کے اشعار بہت اچھے ہیں۔ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین ان کی ادبی بصیرت، تنقیدی صلاحیت اور انشائی قابلیت کے بڑے اچھے ترجمان ہیں۔"

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر مولانا کی ذاتی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر روشنی نہ ڈالی جائے اس لیے کہ کسی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کی گھریلو زندگی دوستوں عزیزوں اور شاگردوں سے تعلقات اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب مولانا اسلم کی بہت قدر کرتے تھے اور ہر قسم کے معاملات میں ان سے مشورہ کرتے تھے، وہ مولانا کا کردار ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"وہ ہمیشہ ایک معمول کے پابند رہے۔ ہمیشہ اپنی طبیعت کے قدرتی توازن کو قائم رکھا، وہ اپنی رائے بہت کم ظاہر کرتے تھے۔ لیکن جب ان کی رائے لی جاتی تو معلوم ہوتا کہ ان میں معاملوں کو اور طبیعتوں کو سمجھنے کی کتنی اچھی صلاحیت ہے۔ ان کا یقین ان کی دانائی کی علامت ان کی فراست ان کے ضبط کا نتیجہ تھی۔ ان کی روزمرہ کی زندگی ایسے اصولوں کی پابند تھی جن کے صحیح ہونے میں ان کو کوئی شک و شبہہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے طریقہ کو چھوڑ کر جامعہ کی زندگی پر اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ جامعہ میں

جو چیز قائم تھی وہ مولانا اسلم مرحوم کا وقار تھا
جس نے اپنے لیے جگہ مقرر کر لی اور اس جگہ سے
ہٹا نہیں یہ وقار علم کا اور عالم کا وقار تھا مولانا اسلم
مرحوم کا علم کتابی نہیں تھا، زمانے سے بے خبر نہیں تھا۔
دوسروں کے ذہن پر حکومت کرنا اپنا حق نہیں سمجھتا
تھا، اسی وجہ سے مولانا اسلم مرحوم اس کا اور اپنا
وقار قائم رکھ سکے۔،،

طہر پرویز بہت دن تک جامعہ میں مولانا کے پڑوسی رہے اور
فتلف اوقات میں مختلف انداز سے قریب سے دیکھتے رہے، انہو
ا ہے کہ؛

"جب میں مولانا اسلم جیراجپوری کے بارہ میں سوچتا
ہوں تو ایک فرشتہ کی شکل آنکھوں کے سامنے پھر
جاتی ہے اور جب کبھی فرشتہ کا خیال آتا ہے تو
مولانا اسلم جیراجپوری ہر طرف نظر آتے ہیں بلا شبہ
مولانا اسلم ان لوگوں میں سے تھے جو فلک کے برسوں پھر نے
کے بعد خاک کے پردہ سے نمودار ہوتے ہیں۔،،

ولانا روزہ نماز کے پوری طرح ہمیشہ پابند رہے، نماز
سکان مسجد ہی میں ادا کرتے تھے، اس بات کی کوشش کرتے کہ
ی رہیں مسجد ضرور قریب ہو، انہوں نے جامعہ میں جب اپنا
کان بنایا تو بھی یہ خیال ذہن میں رہا۔ مسجد کا جو بھی امام ہوتا
کے پیچھے پڑھتے تھے۔ متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ لوگوں نے ان سے
ز پڑھانے پر اصرار کیا مگر انہوں نے امام کو ہمیشہ اپنے پر
ی۔ کہتے تھے کہ امام محلہ والوں نے منتخب کیا ہے اس لیے
ں کو پڑھانا چاہیئے۔ مزاج میں بے انتہا سادگی تھی تصنع
، اور ظاہرداری سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ معمولی قسم کا
ہنتے، مختصر ترین سامان زندگی استعمال کرتے اور حد درجہ
ھانا کھاتے۔ دل میں ہر ایک کے لیے درد تھا، سب کے ساتھ
، اور محبت کا سلوک کرتے، یتیموں بیواؤں اور غریبوں کا
ال رکھتے، مسافروں اور ضرورتمندوں پر دھیان دیتے۔

جامعہ کی زندگی بہت دن تک بڑی کٹھن اور تکلیف دہ تھی
جن لوگوں کو جامعہ سے محبت تھی ان کو اس زندگی میں سکون
و طمانیت کی لذت ملتی تھی اور اسی لیے بہت سے لوگوں نے
اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال جامعہ کے نام لکھ دیئے تھے اور
کبھی حرف شکایت زبان تو کیا دل میں بھی نہ آنے دیتے تھے،
مولانا اسلم بھی ان میں سے ایک تھے۔

مولانا کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ وسیع تھا اور بہت سے لوگ
ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ مولانا ہر ایک سے اس کے معیار کے
مطابق گفتگو کرتے اور مہمانداری میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ ان
کے پاس آنے جانے والوں میں مولانا امداد صابری جسٹس سر شاہ
سلیمان، حضرت خواجہ حسن نظامی، مولانا آزاد سبحانی، علامہ مشرق
مولانا عبید اللہ سندھی، جگر مرادآبادی وغیرہ تھے۔ ان لوگوں کے
علاوہ طلباء اور پاس پڑوس کے لوگ برابر آتے رہتے تھے اور مولانا
ہر ایک کا خیال رکھتے تھے۔ مولانا کو بچوں سے بڑا لگاؤ تھا وہ بچوں
میں بچہ بن جاتے تھے اور شاید ان کو سب سے زیادہ وہی لمحے
عزیز ہوتے تھے جو وہ بچوں کے ساتھ گذارتے تھے۔ جن لوگوں
نے مولانا کو جامعہ کے گھر میں دیکھا ہے ان کو اس بات کا اندازہ
اچھی طرح ہوگا کہ ان کے گھر میں محلہ کے کتنے بہت سے بچے جمع رہتے
تھے اور مولانا اس سے ان کی ہی جیسی باتیں کر کے خود بھی خوش
ہوتے اور ان کو بھی خوش کرتے۔ ان کے مزاج کی یہی وہ خوبی تھی
جس نے ہر ایک کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا، وہ سب کے محبوب تھے
اور اس میں چھوٹے بڑے امیر و غریب، عالم و ان پڑھ کسی کی تفریق
نہ تھی۔ اطہر پرویز صاحب نے لکھا ہے؛

"اگر معصومیت، شرافت، نیک نفسی، تہذیب،
عبادت، مروّت جیسی خوبیاں انسانی شکل اختیار
کرنا چاہیں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں مولانا اسلم
جیراجپوری کے پیکر جسمانی کی تلاش ہوگی۔ کیونکہ
یہی تو وہ تمام خوبیاں تھیں جو ان کی شخصیت میں
مجتمع تھیں۔،،

رئیس احمد جعفری صاحب نے ان کے سلسلے میں لکھا ہے :

"وہ دل بغض، کینہ، عناد سے بالکل خالی۔ بلکہ اس میں ان فنونِ لطیفہ کی سرے سے گنجائش ہی نہیں مولانا کا سب سے بڑا اور میری نظر میں قابلِ تقلید وصف یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی طلبہ کو اپنے ذاتی خیالات و معتقدات سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی، صرف اپنے کام سے کام رکھا۔ ان کے متعدد شاگردوں کو ان کے مسلک کا علم اس وقت ہوا جب انہوں نے جامعہ میں ان کے مقالات دیکھے ورنہ وہ برسوں سے پڑھ رہے تھے اور ان کے فیضِ تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے تھے کبھی انہیں شبہ نہیں گذرا کہ مولانا کے مسلک میں انفرادیت ہے اور وہ اپنا کوئی مخصوص و جداگانہ مسلک رکھتے ہیں۔ مولانا جید عالم تھے لیکن ان کے لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا، نہ جبّہ اور عمامہ کے پابند ہیں نہ وعظ و تلقین کے۔ عام آدمیوں میں عام آدمیوں کی طرح رہتے ہیں یہ ہے ان کی بے نفسی اور بے لوثی۔"

مجھے مولانا اسلم کا شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے مجھے اس پر فخر ہے۔ اپنی تعلیم کے دوران میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے کلاس چھوڑا ہو۔ وقت سے کافی پہلے کالج آجاتے تھے، پہلے دفتر میں یا دفتر کے باہر بیٹھ کر اخبار پڑھتے، پھر مقررہ وقت پر کلاس میں پہنچ جاتے، دو ایک رسمی باتوں کے بعد سبق شروع ہو جاتا۔ میری کلاس کو وہ قرآن مجید کا درس دیتے تھے پڑھانے کا طریقہ انتہائی سادہ لیکن اتنا ہی دلنشیں ہوتا تھا چونکہ بہت اچھے حافظ تھے اس لیے قرآن مجید سامنے رکھے بغیر پڑھاتے تھے، آیات کا مطلب اتنی سیدھی سادی اور آسان زبان میں بتاتے کہ اس کو سمجھنے اور یاد رکھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوتی تھی پڑھاتے وقت اس بات کا دھیان رکھتے تھے کہ جو مطالب وہ بیان کر رہے ہیں وہ عام طلبا کی استعداد کے مطابق ہوں،

اس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ ایک آیت کا مطلب ا[illegible] کسی دوسری آیت سے واضح کریں، کبھی وہ ایسی کوئی با[illegible] کرتے جو بے مقصد بحث کا موضوع ہو یا کسی بھی ذہن کے لڑ[illegible] اس سے اختلاف ہو۔ امتحان کے زمانہ میں عام اساتذہ کی طر[illegible] کی بھی ڈیوٹی امتحان کی نگرانی کی ہوتی تھی۔ اس وقت ان کا خاص انداز ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں جامعہ میں امتحان مدر[illegible] میں فرش پر ہوتا تھا۔ لڑکوں کے آگے ڈیسک رکھے ہوتے۔ نگراں امتحان کے لیے ایک کرسی ایسی جگہ رکھی جاتی تھی جہا[illegible] وہ جملہ طلبا پر نظر رکھ سکے، مولانا اس کرسی پر بڑے اط[illegible] سے بیٹھ جاتے تھے۔ اخبار اپنے ساتھ لاتے تھے اسے او[illegible] پڑھنے لگتے تھے۔ طلبا یہ سمجھ کر کہ مولانا معروف ہیں ایک[illegible] سے پوچھ تاچھ یا عرف عام میں نقل کی کوشش شروع کر[illegible] عین اسی وقت مولانا کی آواز آتی اور اخبار نیچے ہو جاتا ا[illegible] اس لڑکے سے بازپرس کرتیں۔ بہت دنوں تک لوگوں کی [illegible] میں نہیں آیا کہ مولانا اخبار کے پیچھے سے کیسے دیکھ لیتے تھے معلوم ہوا کہ وہ اخبار میں معمولی سے سوراخ کر لیتے تھے او[illegible] سے لڑکوں پر نظر رکھتے تھے۔

ان کے گھر بھی بہت بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر طرف [illegible] سادگی کا راج دیکھا، چائے اور حقہ کا بہت شوق تھا ان دو چیزوں کا اہتمام بھی ہوتا تھا لیکن یہاں بھی دنیاداری [illegible] اور دکھاوا نہ تھا۔ معمولی پیالیاں، معمولی برتن لیکن خلو[illegible] یگانگت محبت اور بزرگانہ شفقت کے گل بوٹے ان پر لعل [illegible] کی طرح جڑے ہوئے۔ لباس وضع قطع بستر ہر چیز سادہ م[illegible] صاف ستھری۔ کتابیں ان کے پاس ملک اور بیرونِ ملک بے شمار آتی تھیں، رسائل و اخبارات بھی بہت آتے تھے انہیں دیکھ کر کتب خانہ بھیج دیا کرتے تھے۔ طبیعت میں استغ[illegible] بہت تھا اگر چاہتے تو خدا معلوم کتنی دولت حاصل کر لیتے [illegible] انہوں نے کبھی اس کا خیال بھی نہ کیا۔ حب جاہ اور طلب د[illegible] ان کی سیر چشمی کے آگے مات تھی وہ سچ مچ دنیا میں "کُن فی الد[illegible]

زیب اولما برسبیل ""کے مانند رہے۔
ستمبر ۱۹۵۵ء میں مولانا اسلم بیمار ہوئے۔ تنفس بلڈپریشر
عارضہ تھا، کبھی طبیعت سنبھلتی اور کبھی پھر خراب ہوجاتی
۔ وسط میں دل کا دورہ پڑا لیکن رفتہ رفتہ حالت سنبھل گئی،
بہت ہوگئی تھی اس لیے چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔
ا یہ سلسلہ ۲۸ر دسمبر تک چلتا رہا۔ ۲۸ دسمبر بدھ کے دن
بجے دن میں ان کو دل کا دوسرا دورہ پڑا اور ذرا سی
دنیائے فانی سے عالم جاودانی میں پہونچ گئے۔ اِنّا
لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔
ان کے انتقال پر جامعہ کی فضا میں کئی دن تک رنج
وغم اور گہرے سوگ کی کیفیت طاری رہی۔ علمی ادبی اور
مذہبی دنیا میں بھی ان کے انتقال پر ماتم ہوا۔ دنیا فانی ہے
ہر آنے والے کو ایک دن جانا ہے لیکن ایسے بہت کم لوگ
ہوتے ہیں جن کے نقوش جانے کے بعد بھی نہ صرف باقی
رہیں بلکہ پریشان حال گم گشتہ راہ مسافروں کو منزل
کا پتہ دیتے رہیں۔

(ایم۔اے۔او۔ کالج) ”سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے کہ جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے۔ مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کا تعلق رہا۔ گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناکام کام کا نتیجہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلافات کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے۔ بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا۔ اپنی قومی زندگی کے سارے عیب برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلہ کی طرح بھڑک بھی اٹھے مگر دہکتے کوئلہ کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا۔ صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو ونما پا سکنے کے لیے ان میں زندگی کے تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی۔ خلوت اور جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب، اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفاشعاری کے ساتھ خود اختیار کردہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا۔“

ڈاکٹر ذاکر حسین

فانی بدایونی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

علی گڑھ ایک ایسی سرزمین ہے جہاں زندگی کے ہر شعبہ کی شاہراہیں یہاں آکر مل جاتی ہیں۔ سیاست، مذہب، ادب، تعلیم کھیل ان سب میں علی گڑھ کی انفرادیت قائم ہے۔ ان سب سے مل کر علی گڑھ نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس کی مثال فی زمانا کم نظر آتی ہے۔ اس وقت تفصیل کا موقع نہیں ورنہ مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تاریخ ادب کے اوراق الٹ کر دیکھئے تو نامورانِ علی گڑھ کی طویل فہرست نظر آئے گی۔ جن میں سے ہر شخص کو محمد حسین آزاد کے بقائے دوام کے دربار میں بڑی آسانی سے جگہ مل سکتی ہے۔ مگر اس وقت علی گڑھ کے صرف ایک نامور فرزند کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا نام شوکت علی خاں ہے اور شعری و ادبی دنیا میں فانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بیسویں صدی میں جن لوگوں نے اردو غزل کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالا ہے ان میں حسرت، فانی، اصغر اور جگر ہیں حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی اشاعت کے بعد ایوان غزل میں زلزلہ آگیا تھا۔ اس وقت اگر ان شعرا نے غزل کو سہارا نہ دیا ہوتا اور جدید مطالبات سے اس کو آگاہ نہ کیا ہوتا تو خدا جانے غزل کا سفر کتنا طویل اور دشوار گذار ہو جاتا۔ فانی کا رشتہ دو ادبی گہواروں سے ہے۔ ان کا وطن بدایوں تھا اور ذہنی تربیت کے لیے علی گڑھ کا ماحول ملا۔

بدایوں روہیل کھنڈ کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ مگر اس کو ہر زمانے میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ آریوں سے لیکر انگریزوں کے زمانہ تک اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ صنعتی شہر تو کبھی نہیں بن سکا اور نہ تجارت کی کوئی ایسی منڈی قائم ہوئی جس کی وجہ سے اس کا سکہ بازاروں میں چلتا۔ مگر معلوم نہیں وہ کونسی کشش تھی جس کی وجہ سے یہ اپنے علمی، سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی کاموں میں مشہور رہا۔ بدایوں کے گوشہ گوشہ میں بزرگان دین اور علما کے مزارات ہیں جن کی وجہ سے اس کو، مدینۃ الاولیاء کے نام سے یاد کیا گیا۔ شعر و ادب کے میدان میں بھی یہ کسی سے پیچھے نہیں رہا ظہور اللہ خاں نوا۔ محشر، وحشت، محو سے خود سے یہ سلسلہ ہوتا ہوا آج ہمارے اور آپ کے عہد سے آکر مل جاتا ہے۔

اسی سرزمین پر فانی نے آنکھ کھولی۔ بدایوں سے کچھ فاصلے پر ستھانہ بلسی (ضلع بدایوں) جہاں فانی کے والد متعین تھے وہاں فانی کی پیدائش ہوئی۔ وہ افغانی النسل تھے والد کا نام شجاعت علی خاں تھا اور اسی رعایت سے فانی کا نام شوکت علی خاں رکھا گیا۔ فانی کے پردادا بدایوں کے گورنر تھے۔ فانی نے ایک جگہ خود لکھا ہے کہ "نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پردادا تھے۔ صوبہ بدایوں کے گورنر تھے یہ خاندان رئیسوں اور جاگیرداروں

---

[1] فانی کی پیدائش کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اسلام نگر (ضلع بدایوں) میں پیدا ہوئے۔

کا تھا۔ بقول فانی دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی۔ مگر دولت
نے کس کے ساتھ نباہ کی ہے جو اس خاندان کے ساتھ کرتی۔ اسباب
اور حالات کا تو علم نہیں البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ جب نوبت ان
کے والد شجاعت علی خاں تک پہونچی تو گورنری کی شان و شوکت
صرف ایک کہانی رہ گئی تھی اور شجاعت علی خاں کو پولس کی
نوکری کرنا پڑی۔

فانی کی ابتدائی تعلیم بدایوں میں ہوئی۔ ۱۸۹۷ء میں انٹرنس
پاس کیا۔ اس کامیابی نے تعلیم کا حوصلہ دیا اور بریلی کالج سے انٹر
اور بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ تعلیم کی جو سہولتیں آج
میسر ہیں وہ اس عہد میں ممکن نہ تھیں۔ والد کی خواہش تھی کہ
فانی جائداد کی دیکھ بھال کریں یا نوکری کر لیں۔ مگر فانی کے
مزاج کو ان دونوں سے بیزاری تھی۔ اس لیے مستقبل کا آزاد
پیشہ اختیار کرنے کے لیے ایل ایل بی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں
فانی نے علی گڑھ جاکر داخلہ لیا۔ فانی اگرچہ صرف دو سال
علی گڑھ رہے مگر ان دو سالوں میں انہوں نے علی گڑھ کے
مزاج کو اپنایا۔ علی گڑھ کا یہ وہ زمانہ ہے جب یہ کہا جاتا تھا
کہ جو کچھ علی گڑھ آج سوچے گا کل ملک وہی کرے گا۔ سر سید کی
تعلیم اب برگ و بار لاچکی تھی۔ تعلیم کے حصول اور مغربی فکر
کے قبول کرنے کے لیے جو حد بندیاں کی گئی تھیں ابھرتے ہوئے
نوجوانوں نے ان کو توڑ دیا تھا۔ مولانا محمد علی، شوکت علی اور
حسرت موہانی کی قیادت میں علی گڑھ کا نوجوان سیاسی مسائل
کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ ان میں ایسے شدت پسند بھی تھے
جن کے یہاں حکومت وقت کے خلاف جذبات ابھرنے لگے تھے جن
میں حسرت موہانی اور مولانا محمد علی کا نام سر فہرست ہے۔ ان
دونوں حضرات سے فانی متاثر تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ فانی خود عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکے
مگر حریت پسندوں کے عمل کو قومی زندگی کے لیے فال نیک خیال
کرتے تھے۔ دوسرا سبب وہ شعری مذاق تھا جس نے ان دونوں کے
مزاج میں سیاست کی خشکی پیدا نہیں ہونے دی۔ شاید سیرت
یہ ہم آہنگی بھی ہو کہ دونوں کے مزاج منافقت سے دور تھے۔
فانی کی شاعری کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ وہ شہزادۂ حیدرآباد
کے دربار کے رکن تھے مگر انہوں نے کبھی چہرہ پہ درباری نقاب
چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بے باکی۔ جرأت حق اور کسی کے
سامنے نہ جھکنے کی ادا اگر یہ کہا جائے کہ ان کے مزاج کا ایک حصہ
تھے تو اس میں بھی علی گڑھ کا حصہ ہے۔

جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر ٭ پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا

علی گڑھ کی فضا ان کے لیے سازگار تھی۔ یہاں شعری اور
ادبی ذوق ملا تو اور بھی جلا ہوئی۔ پروفیسر مغنی تبسم کا بیان ہے کہ

"فانی نے جماعتی اور عملی سیاست میں کبھی حصہ
نہیں لیا مگر جذبہ یا حالات اور ماحول کے زیر اثر
خارجی پیرایہ میں اپنے خیالات اور احساسات
ظاہر کر گئے ہیں۔ جن سے ان کی معاشرتی مسائل
سے دلچسپی اور انسان دوستی اور مظلوموں سے
ہم دردی آشکار ہوتی ہے۔ اس کی مثال وہ رباعیاں
ہیں جن میں انھوں نے پردے کی رسم اور عورتوں پر
مردوں کے مظالم کے خلاف اپنے غم و غصہ کا
اظہار کیا ہے۔"

یہ وہ زمانہ ہے جب شیخ عبداللہ (بابائے گرلز کالج) نے گرلز کالج
کی بنیاد ڈالی۔ آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک اس تیزی کے ساتھ
بڑھی کہ اس عہد کے دوسرے ادیب اور شاعر اس سے متاثر ہوئے
بغیر نہ رہ سکے۔ جن میں فانی بھی ایک تھے۔ مگر وہ کوئی عملی
قدم اس کی حمایت میں آگے نہ بڑھا سکے۔ مگر اس میں کوئی شک
نہیں کہ یہ علی گڑھ کا فیضان تھا کہ ذہن نے آئندہ آنے والے
مطالبات کو خوش آمدید کہا۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں اشارہ کیا کہ فانی کو علی گڑھ سے
جو روایت ملی وہ ظفر علی خاں، خوش محمد ناظر، سجاد حیدر یلدرم
سجاد انصاری، مولانا محمد علی اور میر محفوظ علی وغیرہ سے ہوتی
ہوئی فانی تک پہونچی۔ سر سید اور ان کے رفقائے ادب میں جو

انقلاب پیدا کیا وہ بھی ان کی نظر کے سامنے تھا مگر پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے ایک دلچسپ بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ فانی کی غالب سے دلچسپی محض ان کی ذہنی مناسبت نہیں تھی بلکہ یادگار غالب کی اشاعت کے بعد علی گڑھ میں غالب سے خاصی دلچسپی لی جاتی رہی عبدالرحمٰن بجنوری کے "محاسن کلام غالب" نے غالب پرستی کو اپنے پورے عروج پر پہونچا دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ فانی اس سے متاثر نہ ہوتے[1]۔ یہ حقیقت ہے کہ فانی کی پوری شاعری پر غالب کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو ۔۔۔ پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

بہلا نہ دل، نہ تیرگی شام غم گئی ۔۔۔ یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل ۔۔۔ میں معتقد حشر مجسم نہ ہوا تھا

اٹھتی نہیں ہے تہمت نظارۂ جمال ۔۔۔ منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ۔۔۔ ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

اسی طرح فانی کے یہاں متعدد ترکیبیں مل جائیں گی جن میں غالب کا لب و لہجہ پوشیدہ ہے قیام علی گڑھ میں فانی کے ساتھ ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ ان کی بیاض چوری ہو گئی۔ اس سے قبل ان کے دیوان کو ان کے والد نذر آتش کر چکے تھے۔ علی گڑھ کی فضا میں شاعری کی ایک نئی لہر آئی تھی مگر بیاض کے چوری ہو جانے کے باعث کچھ عرصہ کے لیے ان کا ذہن ترک شاعری کی طرف مائل رہا۔

علی گڑھ سے ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت کا آغاز لکھنؤ سے کیا۔ لکھنؤ کے علاوہ اٹاوہ۔ آگرہ۔ بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کی۔ ان کی متلون مزاجی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی رہی اس کا سبب یہ تھا کہ وکالت سے وہ کبھی ذہنی مناسبت پیدا نہ کر سکے کچھ تو کچہری کے مکر و فریب سے بیزار تھے اور کچھ ان کی تن آسانی بھی اس مشقت کے لیے تیار نہیں تھی بدقسمتی یہ کہ بعض ججوں نے ان کی طرف نظر التفات سے دیکھا اور انھوں نے منہ پھیر لیا۔ مدد کرنا چاہی تو انکار کر دیا۔ خودداری اور متلون مزاجی نے وکالت کے پیشہ کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ شاہ خرچیوں نے قرض کا بوجھ بڑھا دیا۔ آہستہ آہستہ جو جائداد تھی وہ فروخت ہوتی رہی۔ ایک حویلی رہ گئی تھی مگر قرض خواہوں کے مطالبے نے اس کو بھی نہیں چھوڑا۔ جس وقت حویلی کا نیلام ہو رہا تھا کئی بے فکرے آگئے اور شعر سنانے کی فرمائش کر دی۔ زبان نے دکھے ہوئے دل کا اظہار اس طرح کیا۔

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب ۔۔۔ در و دیوار دیے اب انھیں ویرانی دے

شمالی ہندوستان میں فانی بے یار و مددگار گھوم رہے تھے اور حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں فانی کی شاعری کے چرچے ہو رہے تھے۔ ۱۹۳۱ میں فانی حیدرآباد پہونچے اور بیمار پڑ گئے اور بدایوں واپس آگئے۔ مگر یہاں وہ لوگ جو آرام کے ساتھی تھے وہ اب گردش قسمت میں ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر حیدرآباد واپس لوٹ گئے۔ یہ سفر ان کا آخری سفر تھا جس کے بعد ان کو ایسے سفر پر روانہ ہونا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ حیدرآباد کے قیام میں جہاں ان کو ملکی سازشوں کا شکار بننا پڑا وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ ایسے ہمدرد اور بہی خواہ تھے جنھوں نے فانی کے زخم پر مرہم کا کام کیا ان میں قاضی عبدالغفار کا نام سرفہرست ہے۔ وطن کی یاد اور غربت کے مصائب نے یہ شعر کہلوایا۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

بقول فانی "ان کی سعی کچھ اس طرح مشکور ہوئی کہ مشکور نہیں کہی جا سکتی۔" حیدرآباد کے قیام میں ان کا وہ زمانہ سکون اور فراغت کا گذرا جب وہ صدر مدرس تھے اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی توجہ ان کی طرف تھی۔ مگر معظم جاہ کے دربار سے منسلک ہونا ان کی بدقسمتی کا آغاز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انشاء کو نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت لے ڈوبا اور اس کے ساتھ یہی صورت کہ

---

[1] فانی بدایونی — ڈاکٹر مغنی تبسم

فانی کو معظم جاہ کے دربار کی حاضرباشی نے برباد کیا۔ خوشامد اور بیجا تعریف ان کے مزاج میں نہیں تھا۔ غیبت اور برائی کا مسلک نہیں تھا۔ دربار میں عروج کے لیے ممدوح کی خوشامد اور ترقی کے لیے دوسروں کے عیوب کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ فانی دربار سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے جو دوسروں نے حاصل کر لیا۔ پھر نوع کن کن مسائل اور مصائب سے فانی کو گذرنا پڑا۔ یہ طویل افسانہ ہے۔ وظیفہ بند ہوا۔ ناظم پر تبادلہ ہوا۔ بیوی کی وفات اولاد کی بے کاری۔ قرض میں اضافہ ان حالات میں زندگی کا تصور بھی بھیانک معلوم ہونے لگا۔ اب اگر انتظار تھا تو موت کا

موت کا انتظار باقی ہے ✻ آپ کا انتظار تھا نہ رہا

قاضی عبدالغفار کا بیان ہے کہ موت سے ایک سال پہلے ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "بھئی قاضی! بس ایک چیز سنانے آیا ہوں اور یہ میری تاریخ وفات ہے۔"

آواز جہاں گذشت کہ آخر فنا نبود — واین چنیں ز زیست کہ گویا فنا نہ شد

طفیان ناز بین کہ بہ لوح مزار او — ثبت است سال رحلت فانی فنا نہ شد

۱۳۶۰ھ

موت کی تمنا کرنے والا جب نثار جنگ سے یہ سنتا ہے کہ فانی تم مر نہیں سکتے تو چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے مگر قدرت اپنا فیصلہ کر چکی تھی آخر ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو تقریباً باسٹھ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

لو آج مرگ فانی بے کس سے مٹ گئی — وہ اک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

فانی کی سیرت پر نظر ڈالی جائے تو بہت سی غیر معمولی خوبیاں نظر آئیں گی۔ اور ان خوبیوں میں سب سے نمایاں ان کی خودداری اور عالی ظرفی تھی۔ ایک مرتبہ معظم جاہ نے دریافت کیا کہ "فانی صاحب! آپ کے لڑکے کیا کرتے ہیں؟" یہ وہ لمحہ تھا جب شہزادہ آصفیہ بلاواسطہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ خوددار طبیعت نے صرف یہ جواب دیا۔ "ان کے لیے خدا کی ذات کافی ہے"۔ جائداد کے لئے مقدمہ سے صرف اس لیے گریز کرتے رہے کہ کچہری میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ سچ اور جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ بیان دینا ہوگا۔ شہرت سے ان کو ہمیشہ نفور رہا۔ بدایوں میونسپل بورڈ کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے مگر خاموشی سے استعفیٰ دیدیا۔ دربار، شاعروں کو ہمیشہ معیوب خیال کیا اس لیے وہ نہ خواص سے قریب ہو سکے اور نہ عوام ان تک پہنچ سکے۔ مگر ضمیر مطمئن تھا کہ فن کو نہ تو دربار کی سرپرستی خرید سکتی ہے اور نہ مشاعروں کی سستی شہرت اس کا مول لگا سکتی ہے۔ فانی کے الفاظ ہیں۔

"جو شعرا رنگ معنی میں شعلہ تھے پا ہیں۔ وہ شعر کو اس کے مدارج سے گرانے کے لئے نہ کسی قیمت سے خریدے جا سکتے ہیں اور نہ کسی قوت سے مرعوب ہو سکتے ہیں۔"

ان کے کلام میں بھی جابجا ان کی سیرت کے نقوش مل جائیں گے۔

جبیں صرف سجود بے جبیں معلوم ہوتی ہے ✻ طبیعت بے نیاز کفر و دیں معلوم ہے

تسلیم ہیں مجھے بھی تیری بے نیازیاں ✻ یہ کیا کہوں کہ میری تمنا غیور ہے

ننگ ہے سعی عرض محبت، فرض محبت اللہ اکبر ✻ ان کے سوا کچھ یاد نہ رکھ جب سے اقرار نام

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ فانی کو قنوطی اور تشائم پرست کہا جاتا ہے۔ ان کو "مرثیہ خواں"، "میوہ عالم" اور "ہر وقت منہ بسورنے والا انسان" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فانی کی یہ عالی ظرفی تھی کہ جن لوگوں نے ان کو نقصان پہونچایا ان کے خلاف بدلہ کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے ان پر طنز و تعریض کے تیر برسائے ان کو پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ یاسیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے امید کا ہر دامن چھوڑ دیا اور قنوطیت کا مفہوم یہ ہے کہ اب نہ اپنے اوپر اعتماد ہے اور نہ خدا پر بھروسہ۔ ذیل کے اشعار پڑھیے بتائیے کہ کیا واقعی یہ کسی قنوطی کے شعر ہو سکتے ہیں۔

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی

گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

لنگر کا آسرا ہے نہ تائید ناخدا — میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

کعبہ میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا — اے قصر فنا تیری تعمیر نظر آئی

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اکثر نقاد ان روایات کو اپنے عقیدہ کا حصہ بنا لیتے ہیں جو سینہ بسینہ منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کوئی یہ زحمت نہیں کرتا کہ داخلی شہادتوں کو پرکھ کر یہ دیکھے کہ حقیقت

ہے۔ کسی نے کہا کہ میر کے یہاں آہ ہے اور سودا کے یہاں واہ ہے
میر کے ان اشعار کو نظر انداز کر دیا جو میر کا مزاج تھے اور سودا کی
کے پیچھے کتنا کرب پوشیدہ ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ حالی
زل گوئی سے مخالفت بھی ایک ذہنی دھوکہ ہے۔ غزل کو نیم
نیانہ صنف سخن کا خطاب عطا ہوا اور ہر شخص نے اس کو گردن زدنی
دیا۔ یہی صورت حال فانی کے ساتھ ہے۔ فانی نہ قنوطی ہے اور
جائیت پسند۔ ان دونوں کے درمیان راستہ ہے جس میں غم
راپنانے کی کیفیت ہے اور اس کے عرفان کو دوسروں تک پہونچانے
ہے۔ غم کے ساتھ یہ رویہ اور قنوطیت سے بچنے کا یہ راستہ
مذہب نے بتایا۔ مذہب پر پختہ عقیدہ اور اپنے پر اعتماد اس کے
ب دوسرے بھی ہو سکتے ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا
ے گا کہ اس میں کچھ حصہ علی گڑھ کی فضا کا بھی ہے۔

فانی کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اس کی
ل کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اجمالی طور پر چند امور کی طرف
ہ ضروری ہے۔ فانی کی شاعری کی ابتدا اس لب و لہجہ سے
، جو داغ کا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب داغ کا طوطی بول رہا تھا
کے یہاں فکر کی کمی تھی اس لیے فانی نے پیروی داغ کو
رک کر دیا اور میر سے ذہنی نسبت کی وجہ سے ان سے
ب آ گئے۔ چھوٹی بحر میں شعر کہنا۔ خود سپردگی۔ درد کی کسک۔ غم
گیری یہ وہ موضوعات تھے جو فانی کے ذہنی ارتقا میں ہم راہ
مگر فانی کی بے چین طبیعت اپنے لیے نئی منزل تلاش کر رہی تھی
منزل ان کو غالب کے یہاں مل گئی۔ میر کے دل اور غالب کے
نے ایک نئے فانی کو جنم دیا اور یہاں سے فانی کی انفرادیت
ی شروع ہو جاتی ہے۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ فانی کے یہاں غم کی کیا
نسبت ہے۔ ایک سبب تو وہ حادثات زمانہ تھے جن کی طرف
سے اعلاق میں ذکر کیا گیا دوسرا ان کے مزاج کی غم پسندی آ گئی۔

ان حالات میں دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ اپنے آپ کو غم کے حوالے
کر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ غم پر قابو پا لیا جائے۔ فانی کے لیے
دونوں راستے ممکن نہ تھے۔ انھوں نے ان دونوں کے درمیان ایک
راستہ پیدا کیا کہ ... کہ غم کو اختیار کر گذرے تو غم نہ ہو
غم خدا کی ایک ایسی نعمت ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتی۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول ... تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا کر ... دولت دو جہان دی کہ اک دل مبتلا دیا

وہ دل جو خوشیوں اور دنیا کی مسرتوں میں یاد الٰہی سے غافل ہو جاتا
ہے۔ غم اس کو اس کے انجام سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اگر کبھی بر بنائے
بشریت غم ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو شکایت کرتے
ہیں۔ مگر جب یہ سیلاب گذر جاتا ہے تو شکوہ شکر میں بدل جاتا ہے
فانی کے یہاں جہاں کہیں "غم" کا لفظ آیا اس سے غم عشق مراد ہے
اور عشق کا مفہوم "عشق حقیقی" ہے۔ یہی سبب ہے کہ "غم" "عشق"
اور "تصوف" ایک ایسا مثلث ہے جس کا ہر راستہ ایک دوسرے
کی منزل سے ہو کر گذرتا ہے۔

بچھ گئے راہ یار میں کانٹے ... کس کو عذر برہنہ پائی ہے
تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ... ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
دل میں سما کے پھر گئی، آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا
وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر منجملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا
ہل گئی پھر مرے دل کی دنیا ... درد پھر لے کے ترا نام اٹھا

اسی طرح ان کے یہاں تصوف کے موضوعات میں وہی
مسائل ہیں کہ کائنات کیا ہے؟ خالق کائنات کون ہے؟ دونوں
کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ ان دونوں کے درمیان انسان کی کیا
حیثیت ہے؟ مختار۔ مجبور۔ فنا۔ بقا۔ وجودی اور شہودی یہ
سب اپنے فلسفیانہ انداز میں فانی کے یہاں موجود ہیں۔ بقول
ضیا احمد بدایونی مرحوم

"تصوف کا عنصر ان کے یہاں واقعی اور اصلی ہے۔ یہ

صحیح ہے کہ عملی تصوف سے ان کی زندگی ناآشنا رہی تاہم
نظری تصوف ان کے یہاں رسا بسا ہے گفتنی نہیں ہے
یہ تصوف بھی ان کے غم کا ایک حصہ ہے۔ ان کے غم کو سہارا اسی تصوف کی بدولت حاصل ہوا۔ انہوں نے تصوف کو پناہ گاہ کی حیثیت سے کبھی نہیں اپنایا۔ تصوف سے متعلق چند اشعار بغیر کسی تبصرہ کے پیش ہیں۔

خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے
تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

محشر میں جبر دوست کے طالب ہوئے وفا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے
راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز

فلسفۂ غم اور تصوف سے قطع نظر فانی کے یہاں ایک آواز اور بھی ہے۔ جس کے لب و لہجہ سے بالکل اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس پر یاسیت، قنوطیت اور تشائم پرستی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ جس کی شاعری کو کفن اور کافور کی شاعری سے نسبت دی جاتی تھی۔ اس "قنوطی" شاعر کا یہ انداز ملاحظہ ہو

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

ذکر خورشید قیامت سن کے واعظ کیا کہوں
خیر اس تردامنی کو روز محشر دیکھنا

فانی کے دل آیۂ لا تقنطو کے بعد
زاہد وہ دلفریبی حسن عمل گئی

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

ابر اٹھا سمتِ حرم سے زاہد
تو بھی سجادہ الٹ جام اٹھا

فرشِ گل پھر بچھا رہی ہے نسیم
آیئے موسمِ بہار آیا

یہ ایک مختصر جائزہ فانی کی شخصیت اور شاعری کا ہے۔ فانی کی ہمہ گیر شخصیت کے لیے یہ کینوس بہت چھوٹا ہے۔ ان کی شاعری اور زندگی کے بہت سے پہلو ہیں جن کا ذکر اختصار کی وجہ سے حذف کر دیا۔ اس مضمون میں بتلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ علی گڑھ کی سرزمین نے جن دُرہائے بے بہا کو پیدا کیا ان میں ایک نمایاں مثال فانی کی بھی ہے۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ روایتی تنقید سے ہٹ کر نئی معنویت کے ساتھ کلام فانی کا مطالعہ کیا جائے اور روایتی تنقید کے گرد و غبار کو ہٹا کر ادب کے وسیع کینوس پر ان کا درجہ متعین کیا جائے۔

چودھری خلیق الزّماں

ڈاکٹر شان محمّد
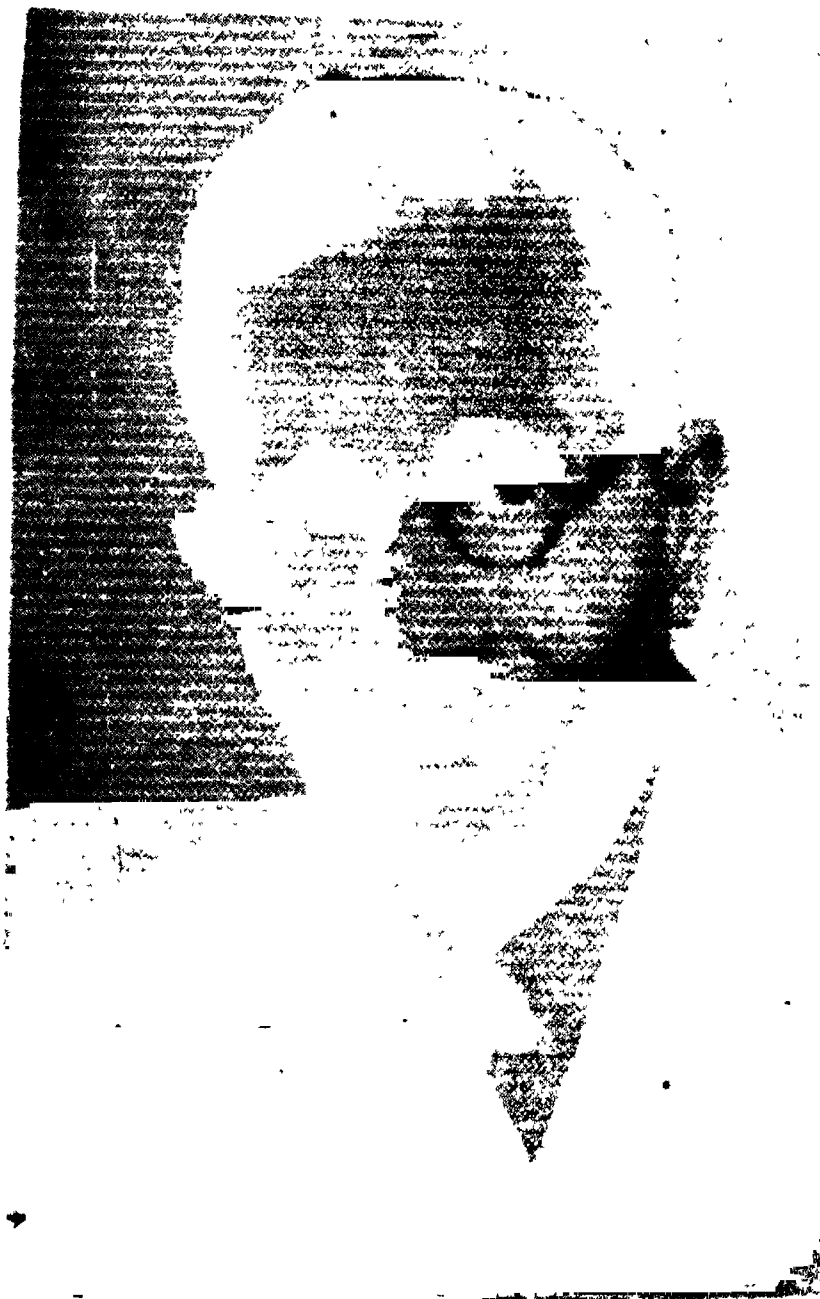
قیام پاکستان کے بعد سردار پٹیل نے ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو لکھنؤ
لدولہ پارک میں تقریر کی اور کہا، پاکستان کا بنوانے والا
شہر کا باشندہ تھا۔ بھگوان کی دعا سے وہ چلا گیا ہم خوش
یہ جملے چودھری خلیق الزماں کے بارے میں کہے گئے تھے
انے زمانہ طالب علمی سے ہی مسلمانوں کے حقوق کے لیے
ہد کی اور ۱۹۳۶ء کے بعد وہ مسلمانوں کے لیے ایک نئے ملک
ہیں لگ گئے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا۔

خلیق الزماں صاحب کی سیاسی زندگی زمانہ طالب علمی سے
ہوتی ہے جبکہ وہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علم
۱۹۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں
لج میں داخلہ لیا۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے اس لیے
بال ٹیم میں انتخاب ہوا۔ اور ۱۹۱۲ء میں کپتان کی حیثیت سے
سربراہی کی۔ آپ کو کھیل سے زیادہ اور کتب بینی سے
پی تھی۔ اس لیے علمی میدان میں وہ جوہر نہ دکھا سکے جو
بال کے میدان میں دکھائے۔

علی گڑھ کالج کے نوجوانوں پر حسرت موہانی کی کانگریس
یسی کا رنگ چھایا ہوا تھا جو چند سال پہلے یہاں کے طالب
ے اور جن کی سیاسی تحریک نے طلبا میں برطانوی سامراج
اف نفرت پیدا کر دی تھی۔ علی گڑھ میں سب سے پہلی کھدر
ن حسرت موہانی نے رسل گنج میں کھولی اور سودیشی کپڑوں کا
پرچار کیا اور اس سلسلے میں کئی مرتبہ زنجیر زنداں سے بھی دوچار
ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں خلیق الزماں کو مولانا محمد علی، شوکت علی سے
علی گڑھ میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ علی برادران برطانیہ سرکار کے سخت
خلاف تھے اور علی گڑھ طلبا پر ان کا خاص اثر تھا۔ اس کے دو سال
بعد اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر کے معصوم مسلمانوں کا خون بہایا۔ ترکی نے
اپنی فوج کو براستہ مصر روانہ کرنے کی کوشش کی مگر برطانیہ
نے اس کی اجازت نہیں دی اور ترکی کی شکست ہوئی اور طرابلس اس
کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس خبر سے علی گڑھ کے طلبا میں ایک تہلکہ
مچ گیا۔ اسی درمیان جارج پنجم نے دہلی دربار میں بٹوارہ بنگال
منسوخ کر کے متحدہ بنگال کا اعلان کر دیا اور اس سے مسلمانان
ہند کو بہت ٹھیس لگی۔ علی گڑھ طلبا نے ترکی کی حمایت میں
جلسے کیے۔ بعد مغرب ان کی نشستیں مسجد میں ہوتی تھیں اور ترکی
کی مدد کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ چودھری خلیق الزماں اس
میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے طلبا میں برطانوی سامراج
کے خلاف تحریک چلائی۔ کالج کی دیواروں پر تاریکی میں برطانیہ
کے خلاف پوسٹر لگائے۔ کالج کے پرنسپل نے خلیق الزماں۔
نور الدین اور محبوب عالم کو اس تحریک کا لیڈر ٹھہرایا مگر ثبوت
فراہم نہ ہو سکا اور پرنسپل کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ مسلمانوں
میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کی خاموش پالیسی اور
ہندوؤں کی انقلابی تحریک نے تقسیم بنگال کی منسوخی کی۔ مولانا

محمد علی کے کامریڈ، آزاد کے الہلال اور ظفر علی خاں کے زمیندار میں برطانیہ کی مسلم دشمنی پر سخت مضامین لکھے گئے جنھوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جھنجوڑ دیا۔ اس کے ایک سال بعد جنگ بلقان شروع ہوئی جس میں عیسائی طاقتوں نے ترکی کو بلقان سے نکالنے کے لیے جنگ شروع کر دی اور ترکیوں کا اس قدر خون بہایا گیا کہ تاریخ کے صفحات کانپ اٹھے۔ گوکہ برطانیہ اپنی غیر جانب داری کا اعلان کرتا رہا مگر یہ سب کچھ اسی کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ ترکی کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور اس قدر زخمی ہوئے کہ اس کے لیے ان کی مرہم پٹی کرنا بھی مشکل تھا۔ ہندوستانی مسلمان اس سے مشتعل ہو گئے۔

علی گڑھ طلبا نے جنگ طرابلس کے دوران ہی اپنے کھانے کی مقدار میں کمی کرا دی تھی تاکہ اس سے جو روپیہ بچے وہ ترکی کو روانہ کیا جائے اور اب انہوں نے چندہ جمع کرنے کی تحریک کو جس کو مولانا محمد علی نے چلایا تھا لبیک کہا۔ تاکہ روپیہ ریڈ کریسنٹ سوسائٹی کا (Red Crescent Society) کے ذریعہ ترکی کی مدد کے لیے روانہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی نگرانی میں ایک میڈیکل مشن ترکی روانہ کیا جائے جو کہ وہاں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کرے۔ ڈاکٹر انصاری خود علی گڑھ آئے اور طلبا سے اپیل کی کہ وہ چند ہونہار طلبا کو پیش کریں جو میڈیکل مشن کے ہمراہ ترکی چلیں۔ خلیق الزماں عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی اور عزیز انصاری کا کالج سے اور منظور محمود اور عبدالرحمن پشاوری کا انتخاب اسکول سے کیا گیا اور یہ لوگ روانہ ہو گئے۔[۳]

ترکی میں اس وقت سخت سردی تھی۔ میڈیکل مشن کے طلبا سردی میں تو دن بھر کام کرتے ہی تھے کبھی کبھی رات گئے تک بھی کام کرتے تھے تاکہ زخمیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکیں۔ میڈیکل مشن نے اتنی محنت سے کام کیا کہ بیرونی ڈاکٹروں نے بھی اس کی تعریف کی۔ بلقان جنگ کے خاتمہ پر میڈیکل مشن واپس ہندوستان آ گیا مگر عبدالرحمن پشاوری نے زندگی بھر ترکی قوم کی خدمت کرنے کا فیصلہ کر لیا اس لیے وہ واپس نہیں آئے۔ انہوں نے ایک ملٹری اکاڈمی میں داخلہ لے لیا اور فوج میں ایک آفیسر ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں انہوں نے ترکی کی طرف سے لڑ کر بڑے کارنامے انجام دیے مگر اتفاقیہ رؤف بے کے کسی دشمن نے جن کے مکان میں وہ رہتے تھے رؤف بے کے دھوکے میں ایک رات گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

خلیق الزماں ترکی کی واپسی کے بعد اور بھی دل و جان سے مسلمانوں کی خدمت میں لگ گئے۔ ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جانے لگی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اس سے ناراض تھے اور ان کو ہوسٹل میں کمرہ الاٹ کرنے میں تاخیر اسی لیے کی گئی مگر نواب اسحاق خاں صاحب کی جو کالج کے سکریٹری تھے فوری مداخلت سے کمرہ مل گیا۔ شعیب، رحمان اور خلیق اب برابر دہلی جاتے اور ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی سے برابر ملاقاتیں کرتے اور سیاسی معاملات میں ان سے تبادلہ خیال کرتے اور دونوں کے جذبۂ ملی سے سرشار ہوتے تھے۔

اسی درمیان جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ترکی انگریزوں کے خلاف جرمنی کے ساتھ جنگ میں آنے کو تیار تھا جبکہ ہندوستانی مسلمان چاہتے تھے کہ ترکی کسی کا ساتھ نہ دے اور خاموش رہے۔ انہوں نے ترکی کو پیغام بھی بھیجے مگر ترکی نے کسی کی نہ سنی اور جنگ میں جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ مقامات مقدسہ کا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ برطانیہ مقامات مقدسہ کو جو ترکی کے قبضے سے نکل کر برطانیہ کے قبضے میں آ گئے تھے منہدم نہ کر دے لیکن برطانیہ نے دور اندیشی سے کام لیا اور اعلان کیا کہ وہ مقامات مقدسہ کی بے حرمتی نہیں کرے گا اس سے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت سکون ہوا۔[۴]

علی برادران اور دیگر مسلم نیشنلسٹ یہی چاہتے تھے کہ برطانوی اقتدار کا ہندوستان سے خاتمہ ہو۔ دسمبر کی ایک رات علی برادران خلیق الزماں کے ہوسٹل آئے اور خفیہ گفتگو کی کہ کسی طرح سرحد پر ہتھیار بنانے کی فیکٹری سے ساز باز کر کے

تان ہتھیار لائے جائیں۔ محمد علی نے اس کام کے لیے
ان کو تیار کیا کہ وہ سرحد جائیں اور وہاں کے قبائل میں
ے خلاف پروپیگنڈا کریں اور وہاں کی فیکٹری سے خفیہ
ہ ہتھیار لینے کی کوشش کریں۔ چنانچہ خلیق الزماں اس
سرحد روانہ ہوئے۔ بہانہ یہ تراشا کہ کالج کے ایک طالب علم
ل سے ملاقات کرانے سرحد جا رہے ہیں۔ شعیب قریشی،
صدیقی اور عزیز انصاری بھی ساتھ تھے۔ مولانا محمد علی
علی بھی جمرود پہنچے لیکن سی آئی ڈی نے گھیرا ڈال دیا اور
پنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ندوستانی مسلمانوں کا خیال تھا کہ جرمنی کو اگر کامیابی
نا ہے تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ براستہ افغانستان
ان پر حملہ کرے اور ہندوستانی مسلمانوں کی مدد سے
ندوستان سے نکال دے جو جنگ میں سب سے بڑا مددگار
س مقصد کے لیے خفیہ چندے کیے گئے۔ دہلی میں اس کا
وا اور حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری۔ نواب آف رامپور
ف بھوپال جیسی شخصیتیں اس سے منسلک ہوئیں۔ بمبئی
کے مسلمان رئیسوں نے بھی اس میں بڑی مدد کی دہلی
ی مسجد میں مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک مدرسہ
کے لیے قائم کیا۔ خلیق الزماں کو اپنے چچازاد بھائی استغنیٰ
بعد جو مدرسہ فتحپوری مسجد میں مدرس تھے عبید اللہ سندھی
ن کا موقع ملا۔ جو ہندوستان میں جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے
ح ہوتا اس سے مسلمان افغانستان اور عرب روانہ کیے
اکہ وہ برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا کریں مولانا شوکت علی
وپیہ کی ایک تھیلی استغنیٰ کریم صاحب کے ذریعہ
اللہ سندھی کو بھجوائی کہ وہ اپنی تحریک تیز کریں اور
ں روانہ ہوں۔ چنانچہ دس ہزار روپیہ لے کر مولانا سندھی
پہنچے اور شاہ افغانستان کو ہموار کر لیا کہ اگر جرمنی
ن پر حملہ کرے تو وہ مداخلت نہ کریں بلکہ آسانیاں
مولانا محمود الحسن بھی ۱۹۱۵ء میں مکہ شریف چلے گئے

اور وہاں کے عوام کو برطانیہ کے خلاف تیار کرنے لگے۔ مولانا
محمود الحسن نے عرب سے شاہ افغانستان کو اور کابل میں ٹرکی
کے سفیر کو بھی خطوط لکھے۔ یہ خط ریشمی رومال میں تھے اس لیے
مورخین اس کو ریشمی رومال سازش کا نام دیتے ہیں۔

۱۹۱۶ میں خلیق الزماں نے راجہ غلام حسین۔ پنڈت ہرکارن
ناتھ مصرا اور رنگا آئیر کے دباؤ ڈالنے پر کانگریس میں شمولیت
اختیار کر لی اور ساتھ ہی ساتھ مسلم لیگ کے ممبر بھی ہو گئے۔
لیگ اور کانگریس میں تعلقات اس قدر بہتر تھے کہ ایک
فرد دونوں جماعتوں کا ممبر ہو سکتا تھا۔ اور کانگریس کے ممبر لیگ
کے اجلاس میں اور لیگ والے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں
شرکت کرتے تھے۔ خلیق الزماں دونوں پارٹیوں میں ایک ممتاز
حیثیت کے مالک ہو گئے اور اس طرح منظر عام پر آ گئے۔ خلیق الزماں
نے ہندو مسلم اتحاد کو ہمیشہ سراہا۔ کانگریس کی پالیسی سے اتفاق
کیا اور اسی لیے ۱۹۱۷ میں ان کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا
ممبر چن لیا گیا۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہو گئی اور جرمنی شکست کھا گیا
انگریزی اخبارات برطانیہ کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ ترکی
کے اس قدر ٹکڑے کر دیے جائیں کہ یہ قوم پھر کبھی سر نہ اٹھا
سکے اور اگر ہو سکے تو ان کے مقامات مقدسہ کو تباہ کر دیا جائے
اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ خلافت
کا تھا کیونکہ سلطان ترکی مسلمانوں کا خلیفہ تھا۔ مسلمانوں کا
نوجوان طبقہ اس کی محافظت میں کھڑا ہو گیا۔ محمد علی شوکت علی
ظفر علی خلیق الزماں نے جگہ جگہ جلسے کیے اور برطانیہ سے اس کے
غلط ارادوں سے باز رہنے کی اپیل کی۵ خلیق الزماں نے مولانا
عبد الباری فرنگی محلی سے ایک فتویٰ تیار کروایا جس پر پانچ سو
مولویوں کے دستخط تھے جو وائسرائے کے سامنے پیش کیا گیا۔

کابل اور عرب میں مسلم انقلابیوں کا مشن فیل ہو گیا
کابل میں مولانا سندھی امیر افغانستان کو انگریزوں کے
خلاف بغاوت کرنے پر تیار نہ کر سکے اور انھیں افغانستان سے

پڑنا پڑا۔ ادھر شریف حسین نے مکہ میں مولانا محمود الحسن کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا جہاں سے وہ مالٹا لائے گئے اور زندان خانے میں رکھے گئے۔ اسیر مالٹا نے قید کے حالات خود تحریر کئے ہیں جو اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انقلابیوں کی اس ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ ہندوستان میں برطانیہ کی سخت مخالفت کی جائے اور اس کو ترکی شکن پالیسی سے باز رکھا جائے۔

ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے گورنمنٹ نے رولٹ ایکٹ بنایا تاکہ ہندوستانیوں کو سخت سے سخت سزا دی جا سکے۔ مہاتما گاندھی نے اس کی مخالفت کی۔ ایک ڈرافٹ تیار کیا گیا جس پر مولانا آزاد۔ حکیم اجمل خاں۔ لاجپت رائے۔ موتی لال نہرو۔ سروجنی نائیڈو۔ عباس طیب جی۔ این سی کیلکر۔ وی جے پٹیل۔ ولبھ بھائی پٹیل۔ ایم۔ آر جیکر۔ جواہر لال نہرو۔ گنگا دھر راؤ۔ دیش پانڈے۔ مسٹر سبحانی۔ جمنالال بجاج۔ ڈاکٹر انصاری۔ عبدالباری۔ راج گوپال اچاریہ۔ حسرت موہانی۔ یعقوب حسن وغیرہ نے دستخط کیے کہ وہ برطانیہ گورنمنٹ کے خلاف احتجاج کریں گے۔ پورے بھارت میں ہزاروں آدمیوں نے قسمیں کھائیں کہ وہ سرکار کی مخالفت کریں گے۔ خلیق الزماں نے لکھنؤ میں کئی تقریریں کیں اور برطانیہ کی سخت مخالفت کی۔ یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ جلیان والا باغ کا واقعہ ہوا جس میں نہتے لوگوں پر جنرل ڈائر نے گولی چلوا دی اور سیکڑوں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

تحریک خلافت شروع ہو چکی تھی۔ مولانا محمد علی شوکت علی جیل سے رہا ہو چکے تھے اور اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ خلیق الزماں نے علمائے فرنگی محل کی درخواست پر آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی کا دستور بنایا۔ مارچ ۱۹۲۰ میں خلیق الزماں کو لکھنؤ کانگریس کمیٹی کا صدر چن لیا گیا۔ خلیق الزماں اس رشتے سے برابر الہ آباد جاتے۔ آنند بھون میں موتی لال نہرو کے ساتھ قیام کرتے اور قومی سیاست میں مشورہ دیتے اور لیتے تھے۔ وہ کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے ممبر تھے۔ خلیق الزماں کی شہرت کافی بڑھ چکی تھی اور ان کی شہرت کا یہ حال تھا کہ جب مراد آباد میں خلافت کانفرنس ہونا قرار پائی تو خلیق الزماں کی بھی شرکت کا اعلان ہوا۔ علی برادران نے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا۔ مراد آباد کے عوام اسٹیشن سے ان کو ایک جلوس کی شکل میں کانفرنس تک لے گئے۔ جہاں انہوں نے دوران تقریر اعلان کیا کہ انہوں نے سرکاری عدالتوں میں وکالت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جس شخص کی ماہانہ پریکٹس ہزاروں روپیہ ہو اس کا یہ فیصلہ کرنا بڑی جرات کا کام تھا۔

کانگریس کے ناگپور سیشن کو اگر "مسلم سیشن" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس میں مسلمانوں نے کثرت سے حصہ لیا جتنا پہلے کبھی نہیں لیا تھا۔ اسی سیشن میں گاندھی جی کا عدم تعاون کا رزولیوشن علی برادران کی کوششوں سے پاس ہوا کیونکہ جناح اس کے خلاف تھے۔ اس کے بعد علی برادران نے علی گڑھ کالج کو نیشنل یونیورسٹی میں بدلنے کا فیصلہ کیا اور جب کامیاب نہ ہوئے تو اسی احاطے میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی۔ شیخ الجامعہ کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ چند سال بعد جامعہ ملیہ علی گڑھ سے دہلی لائی گئی اور ڈاکٹر انصاری۔ پروفیسر محمد مجیب۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے قوم پرستوں نے اس کی سرپرستی کی۔ جامعہ کے ٹرسٹیوں کی پہلی میٹنگ میں خلیق الزماں نے شرکت کی اور دھواں دھار تقریر کی۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریک تیزی پر چل رہی تھی۔ حکیم اجمل خاں علی برادران گاندھی جی اور خلیق الزماں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور لوگوں کو اپنی تقاریر سے سول نافرمانی پر مجبور کیا۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے پر خلیق الزماں کو نومبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے لیڈران بھی گرفتار کیے گئے جن میں تصدق احمد خاں۔ مولانا ظفر الملک ڈاکٹر کچلو مولانا فاخر الہ آبادی بھی تھے۔ خلافت کانفرنس جو ۱۹۲۱ء میں کراچی میں ہوئی نہایت اہم تھی۔ اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ اگر برطانیہ گورنمنٹ نے انگورا گورنمنٹ کے خلاف جنگ

و مسلمان سرکاری حکم کی نافرمانی کریں گے اور قومی پرچم
ہندوستان کی آزادی کا اعلان کریں گے۔ مولانا محمد علی کی
یہ کو ہزاروں جلسوں میں دہرایا گیا اور اس لیے علی برادران
نثار احمد، پیر غلام مجدد اور مولانا حسین احمد کو گرفتار
گیا۔ گورنمنٹ کی پوری مشینری خلیق الزماں کو سزا دینے
ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک نوجوان لیڈر کی حیثیت سے
سرگرمیاں بہت تیز تھیں۔ ۵۹

اسی سال پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد تھی۔
نگریس اور خلافت کمیٹی ان کے بائیکاٹ کا پلان تیار ر
ی تھی۔ گورنمنٹ چاہتی تھی کہ خلافت والنٹیرز ختم کر دیئے
ں اور کچھ علماء بھی گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے مگر
الزماں اس کے سخت مخالف تھے۔ اور ان ہی کی
ششوں سے خلافت والنٹیر کی جماعت کام کرتی رہی ـــــ
الزماں کو دوبارہ گرفتار کیا گیا اور ڈیڑھ سال کی سزا
ی۔ ان کے ساتھ ساتھ موتی لال نہرو۔ جواہر لال نہرو
سلامت اللہ۔ شیخ شوکت علی جعدالولی۔ گوپی ناتھ
واستو۔ علی عباس۔ حکیم آشفتہ اور محمد نواب کو بھی
یش اتنی ہی سزا دی گئی۔ گورنمنٹ گاندھی جی کی گرفتاری
یہ موقع کی متلاشی تھی اور اتفاق سے وہ موقع آپہنچا۔
ری ۱۹۲۲ء کو گورکھپور کے ایک مقام چوری چورا
ب جلوس قابو سے باہر ہو گیا اور اس نے قریب کے
تھانے کو نذر آتش کر دیا۔ ۱۱ سپاہی اور ایک انسپکٹر
ئے۔ گاندھی جی نے اپنی تحریک فوراً ملتوی کر دی۔ ان کو
ر لیا گیا اور چھ سال کی سزا دی گئی۔ ملک کے دیگر
ں میں بھی گرفتاریاں ہوئیں ۶۰

تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی کی ناکامی سے
ہو کر کانگریس کے کچھ ذمہ دار آدمیوں نے سوچا کہ
ب یہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ الکشن لڑ کر کونسل میں
اور وہاں گورنمنٹ کی مخالفت کر کے اپنے مقصد میں

کامیابی حاصل کی جائے۔ سی آر داس اور پنڈت موتی لال
نہرو اس خیال کے مبلغ تھے اور حکیم اجمل خاں کا بھی یہی نقطۂ
نظر تھا۔ گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری اور راج گوپال اچاریہ اس
نظریئے سے متفق نہیں تھے۔ خلیق الزماں پنڈت موتی
لال نہرو کے خیال کے حامی تھے اس طرح سوراج پارٹی نے
جنم لیا جس کے صدر سی۔ آر۔ داس ہوئے اور موتی لال اس
کے جنرل سکریٹری قرار پائے اور خلیق الزماں اور تصدق
احمد خاں نے جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے
ساتھ ساتھ خلیق الزماں لکھنؤ میونسپل بورڈ میں بھی بہت
سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

۱۹۱۶ء کے میونسپل ایکٹ آف یو۔ پی کے تحت پہلی
بار لکھنؤ میونسپل بورڈ کا صدر ایک غیر سرکاری آدمی ہونا تھا
ہندوؤں نے جب اس کا بائیکاٹ کیا تو مسلمانوں نے ۱۹۱۶ء
سے ۱۹۲۰ء تک سید نبی اللہ بیرسٹر کی صدارت میں لکھنؤ
میونسپل بورڈ چلایا۔ بعد کو ہندوؤں نے بھی الکشن لڑنے
کی خواہش ظاہر کی۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی دونوں نے
خلیق الزماں پر چھوڑ دیا کہ وہ لکھنؤ میونسپل بورڈ کی ستائیس
سیٹوں کے لیے امیدواروں کا انتخاب کریں جو انہوں نے
بڑی مستعدی سے کیا اس کے علاوہ سوراج پارٹی کے لیے
بھی ممبروں کے نامزد کرنے کا اختیار بھی خلیق الزماں
کو دیا گیا جو انہوں نے بڑی محنت و جفاکشی سے کیا۔

خلیق الزماں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے
اور ان کی یہی کوشش تھی کہ مادر ہند کی یہ دونوں قومیں
میل ملاپ اور اتحاد سے رہیں۔ لیکن ۱۹۲۴ء سے جو فرقہ وارانہ
فسادات ہونا شروع ہوئے انہوں نے خلیق الزماں کو بہت
پریشان کر دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات میں ایک فرقہ دوسرے
پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا کبھی شدھی اور کبھی
سنگھٹن کا پلہ بھاری رہتا اور کبھی تنظیم اور تبلیغ کا ہندوستان
کا کوئی گوشہ اس آگ سے بچ نہ سکا۔ کبھی بڑے اور کبھی

چھوٹے پیمانے پر فساد ہوئے جس میں ہزاروں آدمی جاں بحق ہوئے۔ اپنے شہر لکھنؤ میں خلیق الزماں باہمی تعلقات استوار کرنے میں لگے رہے اور جب جب موقع ملا لیگ اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے انہوں نے دونوں کو یکجا رہنے کی اپیل کی اور بہت حد تک وہ اس میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۲۶ میں ۱۹۱۹ء کے قانون کے تحت یوپی میں الکشن ہونا قرار پایا۔ ۱۹۲۰ء میں جب الکشن ہوئے تو کانگریس نے ان کا بائیکاٹ کیا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک کانگریس کا کوئی نمائندہ یوپی اسمبلی میں نہ آیا۔ لیکن بعد کو کانگریس نے اپنی پالیسی بدل دی۔ خلیق الزماں سراجسٹ کی حیثیت سے الکشن لڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس کے معنے یہ تھے کہ ان کو JOINT ELECTORATE کی تلقین کرنا پڑتی اور مسلمانوں میں Separate Electorate مقبول تھا اور وہ یقیناً ہار جاتے کیونکہ مسلمان ان کو ووٹ نہ دیتے۔ لیکن موتی لال نہرو کے کہنے سے خلیق الزماں نے الکشن لڑا اور ہار گئے اور ان کا اندازہ صحیح نکلا۔

۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے سائمن کمیشن بھیجے جانے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ ہندستانیوں نے سیاسی امور میں کتنی ترقی کی ہے۔ کانگریس اور لیگ نے اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ لکھنؤ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے خلیق الزماں نے سائمن کمیشن کی زوردار مخالفت کی۔ انہوں نے لکھنؤ میں جلسوں اور جلوسوں کی بھرمار شروع کر دی۔ پتنگوں اور غباروں پر Simon Go Back لکھ کر ان کے دھاگے ایسے نشانے پر اڑائے گئے جہاں پر کمیشن کو تعلقداران اودھ نے پارٹی دی تھی۔ کمیشن کے ممبروں کو پردہ میں بٹھایا گیا تھا کہ وہ مظاہرین کو دیکھ نہ سکیں اور اسی لیے پتنگوں اور غباروں کا طریقہ اپنایا گیا تھا۔ لکھنؤ میں کمیشن کی اس قدر زبردست مخالفت کی گئی اور جلوس ہوئے کہ پولس نے ان کو دبانے کے لیے سخت لاٹھی چارج کیا جس میں جواہر لال پنڈت گوبند ولبھ پنت اور خلیق الزماں کو سخت چوٹیں آئیں عوام نے اپنے رہنماؤں کا ساتھ دیا پولیس پر سخت پتھراؤ ہوا مگر ایک جابر حکومت سے ٹکر مشکل تھی لکھنؤ میں کانگریس کی کامیابی کا سہرا خلیق الزماں کے سر تھا پولیس کے ایک دستے نے خلیق الزماں کا مکان گھیر لیا اور گرفتار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ خلیق الزماں نے انکار نہیں کیا صرف یہ کہا کہ گرفتاری کا وارنٹ لاکر مجھے دکھاؤ اور مجھے لے چلو لیکن وارنٹ جاری نہ ہوا اور گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔

سائمن کمیشن یا اس کی رپورٹ سے ہندوستانی مطمئن نہیں ہوئے اور اس کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لے فروری ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس کانفرنس میں حصہ لیا اور اسی لے اس کو آل پارٹیز کانفرنس کہا جاتا ہے۔ سربرآوردہ لیڈروں میں موتی لال نہرو۔ محمد علی جناح مولانا شوکت علی پنڈت مالویہ۔ نواب اسماعیل۔ راجہ غضنفر علی خاں مسز سروجنی نائیڈو سری نواس آئینگر۔ ڈاکٹر مونجے اور ڈاکٹر جیکر عبداللہ ہارون سیٹھ۔ شعیب قریشی و دیگر حضرات نے کانفرنس میں شرکت کی۔ بمبئی میں اس کا ایک اجلاس ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی اور اس میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کے ممبر مسٹر اینے Mr. Aney سر علی امام۔ شعیب قریشی۔ سبھاش چندر بوس مسٹر جیکر۔ مسٹر پردھان اور سردار منگل سنگھ منتخب ہوے اور پنڈت موتی لال نہرو کو اس کا صدر بنایا گیا۔ اس کمیٹی کو ہندوستان کے لیے ایک ایسا دستور تیار کرنا تھا جو سب کو قبول ہو۔

خلیق الزماں کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے وہ کچھ دنوں کے لیے شملہ چلے گئے۔ لیکن جلد ہی شعیب قریشی اور مولانا محمد علی کا ایک تار ملا کہ وہ الہ آباد واپس آئیں۔ اس کے بعد موتی لال نہرو نے بھی ایک تار خلیق الزماں کو دیا کہ وہ فوراً الہ آباد آئیں۔ تار پاتے ہی وہ شملہ سے الہ آباد آ گئے۔ یہاں آکر ان کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر انصاری۔ شعیب قریشی اور مولانا شوکت علی کے درمیان زبردست اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ شعیب اور شوکت علی کا خیال تھا کہ پنجاب کے

ں کو ۱۵ فیصدی Reservation جو پہلے ہی متفقہ طور
طور ہو چکا تھا برقرار رہنا چاہیئے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثریت
جو کبھی مسلمان مالی پریشانی کی وجہ سے ہندؤں سے متاثر
، اور اپنے ووٹ کا صحیح استعمال نہ کر سکیں گے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری
ماننے کو تیار نہ تھے۔

خلیق الزماں کا خیال تھا کہ ۱۵ فیصدی Reservation کا
محض دل کا بہلاوا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اقلیتی صوبوں میں
ں کو weightage نہ دیا جائے اور اگر ایسا ہو جائے گا تو
ں کا دعوی ۱۳ فیصدی سے ۲۰ فیصدی کا واپس لے
لے گا۔ اس بات کے لیے خلیق الزماں ۱۹۲۴ء سے جدوجہد
رہے تھے اسی لیے جب مسلم اور سکھ اقلیتوں کی کثیر نمائندگی
ل اٹھا تو خلیق نے اس کی مخالفت کی اور کمیٹی نے اس کو
کر لیا۔ اس کے بعد ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں ایک
نس بلائی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری
، سر تیج بہادر سپرو۔ سر علی امام۔ سچیدہ نند سنہا
، پی سوامی۔ مولانا ظفر علی۔ راجہ آف محمود آباد۔ چودھری
الحق۔ راجہ نوشاد علی۔ سبھاش چندر بوس اور جواہر لال نہرو
وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں اور سکھوں
لوط انتخاب کیے جانے اور اقلیت اور اکثریت کے لیے
Reservation of Seats نہ کیے جانے کی بات مان لی یہی
یز تھی کہ جس کے لیے خلیق الزماں برابر کوشش کرتے رہے تھے
ب قریشی اور مولانا شوکت علی اس کے خلاف تھے۔ بحث
حثہ کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا۔

اس رپورٹ کو آخری شکل دینے کے لیے آل انڈیا کانگریس
کی میٹنگ ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو ہوئی۔ اس کے بعد دسمبر میں
یس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں پنڈت موتی لال نہرو کی
رت میں ہوا۔ ساتھ ہی مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے سالانہ
ں بھی کلکتہ میں ہوئے۔ لیگ کی صدارت راجہ آف محمود آباد
ور خلافت کمیٹی کی صدارت مولانا محمد علی نے کی۔ نہرو رپورٹ

ہر پنڈال میں بحث و مباحثہ کا مرکز تھی۔ اس کے بعد ایک
Convention طلب کیا گیا جس میں ہر پارٹی کے ممتاز لیڈروں نے
شرکت کی مسٹر جناح نے بھی شرکت کی اور انہوں نے نہرو رپورٹ
کی مخالفت کی۔ محمد علی نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کی مخالفت کا پہلو یہ تھا کہ
مسلمان جداگانہ انتخاب ترک کر کے مخلوط انتخاب قبول کریں گے بشرطیکہ
نہرو رپورٹ اقلیتوں کے حقوق و تحفظ کی ذمہ داری لے۔ جناح اور محمد علی
کی توقعات کو نہرو رپورٹ نے چونکہ پورا نہیں کیا اس لیے لیگ اور
خلافت کمیٹی نے اس کو مسترد کر دیا۔

آل پارٹیز کی کامیابی کے بعد چند مسلم لیڈروں نے جو کانگریس سے
ہمدردی رکھتے تھے ایک نئی پارٹی بنائی جس کا نام مسلم نیشنلسٹ پارٹی
رکھا۔ اس کے صدر ڈاکٹر انصاری اور سکریٹری خلیق الزماں بنائے
گئے۔ اس نئی جماعت نے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا صرف چند
کانفرنسیں کیں۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے ڈنڈی مارچ شروع کیا تاکہ وہ نمک
بنا کر گورنمنٹ کی سول نافرمانی کریں۔ سردار پٹیل اس میں آگے آگے
تھے اس لیے وہ سب سے پہلے گرفتار کیے گئے۔ لیکن گاندھی جی نے اپنی
جدوجہد جاری رکھی اور آخر کار گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد پنڈت
موتی لال اور جواہر لال گرفتار ہوئے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد
عباس طیب جی نے ان کی جگہ لی اور جب وہ بھی گرفتار ہوئے تو
انہوں نے آزاد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ جب آزاد بھی آزاد نہ رہ سکے
تو انہوں نے ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین مقرر کیا اور جب ڈاکٹر
انصاری بھی سپرد جیل ہوئے تو انہوں نے خلیق الزماں کو کانگریس
ورکنگ کمیٹی کا سربراہ نامزد کیا۔ خلیق الزماں کو ذرا بھی خیال نہ تھا کہ
لکھنؤ کانگریس کی صدارت سے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبر
شپ سے استعفیٰ دینے کے بعد ان کو یہ اعزاز ملے گا۔

چونکہ برطانیہ سرکار اور ملک کی سیاسی پارٹیوں میں کوئی
سمجھوتا نہ ہو سکا اس لیے وائسرائے نے ۵۰ نمائندے برٹش انڈیا
سے اور ۱۶ ریاستوں سے لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس
کے لیے نامزد کیے جو ہندوستان کی سیاسی کشمکش پر غور کرنے کے لیے

طلب کی گئی تھی۔ یہ کانفرنس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء سے شروع ہوئی جس
میں ہندوستان کے ماہرین دستور نے بھی حصہ لیا۔ گورنمنٹ برطانیہ
اس پر تیار ہوئی کہ ہندوستان میں وفاقی حکومت بنائی جائے [11]
مہاتما گاندھی نے دوسری گول میز کانفرنس میں حصہ لیا لیکن
ان کو وہاں کافی مایوسی ہوئی اور واپس ہو کر انہوں نے تحریک سول
نافرمانی جس کو عارضی طور سے روک دیا تھا پھر جاری کیا اس سے
ہندوستانی سیاست عجیب و غریب موڑ پر کھڑی ہو گئی خلیق الزماں
اور ان کے ہم خیال لوگوں نے جولائی ۱۹۳۲ء میں مسلم لیڈروں کی ایک
کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کی صدارت نواب سر ذوالفقار علی خاں
صاحب نے کی۔ ملک فیروز خان نون، جماعت علما اور مسلم نیشنلسٹ
نے بھی اس میں شرکت کی اور یہ طے پایا کہ اگست ۱۹۳۲ء میں
الہ آباد میں ایک یونٹی کانفرنس بلائی جائے۔ یہ کانفرنس اپنے
وقت کے مطابق ہوئی۔ نواب محمد اسماعیل نے مسلم کانفرنس کی نمائندگی
اور تصدق خاں اور خلیق الزماں نے نیشنلسٹ گروپ کی
نمائندگی کی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت
کی پنڈت مدن موہن مالویہ نے بھی کانفرنس میں شرکت کی یہ کانفرنس
مسلمانوں کی مرکزی حکومت میں نمائندگی کے مسئلے پر غور کرنے کے
لیے طلب کی گئی تھی ایسے وقت میں برطانوی سرکار نے
Communal Award کے دیے جانے کا اعلان کر دیا جس کے ذریعے
نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہر فرقے کے لوگوں کو جداگانہ انتخاب کا اختیار
دیا گیا کانگریس نے اس کی مخالفت کی اور خلیق الزماں نے مسلم
نیشنلسٹوں کی کانفرنس بلائی جس کی صدارت راجہ آف سلیم پور
نے کی خلیق الزماں نے اس میں معرکۃ آرا تقریر کی اور کہا کہ
Communal Award کے مقابلے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ
تمام پارٹیاں مل جائیں اور ہر پارٹی ایک دوسرے کے مفاد میں کام
کرے۔ ممبران نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور خلیق الزماں نے
ایک نئی پارٹی بنائی جس کا نام مسلم یونٹی بورڈ رکھا گیا راجہ آف
سلیم پور کو اس کا صدر اور خلیق الزماں کو سکریٹری مقرر کیا گیا
اسی اثنا سوراج پارٹی کو پھر زندہ کیا گیا اور الکشن لڑنے کی تیاریاں
ہونے لگیں۔ خلیق الزماں نے یونٹی بورڈ کے ٹکٹ پر الکشن لڑے
اور لڑائے اور تقریباً سب ہی سیٹوں پر مسلم نیشنلسٹ کامیاب
ہوئے۔ ان کی کامیابی صرف خلیق الزماں کی انتھک کوششوں
کی وجہ سے تھی۔

۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت الکشن ہونا قرار پائے تھے اور
لیگ اور کانگریس کو الکشن لڑنا تھے۔ مسلمانوں میں آپس میں
بہت اختلاف تھا اور الکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے
ان کو سخت اتحاد کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے تحت جناح مولانا
سعید احمد (سکریٹری جماعت العلماء) جن کا اثر مسلم یونٹی بورڈ
میں بہت تھا ان سے گفتگو کرنے پر مجبور ہوئے تا کہ مشترک پلیٹ فارم
سے مسلمان ۱۹۳۷ء کا الکشن لڑیں اور یہ تب ہی ممکن تھا جب کہ
یونٹی بورڈ اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتا ہو سکے لیگ
سے گفتگو کرنے کی غرض سے یونٹی بورڈ نے مولانا شوکت علی
مولانا کفایت اللہ مولانا حسین احمد اور خلیق الزماں کا انتخاب کیا
آخر کار سمجھوتا یہ ہوا کہ یونٹی بورڈ لیگ کے کاموں میں مزاحمت
نہ کریگا۔ اس لیے جناح نے ۱۹۳۷ء کے الکشن کے لیے جن ممبروں کا
انتخاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے لیے کیا اس میں یونٹی بورڈ
خلافت کمیٹی اور احرار کے لیڈران بھی شامل تھے۔ پنجاب میں
پارلیمانی بورڈ کے راہ عمل (Rules) بنانے کے لیے لیگ نے جو
اجلاس طلب کیا اس میں راجہ آف سلیم پور اور لیاقت علی خاں
کے ساتھ خلیق الزماں کے نام کا بھی انتخاب ہوا تھا۔ اسی درمیان
خلیق الزماں کو لکھنؤ میونسپل بورڈ کی چیئرمین شپ کے لیے
دوبارہ الکشن لڑنا پڑا اور ان کا مقابلہ سید علی ظہیر سے ہوا۔ خلیق
الزماں نے الکشن جیت لیا اور چونکہ ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم
دوئم چھڑ گئی تھی اس لیے مونسپل بورڈ کا الکشن جنگ کے
اختتام تک نہ ہوا اور اس طرح خلیق الزماں کو کل ملا کر لگاتار
۱۶ سال تک چیئرمین رہنے کا موقع ملا اور انہوں نے بڑی
خوش اسلوبی اور دور اندیشی سے کام کیا۔

یوپی میں مسلم لیگ کا کام خلیق الزماں نے سنبھالا اور الکشن

نی تمام سیٹیں حاصل کیں۔ کانگریس نے بھی بہت کامیابی
ی کی خلیق الزماں کو یوپی میں صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کا لیڈر
ب کیا گیا چونکہ کوئی بھی پارٹی پوری اکثریت حاصل نہ کر سکی
س لیے مخلوط وزارت بنانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اور
یس نے خلیق الزماں سے یہ معلوم کیا کہ وہ مخلوط وزارت میں
سیٹوں کے متمنی ہیں۔ خلیق الزماں نے کہا کہ ایک تہائی۔ کانگریس
پوری کوشش تھی کہ خلیق الزماں لیگ کو خیرباد کہہ کر کانگریس
شامل ہوں مگر یہ مشکل تھا۔ مولانا آزاد اور پنڈت گوبند
پنت خلیق الزماں سے ملے اور انہوں نے مخلوط وزارت
رضامندی ظاہر کی لیکن کچھ شرائط پر جو ایک خط میں تحریر تھیں
ں کو مولانا نے خلیق الزماں کو دیا۔ اس خط میں تحریر تھا کہ
۔ ایک الگ جماعت کی حیثیت سے کام نہ کرے اور
یس کا ایک حصہ بن جائے۔ ایوان میں مسلم لیگ پارلیمانی
ختم کر دیا جائے۔ اور آئندہ یہ بورڈ کسی ممبر کو الکشن میں کھڑا
نے کا اہل نہ ہو اور کانگریس کا ہر فیصلہ اس پر واجب ہوگا۔

یہ خط پڑھ کر خلیق کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خلیق الزماں
یے آزاد کا یہ خط پروانۂ اجل تھا جس پر وہ کسی قیمت پر بھی
کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد کو جواب دیا کہ میں کسی
اپنی پارٹی کو خودکشی پر مجبور نہیں کر سکتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
یس نے مخلوط وزارت نہیں بنائی اور لیگ کو حزب مخالف
رائض انجام دینا پڑے۔ خلیق کی لیڈرشپ میں یوپی میں لیگ
ہ دن طاقتور ہوتی گئی۔ کانگریس کی وزارت بننے کے بعد
ں میں "ہندو راج" کا احساس بہت مستحکم ہونے لگا جس کی
سے ہندو مسلم فسادات ظہور میں آئے۔

مسلم لیگ اب پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی تھی اور اس میں
ساس بیدار ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستانی سیاست
پنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہیے۔ یوپی میں مسلم لیگ کے مضبوط
نے سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمت بڑھی۔ خلیق الزماں
بشش تھی کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اس سال لکھنؤ میں ہو

لیکن کانگریس وزارت کے ڈر سے مسلمانوں میں ہمت نہ تھی۔
خلیق الزماں نے گھر جا جا کر مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اس
جلسے کے صدر محمد علی جناح کا استقبال اسٹیشن پر جا کر کریں اور اس کے
اجلاس میں شریک ہوں۔ جھجک اٹھتی گئی اور ہمت بڑھتی گئی۔
لیگ کا یہ جلسہ بڑی کامیابی سے طے ہوا۔ اس جلسے میں سر سکندر
حیات خاں نے پنجاب کے ایم ایل اے کی بھاری جماعت کے ہمراہ
اور شیر بنگال فضل الحق نے بہت سے بنگالی لیڈر اور پارٹی ورکرس
کے ساتھ شرکت کی۔ اس کے علاوہ سندھ، بمبئی، صوبہ سرحد، صوبہ
متوسط ہند، مدراس وغیرہ سے بھی لیڈروں نے بڑی تعداد میں
شرکت کی اور خلیق الزماں کی محنت کام آئی۔

مسلم لیگ کا یہ جلسہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ جناح
کے صدارتی خطبہ سے جو بہت ہی پر مغز تھا لیگ میں ایک
نئی جان آ گئی یہ جلسہ اس لیے بھی اہم ہے کہ لیگ نے اپنے دستور
میں ترمیم کی۔ ۱۹۳۱ میں لیگ کا نعرہ Full-self Government تھا
۱۹۳۶ میں یہ نعرہ Complete Responsible Government میں
بدل گیا۔ لیکن لیگ کے بہت سے لیڈران دونوں سے مطمئن
نہیں تھے۔ خود خلیق الزماں کو بھی ان دونوں نعروں سے اتفاق
نہیں تھا۔ خلیق الزماں کا خیال تھا کہ لیگ کو مکمل آزادی یعنی
آزاد خود مختار جمہوری حکومت جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ
ہو اپنا نصب العین رکھنا چاہیے۔ کافی بحث و مباحثے کے بعد
جناح نے خلیق الزماں سے اتفاق کیا چنانچہ لیگ کے دستور میں
تبدیلی کی گئی اور اس کی شاخیں مضبوطی سے مضبوط بنائی گئیں

لیگ اور کانگریس کے اختلاف بڑھتے جاتے تھے دونوں
جماعتوں میں گفتگو ہوتی تھی مگر بے اثر۔ کانگریس مسلم لیگ کا
یہ دعویٰ ماننے کو تیار نہ تھی کہ لیگ ہی صرف وہ واحد جماعت ہے
جو مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس درمیان خلیق الزماں
نے مصر کی دعوت پر ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی فلسطین
کانفرنس میں کی جو لندن میں منعقد ہوئی تھی اور جس کا مقصد
یہ تھا کہ فلسطین کا بٹوارہ نہ ہو۔ سعودی عرب، یمن، عراق وغیرہ

کے نمائندوں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی۔

دوران قیام لندن میں خلیق الزماں کی ملاقات چودھری رحمت علی سے ہوئی جو کسی زمانے میں کیمبرج کے طالب علم تھے اور پاکستان کی اسکیم کے بانی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ دونوں لیڈروں کے مابین کافی ملاقاتیں اور گفتگو رہیں۔ خلیق الزماں لفظ پاکستان کے خلاف تھے۔ چودھری رحمت علی کی اسکیم میں بنگال کا حوالہ نہ تھا بلکہ وہ پورا پنجاب جو دہلی تک ہو اور صوبہ سرحد کو چاہتے تھے۔ خلیق الزماں کا سیاسی رجحان ان سے مختلف تھا۔ وہ بنگال بھی چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان دو وفاقی حکومتیں ہوں لیکن اس کا نام پاکستان کے علاوہ کچھ اور ہو۔ اور خلیق الزماں کا خیال آہستہ آہستہ لیگ میں مقبول ہوا۔

اسی درمیان آپ لندن میں لارڈ زٹ لینڈ وزیر ہند سے ملے۔ ایک گھنٹہ تیس منٹ کی طویل نشست میں خلیق الزماں نے زور دیا کہ ہندوستان کو تین وفاقی حکومتوں میں یعنی مسلم اکثریت والے صوبے اور ہندو اکثریت والے صوبوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ مشرق میں آسام اور بنگال اور مغرب میں پنجاب صوبہ سرحد اور سندھ وغیرہ کی دو وفاقی حکومتیں بنائی جائیں۔ باقی بچے ہوئے صوبے ہندو اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کا ایک الگ وفاق ہو۔ ان کے درمیان جو ریاستیں ہوں وہ اپنے اپنے وفاق سے الحاق کریں۔ لارڈ زٹ لینڈ نے اس سے اتفاق کیا۔

۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو جب خلیق الزماں بمبئی پہنچے اور اخبارات میں ان کی گفتگو شائع ہوئی تو کانگریس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ان کو ملک کا بٹوارہ ناگزیر نظر آنے لگا۔ کانگریس راج زیادہ عرصہ صوبوں میں قائم نہ رہ سکا۔ اور جب برطانیہ نے ۱۹۳۹ میں جرمنی کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور ہندوستان کو بھی اس میں شامل کر لیا تو کانگریس کی وزارتیں صوبوں سے مستعفی ہو گئیں۔ جناح کے حکم پر لیگ نے زبردست خوشی کا اظہار کیا اور "یوم نجات" منایا۔ آہستہ آہستہ وہ وقت اب آپہنچا تھا کہ لیگ واضح طور سے اپنی پالیسی کا اعلان کرے۔ اس درمیان سر سکندر حیات نے بھی ایک اسکیم پیش کی کہ ہندوستان کو سات مختلف حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ اور ہندوستان کو ایک Confederal Structure کی شکل دی جائے لیکن خلیق الزماں کو اس اسکیم سے اختلاف تھا۔ وہ اپنی اسی اسکیم پر قائم تھے جس کو انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ ان کی ذاتی اسکیم تھی اور ابھی تک لیگ نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ چند ماہ بعد یہ طے پایا کہ لیگ کا ایک وفد لندن جاکر سکریٹری آف اسٹیٹ سے ملے۔ لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے آنریبل فضل الحق، سر سکندر حیات خاں، خواجہ سر ناظم الدین اور خلیق الزماں کے نام تجویز کیے۔ جب لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۴ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ہوا تو خلیق الزماں نے ممبران کمیٹی سے اس بات کی وضاحت چاہی کہ وفد کون سی اسکیم لندن میں پیش کرے گا۔ سر سکندر اور خلیق الزماں کی اسکیموں پہ بحث ہوئی اور آخرکار خلیق الزماں کا نقطہ نظر تسلیم کر لیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ لیگ نے تقسیم ملک کے سلسلے میں خلیق الزماں کی اسکیم کو مان لیا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں لیگ کا جو اجلاس ہوا اس میں ملک کی تقسیم کا رزولیوشن فضل الحق نے پیش کیا۔ جناح کے اشارے پر خلیق الزماں نے اس کی تائید کی اور رزولیوشن پاس ہو گیا۔ تاریخ کے صفحات میں یہ رزولیوشن "لاہور رزولیوشن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیگ نے ملک کے مغرب میں ایک وفاقی حکومت جس میں پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان ہوں اور مشرق میں آسام اور بنگال کے وفاق کا رزولیوشن پیش کیا گیا تھا۔ پاکستان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ لفظ پاکستان ہندو پریس کی ایجاد ہے۔ جس نے لاہور رزولیوشن پر تبصرہ کرتے ہوئے ان وفاقی حکومتوں کو "پاکستان" کا نام دیا۔

۱۹۴۲ میں پروفیسر کوپ لینڈ ہندوستان آئے۔ ان کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے گفتگو کریں اور سیاسی معاملات میں برطانیہ کو مشورہ دیں۔ یوپی کے گورنر سر موریس ہیلٹ کی دعوت پر خلیق الزماں پروفیسر کوپ لینڈ

ملے. دونوں میں قریب ۵ گھنٹہ گفت و شنید رہی اور خلیق
ں نے پروفیسر موصوف کو لیگ کا زاویہ سمجھا کر لاہور رزولیوشن
ت بتائی. پروفیسر کوپ لینڈ خلیق الزماں کے دلائل سے اس
ناثر ہوئے کہ وہ پاکستان کے حامی بن گئے۔ پروفیسر کوپلینڈ
رسیلیٹ کو بتایا کہ خلیق الزماں سے بہتر کسی نے بھی ان کو پاکستان
طالبہ کی بابت نہیں بتایا تھا اور وہ ان سے بہت متاثر ہوئے.

۱۹۴۲ء میں لیگ نے ڈیفنس کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ جاپان
یوں سے ملک کا تحفظ کیا جا سکے. اس کمیٹی میں جناح نے نواب
ماعیل سر خواجہ ناظم الدین. قاضی عیسیٰ کے علاوہ خلیق الزماں
ں نامزد کیا اس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے خلیق الزماں نے پورے
کا دورہ کیا. شاید ہی کوئی گوشہ بچا ہو جہاں وہ نہ گئے ہوں۔
لی تقریریں کیں اور ہزاروں لوگوں سے انٹرویو لیا اور اس
یگ کے مطالبہ پاکستان کو بہت تقویت پہنچی جو کسی اور
مکن نہ تھی. جب لیگ نے سنہ ۱۹۴۶ء میں الکشن لڑے تو اس میں
یق الزماں پیش پیش تھے۔ ممبروں کو ٹکٹ دینے کا کام بھی
ں کے سپرد تھا. اس لیے وہ ہر وقت پا بہ رکاب رہتے اور ر
ں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ یہ الکشن لیگ کے لیے بڑی آزمائش
ا. اس لیے کہ مسلمانوں کی دوسری سیاسی پارٹیاں۔ مسلم
لسٹ۔ احرار۔ جمیعتہ العلما۔ مسلم مجلس۔ آزاد بورڈ وغیرہ
سرہ سب ہی کانگریس کی ہم نوا تھیں. ان کی کانگریس
پالیسی سے کانگریس یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ لیگ ہی مسلمانوں
ائندگی نہیں کرتی بلکہ اور دیگر جماعتیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی
ندگی کرتی ہیں اس کے برعکس لیگ کا یہ دعویٰ تھا کہ لیگ ہی
لمانوں کی واحد جماعت ہے اور مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف
سے ہے۔ لیگ کے اس دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے خلیق الزماں
پورے ملک کا دورہ کیا. لیڈروں سے گفتگو کی اور الکشن کے
ے دلوائے۔ جب الکشن کے نتائج سامنے آئے تو خلیق الزماں
شی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ لیگ نے بھاری اکثریت حاصل کی.
ی اسمبلی میں لیگ کی ۳۰ سیٹیں تھیں اور لیگ نے سب ہی

جیت لیں. بنگال میں ۱۱۹ سیٹوں میں لیگ کو ۱۱۷ ملیں. بہار میں ۵۰ میں
لیگ نے ۳۴ حاصل کیں. یوپی میں ۶۶ سیٹوں میں لیگ نے ۵۴
حاصل کیں سندھ میں ۳۴ سیٹوں میں لیگ نے کل سیٹیں حاصل
کیں بمبئی میں بھی لیگ نے اپنی پوری کی پوری سیٹوں پر کامیابی حاصل
کی صرف صوبہ سرحد میں لیگ کو زیادہ کامیابی نہیں ملی وہاں ۳۹
سیٹوں میں سے لیگ کو صرف ۱۷ سیٹیں مل سکیں. مجموعی طور سے
لیگ کی پوزیشن بہت مضبوط تھی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ
لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے.

کانگریس لیگ اور برطانیہ کے درمیان کوئی سمجھوتا نہ
ہوا تھا اس لیے برطانیہ سرکار نے ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن
Cabinet Mission ہندوستان روانہ کیا. اس مشن نے ہندوستان
پہنچ کر سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں سے گفتگو کی اور شملہ میں ایک
کانفرنس طلب کی. حالانکہ خلیق کو کانفرنس میں حصہ لینے کا موقع
نہیں ملا تاہم وہ لیگ کے مشیر کی حیثیت سے شملہ میں رہے.

۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کا وقت آگیا. مسٹر جناح کے حکم
پر خلیق الزماں نے ہندوستانی مسلم لیگ کی لیڈر شپ سنبھال لی
اور خود جناح اور ان کا عملہ نئے ملک کی تعمیر کے لیے پاکستان چلے گئے
ملک کے دونوں حصوں میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی. بڑے پیمانے
پر مسلمان ہندوستان سے جانے لگے اور ہندو پاکستان سے آنے
لگے. راستے غیر محفوظ ہو گئے. خلیق الزماں نے پنڈت جواہر لال نہرو
اور سردار پٹیل سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے
فوج تعینات کریں جو کی گئی اور سیکڑوں مسلمانوں کو بچایا گیا.
اسی درمیان سر ظفر اللہ خاں جو یو این. او میں پاکستان کے لیڈر تھے
کہا کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں کا قتل نہ روکا گیا تو پاکستان اس
مسئلے میں براہ راست مداخلت کرے گا. انہوں نے ہندوستانی
گورنمنٹ پر الزام لگایا کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لیے
کچھ نہیں کر رہی ہے. ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا گورنمنٹ پاکستان
نے ان سے کہا ہے کہ وہ اس معاملے میں یو این او سے رجوع کریں تو
انہوں نے جواب دیا کہ کسی وقت بھی گورنمنٹ پاکستان ان سے

اس معاملے کو یو این او میں پیش کرنے کو کہہ سکتی ہے۔

خلیق الزماں نے جو ہندوستانی دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی ہند کے لیڈر تھے اس بیان کو چیلنج کیا اور انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم اقلیت ہندوستان میں قتل و غارت گری کا شکار رہی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو بھی مغربی پنجاب میں ان ہی پریشانیوں سے دوچار ہیں۔

انہوں نے اپنے بیان میں ہندوستان گورنمنٹ کی کوششوں کو سراہا جس نے مرکز اور صوبوں میں امن و امان قائم کرنے میں اپنی ساری کوشش لگادی۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کی کوششوں کی زبردست تعریف کی جن کی وجہ سے نہ صرف کلکتہ بلکہ مشرقی اور مغربی بنگال میں امن قائم ہوا۔

ظفر اللہ خاں کے بیان کے تین دن بعد لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان دہلی آئے اور دونوں وزرائے اعظم نے اقلیتوں کے حالات کا جائزہ لیا اور ان کے بھی احساسات وہی تھے جو خلیق الزماں کے تھے۔

اسی درمیان یہ خبر مشہور ہوئی کہ تمام ہندو سندھ ہندوستان آنے کو تیار ہو چکے ہیں اس سے کانگریس اور مہاتما گاندھی کو بہت تشویش ہوئی اور یہ سوچا گیا کہ کوئی مسلمان پاکستان جا کر سندھ کے ہندوؤں کو اس سے باز رکھے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں خلیق الزماں سے کوئی بہتر آدمی نہ تھا جو اس خدمت کو انجام دیتا۔ چنانچہ خلیق الزماں کو لکھنؤ سے طلب کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے ان کو بتایا کہ وہ برصغیر کی اقلیتوں کی حفاظت میں اپنا سب کچھ قربان کر چکے ہیں اور ہندوؤں کی پاکستان سے آمد ہندوستان کے امن کے لیے بہت مضر ثابت ہوگی اس لیے وہ پاکستان جائیں اور جس طرح بھی ممکن ہو ہندوؤں کو روکیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خلیق الزماں کراچی روانہ ہو گئے۔ ان کو یہ امید نہ تھی کہ اب وہ لکھنؤ واپس نہ لوٹیں گے اس لیے لکھنؤ سے دہلی روانہ ہوتے وقت اپنے صرف چند کپڑوں کا ایک سوٹ کیس ساتھ لے گئے تھے اور حالات نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ دہلی سے لکھنؤ واپس آتے۔ کراچی پہنچ کر انہوں نے جناح سے ملاقات کی کوشش کی جو تین دن بعد ملنے ہوئی۔ وقت مقررہ پر خلیق الزماں گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ جناح سر ظفر اللہ خاں کا بیان اور خلیق الزماں کا جواب لیے ہوئے تشریف لائے اور خلیق الزماں کے بیان پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ خلیق الزماں نے اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہندوستان کے اس لیڈر کا بیان ہے جو اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے لیکن یہ جواب جناح کو متاثر نہ کر سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیق الزماں کا بیان بالکل مناسب تھا اور کوئی بھی حزب مخالف کا لیڈر یہی بیان دیتا جو انہوں نے سر ظفر اللہ خاں کے بیان پر دیا۔

جناح کے رویے سے خلیق الزماں کو بہت مایوسی ہوئی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ جب وہ ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو پیش نہیں کر سکتے جس کی ذمہ داری خود جناح نے ان پر ڈالی تھی تو ان کی واپسی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سودمند ثابت نہ ہوگی۔ انہوں نے ہندوستان واپس آنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ملکی سیاست سے دست بردار ہو گئے۔ جناح سے یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔[۱۳]

زندگی کا بہترین حصہ انہوں نے مسلم لیگ کی خدمت میں صرف کیا اور پاکستانی عوام چاہے اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں پاکستان کی تعمیر میں خلیق الزماں کا رول جناح سے کم نہیں رہا ہے۔ پاکستان شاید کبھی وجود میں نہ آتا اگر خلیق الزماں مسلم لیگ میں شامل نہ ہوتے۔ ۱۹۳۷ء سے خلیق الزماں ہمہ تن لیگ کے کام میں لگ گئے۔ انہوں نے بہت نمایاں کام کیے اور جناح نے ہر موقع پر ان کے نقطۂ نظر کو قبول کیا یوپی کے مسلمانوں نے لیگ کے جسد مردہ میں نئی روح پھونکی۔ جمعیت العلماء، احرار، مسلم نیشنلسٹ، آزاد بورڈ سے ٹکر لینا جناح کے بس کی بات نہ تھی یہ صرف خلیق الزماں ہی کی کاوش تھی جس نے ان پارٹیوں سے چٹانوں جیسا مقابلہ کیا۔ لارڈ زٹ لینڈ اور پروفیسر کوپ لینڈ کو مطمئن کرنا بھی ان ہی کا کام تھا جو خلیق الزماں کی ملاقات کے بعد لیگ کے زبردست حامی بن گئے۔

وہ شخص جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لیگ کی خدمت میں صرف کیا ہو پاکستان جا کر بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتا تھا جیسا کہ دیگر لوگوں نے کیا مگر انہوں نے جناح کے مشورہ کو مانا اور دنیاوی شہرت اور عہدہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو پاکستان میں ان کے لیے

بکے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کو ترجیح دی۔ ۱۵ اگست کو
ریسم لہرانے کے بعد جواہر لال کی تقریر کے بعد خلیق الزماں نے جو
ی اس نے جواہر لال کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے خلیق
کو گلے سے لپٹا لیا۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات اور حالات قیامت
م نہ تھے خلیق الزماں جیسے دور اندیش سیاست داں ہی ہندوستان
سلمانوں کی رہنمائی کر سکتے تھے ان کی تقریر سے ان کی ذہانت
بہ چلتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جناح اپنا پاکستان لے کر کراچی چل دیئے۔ کیا انہوں
ں بھی یہ سوچا کہ ان کروڑوں مسلمانوں کا کیا ہوگا جو ہندوستان
ہوٹ جائیں گے۔ اور جن کو اب کانگریس گورنمنٹ کے ماتحت جینا
اور مرنا تھا جس کی مخالفت انہوں نے زندگی بھر کی۔ ہندوستانی
مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا اندازہ گورنمنٹ ہاؤس کراچی سے
نہیں لگایا جا سکتا تھا بلکہ اس کو وہ شخص سمجھ سکتا تھا جو ہندوستان
میں موجود ہو خلیق الزماں قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے ہندوستانی
مسلمانوں کی بے کسی کو سمجھا اور ان کے ساتھ وقت کے ناسازگار حالات
سے لڑنے کو تیار ہوئے خلیق الزماں کے ترک وطن کے بعد ہندوستانی
مسلمان ایک جلیل القدر مدبر سے محروم ہو گیا جس کی ان کو سخت ضرورت
تھی۔ کانگریس کے چند سیاست داں جو خلیق الزماں کے معاملے
واقف تھے وہ ان کی روانگی سے خوش تھے اور سردار پٹیل نے لکھنؤ کی
تقریر میں ان کی بابت جو کہا وہ اس کا آئینہ دار تھا۔

Footnotes

2. William Miller, The Ottoman Empire and Its Successors-1801-1923 p. 504
3. The Comrade, November 2, 1914
4. The Hardinge Papers-1914-15
5. The Independent, March 19, 1920
6. Raja Ram, The Jalliawala Maccacre, pp. 136-137
7. The Bombay Chronicle, August 20, 1923
8. Home Department (Pol.) F. No. 155/1922
9. H. N. Sabherwal and Ram Golam Gupta, Indian Politucs and Government p. 49
10. Shan Muhammad, Freedom Movement In India Role of Ali Brothers See chapter 'Communal Tension'
11. Satyamurthy, S., 'Why we Boycott the Commission in the Indian Review, December 1927, p. 802
12. See Indian Round Table Conference (12th Nov. 1930 to 19th Jan. 1931)
13. See details in Khaliquzzaman, Pathway to Pakistan

ناموران علی گڑھ

کی

پہلی جلد

قیمت: پندرہ روپے

اِس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ھیں!

۱۔ علی گڑھ اور عصرِ حاضر
۲۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر
۳۔ معمارِ قوم: سر سید
۴۔ سر سید کے ایک رفیق: منشی نجم الدین
۵۔ محسن الملک سید مہدی علی خاں
۶۔ وقار الملک مولوی مشتاق حسین
۷۔ علامہ شبلی نعمانی
۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی
۹۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد
۱۰۔ مولوی سمیع اللہ خاں
۱۱۔ جسٹس سید محمود
۱۲۔ راجہ جے کشن داس
۱۳۔ مولوی زین العابدین
۱۴۔ مولوی ذکاء اللہ
۱۵۔ مولوی چراغ علی
۱۶۔ سر سید کے مخالفین
۱۷۔ پرنسپل سر ٹامس واکر آرنلڈ
۱۸۔ پرنسپل تھیوڈور بیک
۱۹۔ پرنسپل تھیوڈور ماریسن
۲۰۔ پرنسپل ڈبلیو۔ اے۔ جے۔ آرچبولڈ
۲۱۔ حاجی اسماعیل اور چند غیر معروف رفقا۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی

ڈاکٹر جمال آرا نظامی

کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن پر کچھ توجہ نہیں دی جاتی زمانے کا
ل بڑا دردانگیز اور افسوسناک ہوتا ہے کیونکہ جو علمی و ادبی خدمات
دیتی ہیں اس سے آنے والی نسلیں بے خبر رہتی ہیں ۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی مرحوم ان ہی ہستیوں میں سے ایک ۔
بے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی یونیورسٹی
ت میں گذاردی لیکن بڑا افسوس ہے کہ ان کی حیات اور کارناموں
سلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کتابوں اور رسائل میں کوئی
سل نہیں ہوتا ۔

یہاں میں عبدالمجید صاحب کی زندگی کے متعلق جو کچھ بھی پیش
گی وہ انتہائی معتبر ذریعہ سے قارئین تک پہنچاؤں گی وہ ذریعہ
کے صاحبزادے پروفیسر عبدالوحید قریشی صاحب جن سے میں نے
ید صاحب کے سلسلے میں معلومات فراہم کیں اور جس میں کسی قسم کے شک
کی گنجائش نہیں۔

پروفیسر عبدالمجید کی پیدائش ۵ فروری ۱۸۸۵ء بھیرہ (Bhezha)
ی اس شہر میں فاتحین آکر قیام کرتے تھے گویا کہ یہ شہر تاریخی اہمیت
ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی عبدالکریم قریشی تھا۔ جب عبدالمجید
ب ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ تعلیم کی غرض سے آئے اسی سال والد نے
بل کو لبیک کہا۔

بڑے بھائی فضل حق صاحب نے دو سال ان کی کفالت کی ذمہ
اٹھائی اس کے بعد انہوں نے اپنا بوجھ خود اٹھایا۔ منجھلے بھائی
جن کا نام عبدالعزیز تھا انہوں نے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی عبدالمجید
صاحب نے علی گڑھ کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو کے رہا ان کا شوق
انہیں بے اختیارانہ علی گڑھ کھینچ لایا جو تہذیب و تمدن کا مرکز ہے
اور یہاں انہوں نے چوالیس سال طالب علم اور ریاضی کے نامور
استاد کی حیثیت سے گزارے۔ علی گڑھ آنے سے متعلق ان کا
ایک واقعہ ہے جب عبدالمجید صاحب نے تعلیم کی غرض سے یہاں بھائی
کے پاس آنے کا ارادہ کیا ایک صبح جب آنکھ کھلی تو بکس اٹھا کر باہر
آکر بس پر بیٹھ گئے اتنے میں والد صاحب فجر کی نماز کو مسجد جانے کے
لیے باہر نکلے تو بیٹے کو ایسے بیٹھے ہوئے دیکھ کر تعجب ہوا۔ اور دریافت
کیا کہ اتنے سویرے کیسے اٹھ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ میرا ارادہ علی گڑھ
جانے کا ہے۔ والد صاحب تو مسجد میں نماز کو گئے اور عبدالمجید صاحب
علی گڑھ کو روانہ ہو گئے۔ والد صاحب نے مسجد میں ہی اسی وقت وفات
پائی ادھر عبدالمجید صاحب علی گڑھ پہنچے۔ ساتھ ہی بڑے بھائی فضل
حق صاحب کو دو تار ملے ایک والد کے انتقال کا اور ایک بھائی کے
علی گڑھ پہنچنے کا۔

۱۹۰۷ء میں عبدالمجید صاحب نے علی گڑھ سے بی اے کیا اسی
سال یونین کے سکریٹری رہے اس زمانہ میں T.A.K شیروانی صدر
تھے۔ اسی زمانے میں فٹ بال کے چیمپین بھی رہے۔ بی اے کرنے کے
بعد دو لڑکوں کے نام ڈپٹی کلکٹری کے لیے جاتے تھے ان میں عبدالمجید صاحب
کا نام بھی گیا اور منظور بھی ہو گیا۔ لیکن اس سے قبل ایسا ہوا کہ ایم اے

درمیان ایک دن شام کو چار بجے کے قریب ان کے محترم استاد سر ضیاء الدین احمد مرحوم کا حکم پہنچا "پروفیسر چکرورتی رخصت پر جا رہے ہیں اور تم کو کل صبح سے ان کی جگہ کالج میں جاکر ریاضی کی تعلیم دینا ہوگی۔ جاؤ پروفیسر چکرورتی سے ان کا ٹائم ٹیبل وغیرہ لے لو"

یہ اتنی سخت ذمہ داری تھی کہ عبدالمجید صاحب کی ہمت نہ ہوتی تھی لیکن استاد کا حکم سر آنکھوں پر اسی وقت پروفیسر چکرورتی سے ملے جہاں تک وہ ہر درجہ میں پڑھا چکے تھے واقفیت حاصل کی ٹائم ٹیبل دیکھا تو پہلا کلاس جس کا سامنا صبح کو کرنا تھا بی اے کا کلاس تھا وہ بھی آخری سال اور جس کلاس میں بعض نہایت ذہین طلباء مستعد طلباء شامل تھے۔ مثلاً کرنل حیدر خاں مرحوم، پرنسپل خورشید احمد خاں مرحوم محمد فاروق وغیرہ۔ یہ سب طلباء بورڈنگ میں ان کے ہم عمر تھے۔ اس زمانے میں ایم اے کے طالب علم بہت کم ہوتے تھے یہی بی اے کے طالب علم سینیر سمجھے جاتے تھے۔ رات کو پڑھانے کی تیاری کی جیسے ہی صبح کو کلاس میں پہنچے (اس وقت ۸ بجے سے کالج شروع ہو جاتا تھا) اور حاضری لے رہے تھے کہ پیچھے نہایت خاموشی سے سر ضیاء الدین مرحوم اور پرنسپل آرچیبولڈ آکر بیٹھ گئے۔ عبدالمجید صاحب نے جو پڑھانا شروع کیا تو انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دونوں بیٹھے ہیں۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی پرنسپل صاحب بالکل نہ چاہتے تھے کہ اس جگہ پر کوئی ایسا لڑکا ہو جو ابھی ایم اے کر رہا ہو لیکن جب وہ کلاس سے نکل کر گئے تو ان کا یہ اختلاف ختم ہو چکا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے کلکٹری کا انتخاب ہوا[؎] یہاں عارضی لیکچرر شپ تھی جانے کا ارادہ کر لیا۔ ایم اے او کالج میں دستور تھا کہ جب کبھی کسی طالب علم کو یہ اعزاز حاصل ہوتا تو کالج کے آنریری سکریٹری اس طالب علم کو چائے پر بلاتے تھے یا کھانے پر اور اس میں چند استاد اور چیدہ طالب علموں کو شریک کیا جاتا تھا پھر چھوٹی سی تقریر ہوتی جس میں نئی زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتے اور الوداع کہتے ایسی ہی ایک دعوت کا اہتمام عبدالمجید صاحب کے لیے ہوا اس وقت آنریری سکریٹری نواب وقار الملک مرحوم تھے۔ تقریر کے دوران ان کی زبان سے یہ نکلا "تم بھی آخر کالج چھوڑ چلے" عبدالمجید صاحب کا کہنا تھا کہ اس فقرے نے ان کی زندگی کا رخ پلٹ دیا یہ ایک بزرگ قوم کی طرف سے ایک سرٹیفکٹ تھا انہوں نے بغیر کسی تامل کے کہا کہ

"حضور آپ ہی تو مجھے جدا کر رہے ہیں، تقرر تو
آپ اور پرنسپل صاحب کی سفارش پر ہوا ہے
ورنہ میرا جی تو یہاں سے جانے کو نہیں کرتا"

یہ بات سن کر نواب وقار الملک بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہم اتنی تنخواہ تو نہیں دے سکتے اگر تم آدھی تنخواہ پر راضی ہو جاؤ تو تمہارا مستقل تقرر یہاں میری مسرت کا باعث ہوگا لہٰذا ایک سو پچیس روپیہ ماہوار پر ان کا تقرر یہاں ہو گیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں عبدالمجید صاحب کے تقرر کا اعلان کرتے ہوئے نواب صاحب مرحوم نے لکھا

"ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے بھی ڈپٹی کلکٹری کی نوکری
پر کالج کی کم تنخواہ پر ملازمت اختیار کی تھی میں دعا
کرتا ہوں کہ جیسا ضیاء الدین احمد کا مستقبل شاندار
رہا ویسا ہی عبدالمجید قریشی کا بھی ہو"

اور شاید یہی دعائیں تھیں کہ عبدالمجید صاحب کی زندگی علی گڑھ میں جتنی شاندار رہی اس کا انہوں نے خود اقرار کیا کہ کبھی کلکٹری کی نوکری کو ترک کرنے کا خیال دل میں کبھی نہیں آیا۔

عبدالمجید صاحب ۱۹۲۰ء میں شعبہ ریاضی میں ریڈر ہوئے اور ۱۹۳۳ء میں پروفیسر ہوئے سر ضیاء الدین صاحب کی ولایت سے واپسی کے بعد وہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ اور ڈین بھی رہے عبدالمجید صاحب، سر ضیاء الدین صاحب کے شاگرد اور مرید تھے ایک مرتبہ الطاف علی بریلوی کو لکھا کراچی سے۔

"کبھی کبھار ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم یا ان کی یادگار کے
سلسلے میں کچھ "العلم" میں لکھ دیا کرو تو ان مرحوم کے
احسانوں کی کچھ تو تلافی ہو جایا کرے گی"[؎]

سر ضیاء الدین مرحوم نے ایک پوسٹ اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں قائم کی وائس چانسلر کی نکالی تھی جس پر عبدالمجید صاحب کا تقرر رہا۔ فروری ۱۹۴۶ء میں ریٹائر ہوئے لیکن سیشن پورا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء

دی کے وقت چھ ماہ وائس چانسلر شپ کے فرائض انجام دیئے۔ اس
ت کوئی وائس چانسلر نہیں تھا۔

وی ایم ہال کے چھ سال پرووسٹ رہے ایس ایس ہال
ادو دو سال کے لیے دو بار تقرر ہوا۔ سینیر موسٹ ہونے کی وجہ سے
اسی کے ممبر بھی رہے (۱) ڈیوٹی سوسائٹی (۲) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
دو ادارے یونیورسٹی کے ساتھ قائم ہوئے تھے ۳۵ سال تک ان
دونوں اداروں سے عبدالمجید صاحب کی وابستگی رہی۔ اسسٹنٹ
سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے۔ ایک مرتبہ یوپی
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس جو جونپور میں ۱۵ فروری سنہ ۱۹۳۶ء کو
منعقد ہوا تھا اس میں انہوں نے کہا کہ

"یہ کانفرنس کا اجلاس اگر اس اعتبار سے یادگار
رہے گا کہ اس اجلاس اول کی صدارت ہماری قوم
کے ایک مشہور نوجوان ماہر تعلیم نے کمال قابلیت سے
کی تو ساتھ ہی یہ واقعہ بھی غالباً فراموش نہ کیا جائے گا کہ
اسکی اجلاس دوم کی خدمت گذاری کا فرض ایک ایسا
شخص انجام دینے پر مجبور ہوا جس کے یہ بات وہم وگمان
میں بھی نہ تھی کہ وقت کے وقت اس اہم قومی خدمت کا
فرض اس کے سپرد کیا جائے گا۔ ایک قومی ضرورت کے
تحت آج کے جلسہ کے صدر منتخب عالی جناب نواب
صدر یار جنگ بہادر کا اچانک طور پر حیدر آباد
تشریف لے جانا اور آج سے صرف دو روز قبل اراکین
کانفرنس کے قرعۂ فال میں میرے نام کا نکلنا اس
تاریخی شہر کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ملک العلما شہاب الدین،
ملا محمود، قاضی جلال الدین اور سر شاہ محمد سلیمان کے
"شیراز ہند" میں ماہرین تعلیم کے اس وقیع مجمع کے
رو برو میری یہ بے بسی حقیقتاً دلی ہے کہ نہایت
عجلت کی حالت میں مجھے ایک باقاعدہ خطبۂ صدارت
کی تیاری کرنا پڑی۔ دراصل یہ جسارت میں کبھی بھی
نہ کرتا اگر میرے دل میں پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس

صوبہ متحدہ کی شاندار خدمات قومی اور اس کے کارکنان
بالخصوص خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب،
مولوی حشمت نظامی صاحب اور مولانا سید طفیل صاحب کے
ایثار و قربانی کی قدر و منزلت نہ ہوتی۔ حضرات
تعلیم کا مسئلہ نہ صرف مسلمانوں کی موت و حیات کا
مسئلہ ہے بلکہ درحقیقت تمام ملک کی آئندہ ترقی اور
اس کے سیاسی ارتقاء کا دار و مدار اسی پر ہے۔ ذاتی
طور پر میں مسلمانوں کے تعلیمی مستقبل سے مایوس نہیں
ہوں کیونکہ گذشتہ پچاس سال کی ہماری تعلیمی
جدوجہد کے نتائج ہمارے پیش نظر ہیں۔ مسلمانوں نے
تعلیم جدید کو برادران وطن کے مقابلے میں پورے
نصف صدی بعد شروع کیا اور ترقی کی دوڑ میں
اپنے تناسب آبادی کے لحاظ سے نہ صرف بیشتر حصہ
ملک میں برابر ہو گئے بلکہ بعض بعض مقامات پر ان سے
آگے نکل گئے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ۱۹۳۱ء کی رپورٹ
مردم شماری ملاحظہ فرمایئے جس کے مطالعے سے آپ کو
معلوم ہوگا کہ خصوصیت کے ساتھ ان صوبوں میں جہاں
مسلمان اقلیت میں ہیں تعلیمی ترقی میں مسلمان ہندوؤں
سے فوقیت لے گئے ہیں مثلاً یوپی کے اعداد تعلیمی
دیکھیے اس صوبہ کی کل آبادی دو کروڑ ۹۶ لاکھ چودہ
ہزار آٹھ سو تینتیس ہے ہندو مسلمان خواندہ
ساتے فیصد اور انگریزی داں چون ہیں صوبہ
مذکور میں مسلمانوں کی آبادی پندرہ فیصد یعنی ۴۴ لاکھ
۴۴ ہزار اٹھاون ہے ان میں خواندہ تین لاکھ ۴۴ ہزار
۹۰۳ یعنی ۹۰۴ ہیں انگریزی داں ۴۴ ہزار ۹۹۸ یعنی
۱۰۶۷ ہیں ان کے مقابلے میں ہندو خواندہ ۴٫۱۲۱
اور انگریزی داں ۳۹ ہیں کامیابی کی سب سے پہلی شرط
تنظیم ہے، خدا کے فضل سے مسلمانوں کی تعلیم تنظیم آل
انڈیا مسلم ایجوکیشنل کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے"

یہ خطبہ ہم نے بہت مختصر شکل میں پیش کیا ہے یہ کبھی نہ بھلایا جا سکے گا
۱۹۴۲ء میں عبدالمجید صاحب کو خان بہادر کا خطاب عطا ہوا عورتوں
کی تعلیم کے سلسلے میں بڑا شوق تھا اور اس میں برابر مصروف رہتے تھے
ڈیوٹی ہوسٹل جو سلیمان ہال کا ایک حصہ تھا وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے
پیسے سے ہندو لڑکوں کے لیے بنوایا تھا اس میں وہ برابر کے شریک
رہے۔ سلطان جہاں بلڈنگ (کانفرنس کی بلڈنگ) یہ بھی عبدالمجید
صاحب نے بنوائی تھی اس کے قریب میں چھوٹے چھوٹے گھر بنوائے بڑھاپے
میں ایک خط سر ضیاالدین احمد مرحوم کو لکھا کہ

"میں عمر کی وجہ سے بہت سے کاموں میں اب تعاون
نہ کر سکوں گا استعفیٰ دینا چاہتا ہوں"

سر ضیاالدین صاحب نے خط کی پشت پر جواب لکھا۔

"تم دو گے استعفیٰ یا میں دے دوں"

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سر ضیاالدین مرحوم ان کے
کاموں سے کس قدر مطمئن اور خوش تھے۔

عبدالمجید قریشی صاحب نے میرس روڈ پر اپنی کوٹھی بنائی جس کا
نام "بیت المجید" رکھا۔ کوٹھی میں اعلیٰ درجہ کا باغ بھی لگایا جس کا
ذکر انھوں نے پاکستان جانے کے بعد بھی کیا ہے ایک خط میں۔

"آم یہاں ملتا ہے لیکن بہت بُرا وہاں کا آم اور بالخصوص
اپنے باغ کا آم بہت یاد آتا ہے"

بلاسنڈا اسکول کی زمین بھی عبدالمجید صاحب کی تھی میرس روڈ پر کسی
کو زمین نہیں ملتی تھی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ان سے
زمین بدل لی تھی اکتوبر ۱۹۴۶ء میں بڑھاپے کی وجہ سے اپنے وطن
پاکستان چلے گئے تھے۔ کئی سال سرگودھے میں رہے۔ پاکستان میں
ضیاالدین میموریل کمیٹی بنی اس کے سکریٹری رہے۔ وہیں پر ایک
کتاب کا ۱۸ جنوری ۱۹۶۳ء میں اردو ترجمہ کیا "مقدر انسانی" جو
لی کامت دو نواے کی کتاب "ہیومن ڈیسٹنی" کا روزنامہ امروز
نے اس کتاب کے ترجمہ کے سلسلے میں لکھا۔

"ڈاکٹر لی کامت دو نوائے مشہور ماہر طب ہی نہیں
سائنسداں بھی ہیں۔ طب کے میدان میں جہاں انھوں نے

بیسوں ایجادات کیں اور کئی نئے نظریات پیش کیے
ہیں وہاں فلسفے پران کی متعدد تصانیف مختلف
عالمی اداروں کی جانب سے اول انعامات کی مستحق
قرار پائیں۔ "مقدر انسان" ان کی تصنیف "ہیومن
ڈیسٹنی" کا ترجمہ ہے جس میں مصنف نے کائنات
میں انسان کے صحیح مقام اور اس کے وجود کا حقیقی مقصد
متعین کرنے کی سعی کی ہے اور اس ضمن میں فلسفہ
اور سائنس سے استدلال کیا ہے اس تصنیف کی
اصل غایت انسان کو یہ احساس دلانا ہے کہ وہ مادی
لحاظ سے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے روحانیت کے
بغیر اس کی انسانیت کی تکمیل ممکن نہیں۔ مصنف کے
نزدیک سائنس کی ترقی نے مادہ پرستی کو فروغ
دیا ہے اور ضمیر کی آواز دبا دی گئی ہے۔ یہ صورت شرف
انسانیت کے منافی ہے۔ اصلاح احوال کے لیے ضروری
ہے کہ مذہب کو اوہام سے پاک کر کے ایک سائنٹفک
طریق سے پیش کیا جائے اور پھر مذہب اور سائنس
کی باہمی تفریق کو دور کر دیا جائے"

آخر میں ایک نظر اس پر بھی ڈال لی جائے کہ اس ماہر ریاضی داں کی
ریاضی کے بارے میں کیا رائے تھی۔ عبدالمجید صاحب کا خیال تھا کہ
ریاضی فی الحقیقت "تناسب" کا دوسرا نام ہے حسن اور زیبائی عبارت
ہے اس تناسب تامہ سے جو عالم خیال اور عالم محسوسات دونوں میں
مشترک ہے۔ ہر وہ چیز جو حسین ہے فطرت کے احساس تناسب کی
مظہر بن ہے اس کلیہ کے ماتحت ریاضی کا مرتبہ خود فنون لطیفہ سے
بلند ہے مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی وغیرہ ہمارے لیے صرف
"جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن
وہ تناسب تامہ جس پر حسن معنوی یعنی سعادت اور صداقت یا نیکی
اور پاکی کا مدار ہے جو کلید معرفت اور صحیفۂ عرفان ہے اور جو عین مقصد
حیات انسانی ہے کچھ اور ہی چیز ہے۔ فنون لطیفہ فی الحقیقت
ہماری رفیق حیات کو منتج کرتے ہیں جو ہماری خلقت میں فطرت نے

ر سکے ہیں اور جن کو بسا اوقات ہم انسانی کمزوریوں سے تعبیر
ے ہیں لیکن ریاضی ہماری رہبری عرفان اور معرفت کے ان بے پایاں
ی طرف کرتی ہے جہاں پہنچ کر ہم بالکل از خود رفتہ ہو جاتے
ہماری روح اپنی اصل سے ہم آویز ہونے کے لیے مضطرب ہونے
ہے اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں ان حقائق کو جو ہماری محدود
ر اور فکر دونوں سے بالاتر ہیں۔ یہ ریاضی سمجھ لینے یا یاد کر لینے کی
نہیں بلکہ خود حیات انسانی کا جزو بن جانے کی اور محبت کرنے کی چیز ہے

عبدالمجید صاحب نے دو شادیاں کیں پہلی شادی بدایوں میں
ی جن سے چار بچے ہوئے۔ دوسری شادی پنجاب میں کی ان سے
بچے ہوئے۔ ایک صاحبزادے پروفیسر عبدالوحید قریشی علی گڑھ میں
ے ہیں ان کی پیدائش ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ میں ہوئی یہیں تعلیم حاصل
ر یہیں شعبہ تاریخ سے منسلک رہے ۱۹۷۶ء میں ریٹائر ہوئے
ے نے اپنی رہائش گاہ کا نام بھی "بیت المجید" رکھا۔

میں پروفیسر عبدالوحید صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ
انہوں نے یہ تمام معلومات فراہم کرنے میں میری بے حد مدد کی
ورنہ عبدالمجید قریشی صاحب کے یہ تمام کارنامے اور جو یونیورسٹی
کے سلسلے میں خدمات تھیں وہ شاید منظر عام پر نہ آسکتیں اور
ایسی ہستیوں کو زمانہ وقت کے ساتھ ساتھ فراموش کر دیتا۔

آخر میں پروفیسر عبدالوحید صاحب کی صاحبزادی شیما[8] جو چند
دن قبل امریکہ سے آئی ہیں ان کا شکریہ ادا کر دوں جو ایک
کتاب پاکستان کی چھپی ہوئی "نامہ ہائے صدق و صفا"[9] اپنے
ساتھ لائیں اس سے میں نے بہت سا مواد حاصل کیا۔

عبدالمجید صاحب نے ۸۰ سال کی عمر میں بمقام کراچی
انتقال کیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حواشی

۱۔ جہلم کے کنارے ایک شہر (پنجاب)

۲۔ ریاضی کے مشہور پروفیسر۔ اسی نام سے ریاضی کی ایک کتاب بھی ہے۔

۳۔ اس زمانے میں مقابلے کا امتحان نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ "علی گڑھ میں میرے چالیس سال" قسط وار "العلم" اپریل تا جون ۱۹۶۳ء
(پروفیسر عبدالمجید قریشی) (تین قسطیں) ایڈیٹر سید الطاف علی بریلوی ([illegible])

۵۔ مولوی فرید احمد نظامی میرٹھ۔ راقم الحروف کے دادا مرحوم خیر نگر گیٹ میں مکان
جواب "قصر عزیز" میرے والد کے نام سے ہے (عزیز احمد نظامی)

۶۔ مشہور ماہر طب، سائنس داں، بلند پایہ فلسفی

۷۔ اخبار (کراچی)

۸۔ ان کی شادی امریکہ میں ہوئی ہے اور مستقل طور سے وہیں رہتی ہیں۔

۹۔ طبع اول ۱۹۵۸ء یہ خطوط اور تعلیمی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو سید الطاف حسین
بریلوی نے مرتب کیا اور اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آف پاکستان۔ کراچی نے شائع کیا

"جن اصحاب نے سرسید کی زندگی کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے
وہ جانتے ہیں کہ طرح طرح کی دشواریوں اور رسوائیوں میں مسلسل گھرے
رہنے کے باوجود کم وبیش پچاس سال تک دن رات بغیر کسی طرح کی تعطیل
منائے قوم کی ترقی و ترفع کے لیے وہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے
بڑے کاموں میں معروف رہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت
میں، نہ اس کے بعد سرسید جیسا ہمہ صفت موصوف لیڈر اب تک مسلمانوں
میں پیدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ کچھ کچھ بے اختیار یہ بات ذہن میں آتی ہے
کہ آل تیمور کے آخری دور تفرقہ و تہلکہ میں شاہی خاندان کی کٹ پتلیوں یا
نالائق، خود غرض امرا کے بجائے کاش زمام سلطنت سرسید کے ہاتھوں
میں آئی ہوتی!"

رشید احمد صدیقی

سُلطان حیدر جُوش

وحید احمد

یادش بخیر مرحوم سلطان حیدر صاحب باپ کی طرف سے
بجنور (بدایوں) کے فریدی خاندان سے تھے اور ماں باپ کی جانب
سے ان کا سلسلہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب دہلوی سے ملتا تھا معلوم
نہیں حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ شیخ فاروقی تھے یا سید تھے مگر
سیادت فریدی کو تسلیم کرنے والے سلطان حیدر کے نام سے پہلے
سید لکھا کرتے. ان کے والد نے پہلے عیش میں پھر راہ خدا میں اپنی کثیر جائداد
لٹادی تھی سخاوت میں وہ مشہور تھے. چہرہ پر نور برستا تھا. اور
بڑھاپے میں بچوں کی سی باتیں پر وقار ظرافت سے کیا کرتے تھے. سلطان
حیدر کا بچپن اپنی والدہ صاحبہ کے زیر سایہ دہلی میں گزرا اور وہیں
تعلیم و تربیت پائی. اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کرنے
کے بعد ۱۹۰۵ء میں مدرستہ العلوم علی گڑھ پہنچے. لیکن ۱۹۰۶ء میں
بعہد محسن الملک جب کالج میں اسٹرائک ہوئی تو انہیں علی گڑھ کو
خیرباد کہنا پڑا اور سلسلۂ تعلیم ختم ہوگیا. اس کے بعد کچھ وقت بیکاری
میں گزرا اور کچھ سعی ملازمت میں. نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں ملازمت
تحصیلداری سے شروع کی اور نیک نامی کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں
ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پائی. علی گڑھ ہی میں سکونت اختیار کی اور وہیں
۱۸ مئی ۱۹۵۳ء کو ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سو رہے.

دہلی میں فٹ بال ٹیم کے اچھے کھلاڑیوں میں تھے. میچوں کے
سلسلے میں قلعہ کے انگریزی فوجیوں سے مراسم ہو گئے تھے انگریزی
تہذیب کے رسیا تھے علی گڑھ کالج کی فٹ بال ٹیم نے انہیں ہاتھوں
ہاتھ لیا. صاحبیت کے منازل طے کرنے کا یہاں خوب موقع ملا. اور
"جان بل" کے خطاب سے نوازے گئے. لباس عمدہ اور دیدہ زیب
پہنتے تھے. مجال نہ تھی کہ سوٹ میں کوئی سلوٹ در اندازی کر سکے جسمانی
ورزش کا ہر دور میں شوق رہا. ورزش اور ملازمت نے پابند اوقات
بنا دیا تھا. اسی واسطے عادات اور اصولوں میں استقلال تھا. تحکم آمیز
تھے مگر جس سے ملتے خلوص سے ملتے. تصنع اور ظاہر داری کا ان کے
یہاں گزر نہ تھا. ماشاء اللہ جسیم و وجیہ ہونے کے ساتھ زندہ دل تھے.
ظرافت ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی. شرارت و شوخی
فطرت میں داخل تھی. ان کی صحبت میں وقت کا اندازہ مشکل سے
ہوتا تھا. آخر میں ثقل سماعت نے ستم پیدا کر دیا تھا مگر اپنی ظرافت
سے اسے نباہ لے جاتے تھے.

نام یاد نہیں . مگر ایک مسلمان عالم و فاضل مذہب عیسوی
قبول کرکے پادری کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے اور دہلی میں منظر عام
پر مناظرے کیا کرتے تھے. سلطان حیدر کو مناظرے سننے کا شوق تھا
لہذا منطق سے ان کی دلچسپی بڑھی اور پھر منطق کی تحصیل بھی کی. اسی
زمانے میں ناولوں کا بھی چرچا شروع ہوا تھا لہذا طالب علمی ہی کے
زمانے میں ایک معمولی سا ناول شائع کرکے مصنف بن گئے تھے.
...افت ذکا دانی کے عہد میں شاید شاعری سے شوق رہا ہو. لیکن
ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا. بجز اس کے جوش تخلص
رکھتے تھے بہرحال ان کا علمی شوق ملاحظہ ہو رسالہ مخزن سے شروع

ہوتا ہے۔ ابتدائی دو تین مضمون اگر قابل اعتنا نہ ہوں تو نہ سہی، لیکن پھر ان کے مضامین میں اہمیت و خصوصیت جھلک مارنے لگی تھی۔ انگریزی رسالوں میں مس کوریلی کے ناولوں، آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کے ڈراموں اور دیگر یورپین تصانیف پڑھنے کے بعد انہیں افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے مقبول و دلچسپ طرز کے مالک بن گئے۔ رسالہ تمدن میں ان کے چند مضامین و افسانے ان کی پختگی کے مظہر ہیں۔ تمدن میں پروفیسر مشتاق زاہدی صاحب سے پردہ کے متعلق بحث چھڑ گئی۔ اس قلمی نبرد آزمائی سے رسالہ تمدن کی ہر دلعزیزی اور اشاعت میں معتدبہ اضافہ ہوا مجھے یاد ہے کہ سلطان حیدر اور پردہ کی موافقت میں میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور غالباً یہ میرا پہلا تیر تھا۔ جب مولانا شوکت علی صاحب نے علی گڑھ سے رسالہ "اولڈ بوائے" جاری کیا تو جوش صاحب اپنے مضامین کے ذریعہ اس رسالہ کی روح رواں تھے۔ پھر مولانا محمد علی صاحب نے دہلی سے کامریڈ کے ساتھ روزآنہ ہمدرد بھی نکالا تو اس کے اسٹاف میں سید محفوظ علی صاحب، محمد طارق صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب جیسے گراں قدر اہل قلم شامل تھے۔ ہمدرد میں اودھ پنچ کے مرحوم حاجی بغلول صاحب نے سیاسی آن بان کے ساتھ از سرنو جنم لیا تھا۔ اس موقع پر سلطان حیدر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین سے ہمدرد میں چار چاند لگا دیے اور خوب خوب داد حاصل کی۔

کہنہ مشقی نے اب انہیں مستقل تصانیف کے لیے مجبور کیا۔ چنانچہ یکے دیگرے دو تصانیف لکھیں۔ ابن مسلم ایک ناول ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے آج بھی جدت کا نمونہ ہے۔ اس میں کردار نگاری کے وصف کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا دوسرا ایڈیشن میں نے اپنے نقیب پریس بدایوں سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ اور اب تیسرا ایڈیشن لاہور سے چھپا ہے۔ ان کی دوسری کتاب بانی شیخو پورہ محتشم خاں نواب فرید کی سوانح عمری ہے جو دور جہانگیری شاہجہانی اور عالمگیری سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں تاریخ کی خشکی کو ادب کی رنگینی کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔ ان تصانیف کے بعد ان کی تحقیق اور ان کے مطالعہ میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ ان کے مختصر افسانے مثلاً "ہوائی"، اور "نقش نقاش" ان کی بیش بہا یادگار ہیں۔ پہلی جنگ جرمن کے موقع پر ریکروٹنگ آفیسر بنا دیے گئے تھے۔ اس زمانہ میں انہوں نے فوجی زندگی اور جنگ کے اصولوں کے متعلق کافی واقفیت و معلومات حاصل کی تھیں۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں اکثر میدان جنگ کے نقشوں کی بھی تفصیل مل جاتی ہے سلطان حیدر صاحب مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید کے اصول کے قائل تھے۔

اپنی تصانیف کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اشاعت کے متعلق بے نیاز رہے اور تجارتی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ ابن مسلم کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت اور افسانوں کی طباعت کی اجازت وہ اپنے چند احباب کو بلا معاوضہ عطا کر گئے۔

ولایت سے میری واپسی ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی۔ یہ حضرت اس وقت ہردوئی میں تحصیل دار تھے۔ اتفاق سے وہاں پر بہترین صحبت و سوسائٹی مہیا ہو گئی تھی۔ سید ضامن علی صاحب، سید مسعود الحسن رضوی، اور مولوی بدر الحسن صاحب اودلوی وہاں ڈپٹی کلکٹری پر فائز تھے۔ سب کے سب زندہ دل اور بامذاق تھے۔ ان سب کے روح رواں بدر الحسن صاحب تھے اور سلطان حیدر اس سوسائٹی کے پرزور رکن اعلیٰ تھے۔ ہردوئی کے دیگر مذاق سلیم رکھنے والے احباب کے علاوہ سلطان احمد صاحب بیرسٹر اور جان ظرافت چودھری، محمد علی صاحب قبلہ اس سوسائٹی کے ممبر تھے اور چودھری صاحب کا شوق رودولی سے یہاں لے آیا کرتا تھا۔ سوسائٹی کے صدر صاحب نے فرمان جاری کیا کہ ممبران آپس میں اپنے انداز طرز میں گفتگو کیا کریں۔ شاعر ممبران کو حکم ہوا کہ شاعری بھی عامیانہ روش کو ترک کر کے سوسائٹی کے رنگ میں کی جایا کرے اور اعلان عام ہوا کہ شاعر ممبران میں سے کوئی ایک صاف ستھری غزل لکھے۔ پھر اس غزل کو تمام استادان فن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیج دیا جائے۔ امیر حسن مرحوم انسپکٹر زراعت نے شاعری کے اس خاص طرز میں کمال حاصل کیا۔ شوکت الفاظ سے مشاعروں میں داد حاصل کرتے۔

نشتر سندیلوی کو جب جملہ شاعران باکمال کی اصلاحیں موصول ہو گئیں تو صنف شاعری و ادب میں اضافہ کرنے کی غرض سے کتابی صورت

ں شائع کی گئیں۔ اور بڑے بڑے ماہران فن کی شخصیتوں کو چمکا کر دکھا
یا گیا۔ غرض ہر دوئی کی اس سوسائٹی میں سلطان حیدر کو پڑھنے کا
بہترین موقع ملا۔ رسالہ نقیب بدایوں کے اجرار کا تصور اسی سوسائٹی
نے پیدا کیا تھا۔ بدایوں پہنچ کر جب سید محفوظ علی صاحب سے میں نے مشورہ
لیا تو وہ دل و جان سے سرپرستی پر آمادہ ہوگئے۔ نقیب نے ادب و
ظرافت میں کس قدر اضافہ کیا مجھے معلوم نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ سید
محفوظ علی کی تقلید کا فخر مجھے حاصل ہوا۔

پنشن کے بعد مستقل قیام علی گڑھ میں تھا مگر شیخوپور بھی آکر رہا
کرتے تھے۔ بدایوں کے اسلامیہ کالج میں خرابی واقع ہوئی۔ اور اس کے
متعلق اس کے صدر صاحب کلکٹر صاحب سے استدعا کر رہے تھے کہ
انتظامیہ کمیٹی میں بحیثیت وزیٹر کے تشریف لاکر ٹرسٹیوں میں منیجری
کے متعلق تصفیہ کر دیں۔ اس وقت میں اور سلطان حیدر صاحب ضلع
کلکٹر سے ملنے اتفاق سے پہنچے۔ کلکٹر صاحب نے سلطان حیدر صاحب
سے کہا کہ آپ ٹرسٹی بھی ہیں۔ پنشن بھی حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا میری
رائے ہے کہ آپ کالج کے ٹرسٹی بن جائیں تاکہ یہ بدنظمی دور ہو جائے یہاں
کی صورت حال پر غور کیے بغیر یہ حضرت راضی ہوگئے۔ صاحب نے صدر صاحب
سے کہا کہ اب میرے آنے کی ضرورت نہیں۔ صدر صاحب سکریٹری شپ
کے نزاع کو انہیں منتخب کر کے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں۔ صدر صاحب
نے بڑے تپاک سے وعدہ کیا۔ معاملہ طے ہوگیا اور سلطان حیدر صاحب
کی استدعا پر کلکٹر صاحب نے یہ حکم دیا ہے لہٰذا آپ غور کر لیں اور
سلطان حیدر صاحب کو سکریٹری بنالیں۔ پروپیگنڈا پہلے ہی ہو چکا
تھا۔ ٹرسٹیوں نے ان میں دو ہزار عیب نکالے اور ان کو سکریٹری
منتخب نہیں کیا۔ جب واپس آئے تو روداد مجھے سنائی۔

اب اس عرصہ میں ان کے کچھ دوست عالم بالا کو منتقل ہوگئے
اور کچھ احباب پاکستان چلے گئے۔ ان بیرونی، خانگی انقلابات نے
ان کی جان پہ بنا دی۔ اور ان کی ظرافت و شوخی نے بھی نیا دطیرہ اختیار
کر لیا بھائی عظمت اللہ خاں کی وفات پر انہیں سخت صدمہ ہوا۔
اس لیے کہ ان کے ذوق کی اصلاح کرنے میں ان کو بہت دخل تھا۔
ایک روز مجھ سے فرمایا کہ بس ہندوستان میں ایک تم ہو

اور پاکستان لاہور میں عطاء اللہ بیرسٹر جن سے ڈھارس بندھی رہتی ہے
عطاء اللہ صاحب ان کے خالہ زاد بھائی اور بچپن کے ساتھی تھے۔ اس کے
بعد جب بحیثیت پارلیمنٹری سکریٹری کے مجھے علی گڑھ کے دورے پر
جانا پڑا تو ان کو لکھ دیا تھا کہ میری مصروفیات مجھے ڈاک بنگلہ میں رہنے
کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ ان سے فارغ ہو کر میرا وقت آپ کے یہاں گزرا
کرے گا۔ دوسرے دن صبح کو جب ان سے ملنے گیا تو میری صورت دیکھتے ہی
برس پڑے میرے عہدہ کو سیکڑوں صلواتیں سنائیں۔ اور میرا اسباب ڈاک
بنگلہ سے اپنے یہاں منگوا لیا اور پھر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت
کیں جن سے میں ان کو بچانا چاہتا تھا۔ جب میں حاکم ضلع سے ملنے گیا تو
انہوں نے مجھ سے جائے قیام کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی میں نے
انہیں بتایا کہ سلطان حیدر میرے چچازاد بھائی ہیں لہٰذا ان کے حکم کی
تعمیل کرنا تھی بڑی حیرت کے ساتھ صیغۂ راز میں کلکٹر صاحب نے بتایا کہ
یہ تو پاکستانی جاسوس ہیں۔ میں نے ان کے خط پکڑے ہیں اور عنقریب
ان پر مقدمہ چلانے والا ہوں میں نے تعجب سے دریافت کیا کس کو
لکھے ہیں اور کیا لکھے ہیں کہا یہ لکھا ہے کہ اقلیت مظلوم ہوتی ہے۔ میں
ہنس پڑا میں نے اصل واقعہ سنا کر انہیں یقین دلایا کہ سلطان حیدر صاحب
کو سیاست سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔ اور اب تو اپنے بعض مضامین میں
انہوں نے کانگریس کو سراہا ہے۔ آپ کا مقدمہ ناکام ہوگا۔ تو تسلیم کرنے
کے بعد اس شکایت کو باقی رکھا کہ باوجود پنشن یافتہ ہونے کے مجھ سے
کبھی ملنے نہیں آئے۔ میں نے ان کی اس کوتاہی کی توجیہ کر کے وعدہ کر
لیا کہ اب وہ ملنے آئیں گے۔ گھر جا کر پورا لطیفہ سنا دیا اور عرض کیا کہ مل
آیئے۔ اب تو ایسے بکھرے ہیں کہ آتے ہیں تو جاتے نہیں۔ کہنے لگے میں کبھی
نہیں ملنے جاؤں گا۔ اب وہ مجھ پر مقدمہ چلالیں۔ میں اور بھابی
صاحبہ ہنسنے لگے۔ مگر صاحبزادی اور صاحبزادے نے ان کی بے طرح خبر
لی کہ نہ دوست سمجھیں نہ دشمن کو سمجھیں بر آمدہ میں بیٹھ کر ہر کس و ناکس
سے چیخ چیخ کر بحث کرتے ہیں ——۔ اب اگر کوئی C.I.D یا
دشمن رپورٹ کر دے تو موجودہ فضا میں کوئی سننے والا نہیں
اور برا دن دیکھنا پڑے گا۔ ٹھنڈے ہو کر قائل ہوگئے۔ اور دوسرے
دن کلکٹر صاحب کے یہاں جانے کو راضی ہوگئے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ

کلکٹر صاحب کو انہوں نے رام کیا یا خود رام ہو گئے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سلطان حیدر بحیثیت انسان کے مرنجاں و مرنج تھے۔ بحیثیت ادیب و ظرافت نگار کے بلند پایہ رکھتے تھے لیکن بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کی شوخی اور زندہ دلی نئے قسم کی تھی۔

جس کو عام مذاق کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کیا عجب ہے کہ بیشتر ڈپٹی کلکٹر صاحبان کا یہی مذاق ہو۔ اس کو ایک مثال دے کر سمجھاؤں گا کیونکہ ان جو اس کو سمجھنے کی قابلیت اپنے اندر نہیں پاتا۔ کانگریس گورنمنٹ نے نیا نیا چارج لیا تھا۔ میں محض کونسل کا ممبر تھا اور سلطان حیدر کی لمبی چوڑی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ میرے ساتھ مکھنؤ اس لیے گئے تھے کہ چھٹی کے بعد ان کی تعیناتی لکھنؤ ہو جائے۔ میں نے قدوائی صاحب سے اس قسم کا وعدہ لے کر انہیں بتا دیا مگر یقین نہیں آیا انہیں ساتھ لے کر ان کے سامنے مودی صاحب سے جو چیف سکریٹری تھے نوٹ لکھوا دیا۔ شام کو جب کونسل کے اجلاس سے کمرے پر پہنچا تو فرمایا کہ مجھے تحقیق ہوا کہ قدوائی صاحب کو مودی صاحب نہیں مانیں گے۔ اس لیے پنتھ جی سے کہلوا دو۔ دوسرے دن میں نے پنتھ جی صاحب سے عرض کیا اور انہوں نے بھی وعدہ کر لیا۔ اور میں سمجھا کہ اب انہیں اطمینان ہو جائے گا۔ مگر بولے تو یہ بولے کہ چیف سکریٹری بھلا ان منسٹروں کی کب ماننے والا ہے۔ گھبرا کر میں نے کہا اب تو آپ مودی صاحب سے خود مل لیجیے اس پر انہوں نے سپر ڈال دی۔ اور مودی صاحب سے ملنے گھر گئے۔ مودی صاحب کے سامنے قدوائی صاحب کا نوٹ موجود تھا۔ اس نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ علی گڑھ چاہتے ہیں؟ جواب دیا علی گڑھ ہو یا کوئی سا بدایوں کے قریب کا ضلع ہو۔ اور پھر خود ہی ایٹہ کا نام تجویز کر دیا۔ اس لیے پھر دریافت کیا کہ ترجیح کس کو دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا ایٹہ کو۔ ملاقات ختم ہو گئی۔ واپسی میں کونسل کے اجلاس کے باہر مودی صاحب کی ملاقات کا سارا حال سنایا لیکن مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کہ جلدی میں اصل حقیقت کو نہیں سمجھ پایا۔ وقت رخصت مجھے تاکید کی کہ علی گڑھ کی تعیناتی کا خیال رکھنا۔ کچھ دن بعد خط آیا ایٹہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی اور قدوائی صاحب سے شکایت کرنے پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی فرمایا کیوں حضرت یہ کیا بات ہے مجھ سے علی گڑھ کے متعلق کہا اور چیف سکریٹری سے ایٹہ کے متعلق طے کیا۔ عرض کیا یک نہ شد دو شد۔ آپ نے تو الٹا میرا منہ بند کر دیا۔ میں تو خود اسی کی شکایت کرنے آیا تھا۔ فرمایا دفتر سے تحقیق کر لو نتیجہ تحقیق وہی نکلا جو قدوائی صاحب نے فرمایا تھا۔ اب میں نے ان حضرت کو لکھا کہ ایں ہمہ آوردہ تست۔ شکایت کس بات کی ہے۔ جواب ملا یہ حرکت میں نے مصلحتاً کی تھی کہ چیف سکریٹری یہ نہ سمجھے کہ میں منسٹروں سے اس پر اثر ڈلواتا ہوں۔ مگر تمہاری کوشش پر مجھے اعتماد تھا جس میں مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہاری کوتاہی کی شکایت ہے اور کچھ نہیں۔ یہ توجیہہ سن کر مجھے اپنی غلطی تسلیم کر لینے کے علاوہ اور صورت ہی کیا تھی۔ اب آخر میں بیوی کے انتقال کے بعد ان کی ظرافت نے خود ان کے اوپر مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ظرافت سے باز نہیں آتے تھے۔

خدا جانے کیا قصہ ہے میرا اپنا تجربہ یہی ہے کہ جب میرا کوئی عزیز و قریب اس جہاں سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو میرے اور اس کے درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے۔ قصہ مختصر ان کے ایک حکم کی تعمیل میں ان کے منشی نے ایک مغالطہ پیدا کر دیا تھا ہر چند میں نے معذرت کرتے ہوئے منشی کی غلط بیانی کا یقین دلایا۔ لیکن انہوں نے میری نہیں مانی تو میں نے عمر میں پہلی مرتبہ ایک سخت خط ان کو لکھ دیا جواب آیا کہ رسول کے واسطے عند اللہ معاف کر دو۔ میں نے ان کے ہی الفاظ دہرا کے انہیں معاف کر دیا۔ لیکن اس کے بعد خط و کتابت بند ہو گئی۔

اس عرصہ میں عطاء اللہ صاحب کا لاہور میں انتقال ہو چکا تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ اس سانحہ پر ان کے اوپر کیا گزری، کچھ عرصہ بعد علی گڑھ سے خبر آئی کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے وہ بھی چل بسے۔

* * *

حسرت موہانی

پروفیسر نورالحسن نقوی

احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام نظر بند تھے۔ باقی حضرات شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں میں بھی تھا۔ اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے۔ گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے، بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا کہ جلدی چلیے کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کر دیا ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں کوئی غیبی گولہ آ پڑا ہے۔ گاندھی جی گھبرائے ہوئے جلسے سے اٹھ کر سبجیکٹ کمیٹی کی طرف روانہ ہو گئے مگر حسرت ـــ

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اسے کھلے اجلاس میں پیش کریں گے۔ چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہ اٹھی۔

ـــــــ مولانا سید سلیمان ندوی

مندرجہ بالا اقتباس سے حسرت کے رنگ طبیعت کا اندازہ لگانا ممکن ہے۔ ان کے مزاج کی اس شدت اور طبیعت کے اس جوش و خروش نے انھیں علی گڑھ میں ایسا ہر دل عزیز بنا دیا کہ یہاں کا ہر ایک طالب علم ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اسی نے شاعری و صحافت میں انھیں مقبول و محبوب بنایا مگر اسی افتاد طبع کے باعث اس خوش گو شاعر، بیباک صحافی اور نڈر سپاہی کو سیاسی حلقوں میں وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ ہر طرح مستحق تھا۔

سوانح :

فضل الحسن جنھوں نے مولانا حسرت موہانی کے نام سے شہرت پائی، حضرت امام رضا کی اولاد میں تھے۔ ان کے ابو الآبا سید محمود نیشاپوری جو جناب امام کی سترھویں پشت میں تھے،

ترکِ وطن کرکے ہندوستان آئے اور موجودہ اترپردیش کے قصبہ موہان ضلع اُناؤ میں جو لکھنؤ سے چودہ میل کے فاصلے پر ہے، اقامت گزیں ہوئے۔ یہ بات ۶۱۱ہجری کی ہے۔ اس کے ثبوت میں دفترِ حسرت نے یہ اشعار پیش کیے ہیں،

اولادِ علی بود نیشا پوری محمود
در پانصد و ہفتاد درآمد بوجود
در شش صد و یازدہ وطن را بگذشت
ناچار شد از دست ہلاکو مردود
در شش صد و پانزدہ در موہان رسید
در شش صد و سی دہشت رحلت فرمود

ان کی سولھویں پشت میں فضل الحسن پیدا ہوئے[1]

ان کا سنہ ولادت ۱۸۸۰ء ہے۔ بچپن موہان ہی میں گزرا اور ابتدائی تعلیم پہلے گھر اور پھر مدرسے میں ہوئی۔ یہیں اوائلِ شباب کی وہ وارداتیں پیش آئیں جنھوں نے ان کی شاعری کا اولین محرک فراہم کیا۔ ۱۸۹۳ء کی ایک غزل کا مطلع ہے،

عشق نے ان کو سکھا دی شاعری
اب تو اچھی فکرِ حسرت ہو گئی

اس عشق کی تفصیل تو معلوم نہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہمارے علم میں ہے کہ حسرت کے قریبی عزیز ان کے اس زمانے کے متعلق گفتگو کرتے وقت زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ کبھی کبھی اُڑتا اُڑتا کوئی نام بھی سنائی دیتا ہے کبھی خوبصورت پنکھیوں کا ذکر ہوتا ہے جو خربوزوں کے بیجوں کو پیلا اور سرخ رنگ کر بنائی گئی تھیں اور ہدیۂ شوق کے طور پر پیش کی گئی تھیں[2]

حسرت بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس وقت تک وہ مڈل کے امتحان سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں یہ امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور ۱۸۹۸ء میں انٹرنس کرنے کے بعد علی گڑھ پہنچے یہاں ۱۵ر مارچ ۱۸۹۹ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی انٹرمیجیٹ کلاس میں داخلہ لیا۔ اس تاریخ کو حسرت کی زندگی کا ایک اہم موڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔

حسرت علی گڑھ پہنچے تو نرالی دھج تھی۔ چھوٹا سا قد، لاغر بدن، گندمی رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، ابھی ابھی داڑھی، سر پر کالا بھوری ٹوپی، چارخانے کا انگرکھا، ٹخنوں سے اونچا پائجامہ، آنکھوں پر پرانی وضع کی عینک، ایک ہاتھ میں چھتری، دوسرے میں پاندان۔ شریر لڑکوں نے خالہ جان کا لقب عطا کیا[3] یہاں ان باتوں کی کسے پروا تھی۔ آخر کار حسرت کی شخصیت کے جادو نے کام کیا۔ طلبا ان کی لیاقت و صلاحیت کے قائل ہوتے گئے اور حسرت خالہ جان کے بجائے مولانا کہلانے لگے۔ اب ان کا نام ادب و احترام اور محبت کے ساتھ لیا جانے لگا۔

حسرت ملک و قوم کے پرستار تھے اور ملک پر انگریزی تسلط انھیں ناگوار تھا۔ کالج پر انگریز اسٹاف کی بالادستی انھیں بے حد ناپسند تھی۔ جلد ہی اس کے اظہار کا بھی موقع مل گیا۔ ایک بار کالج کی کرکٹ ٹیم نے کسی انگریز ٹیم کو ہرا دیا۔ طلبا نے اس فتح کا زبردست جشن منایا۔ لڑکے رکابیاں، گلاس، لوٹے بجاتے کمروں سے باہر نکل آئے۔ حسرت ایک ٹوٹا ہوا کنستر لیے سب سے آگے تھے۔ یہ جلوس خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا کالج اسٹاف کی رہائش گاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر کار محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچا۔ حسرت کی سرکشی و شدت پسندی کا یہ پہلا سرِعام اظہار تھا۔ بقول یلدرم نتیجہ یہ ہوا کہ اس فردِ سیاہ میں جو پرنسپل کے داہنے خانے میں رہتی ہے، ان کا نام لکھ لیا گیا۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حسرت کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے انجمن اردوئے معلی کے نام سے ایک علمی و ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی جو آج بھی شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام جاری ہے اور طلبا و طالبات کو تحریر و تقریر کی تربیت دیتی ہے۔ حسرت اس کے سرگرم رکن تھے۔ ۱۹۰۳ء کے اوائل میں اس انجمن نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ اس مشاعرے کا انتظام معتمد کی حیثیت سے حسرت نے کیا۔ اس وقت ماریسن کالج کے پرنسپل تھے۔ حسرت علی گڑھ آئے تو مسٹر بیک اس منصب پر فائز تھے۔ وہ مسلمانوں کے بہت بڑے محسن تھے اور کالج کے

سے بے پناہ محبت کرتے تھے اس لیے ان میں بے حد مقبول
۔۔ ان کی وفات پر حسرت نے کہا تھا ۔

بیک کے مرجانے سے ویران جلسہ ہوگیا
خاک میں ارمان ملے ، خونِ تمنا ہوگیا

پل کا عہدہ مسٹر ماریسن کو تفویض ہوا تو انھوں نے یہ اشعار کہے ،

افسرِ اعلا ہوئے ماریسنِ ذی شان و علم
سن کے یہ جامے سے باہر ہر مسلمان ہوگیا
آپ کے اسلام پر احسان سارے دیکھ کر
ہر مسلمان خود بخود ممنونِ احسان ہوگیا

، اس مشاعرے کے سلسلے میں پرنسپل صاحب کو ایسی اطلاعات
پہنچائی گئیں جو ان کی خفگی کا باعث ہوئیں ۔ اس مشاعرے
گستاخ شاگردِ امیر مینائی بھی شریک تھے ۔ انھوں نے غزل
ی ۔ جس کی صورت اچھی دیکھی اس پہ شیدا ہوگیا
پل صاحب کو بتایا گیا کہ گستاخ نے مشاعرے میں مخربِ اخلاق
ر پڑھے ۔ انھوں نے حسرت سے باز پرس کی ۔ حسرت نے
، کی تردید کی ۔ نوبت تکرار تک پہنچی ۔ حسرت نے کہا ہمارے
اق کے معیار آپ کے معیاروں سے مختلف ہیں ۔ اس پر
پل صاحب نے چراغ پا ہوکر کہا کہ اخلاق کے دو مختلف معیار
طرح ممکن ہیں اور حسرت کو کالج سے نکال دینے کی سفارش
۔ کالج کے سکریٹری محسن الملک نے اس سزا میں اتنی ترمیم کردی
سرت کو کالج سے تو نکال دیا مگر انھیں امتحان میں شریک
ے کی اجازت دے دی ۔

حسرت شہر علی گڑھ کے محلہ رسل گنج میں کرائے پر مکان
کر رہنے لگے ۔ یہ بات ۱۹۰۳ء کی ہے ۔ یہ سال حسرت کی
گی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس سال انھوں نے
۔ اے ۔ کا امتحان پاس کیا ۔ اس کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ
کر ہاسٹل میں رہنا چاہا مگر پرنسپل صاحب سخت ناراض
ے اجازت نہیں ملی ۔ ساتھ ہی انھیں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ
یشہ ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا ہے چنانچہ انھوں نے

فیصلہ کرلیا کہ ۔

فکرِ معاش سے گزر ، حوصلۂ معاد کر

اسی غزل کا ایک شعر ہے ۔

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر

چنانچہ یہ بھی طے ہوگیا کہ باقی زندگی ملک کو غلامی سے نجات دلانے کی جد و جہد میں بسر ہوگی ۔

اسی سال کا ایک نہایت اہم واقعہ خاندان کی ایک تعلیم یافتہ اور شیر دل خاتون نشاط النسا بیگم سے حسرت کی شادی ہے ۔ سخت آزمائشوں کے موقعوں پر انھوں نے حسرت کو سہارا دیا اور ان کے حوصلے بلند رکھے ۔

اسی سال (۱۹۰۳ء) جولائی کے مہینے سے حسرت نے ایک علمی و ادبی مجلہ اردوئے معلیٰ جاری کیا جس کا اصل مقصد "درستیِ مذاق" تھا ۔ مگر حسرت کی توجہ اب شعر و ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کی طرف بھی ہو گئی اور سیاسی مضامین بھی اس کے صفحات میں جگہ پانے لگے ۔ نومبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں اعلان ہوا کہ "آئندہ اس کے صفحات کا زیادہ حصہ لٹریچر اور پالیٹکس سے متعلق ہوا کرے گا " اس وقت حسرت کانگریس کے سرگرم رکن بن چکے تھے اور اس کے انتہا پسند حلقے سے متعلق تھے ۔ اس حلقے کی قیادت بال گنگا دھر تلک کے ہاتھ میں تھی ۔ حسرت نے اعلان کیا " ہم پالیٹکس میں مسٹر تلک اور بابو اروند گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں " اور کہا " ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو " تلک کی گرفتاری پر حسرت نے اپنے شعروں میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ۔

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِ ذوالمنن

مولانا حسرت کا " اردوئے معلیٰ " اب جدو جہد آزادی میں

اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو تحریک آزادی اور بالخصوص
کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا تھا جو ان حالات میں یقیناً
درست تھا مگر اب حالات بدل چکے تھے اور ضروری تھا کہ مسلمان
بھی اس سلسلے میں سرگرم عمل ہوں۔ سرسید اس وقت حیات ہوتے تو
یقیناً مسلمانوں کو یہی مشورہ دیتے۔ حسرت نے اردوئے معلیٰ کے
ذریعے یہ خدمت انجام دی اور مسلمانوں کو تحریک کی طرف متوجہ کیا۔
اپریل ۱۹۰۸ء کے رسالے میں "مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی"
کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جسے ارباب حکومت نے
باغیانہ فعل قرار دیا اور مضمون نگار کا نام جاننا چاہا مگر حسرت نے
نام بتانے سے انکار کر دیا اور ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔
اس پر انھیں ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔
۴ اگست ۱۹۰۸ء کو انھیں عدالت نے دو سال کی قید با مشقت
کی سزا دی اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کیا۔ اپیل پر ہائی کورٹ نے سزا
میں ایک سال کی تخفیف کر دی مگر جرمانہ معاف نہیں کیا۔ حسرت نے
جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ان کا کتب خانہ جس میں
بہت سی نادر کتابیں اور مخطوطات شامل تھے۔ ساٹھ روپے میں
نیلام کر دیا گیا۔ حسرت کی شادی کو اس وقت صرف پانچ برس
ہوئے تھے اور گھر میں بے سروسامانی کا عالم تھا مگر بیگم حسرت
نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا۔ اسی درمیان انھیں مالی امداد بھی
پیش کی گئی جسے قبول کرنے سے انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ
حسرت نے کبھی کسی کا سہارا منظور نہیں کیا تو میں یہ کیسے گوارا کروں۔
صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے شوہر کو لکھا۔ "تم پر جو افتاد
پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا خیال نہ کرنا
خبردار تم سے کسی طرح کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔"

رہائی کے بعد حسرت نے اردوئے معلیٰ پھر سے جاری کیا اور
"مشاہدات زنداں" کے عنوان سے اپنی اسیری کے حالات قلم بند
کیے۔ ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ حسرت نے قید و بند کی
کیسی صعوبتیں جھیلیں۔ حسرت کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر لے جایا گیا۔
راستے میں ہیگار کا اتفاق مل جاتا تو انھیں اسی عالم میں اسٹیشن تک
جانا پڑتا۔ سفر کے دوران قیدی کو ایک آنہ یومیہ خوراک کے لیے
ملتا تھا مگر وہ بھی ادا نہیں کیا گیا اور حسرت کو مٹھی بھر چنوں پر
گزر کرنی پڑی۔ ۴ اگست کو جب عدالت نے انھیں مجرم قرار
دے کر سزائے سخت کا حکم صادر کر دیا تو اس کی ابتدا اس طرح
ہوئی کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک
کرتا ٹوپی پہننے کے لیے، ایک ٹکڑا ٹاٹ بچھانے اور ایک کمبل
اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدحِ آہنی بڑا، ایک لوٹا دیگر جملہ
ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔ جیل کی سخت ترین
مشقت چکی سے پہلے روز ہی سابقہ پڑا اور ایک من آٹا روز پیسنے
کی مشقت مقرر ہوئی۔ اس مشقت کا ذکر حسرت نے اپنے شعروں
میں بھی کیا ہے۔ حسرت نے ملک کی خاطر یہ تکلیف تو آسانی سے
سہہ لی مگر شکایت اس کی تھی کہ انھیں جیل میں اخبار میسر نہ تھا،
اور میسر ہوتا بھی تو بغیر عینک کے اخبار پڑھتے کیسے۔ عینک تو
جیل میں قدم رکھنے سے پہلے اتروا لی گئی تھی۔ کتابوں کا ایک
پلندہ حسرت ساتھ لے گئے تھے اسے چھین کر سپردِ آتش
کر دیا گیا۔

چکی پیسنے کی مشقت قید و بند کی زندگی میں سب سے کڑی
سزا خیال کی جاتی ہے اور چند مہینوں کے بعد قیدی کو نسبتاً
کسی سہل کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ حسرت کے مقام و مرتبے
کے پیشِ نظر عام رائے تھی کہ کوئی پڑھنے لکھنے کا کام ان کے
سپرد ہوگا مگر تمام روایات اور سارے دستور بالائے طاق
رکھ کے آخر تک ان سے یہی خدمت لی گئی۔ رہائی کے دن نزدیک
آ گئے تو ایک روز ان سے پوچھا ضرور گیا کہ کوئی اور مشقت
پسند کرو گے؟ مگر حسرت کی غیرت نے کسی رعایت کو قبول
کرنا گوارا نہ کیا۔ حسرت جیل ہی میں تھے کہ والد بیمار ہوئے
اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بیٹے کو نہ بیماری کی اطلاع
ہوئی نہ موت کی۔

اب حکومت حسرت کے باغیانہ خیالات سے پوری طرح باخبر
تھی۔ ان کی ہر تقریر اور ہر تحریر پر نظر رکھی جاتی تھی اور اسی

بی ہوتی تھی۔ مئی ۱۹۱۳ء میں حسرت کے پریس سے تین ہزار کی
ت طلب کی گئی اور زرِ ضمانت جمع نہ کرنے کی پاداش میں پریس
کرلیا گیا۔ اس کے نتیجے میں اردوے معلّیٰ کی اشاعت بند ہوگئی۔
ے اور شغل کے ساتھ ذریعۂ آمدنی ختم ہوا تو حسرت نے گزر اوقات
یے محلہ رسل گنج (علی گڑھ) میں ایک سودیشی اسٹور قائم کرلیا۔
ت وتالیف ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کی تسکین بھی ضروری
۔ اس لیے جولائی ۱۹۱۴ء سے "تذکرۃ الشعرا" کے نام سے ایک
ہی رسالہ جاری کیا جسے وہ زیادہ عرصے زندہ نہ رکھ سکے۔
اپریل ۱۹۱۶ء میں پھر قید و بند کی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں
ملی۔ رہائی کے بعد وہ پھر آزادی کی جدوجہد میں منہمک ہوگئے۔
ت تحریک اور ترک موالات اب ان کی توجہ کے خاص مرکز تھے۔
ب ان میں ایک طرح کی بددلی پیدا ہونے لگی تھی۔ در اصل
ں ناز تھا تلک کی پیروی پر اور تلک کو مہاتما گاندھی پر اعتماد
تھا۔ انھیں گاندھی جی کی اہنسا اور کھادی تحریک دونوں مہمل
تھیں۔ جب تک تلک زندہ رہے کانگریس کا بایاں بازو مضبوط
۔ ان کی وفات کے بعد کانگریس کی قیادت بلا شرکت غیرے مہاتما
ہاتھ میں آگئی۔ حسرت کو یہ صورتحال ناگوار تھی مگر وہ کچھ نہ کرسکتے
۔ مہاتما کی ہمسری ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تاہم انھوں نے
دھی جی کے خلاف آواز ضرور اٹھائی۔ امرتسر کے اجلاس
مبر ۱۹۱۹ء) میں انھوں نے گاندھی جی کی مخالفت کی مگر اس کا
اثر نہ ہوا۔ وہ حصولِ آزادی کے لیے پُرامن جدوجہد کو ناکافی
کرتے تھے۔

حسرت حریتِ کامل کے علمبردار تھے اور ان کے یہاں
لحت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ۱۹۲۱ء کا سال تحریکِ آزادی کی
خ اور خود حسرت کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت
تا ہے۔ اس سال آل انڈیا کانگریس، خلافت کانفرنس اور
لیگ تینوں کے اجلاس الٰہ آباد میں ہوئے اور معلوم ہوا کہ تینوں
ستوں میں ایک بھی ایسا سرپھرا نہ تھا جو تمام مصلحت اندیشی کو
دکھ کے مکمل آزادی کے سلسلے میں حسرت کی تائید کرسکتا۔

کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کے جلسے میں حسرت نے مکمل آزادی کی
تجویز پیش کی۔ مہاتما گاندھی اس وقت موجود نہیں تھے۔ رضا کاروں
نے انھیں اطلاع دی تو وہ گھبرائے ہوئے واپس آئے۔ گاندھی جی
اس تجویز کو قبل از وقت خیال کرتے تھے۔ حسرت کی تجویز پر رائے
دیتے ہوئے انھوں نے کہا "حسرت ہم کو ایسے پانی میں لے جانا چاہتے
ہیں جس کی گہرائی کا بھی ہمیں اندازہ نہیں میں پورے اعتماد کے ساتھ
آپ سے اسے مسترد کرنے کی اپیل کرتا ہوں"۔ تجویز مسترد ہوئی مگر حسرت،
کب ماننے والے تھے۔ انھوں نے یہ تجویز کھلے اجلاس میں پیش کی۔
مگر ہزاروں کے مجمع میں کسی کی ہمت نہ تھی جو اس تجویز کی تائید بھی
کرسکے۔ حسرت کو اسی کا اندیشہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی بیگم کو ساتھ
لے گئے تھے انھوں نے آخر میں کہا میں اپنی بیوی کو اس تجویز کی تائید
کرنے کے لیے ساتھ لایا ہوں۔ میں نہیں چاہتا مورخ لکھے کہ مکمل
آزادی کا ریزولیشن پیش ہوا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی ایک ہاتھ
بھی اس کی تائید میں نہیں اٹھا[4] حسرت نے ایسی پرجوش تقریر
کی تھی کہ بقول سبھاش بوس اندازہ یہ ہوتا تھا کہ تجویز زبردست
کثرت رائے سے منظور ہوگی[5] یہی خیال بام فورڈ کا ہے[6] احمد آباد
کے اجلاس کی صدارت چترنجن داس کرنے والے تھے مگر وہ پہلے ہی
گرفتار کرلیے گئے۔ عام خیال ہے کہ وہ موجود ہوتے تو حسرت کی
پُرزور حمایت کرتے۔

اس کے بعد حسرت نے یہ ریزولیشن خلافت کانفرنس کی سبجکٹ
کمیٹی میں پیش کیا اور منظور بھی ہوگیا حکیم اجمل خاں نے کانفرنس کے
اجلاس کی صدارت کی اور صدر کا خصوصی اختیار استعمال کرتے ہوئے
اس تجویز کو جلسۂ عام میں پیش کرنے کی اجازت ہی نہ دی۔ مسلم لیگ
کے اجلاس کی صدارت خود حسرت کے حصے میں آئی تھی۔ انھوں نے
یہ تجویز مولانا آزاد سبحانی سے پیش کرائی مگر سبجکٹ کمیٹی اسے پہلے ہی
نامنظور کرچکی تھی۔ تاہم حسرت نے یہ کہہ کر اس تجویز پر بحث کی اجازت
دی کہ اس تجویز کو مسترد سمجھا جائے گا اور اس پر رائے شماری
نہیں ہوگی۔

اگلا سال مولانا کے لیے پھر قید و بند کا پیغام لایا۔ ۱۹۲۲ء سے

۱۹۲۴ء تک وہ جیل میں رہے۔ ان کی رہائش اب کانپور میں تھی اور ان کا تعلق کانگریس کے بجائے اب مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی سے تھا۔ اس میں انھیں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ اسی زمانے میں (۱۹۲۸ء) انھوں نے کانپور سے روزنامہ "مستقبل" جاری کیا۔

۱۹۳۷ء میں حسرت اپنی رفیق حیات سے محروم ہوگئے۔ نشاط النسا بیگم کی رفاقت پر انھیں بجا طور پر ناز تھا۔ اس حوصلہ مند خاتون نے بڑے خلوص اور بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور ان کے دکھ درد میں شریک رہیں۔ حسرت کی زندگی میں دکھ درد کے سوا رکھا ہی کیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کملا نہ ہوتی تو نہرو نہ ہوتے، زلیخا نہ ہوتی تو ابوالکلام آزاد نہ ہوتے اور نشاط النسا بیگم نہ ہوتی تو حسرت نہ ہوتے۔ پہلی دو باتیں چاہے درست نہ ہوں لیکن آخری یقیناً صحیح ہے۔ سخت سے سخت حالات میں وہ اپنے شوہر کو سہارا دیتی رہیں اور کبھی انھیں ہمت نہ ہارنے دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں کوہِ عزم وثبات" کا لقب عطا کیا۔ حسرت نے اپنے شعروں میں ان کی موت کا اس طرح ماتم کیا۔

مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے
سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے، نہ وہ ذخیرۂ شوق
توڑ دوں کنجیاں خزانے کی
غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس
دل کسی اور سے لگانے کی
ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت
دل فریبی ترے فسانے کی

مگر وقت ایسا مرہم ہے جو گہرے سے گہرے گھاؤ بھر دیتا ہے۔ اگلے سال یعنی ۱۹۳۸ء میں حسرت نے اپنے خاندان کی ایک بیوہ حبیبہ بیگم سے عقد ثانی کر لیا۔

۱۹۴۶ء میں حسرت مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کانپور سے یوپی اسمبلی کے ممبر چنے گئے اور مجلس آئین ساز میں انھوں نے یوپی کی نمائندگی کی۔ آخرکار ملک کا آئین مکمل ہوا مگر وہ حسرت کی توقعات پر پورا نہیں اترتا تھا۔ حسرت مجلس کے اکیلے رکن تھے، جنھوں نے اس آئین کے خلاف رائے دی اور جب اس پر دستخط کرنے کا وقت آیا تو اس سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کا دستور سوویت یونین کے دستور کے نمونے پر ہونا چاہیے کیونکہ اہل ہند کے مفادات کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن ہے، انھوں نے کہا تھا۔

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین سوویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

آزادی کے بعد حسرت جیسے سرفروش مجاہد آزادی کی جتنی عزت افزائی ہوتی کم تھا مگر محرومی کے سوا ان کے حصے میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ کسی صلہ وستائش کے طلب گار بھی نہ تھے لیکن تھے تو آخر انسان ہی مسلسل نظر انداز کیے جانے سے ان کے مزاج میں ایک افسردگی اور بے دلی سی پیدا ہوگئی تھی جو آخر وقت تک ان کے ساتھ رہی۔

حسرت نے ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور ان کے جسد خاکی کو اسی شام فرنگی محل کے قبرستان انوار باغ میں سپرد خاک کیا گیا۔

سیرت:

حسرت ایک مرد درویش تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ اور ضروریات بہت محدود تھیں اس لیے وہ کبھی دھن دولت کی طرف نہیں دوڑے بلکہ ہمیشہ اس سے دور ہی بھاگے۔ کالج کی انتظامیہ نے جب یہ حکم نافذ کر دیا کہ ان کے سودیشی اسٹور کا بائیکاٹ کیا جائے تو وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے بولے ہمارا خرچ ہی کتنا ہے جو فکرمند ہوں۔ آمدنی ہمیشہ خرچ سے کم رہی۔ اس لیے ملازم رکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ کرایے کے جس مکان میں رہتے تھے اس میں نل نہیں تھا۔ مکان کے سامنے سڑک کے اس پار پانی کا نلکا تھا۔ حسرت پائنچے چڑھا کر بالٹیاں

بھر کے لاتے اور دن بھر کی ضرورت کے لیے گھڑوں میں پانی بھر لیتے
اس کام میں مدد کرنا چاہتا تو سختی سے انکار کر دیتے۔

لباس کی طرف سے وہ ہمیشہ بے پرواہ رہے۔ بیگم نے جو
ے دیدیے انھوں نے بلا تامل پہن لیے۔ وہ ان کے کپڑے
ہی سیتی تھیں خود ہی دھوتی تھیں۔ مولانا کو افسوس تھا کہ شیروانی
ی سے سلوانی پڑتی ہے۔ بیگم سے ذکر کیا تو انھوں نے کسی درزی
شیروانی کی تراش سیکھ لی اور درزی کا قصہ ہی پاک ہوگیا۔

تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ اکثر کئی کئی وقت کے فاقوں کی
ت آجاتی تھی۔ ایک بار کوئی تاجر مولانا کے سلام کو حاضر ہوا۔
ھا کچھ لکھنے میں مشغول ہیں۔ پشت پر ایک پھٹا پرانا پردہ لٹکا
ہے اس کے پیچھے سے کچھ نکال کے کھاتے جاتے ہیں۔ تاجر کے
رار پر مولانا نے پردہ ہٹایا تو پتہ چلا ایک آب خورے میں
ھی روٹی کے ٹکڑے بھگو رکھے ہیں جس سے بھوک مٹا رہے ہیں۔"
کھی روٹی بھی کئی وقت کے فاقوں کے بعد میسر آئی تھی۔ کچھ میسر
ر مہمانداری کا شوق بھی پورا کر لیتے تھے مگر انتہائی بے تکلفی اور سادگی
ساتھ۔ ایک دوست کو کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا وقت آیا تو
ن عزیز کے لیے ڈیوڑھی میں چٹائی بچھادی اندر سے ایک کابی
، چنے کی دال کا سالن اور طباق میں روٹیاں لے آئے۔ اسے
ت سے بٹھایا اور میزبانی کا حق ادا کر دیا۔

حسرت کے یہ قصے تو اب تک بہتوں کو یاد ہوں گے کہ
ی مشاعرے میں جاتے تو ریل کا تیسرے درجے کا کرایہ بڑی
کل سے قبول کرتے اور اسٹیشن سے جلسہ گاہ تک عموماً پا پیادہ ہی
ج جاتے۔ انھوں نے ایک مشاعرے کے منتظمین سے یہ کہہ کر
ر خرچ لینے سے انکار کر دیا تھا کہ گرفتاری کے ڈر سے بلا ٹکٹ
ن میں بیٹھ کر آیا ہوں کرایہ کیسے لے لوں۔ ایک بار پی ایچ ڈی
زبانی امتحان لینے علی گڑھ آئے۔ رشید صاحب نے دستخط
ے لیے ٹی۔ اے بل پیش کیا۔ میزان پر نظر پڑی تو دیر تک
تے رہے کہ اتنے بہت سے روپیوں کا ہم کریں گے کیا؟ پھر
فصیل پر نظر پڑی تو چونکے، بولے ہم تو تھرڈ کلاس میں آئے ہیں

فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسے لے لیں۔ پھر ارشاد ہوا ہم تو آپ کے گھر
ٹھہرے ہیں یہ قیام و طعام کا خرچ کیا معنی؟ اتنے میں کچھ اور خیال آیا
بولے ہم تو دہلی جا رہے تھے ذرا دیر کو یہاں اتر گئے ہم تو کچھ لے ہی
نہیں سکتے۔

حسرت کو اس پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ پارلیمنٹ کے ممبر
خود اپنی سرکار سے سفر خرچ کے نام پر اتنی بڑی رقمیں کیوں وصول
کرتے ہیں۔ وہ خود اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی جاتے تو اس
شان سے کہ ایک میلا سا تکیہ پھٹی ہوئی دری میں لپٹا، رسی سے
بندھا داہنی بغل میں ہے اور دوسرے ہاتھ میں لوٹا، اسٹیشن
سے نکل کے نئی دہلی کی ایک مسجد میں جا پہنچتے کہ یہی ان کی قیام گاہ
تھی۔ کئی میل کا یہ سفر پیدل طے ہوتا۔ جس غریب کو سرکار سے
بھتا وصول کرنا نہ ہو وہ یہ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

حسرت کا ایک شعر ہے:

لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو
کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل

مصلحت کوشی اور عافیت بینی جیسے الفاظ ان کی لغت
میں تھے ہی نہیں۔ وہ بہت نڈر اور بے باک تھے اور ان کے
مزاج میں ایک خاص قسم کی شدت پسندی تھی حصولِ آزادی
کے لیے وہ تشدّد کو بھی جائز اور ضروری خیال کرتے تھے۔ اور
اہنسا کو اصول خودکشی بتاتے تھے۔ ایک شعر میں کہا ہے کہ ہم
گاندھی کی طرح بیٹھ کے چرخا کاتنے والے نہیں لینن کی طرح
دنیا کو ہلا ڈالنے والے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب حکومت سے عدم تعاون
کا اعلان کر دیا تو پھر کسی بھی طرح کی لچک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سول
نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور جیل جانے کا وقت آیا تو گاندھی جی
اور دوسرے رہنما چپ چاپ پولیس کے ساتھ ہو لیے۔ حسرت نے
سنا تو حیران ہوتے کہ یہ کیا نافرمانی ہوئی۔ جب پولیس انھیں گرفتار
کرنے پہنچی تو دل میں جیل جانے کی خواہش تھی مگر اظہار نافرمانی کے
لیے زمین پر اوندھے لیٹ گئے کہ میں تو نہیں جاتا۔ مار پڑ رہی ہے
مگر نہیں اٹھتے۔ پولیس والوں نے گھسیٹا تو گھاس پکڑ لی۔ آخر بہ ہزار

وقت اسباب کی طرح لاری پر لاد کرے جائے گئے۔[۱]

حسرت کی بے باکی اور صاف گوئی کبھی کبھی ان سے ایسی باتیں کہلوا دیتی تھی جن کا کہنا نامناسب ہوا اور جو ملک و قوم کے لیے مضر ہوں۔ انھوں نے شیخ عبد اللہ سے بگڑ کے پوچھا تھا کہ تم نے کشمیر کے راجا کی بالادستی کیوں تسلیم کی۔ کانپور میں مسلمانوں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ آپ کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اگر حکومت آپ کے ساتھ انصاف نہ کرسکی تو میں آپ کو گوریلا جنگ شروع کرنے کا مشورہ دوں گا۔ آزادی کے بعد ملک کے استحکام کے لیے سردار پٹیل نے بعض ریاستوں کو حسنِ تدبیر سے رام کیا بعض کو زور زبردستی سے قابو میں لائے۔ یہ بات مولانا کو ناگوار گزری۔ انھوں نے سرعام ہندوستان کے مردِ آہن سردار پٹیل کو مخاطب کرکے کہا: تم نے وہی کام کیا ہے جو ہٹلر، مسولنی اور کلایو نے کیا تھا۔ تم نے اپنی طاقتور فوجوں کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادیاں چھینی ہیں۔ تمھارے محکمے پر خدا کی لعنت ہو۔

اس طرح کی تقاریر اور ایسے بیانات سے مولانا کے بارے میں اکثر غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی جذباتیت اور شدت پسندی سے خود ان کی ذات کو بھی نقصان پہنچا اور ملکی سیاست خصوصاً مسلم سیاست کو بھی۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ غور و فکر کے عادی نہ تھے یا ان میں تدبر کی کمی تھی۔ ان کی طبیعت میں ایک طرح کی جلد بازی ضرور تھی۔ ان کے مزاج میں تلون تھا۔ ہر کام جلدی کرتے، فیصلہ کرنے میں بھی دیر نہ لگاتے تھے۔ جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تو چونکہ مصلحت کا ان کے مزاج میں گزر نہ تھا، موقع محل دیکھے بغیر دل کی بات زبان پر لے آتے ورنہ ان کی دور اندیشی اور فہم و فراست کے ثبوت میں بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم بہت دنوں مکمل غیر جانب داری کی پالیسی پر عمل نہیں کرسکتے۔ لامحالہ کسی ایک بلاک سے ہمیں اپنا رشتہ استوار کرنا ہوگا اور وہ بلاک امریکی نہیں روسی بلاک ہونا چاہیے۔ دولت مشترکہ کے زیرسایہ رہنے کو وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ مرکز کے بجائے ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کے حق میں تھے۔ ان کا خ
تھا کہ مرکز کے پاس صرف دفاع، رسل و رسائل اور مالیات جیسے چ
محکمے ہی رہنے چاہئیں۔ کون جانے کل لوگوں کے سوچنے کا انداز
ہوگا اور حسرت کی رائے کے متعلق مستقبل کیا فیصلہ کرے گا۔

اردو رسم خط کو حسرت مشکل بتاتے تھے اور آزادی سے
پہلے انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں رومن (انگریزی) رسم خ
اپنا لینا چاہیے، اس کے کئی فائدے ہیں۔ انگریزی اعداد اور نا
بالکل اسی طرح باقی رہیں گے، ٹائپ اور چھاپے کی آسانی ہو جا
بولنے کی حد تک اردو زبان سارے ملک میں سمجھی جاتی ہے۔ معا
صرف رسم خط کا ہے۔ رومن رسم خط سے اس کے حدود بہت
وسیع ہو جائیں گے اور یہ زبان بآسانی انتہائے جنوب تک
پہنچ جائے گی اور پھر ملک کی کوئی زبان اردو کی ہمسری کا دعو
نہ کرسکے گی۔ اس وقت لوگ مولانا کے مشورے کو ایک دیوا
کی بات سمجھ کر ہنس دیے اور خود مولانا بھی چپ ہو رہے لیکن
آج بعض لوگوں کو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اس دیوانے کی با
میں وزن تھا ضرور۔

حسرت کی ناکامی کے اسباب متعدد تھے اور ان میں سے
یقیناً ایک یہ بھی تھا کہ ان کی شخصیت میں وہ جاذبیت نہ تھی ج
لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر ان کے شعروں میں جادو کا سا
اثر تھا۔ سیاست کی دنیا پر نہ سہی شاعری کی دنیا پر ان کی حکمرا
مسلّم تھی۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

*

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

*

گر جوششِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

*

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر
جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی

اور اسی طرح کے بہت سے اشعار اور ان کے ساتھ "لندن کی آفتِ جاں"، "قبرص کی پری" اور "یونان کی حسینہ" کے قصے پڑھ پڑھ کر کسی عجب سجیلے جوان کی تصویر آنکھوں میں بس گئی تھی مگر جب انھیں پہلی بار نئی دہلی کی ایک مسجد کے پاس الجھی ہوئی بے ہنگم داڑھی، پچکی ہوئی ٹوپی، ٹوٹی ہوئی کمانی کی عینک، ملی دلی کھدر کی شیروانی کے ساتھ ایک ہاتھ میں لوٹا اٹھائے، دوسرے میں رسی سے بندھا دری تکیہ سنبھالے پھٹی پھٹی باریک آواز میں بولتے دیکھا تو ایک عظیم الشان دیوار ڈھیتی ہوئی معلوم ہوئی مگر جب ان کے حالات زندگی اور کارناموں سے شناسائی حاصل ہوئی تو اسی شکستہ دیوار کے ملبے سے ایک مینارۂ نور بلند ہوتا دکھائی دیا — ایسا بلند کہ آج تک تو اس کا ہمسر کوئی دوسرا مینار نظر آیا نہیں۔

حواشی

●

۔ نعیمہ بیگم: حسرت موہانی (جائزہ) ص ۴

۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو عبداللطیف اعظمی کا مضمون "مولانا حسرت موہانی" ماہنامہ آجکل نئی دہلی، حسرت نمبر، مئی ۱۹۸۵ء ص ۵ تا ۸۔
اس مضمون کا بیشتر سوانحی مواد اسی مضمون سے ماخوذ ہے۔

۔ رابعہ بیگم: حسرت کی خانگی زندگی، اردو اکتوبر ۱۹۵۱ حسرت نمبر

۔ خانی خاں (یعنی سجاد حیدر یلدرم) "حسرت ایک قدر داں کی نظر سے" بحوالہ "کارِ جہاں دراز ہے"، حصہ اول، ص ۱۱۰۔

۔ مجنوں گورکھپوری: اردو ادب، حسرت موہانی نمبر۔

۶۔ حسرت کی کہانی نعیمہ کی زبانی، ص ۲۰۔

۷۔ حسرت: اردوے معلی، مارچ ۱۹۱۰ء

۸۔ انڈین مینول رجسٹر ۱۹۲۱ حصہ دوم، ص ۶۵۔

۹۔ سبھاش بوس: انڈین اسٹرگل، ص ۶۹۔

۱۰۔ بام فورڈ رپورٹ ص ۴۷، ۴۸۔

۱۱۔ کرشن بلد یو شرما: مولانا حسرت موہانی، آجکل ستمبر ۸۱، حسرت نمبر، ص ۳۲۔

۱۲۔ سید مشرف علی: مولانا حسرت موہانی، تہذیب الاخلاق، اگست ۸۴ء، ص ۱۹۔

"موجودہ زمانے میں جب کہ مغربی علوم کی تعلیم ہندوستانی
زندگی کی ایک عام حقیقت بن گئی ہے اور ہم تعلیم کے لفظ کا اطلاق صرف اس
تعلیم پر کرنے لگے ہیں بہت کم لوگ اس جدوجہد کی دشواریوں کا صحیح اندازہ
کرسکیں گے جو آج سے سو برس پہلے نئی تعلیم کے حامیوں کو پیش آئی تھیں ۔
انہیں صرف نیا راستہ ہی نہیں دکھانا تھا۔ اس راستے میں قدم قدم پر لڑنا تھا۔
ان کی راہ قدامت پرستی کی بے شمار قوتوں سے رکی ہوئی تھی۔ جو ہمیشہ نئی تبدیلیوں
کی راہ روکنا چاہتی ہیں۔ صدیوں کے اوہام و تعصبات ہر طرف چھائے ہوئے تھے
طرح طرح کے دماغی عقائد جذباتی رجحانات برسرِ پیکار تھے۔ مخالف قوتوں کے
ہاتھ میں ایک بڑا ہتھیار مذہب کا بھی تھا۔ مذہب کی راہ اصلاً علم اور عقل کی
راہوں کی مخالف نہیں ہے۔ لیکن اُسے ہمیشہ مخالف بنا لیا گیا ہے۔ وقت کا عام
عقیدہ یہ تھا کہ مغربی علم کی تعلیم لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کردے گی اور اگر
ہمیں مذہب عزیز ہے تو پرانی تعلیم پر قناعت کرلینی چاہیے۔ دراصل یہ جنگ
فکرِ انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں
اور اٹھارہویں صدی میں ہوئی۔ اور مشرقی ممالک کا اس سے سامنا انیسویں صدی
میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور جلد ختم ہوگئی۔ مگر مسلمانوں
میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے۔ وقت
کے تقاضے فتح مند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔ جہاں تک
کہ مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف و ڈر کہا جاسکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا
مردِ میداں وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشے میں مدفون ہے۔ یہ
جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری
مینار رہے گا۔"

ابوالکلام آزاد

محمود احمد عباسی امروہوی

مالک رام

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطۂ خلیفہ عباسی (بغداد)
ین الرّشید (خلفِ ہارون رشید) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ
بن الرّشید (۸۰۹ ـ ۸۱۲ ء) حضرتِ عباسؓ سے نویں پشت
ں تھے۔ جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں نے بغداد کو تاراج کیا
ر آخری خلیفۂ بنی عباس معتصم باللہ کو تہہ تیغ کر دیا تو اس
اندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترکِ
لن پر مجبور ہوئے۔ انہیں خلیفہ امین سے دسویں پشت
ں مخدوم زادہ محمد یوسف بھی تھے، وہ ہندوستان چلے آئے
سلطان غیاث الدین بلبن کا عہدِ حکومت تھا۔ سلطان نے
ن کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیشِ نظر انہیں ہاتھوں
تھ لیا، اور شایانِ شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان
یک صدی تک آرام و آسایش سے دہلی میں مقیم رہا تھا کہ
تنے میں قہرِ خداوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب
ندوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین
ہاں سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام
ہوں نے وہیں بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا رکن الدین
باسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودی کے عہد
ں پنجاب سے نقلِ مکان کر کے امروہہ آئے۔ عباسیان
روہہ انہیں مولانا رکن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رکن الدین کی نویں پشت میں مولانا سید احمد علی
شاہ عباسی پچھلی صدی کے صاحبِ صورت و سیرت بزرگ
تھے۔ شروع سے خاندانی جاہ و ثروت سے کنارہ کش اور
یاد اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ
چشتی قادری مانکپوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے
سلاسل طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں
بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعۂ
کتبِ دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادتِ الٰہی میں پیر کے دن ۲۹ر
شوال ۱۲۹۷ھ (۴ار اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر
میں انتقال کیا۔ امروہہ میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انہیں
انہیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سیّد احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سیّد علی محمد عباسی
۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ - ۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دینی
تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی پھر حکومت
انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثناء میں وکالت کا امتحان پاس
کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا پہلے مختلف مقامات پر کام
کیا، لیکن بالآخر امروہہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا شہر کے اکابر
میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے
والد کے پہلو میں جوارِ حضرت شاہ علاؤل میں دفن
ہوئے۔

سیّد علی محمد عباسی نے اپنی زندگی میں دو نکاح
کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب
کے نام لکھنا طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ دو قابلِ ذکر ہیں۔
سب سے بڑے محمد داؤد عباسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ
میں طالب علم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تضمین
کے سلسلے میں بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، یہ سیّد علی

محمد عباسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ وہ ۲۰ رمضان ۱۲۸۰ھ (۲۹ فروری ۱۸۶۴ء) کو امروہہ میں پیدا ہوئے ان کا بعارضۂ تپ دق ۲۷ جون کو فتح آباد (ضلع آگرہ) میں انتقال ہوا، اور وہیں احاطۂ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔ («خمخانۂ جاوید»[۳] میں دونوں تاریخیں غلط ہیں)۔ ان کی مثنوی «لحن داؤدی» محمود احمد عباسی نے شایع کی تھی۔
محمد داؤد کے چھوٹے بھائی حکیم فرید احمد عباسی کا اپنے عہد کے مشہور طبیبوں میں شمار تھا۔ وہ مدتوں طبیہ کالج، دہلی کے پرنسپل بھی رہے۔

سید علی محمد عباسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد صدیقی کی صاحبزادی (صغیر النسا) تھیں۔ ان بیگم سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے۔ محمود احمد عباسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے، یہ گویا محمد داؤد عباسی مذکور الصدر کے علاتی بھائی تھے۔ وہ منگل کے دن ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ (۳۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقت صبح امروہہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آ گئے، جو ان کے والد ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ وہ انھیں اولیا اللہ کے واقعات سناتے؛ اگر کسی درویش کی ملاقات یا بزرگ کی زیارت کو جاتے، تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ اس سے ان کے دل میں تاریخ اور سیرت اولیا اور تصوف کا شوق پیدا ہوا، جس سے گویا بعد کے زمانے کے مطالعے کا رُخ متعین ہو گیا۔

تعلیم کا زمانہ آیا تو امروہہ ہائی اسکول میں داخلہ ملا۔ یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ اپنے دوسرے علاتی بھائی ڈاکٹر محمد احسن عباسی کے پاس اٹاوہ اور رائے بریلی میں رہنے لگے، وہاں میڈیکل افسر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ کالج میں بھیج دیے گئے۔ وہاں یہ کالج اقامت گاہ باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اور یہی ان کی تعلیم سے بے توجہی کا باعث ثابت ہوا۔ نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین امروہوی ان کے والد کے دوست تھے۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں اپنے ایک ممتاز دوست کو ان کے حالات کی نگرانی اور تعلیمی رہنمائی پر مقرر کر دیا تھا، لیکن یہ صاحب اپنا فرض بوجہ احسن بجا نہ لائے۔ غرض محمود احمد عباسی کی تعلیم نامکمل رہ گئی؛ لیکن ان نگراں صاحب کی بدولت ان کا شہر کے متعدد ادیبوں اور اکابر سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں شبلی اور شرر بھی تھے۔ تعلیمی زمانے میں اگر کسی کو مجلس آرائی اور ہنگامہ پروری کا چسکا پڑ جائے، تو تعلیم کے لیے اس سے مہلک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔

مولانا شبلی اور شرر کے زیر اثر ان کا زیادہ وقت تاریخ و سیرت کی کتابوں اور سیاسی اور قومی لٹریچر، رسائل و جرائد کے مطالعے میں صرف ہونے لگا، اور وہ نصاب کی طرف سے بے پروا ہو گئے۔ چنانچہ امتحان میں بار بار ناکام رہنے، اور سیاست میں روز بروز زیادہ محو رہنے لگے۔

لکھنؤ میں مزید قیام بیکار بھی تھا اور ذریعۂ معاش کے فقدان کے باعث تکلیف دہ بھی۔ چنانچہ مسلم اسکول، بریلی میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے، جب مولانا حالی اپنے مرگی کے مریض نواسے عبد الولی کے علاج کے لیے یہاں مقیم تھے۔ جس طرح قیام لکھنؤ کے زمانے میں، شبلی اور شرر نے محمود احمد عباسی کی حوصلہ افزائی کی تھی؛ اسی طرح حالی بھی، ان کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے، ان سے لطف و عنایت سے پیش آئے۔ عباسی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا؛ ان کا مضمون نگاری کا شوق دراصل ان کی اسی حالی سے ملاقات کا رہین منت تھا۔ یوں رسمی تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اس نقصان کی بھی کچھ تلافی ہو گئی۔

حالی ان سے بہت شفقت سے پیش آتے رہے دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا، جیسا کہ مکتوبات

حالی میں شائع شدہ خطوط سے ظاہر ہے)۔ آخرکار انہیں کی سفارش پر عباسی صاحب کو ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کے دفتر میں بطور نجی معاون (پرسنل اسسٹنٹ) ملازمت مل گئی۔ عباسی صاحب یہاں چودہ برس رہے، ان میں سے تقریباً دس برس انہوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جائنٹ سکریٹری (ف، جنوری ۱۹۳۰ء) کے ماتحت کام کیا۔ وہ ان سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انہوں نے عباسی صاحب کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر (نجی) معاون اور پھر صدر دفتر کا قائم مقام سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ جب تک وہ ستمبر ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند کی کونسل کے رکن بن کر انگلستان تشریف نہیں لے گئے، یہ بے غل و غش یہاں کام کرتے رہے۔ اور اس زمانے کے تمام اصحابِ مجاز نے بھی ان کے کام کی تحسین کی۔ (صدر یار جنگ) مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی (ف: اگست ۱۹۵۰ء) بھی اسی زمانے میں حضور نظامِ دکن کی خواہش پر صدر الصدور امورِ مذہبی ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ ان کے بعد جن اصحاب کے ہاتھ میں کانفرنس کی باگ ڈور آئی، ان سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ کانفرنس نے صاحبزادہ صاحب موصوف کی سفارش پر انہیں انگلستان جاکر تعلیمی امور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ ہزار روپے دینا منظور کیا تھا۔ عباسی صاحب نے سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ لیکن مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باعث نہ صرف یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، بلکہ انہیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد لمبی غیر حاضری کے بعد یہ اپنے وطن امروہہ واپس آگئے۔

یہ طویل قیامِ علی گڑھ ان کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کی پختگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ کار منصبی سے جو وقت بچتا، وہ اسے مطالعے میں صرف کرتے۔ کالج اور کانفرنس کے کتب خانوں میں کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ اس پر افسر ایسے ملے، جو کام اور علم کے قدردان تھے۔ عباسی صاحب کے دل میں بھی امنگ اور کام کرنے کا ولولہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مختلف موضوعات کے بارے میں وسیع مطالعے سے اپنی معلومات اور لیاقت میں معتدبہ اضافہ کر لیا۔

اب امروہے میں مقیم ہوئے، تو رفاہِ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے، لیکن ابنائے وطن کے عدمِ تعاون، بلکہ عملی مخالفت کے باعث اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) نے دلی سے اپنا مشہور روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا۔۔۔۔ انہوں نے عباسی صاحب کو بھی اس کے صیغۂ ادارت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انہوں نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دہلی میں قیام رہا تھا۔

امروہے کے قیام کے زمانے میں انہوں نے "تاریخ امروہہ" (جلد اول) اور پھر "تذکرۃ الکرام" (دوسری جلد) اور "تحقیق انساب" تین کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے؛ حق پژوہی اور حق گوئی میں کسی کی رو رعایت ان کے سد راہ نہیں ہوئی۔ "تاریخ امروہہ" میں اور پھر "تحقیق انساب" میں کئی خاندان کا کچا چٹھا تھا۔ اس سے قدرتاً بہت لوگوں کو رنج ہوا اور انہوں نے سخت مخالفت کی۔ عباسی صاحب نے تکلیف برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہ آئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی؛ از بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انہوں نے ملکی سیاست میں بھی عملی حصہ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی رہا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی محبت میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ بعد کو امروہہ کانگریس کمیٹی

کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدت وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جواہر لال نہرو دورے پر امروہے گئے تو وہاں جلسے کا انتظام، اور نظم و ضبط کا اہتمام عباسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی فضا مکدر ہو گئی اور امروہے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے۔ لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا چنانچہ بعد کو جب دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب مہاجرین کو اپنی مستقل قومیت کا تعین کرنا پڑیگا؛ فلاں تاریخ کے بعد پاسپورٹ اور راہ داری کے قواعد نافذ ہو جائینگے، تو وہ ہندے واپس چلے آئے۔ یہاں ان کی خاصی بڑی جائداد وغیرہ تھی۔ کچھ کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسر اوقات کے لیے کوئی تشویش نہیں تھی۔

ان کا نکاح ملا امان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (شکیلہ بیگم) سے ہوا تھا۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی (برجیس فاطمہ) ہوئیں، جو جناب سبط رسول فاروقی کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ پاکستان بننے پر بیٹی اور داماد وہاں چلے گئے تھے۔ جب عباسی صاحب تقاضائے عمر سے زیادہ بیمار رہنے لگے، تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ پاکستان چلے آئیے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یوں بھی اب امروہے میں ان کا کون تھا! لہٰذا بیٹی کے بلانے پر وہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے یہاں کی بیشتر جائداد فروخت کر دی تھی، بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ مل گئے تھے۔ غرض نہیں وہاں بھی مالی پہلو سے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کراچی کے زمانۂ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے "حقیقت قوم کمبوہ" چھپی جو امروہے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن جس کتاب نے زیادہ ہنگامہ بپا کیا، وہ "خلافتِ معاویہ و یزید" ہے؛ یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے امیرِ معاویہ اور ان کے جانشین یزید کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قدرتی بات تھی، شیعہ حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن وہ عباسی صاحب کو خاموش نہ کر سکی؛ انہوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب "تحقیقِ مزید" شائع کی (۱۹۶۰ء) مخالفانہ جلسے وغیرہ اب کے بھی ہوئے؛ لیکن چونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی تردید محال تھی، اس لیے مخالفین نے خموشی اختیار کی اور یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی۔

انہوں نے شعرائے امروہہ کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ دراصل یہ ان کی تاریخ امروہہ ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور اس کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اگر ان کے پسماندگان ان کے مسودات کی چھان بین کر کے اسے الگ کر لیں، اور شائع کر دیں، تو یہ ادب کی مستقل خدمت ہوگی۔

۱۴ر مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ طارق روڈ کراچی پر سوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حکیم احمد شجاعؒ

شہپر رسول

لاہور کے مشہور طبیب، فلسفی اور ادیب و شاعر
شجاع الدین محمد کے گھر میں یکم صفر ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء کو جس ہونہار
نے آنکھیں کھولیں اس کا نام احمد شجاع رکھا گیا۔
حکیم شجاع الدین محمد کا خاندان لاہور میں "حکیموں کے
ان" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لاہور کا "بازار حکیماں" اسی
ان سے منسوب ہے۔ اس گھرانے میں سالہا سال سے
اور ادب کا شوق و شغف جاری تھا۔ حکیم شجاع الدین محمد
ت خود ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک اہل بیت کے مرثیوں
وعہ اور "داغِ ہجراں" کے نام سے ان کے اشعار کا دیوان
شائع ہوا۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب پنجاب میں اردو
ری عالمِ طفلی سے گزر رہی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد اور
نا حالی اسی زمانے میں اردو شاعری کو ایک نئی سمت
ا کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

۱۸۹۵ء میں "اردو بزمِ مشاعرہ" کا قیام بھی حکیم شجاع الدین
کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ رسالے "شورِ محشر" کی اشاعت اسی
م کے آرگن کے طور پر شروع ہوئی تھی اور اسی بزم کے مشاعرے
علامہ اقبال نے (جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب
م تھے) اپنی پہلی غزل پڑھی تھی۔ جس کا مندرجہ ذیل شعر
زمانے میں زبانِ زدِ خاص و عام ہو گیا تھا ؎
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

نوعمر احمد شجاع پر خاندانی ذہانت اور خاندانی روایت
کا اثر ہونا لازمی سا امر تھا چنانچہ بچپن ہی سے طب اور علم و
ادب سے رشتۂ شوق قائم ہو گیا۔ حالانکہ کم عمری ہی میں والدین کا
سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ڈھائی برس کی عمر میں والد اور تیرہ سال کے
سن میں والدہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئیں لیکن
احمد شجاع کے عم زاد بھائی اور بہنوئی حکیم امین الدین اور ان کی
ہمشیرہ نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ ان کی پرورش
کی۔ اس وقت کے مشہور مفسر اور مجتہد مولانا ثروت علی کو
عربی و فارسی کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا اور پروفیسر لنگ
ہارن کو انگریزی پڑھانے کے لیے بعد مشکل رضامند کیا
گیا۔ نتیجتاً احمد شجاع اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ
انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے۔

گھریلو تعلیم کے علاوہ چھٹی جماعت سے میٹریکولیشن
تک انہوں نے سینٹرل ماڈل اسکول لاہور میں تعلیم پائی۔ اس
زمانے کا ایک واقعہ حکیم احمد شجاع نے یوں بیان کیا ہے ـــ
"ان ہی ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت میسر آئی جس کا ذکر
میرے تخیل کی مسرتوں کی معراج اور عمرِ گذشتہ کی ساری
کامیابیوں کا سرور و کیف ہے۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد جو
اس وقت امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے میں امرتسر
آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اپنے پرانے دوست اور ہمارے استاد

مولوی غلام رسول قریشی سے ملنے کے لیے. لاہور تشریف لائے. مولوی غلام رسول مولانا ابوالکلام کی نوعمری کے باوصف ان کے علم کے قائل اور ان کے جمال و کمال کے دلدادہ تھے. جب ابوالکلام ان سے ملنے گئے تو اس وقت وہ ہماری جماعت کو عربی پڑھا رہے تھے. مصافحے اور معانقے کے بعد مولوی صاحب نے مولانا سے کہا کہ آپ میرے شاگردوں کو بھی دو لفظ پڑھا دیں تاکہ وہ آپ کی شاگردی کی سعادت سے بہرہ مند ہو جائیں، یہ سنتے ہی علم و فضل کا ایک بحرِ مواج تھا کہ اُبل پڑا. حکمت و دانش کا ایک ابرِ محیط تھا کہ فضائے آسمان پر چھا گیا. ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحر بیکراں کی اُچھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور اس ذرا سے وقت میں اس بارشِ کرم کے جتنے موتی جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا. میں اُس دن سے آج تک ابوالکلام آزاد کو اپنا استاد مانتا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس دن کے بعد ان کے مشہور زمانہ جریدے "الہلال" میں جو کچھ پڑھا اور اس سے جو کچھ سیکھا وہ حقیقت میں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک جرعہ اور اسی دانائے آئینِ فطرت کے خوانِ نعمت کی خیرِ جاری کا ایک ریزہ تھا"

۱۹۰۹ء میں حکیم احمد شجاع نے "ایم. اے. او کالج" علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا "سرسید کورٹ" کے ہوسٹل میں رہنے کے لیے جگہ ملی. جس کو سرسید سے جذباتی عقیدت کے پیشِ نظر انہوں نے ہمیشہ اپنی خوش قسمتی تصور کیا.

ہز ہائی نس نواب سر محمد حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال نواب احمد سعید خاں آف چھتاری (جو بعد میں یو. پی کے گورنر حیدرآباد ریاست کے مدارالمہام اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر بھی رہے)، سر سکندر حیات خاں (جو بعد میں پنجاب کے گورنر اور پھر اسی صوبے کے وزیرِ اعظم بھی رہے) اسی دور میں علی گڑھ کے طالب علم تھے. سر حمید اللہ خاں اور حکیم احمد شجاع ہم جماعت بھی رہے.

فرسٹ ایر کے امتحان میں حکیم احمد شجاع اپنے کلاس میں اول رہے جس کے بعوض ان کو جونیر اسکالر کے شرف سے مشرف کیا گیا. خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر اور خان بہادر ملک زمان مہدی کے بعد وہ تیسرے پنجابی تھے جن کو یہ اعزاز ملا تھا.

ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر ڈلّی کلف علم کیمیا کے علاوہ فنِ تمثیل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے. ڈرامے کے فن پر ان کو بہر طور عبور حاصل تھا. حکیم احمد شجاع نے فنِ تمثیل کی ابتدائی واقفیت ڈاکٹر ڈلّی کلف ہی سے حاصل کی اور ڈاکٹر کلف ہی کی نگرانی میں شیکسپیر کے ڈرامے "ٹویلفتھ نائٹ" کو دیگر افراد کے ساتھ مل کر علی گڑھ کالج کے اسٹیج پر ادا بھی کیا. اس کے بعد آغا حشر کے ڈرامے "میدِ ہوس" کو ادا کرنے کے لیے منتخب کیا دونوں ڈرامے بہت کامیاب ہوئے. اسی کے ساتھ حکیم احمد شجاع نے ڈرامہ نگاری کا آغاز بھی کیا.

بی. اے کرنے کے بعد حکیم احمد شجاع کو اپنے عم زاد بھائی اور بہنوئی حکیم امین الدین کی علالت کے سبب کئی بار علی گڑھ سے لاہور جانا پڑا. علالت نے طول کھینچا تو ان کو علیگڑھ کالج سے ڈسچارج سرٹیفیکیٹ لینا پڑا.

حکیم امین الدین کی صحت جب ذرا سنبھل گئی تو حکیم احمد شجاع نے مزید حصولِ تعلیم کے لیے میرٹھ کالج کا انتخاب کیا. وہ یہاں پڑھتے بھی اور ۱۹۱۴ء میں یہیں پر انگریزی اور تاریخِ ہند کے اسسٹنٹ پروفیسر بھی مقرر ہوئے لیکن ان کے پیروں میں جیسے سفر ہی سفر لکھا تھا. میرٹھ میں بھی وہ بہت زیادہ نہ ٹھہر سکے اور حیدرآباد کا رخ کیا.

حیدرآباد میں نواب معین الدولہ اور نواب ولی الدولہ کے دربار میں ایک ہزار روپیہ ماہوار مشاہرے پر ان کے سکریٹری کی حیثیت اختیار کی. دو مہینوں تک حیدرآباد میں رہے لیکن جہاں تک مجلس ارتباط کا تعلق ہے وہ حیدرآباد کے لوگوں میں گھل مل نہ سکے. گو کہ وہاں ان کے لیے کوئی کمی نہ تھی. آسودگی اور آسائش کا تمام سامان میسّر تھا. سواری کے لیے نواب معین الدولہ کی

س رائش، تھی، رہنے کے لیے، خانہ باغ بیلس، بشیر باغ، اور
دلی الدولہ کا قصر، کھانے کے لیے انواع واقسام کی بے شمار
، وقت گذارنے کے لیے بادشاہی صحبتیں تھیں مگر طبیعت
رح لگتی ہی نہ تھی۔ صحت بھی رفتہ رفتہ خراب ہونے لگی
ار ایک دن مستقبل کی ساری امیدوں اور ترقی و اقبال
تمام سنہرے خوابوں کو توڑ کر لاہور چلے گئے۔ بعد ازاں ملازمت
تر وقت انہوں نے پنجاب قانون ساز اسمبلی کے سکتر کے
ے سے گذارا۔

علی گڑھ، میرٹھ اور دہلی کے قیام میں حکیم احمد شجاع کی
ے اور ان کی صحبتیں ملک کے نامور لوگوں سے جگمگاتی رہیں
الملک حکیم اجمل خاں کی مجلسوں میں بھی شرکت کا شرف ان کو
تھا۔ اس وقت کے ایک واقعہ کو وہ اس طرح رقم کرتے ہیں۔

"ایک مرتبہ مسیح الملک کے دولت کدے پر حضرت ناباں دہلوی
ن سائل دہلوی اور حضرت بیخود دہلوی تشریف رکھتے تھے اور
بھی حاضر تھا۔ مشاعرے کی سی بزم تھی۔ سب نے ایک مصرعے
پر اپنی اپنی غزلیں پڑھیں۔ حضرت سائل کا یہ مشہور شعر اسی
کا مقطع ہے ؎

تمنا تھی کہیں پردیس میں کچھ مانگ کھائیں گے
مگر قسمت میں سائل جہان آباد کے ٹکڑے

نے بھی اسی وقت فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

مزا دے جا دلِ ناشاد کو مر مر کے مٹنے کی
اڑا جا ٹھوکروں سے خاک ساں برباد ٹکڑے

ہی لوگوں نے بہت داد دی اور حضرت ناباں نے خاص طور پر
شعر کو پسند کیا۔"

ایک صاحب منشی نثار احمد دہلی کے رہنے والے تھے جن
حکیم احمد شجاع کا خصوصی تعلق تھا۔ نثار احمد چونکہ ایک عرصے
منصف کے عہدے پر فائز رہے تھے اس لیے ان کے تعلقات
اس وقت کے بیشتر بڑے لوگوں سے تھے۔ حکیم اجمل خاں
بھی حکیم احمد شجاع کی ملاقات منصف صاحب کی وساطت
ہی سے ہوئی تھی۔ منصف صاحب کے یہاں ادبی محفلیں
اکثر برپا ہوا کرتی تھیں۔ ایک ادبی محفل کا ذکر حکیم احمد شجاع نے
اس طرح کیا ہے ؎

"ایک بار منصف صاحب کے دولت کدے پر کلکتہ کے
ایک شاعر صولت کلکتوی قیام پذیر تھے۔ بزم مشاعرہ برپا ہوئی
میں نے بھی ایک طرحی شعر کہہ ڈالا ؎

فرقتِ یار میں رو رو کے بہت دن ساحر
ہم نے دامانِ شبِ تار میں گوہر ٹانکے

اس پر ایک صاحب نے فرمایا، "دن میں شبِ تار کہاں ہوتی
" حضرت صولت نے کسی قدر خشمگیں انداز سے جواب دیا۔ اب
دلّی والے بھی اردو بھول گئے۔ لڑکا ٹھیٹھ اردو لکھ گیا ہے۔"

ایک اور قابلِ ذکر واقعہ حکیم احمد شجاع نے یوں رقم
کیا ہے ؎

"ایک دن نواب غلام محمد حسن خاں صاحب کی حویلی
میں چند با مذاق لوگ میرے کمرے میں جمع تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا
جس میں کبھی مرزا غالب رہا کرتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو نے
ایک شعر پڑھا۔ جس کا قافیہ رہزن تھا اور ردیف دوست۔ فرمایا کسی
زمانے میں دلّی والے ایسے شعر کہا کرتے تھے۔ میں نے کہا اجازت ہو تو
میں بھی کچھ عرض کروں۔ نواب فیض احمد نے فرمایا کہو۔ میں نے
برجستہ یہ شعر کہا۔ سب نے بہت پسند کیا ؎

میرے سینے میں ہے دل یا ایک مارِ آستیں
رہ کے پہلو میں مرا دشمن ہے اور دشمن کا دوست

میر باقر علی داستان گو نے کمرے کی جانب اشارہ کر کے کہا، یہ مرزا
غالب کا فیض ہے۔"

حکیم احمد شجاع نے "ساحر" تخلص کیا۔ شعر کہے۔ لیکن وہ ہمیشہ
یہی کہتے رہے کہ میں تو اگر طبیعت موزوں ہو جائے تو کوئی شعر کہہ
لیتا ہوں ورنہ شاعری کہاں اور میں کہاں۔ بحیثیت تمثیل نگار کے
بھی ان کی خاص شہرت رہی۔ اس سلسلے میں وہ خود کو آغا حشر
کاشمیری کا شاگرد تصور کرتے تھے۔ آغا حشر سے ان کی بہت سی

ملاقاتیں رہیں۔ بطورِ خاص پہلی ہی ملاقات ایک خاص قسم کا تاثر چھوڑتی ہے حکیم احمد شجاع فرماتے ہیں ——

"سلا۱۹۱ء میں ایف۔ اے کا امتحان دے کر میں علی گڑھ سے لاہور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ آغا حشر اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں اور جب میں نے وہ ٹوٹا پھوٹا مکان دیکھا جس میں آغا حشر ایک تھیٹریکل کمپنی کا مالک اور ہندوستان کا عظیم القیمت ڈرامانسٹ رہتا تھا تو میں سمجھا کہ میری آنکھوں نے کچھ دھوکا کھایا ہے۔ حشر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور فرمایا۔ "تم کون ہو بھائی اور مجھ سے کیوں ملنے آئے ہو۔ میں نے شوقِ ملاقات کی داستان سنانا شروع کی۔ دو برس ہوئے دلی ہیں۔ میری بات کاٹ کر فرمایا میاں! دو برس ہوئے ہیں دہیں تھا۔ مگر اب دلی وہ نہیں رہی۔ دلی حشر کے ڈراموں کی قدر کرتی ہے حشر کی قدر نہیں کرتی۔ اسی لیے لاہور آیا ہوں۔ اس شہر سے مجھے محبت ہے میں نہیں جانتا کیوں۔ تم لاہور ہی میں رہتے ہو۔؟ تو پھر مجھے تم سے بھی محبت ہے مجھے اس شہر کے در و دیوار سے محبت ہے اور اس کی زمین اس کے آسمان سے محبت ہے۔"

یہ ایک بادشاہ کا اندازِ گفتگو تھا، ایک شاعر کا اندازِ گفتگو تھا۔ ایک ایسے جوانِ بے پروا کا اندازِ گفتگو تھا جو بات کرتے وقت نتائج و عواقب سے بے خبر ہوتا ہے مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم اور وہ دونوں پرانے دوست ہیں ایسے دوست جو ایک دوسرے کی روح سے واقف ہوں اور یہ دوستی پچیس سال بڑی فراوانیٔ محبت اور صداقت جذبات کے ساتھ قائم رہی جسے میں جانتا ہوں یا حشر جانتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں جب میں نے کچھ ٹکڑے اپنے لکھے ہوئے ڈرامے کے سنائے تو اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور فرمایا تم کو میری طرح لکھنا کس نے سکھایا؟ میں نے جواب دیا آپ نے۔ تو فرمانے لگے کہ تم میرے شاگرد ہو۔"

آغا حشر کاشمیری سے تعلقات پیدا ہو جانے کے بعد حکیم احمد شجاع نے کئی کامیاب ڈرامے لکھے اور بہت سے تھیٹروں کے مالکوں سے ان کی شناسائی بھی آغا حشر ہی کی وساطت سے ہوئی۔ ایلفرڈ تھیٹریکل

کمپنی نے "باپ کا گناہ" اور اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی نے "بھیشم پرتگیہ" حکیم احمد شجاع کے یہ دونوں ڈرامے اتنی قیمت پر خریدے جتنی قیمت حشر کے علاوہ کسی دوسرے ڈرامہ نگار کو نہیں ملتی تھی۔

حکیم احمد شجاع کے ڈراموں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے لیکن انہوں نے ہندوستان کی مجلسی اور معاشرتی زندگی سے متعلق کئی ڈرامے لکھے۔ اور کچھ ڈرامے دنیا کے مشہور تاریخی واقعات سے متاثر ہو کر بھی تحریر کیے۔ جن میں "آخری فرعون" "مینا" "منتوشس اور تارا" کو بہت پسند کیا گیا۔ نقادانِ فن نے بھی حکیم احمد شجاع کے ڈراموں کی قدر و منزلت کی۔ ہندوستان کی بڑی بڑی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور کے سٹیج پر بھی ان کے ڈرامے ادا کیے گئے اس وقت کے مشہور نثر نگار اور ڈرامہ لکھنے والے ان کے ڈراموں کو دیکھنے آتے تھے جن میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مسٹر گرودت سوندھی، آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کے کنٹرولر سید احمد پطرس بخاری، نامور ادیب امتیاز علی تاج، مشہور تمثیل نگار دیوان آتما نند شرر اور مشہور کریکٹر ایکٹر منشی جگل کشور بھی شامل تھے۔

حکیم احمد شجاع کے فلمی ڈرامے "دھنے وان" "دو عورتیں" "آنسوؤں کی دنیا" "پریم یاترا" اور "اصلاح الدین" بھی یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آئے اور پسند کیے گئے —— حکیم احمد شجاع نے افسانے بھی لکھے اور ایک طویل مدت تک وہ لاہور کے ماہانہ رسالے "ہزار داستان" کے مدیر بھی رہے فلم سے تعلق بھی رہا۔ اور اسٹیج کی ایک مدت تک خدمت بھی کی اور شاعری سے بھی ان کا تعلق رہا آخر کار علی گڑھ کا یہ نامور فرزند سماج و ادب کی خدمت کرتے ہوئے ۴ر جنوری ۱۹۶۹ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔

حکیم احمد شجاع کا انتقال ان کے ذاتی مکان (فیروز پور روڈ لاہور) ہی پر ہوا اور وہ بیت جو برسوں کے قریب اپنے خاندانی قبرستان میں دفن بھی ہوئے۔

خان عبدالغفار خان

محمد محمود فیض آبادی

هندوستان کی جنگ آزادی کے جیالے سورما، اہنسا اور متحدہ
ت کے علمبردار اور گاندھیائی عہد کی آخری یادگار خان عبدالغفار خان
کے میدان میں ہندوستان کو کچھ نہیں دیا لیکن عمل کے میدان میں
نال آپ تھے۔ ان کی زندگی یقین محکم، عمل پیہم، خدمت، ایثار اور
ن سے عبارت تھی۔ انہوں نے اپنے اصولوں کے عوض کبھی سمجھوتا نہیں
ر ۳۰ سال جیلوں میں گزار دیے۔ نصف آزادی سے پہلے برٹش
ں میں اور آزادی کے بعد نصف پاکستانی جیلوں میں۔ وہ محض علاقائی
دیائی سطح کے لیڈر نہ تھے بلکہ ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے
اؤں میں ہوتا تھا۔

خان عبدالغفار خاں جو "بادشاہ خان"، "باچہ خان" اور
رحدی گاندھی" کے ناموں سے بھی معروف ہیں اور جو اپنی قومی خدمات
تـ ربانیوں کی بنا پر "فخر افغان" اور "فخر ہندوستان" کے خطاب سے
ے گئے، ۱۸۹۰ء میں صوبہ سرحد کے پشاور ضلع کے چرسدہ تحصیل کے
ان زئی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان محمدزئی پٹھان قبیلے سے
ق رکھتا تھا۔ ان کے والد خان بہرام خاں اچھی حیثیت کے زمیندار
، اور انگریزوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ اس خاندان کے دو
پوتوں یعنی ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالغفار خاں نے صوبہ سرحد میں
اجی اصلاح، سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد میں نمایاں
دار ادا کیا۔

غفار خان نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے اسلامی مکتب میں حاصل کی۔
ان کے والد اگرچہ برائے نام خواندہ تھے لیکن آزاد خیال اور ترقی
پسند تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو انگریزی تعلیم دلائی۔ اس
زمانہ میں سرحد میں تعلیم سے مراد دینی تعلیم تھی۔ دنیاوی خصوصاً انگریزی
تعلیم کو مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

غفار خاں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی طرح پشاور کے میونسپل
بورڈ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ پھر پشاور کے ایڈورڈس میموریل
مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا جہاں عیسائی مشنریوں کے جذبۂ خدمت خلق
اور بے لوثی نے انہیں بہت متاثر کیا۔ اس اسکول سے ڈاکٹر خان صاحب نے
۱۹۰۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس زمانہ میں مشن
اسکول میں پڑھنے والوں پر کفر کا فتویٰ لگنا معمولی بات تھی۔

دورانِ تعلیم نوجوان غفار خاں کے نابختہ ذہن پر ان کے ساتھ مقیم
ایک خاندانی خدمت گار نے جو فوجی سروس کا گرویدہ تھا بڑا اثر ڈالا۔
اس کے کہنے سے انہوں نے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہونے کی درخواست
دے ڈالی۔ وہیں اثنا وہ ترقی پاکر دسویں کلاس میں پہنچ چکے تھے۔ ۱۹۰۶ء
کے میٹرک امتحان میں شریک ہوئے۔ ابھی آدھے پرچے ہوئے تھے کہ فوج
میں کمیشن کی منظوری کی اطلاع اور دوسرے دن بھرتی افسر کے سامنے حاضر
ہونے کی ہدایت ملی۔ نوجوانی کی ترنگ اور ملٹری سروس کے رومانس میں
غفار خاں اپنا امتحان پورا کیے اور والدین کی اجازت لیے بغیر مردان کنٹونمنٹ
بھرتی ہونے پہنچ گئے۔ چھ فیٹ تین انچ کی دراز قامت، وجاہت اور
نامور سرحدی خاندان سے تعلق کی بنا پر ان کا نام فوراً کمیشن کے لیے

درج ہوا اور "گائڈ" کا درجہ دیا گیا۔ اس زمانہ میں مردان کنٹونمنٹ اپنے چیدہ پیدل اور گھوڑ سوار دستوں کے لیے مشہور تھی۔ اس کے ارکان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اجتماعی طور سے "گائڈس" کہلاتے تھے۔

مردان کنٹونمنٹ میں ابھی ایک سال کا عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک واقعہ نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ ایک دن وہ اپنے ایک دوست پٹھان فوجی افسر سے ملاقات کو گئے تھے جو انگلش لباس زیب تن کیے ہوئے اور انگریزوں کی طرح درمیان سے مانگ نکالے ہوئے تھے۔ اُدھر سے ایک انگریز سپاہی کا گذر ہوا جو پٹھان افسر کو انگریزی لباس میں دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ "خان صاحب" آپ کو شرم نہیں آتی۔ آپ انگریز بننے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ مارے غیرت کے پٹھان افسر کے چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ لیکن نوجوان غفار نے عہد کر لیا کہ وہ کبھی برٹش سرکار کی فوجی ملازمت نہیں کرے گا۔ کچھ دنوں کے بعد اپنی تعلیم پھر سے شروع کرنے کی غرض سے علی گڑھ کالج میں ۱۹۰۹ء میں ڈے اسکالر کے طور پر نام لکھایا۔ ایک سال کے قیام کے بعد گرمیوں کی چھٹی میں اپنے آبائی گاؤں گئے۔ لیکن علی گڑھ سے بائی اسکول کرنا مقدر نہیں تھا۔ واپس جانے کی نوبت نہیں آئی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" اور مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" نے ان کے ذہن کو قوم پرور بنایا۔ بعد کی زندگی میں وہ علی گڑھ تحریک کے سیاسی رجحانات اور مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست کے یکسر مخالف رہے۔

دریں اثنا لندن سے ڈاکٹر خان صاحب نے جو اُن سے عمر میں سات سال بڑے تھے اور بمبئی میڈیکل کالج سے ڈگری لینے کے بعد اعلیٰ طبی تعلیم کے لیے لندن میں مقیم تھے، والد صاحب کو خط لکھا کہ چونکہ غفار ریاضی میں بہت ہوشیار ہیں اس لیے انہیں لندن انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے بھیجا جائے۔ والد بزرگوار نے ساز و سامان اور سفر خرچ کا انتظام کر دیا لیکن والدہ کو منظور نہیں تھا کہ ان کا ایک ہی لڑکا جوان کے ساتھ رہ گیا تھا ولایت چلا جائے۔ والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے غفار خاں نے ولایت جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور خود کو خلق خدا کی خدمت اور جہالت و پسماندگی کی شکار پٹھان قوم کی اصلاح کے لیے وقف کر دیا۔

اس مرحلہ پر انہیں پٹھانوں کی پسماندگی کا علاج قومی تعلیم میں نظر آیا۔ اور انہوں نے قومی تعلیم کو عام کرنے کا عزم کیا۔ سرحد کے اصلاح پسند افراد سے ربط قائم کیا اور ۱۹۱۰ء میں اپنے گاؤں عثمان زئی میں پہلے اسکول کی بنیاد ڈالی۔ رفتہ رفتہ صوبہ میں ایسے بے شمار اسکول کھل گئے۔ انہیں انگریزی اسکولوں کے برخلاف "آزاد" اسکول کہا جاتا تھا۔ ان میں پڑھنے والوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی گئی۔

غفار خاں کی شادی ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں اپنی ۲۶ سالہ بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے باقی زندگی پٹھانوں کی فلاح و بہبود، اصلاح تعلیم، سیاسی بیداری تنظیم اور اتحاد کے لیے وقف کر دی۔ ان کی بے لوث خدمات سے متاثر ہو کر ہشت نگر کے معصوم صفت پٹھانوں نے ایک مسجد میں جمع ہو کر عبدالغفار کو اپنا بادشاہ بنانے کا اعلان کیا۔ تب سے وہ "بادشاہ خاں" کہلانے لگے۔

خان صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں رولٹ کے خلاف ایجی ٹیشن میں حصہ لینے سے ہوا۔ انہوں نے اپنے گاؤں عثمان زئی میں ایک عام جلسہ کرایا اور پہلی سیاسی تقریر کی اور بل کے خلاف قرارداد منظور کرائی۔ اس کی پاداش میں وہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو گرفتار ہوئے مقدمہ چلا، سزا ہوئی لیکن چھ ماہ بعد چھوڑ دیے گئے۔

کانگریس سے ان کا تعلق ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا جب انہوں نے ناگپور کے اجلاس میں شرکت کی۔ پھر خلافت اور شہری نافرمانی تحریکوں میں حصہ لیا اور صوبۂ سرحد میں خلافت تحریک کو منظم کیا۔ سقوطِ خلافت کے بعد ۱۹۲۰ء کی "ہجرت کابل" کو منظم کرنے میں حصہ لیا۔ جس میں ہزاروں لوگوں کو بے شمار مشکلات اور صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۲۱ء میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہوئے اور تین سال قید میں رہنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ واپس آکر ۱۹۲۸ء میں "پختون" نامی ماہنامہ پشتو زبان میں جاری کیا جو ۱۹۳۰ء میں ان کی گرفتاری کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء میں دس روزہ کی شکل میں جاری ہوا لیکن ۱۹۴۱ء میں بند ہو گیا۔ پھر ۱۹۴۵ء میں ہفت روزہ کی شکل میں جاری ہوا

دو سال بعد بند ہو گیا۔

سماجی اصلاح اور سیاسی بیداری کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۲۹ء میں "تنظیم خدائی خدمت گاراں" کی تشکیل ہے۔ یہ تنظیم شروع میں خالص اصلاحی اور سماجی تھی۔ اس کا مقصد پختون عوام کو تعمیری سرگرمیوں میں لگا کر ان کی پسماندگی دور کرنا تھا۔ صوبہ کے ۹۰ فیصد پٹھان اس زمانہ میں ناخواندہ تھے۔ خدائی خدمت گاروں کے لیے لال رنگ کی وردی تجویز ہوئی۔ اسی لیے وہ "ریڈ شرٹ" کہلائے گئے۔ برٹش سرکار کو کوئی ایسی تحریک پسند نہیں تھی جو سرحد میں سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک لائے۔ اس لیے خدائی خدمت گاروں پر جبر و تشدد کا سلسلہ شروع ہوا۔ غفار خاں نے انگریزوں کے ظلم کے خلاف ہندوستان کی تمام مسلم تنظیموں اور مسلم لیگ سے مدد مانگی۔ کسی نے انکی پروا نہیں کی۔ بالآخر انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس سے رجوع کیا جس نے پٹھانوں کی پوری حمایت کا وعدہ کیا۔ یہاں سے کانگریس اور خدائی خدمت گار تنظیم کے درمیان سیاسی تعاون کا دور شروع ہوا۔ اس اتحاد کے طفیل ڈاکٹر خان صاحب نے صوبۂ سرحد میں ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارت کی سربراہی کی۔ پھر ۱۹۴۶ء کے عام چناؤ میں خدائی خدمت گار تنظیم نے صوبۂ سرحد کی اسمبلی میں بھاری اکثریت حاصل کی۔

انڈین نیشنل کانگریس سے بادشاہ خاں کا تعلق ۱۹۲۰ سے آزادی تک مسلسل قائم رہا اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۱ء تک چلائی گئی تمام کانگریسی تحریکوں میں شریک رہے۔ وہ طویل عرصہ تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔ ان کی قربانیوں اور جرأت مندانہ قیادت کے اعتراف کے طور پر کانگریس نے ان کو ۱۹۳۴ء کے اجلاس کی صدارت پیش کی۔ لیکن انہوں نے اسے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ "میں ایک معمولی سپاہی پیدا ہوا اور ایک سپاہی کی طرح مروں گا۔" ۱۹۳۰ء کی تحریک نافرمانی کے دوران گرفتار ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں رہا ہوئے۔ اور کراچی میں کانگریس کے ۴۵ ویں اجلاس میں شرکت کر کے ایک پرزور تقریر کے ذریعہ کانگریسیوں پر زور دیا کہ وہ کاغذی قراردادوں کے بجائے عمل پر توجہ کریں۔

بادشاہ خاں کی شخصیت، سیرت اور خیالات پر گاندھی جی کی ایسی چھاپ لگی کہ اچاریہ ونوبا بھاوے کے سوا کوئی دوسرا ان کے مقابلہ میں نہیں آسکا۔ انہوں نے گاندھی جی کی ہر بات کو اس طرح اپنایا کہ سرحدی گاندھی کہلانے لگے۔ اہنسا کے خود ایسے قائل تھے کہ کبھی طاقت کی وکالت نہ کی۔ خدائی خدمت گار برٹش فوج کی گولیاں کھا کر گر جاتے تھے لیکن جوابی گولی نہیں چلاتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں اپنی رہائی کے بعد ایک سال وردھا میں سیواگرام میں گاندھی جی کے ساتھ رہے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں گاندھی کی رفاقت حاصل رہی۔ اسی سال انہوں نے لندن میں زیر تعلیم اپنی بیٹی کو بلا کر وردھا کے مہیلا آشرم میں جو میرا بہن کی نگرانی میں چلتا تھا، داخل کرایا۔

بادشاہ خاں اہنسا، سچائی، ستیہ گرہ، مذہبی رواداری، ہندو مسلم اتحاد، اور وحدت ادیان کے قائل تھے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کی سرشت میں تھی۔ تقسیم کے بعد جب بھی ہندوستان آئے یہاں کے حالات سے بے اطمینانی ظاہر کی۔ نہ ہی انہوں نے کبھی پاکستانی حکمرانوں کو اپنی تنقید سے معاف کیا۔

وہ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے۔ لیکن جون ۱۹۴۷ء کے منصوبۂ تقسیم کے تحت صوبۂ سرحد میں تقسیم کے سوال پر ریفرنڈم ہوا جسے خان بھائیوں نے بائیکاٹ کیا میدان مسلم لیگ کے ہاتھ رہا۔ قیام پاکستان کے بعد گاندھی جی نے انہیں بھارت ہجرت کرنے اور یہاں سے اہنسا کا پرچار کرنے کی دعوت دی۔ لیکن بادشاہ خاں نے پاکستان کا شہری رہ کر پٹھان قوم کی رہنمائی کو ترجیح دی۔

۱۹۴۸ء میں صوبۂ سرحد کے نمائندہ کی حیثیت سے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں شرکت کی اور اس پلیٹ فارم سے مطالبۂ پشتونستان کی وکالت کی۔ انہوں نے پاکستان کا وجود تسلیم کرتے ہوئے حکومت کو تعاون کی پیش کش کی۔ لیکن جناح نے خدائی خدمت گار تنظیم کو مسلم لیگ میں ضم کرنے کو کہا تو بادشاہ خاں نے اس سے انکار کیا۔ پشتونستان تحریک چلانے کی پاداش میں وہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک نظربند رہے۔ ۱۹۵۴ء میں مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک انتظامی یونٹ میں ضم کرنے کی تجویز آئی تو بادشاہ خاں نے اسے پٹھانوں کے مفاد کے خلاف تصور کیا اور ان کے خلاف تحریک چلائی

۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کا ایک یونٹ قائم ہوا جو ۱۹۷۰ء تک
قائم رہا۔ جون ۱۹۵۶ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور ان پر مغربی
پاکستان کی ہائی کورٹ (لاہور) میں مقدمہ چلا۔ اس کے دوران انہوں
نے ۱۹ صفحات پر مشتمل اردو میں ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے
اپنی زندگی کی ساری جدوجہد کا خاکہ دے کر کہا کہ پٹھانوں کے
ساتھ انگریزوں کے ہاتھوں جو ناانصافی ہوئی وہ اس کا ازالہ چاہتے
ہیں۔ اس کے لیے پاکستانی حکومت انہیں جو سزا دینا چاہے دے سکتی ہے
۱۴ اپریل ۱۹۵۹ء کو جیل سے رہائی کے بعد وہ کافی عرصہ تک کابل میں مقیم
رہے۔ حکومت ہند کی دعوت پر ۱۹۶۹ء میں گاندھی جی کے صد سالہ
جشن ولادت میں شرکت کے لیے تقسیم کے بعد سے پہلی بار ہندوستان
آئے۔ دوسری بار ۱۹۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی صد سالہ
تقریبات میں شرکت کرنے بمبئی آئے۔ تیسری بار جون ۱۹۸۷ء میں بغرض
علاج خان عبدالغفار خان بمبئی تشریف لائے۔ بمبئی سے
صحت یاب ہو کر دہلی پہنچے تھے کہ ۱۳ جولائی کو نصف جسم پر فالج کا
حملہ ہوا۔ تب سے غشی طاری ہوئی تو تا دم وفات طاری رہی۔ علاج
آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کیے گئے۔ دریں
حکومت ہند نے انہیں ۱۴ اگست کو ہندوستان کے عظیم ترین
"بھارت رتن" سے نوازا جسے ان کی جانب سے ان کے بیٹے
عبدالولی خاں نے وصول کیا۔ ۱۸ اگست کو دہلی سے پشاور کے ا
ریڈنگ اسپتال منتقل کیے گئے جہاں ۹۸ سال کی عمر میں ۲۰ جنوری
۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔

اُن کی ساری زندگی اقبال کے اس شعر کی آئینہ دار تھی۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

---

[1] اس موقع پر حکومت ہند نے انہیں "نہرو ایوارڈ" سے نوازا۔ مسلم یونیورسٹی کے
اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم صاحب مرحوم کی دعوت پر وہ دونوں کے
لیے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ یونین ہال اور اسٹریچی ہال میں طلبائے جامعہ کو
خطاب بھی کیا تھا۔

سر سکندر حیات خاں

عبدالمجید سالک
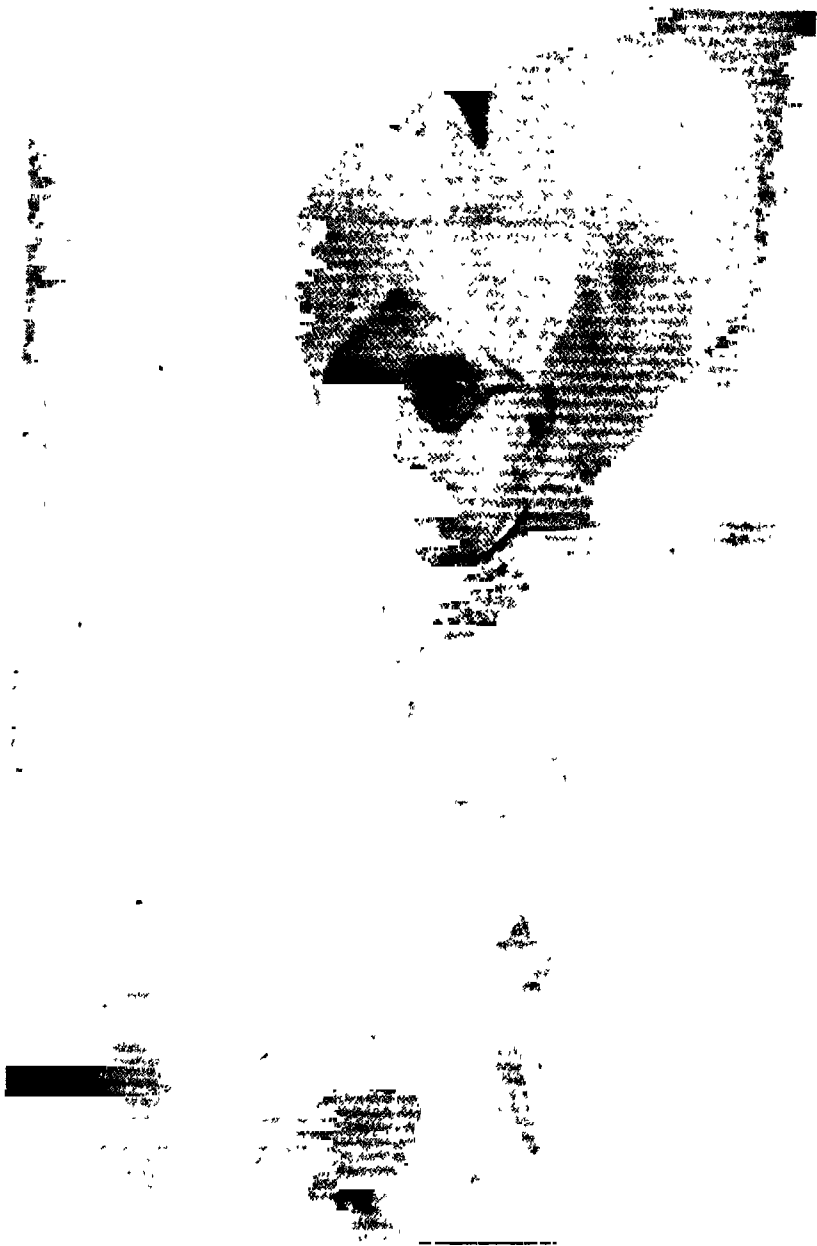
پنجاب کے ارباب سیاست میں میاں فضل حسین اور سکندر حیات خاں دونوں نہایت دانش مند بالغ نظر اور مصلحت بیں واقع ہوئے تھے اور انھوں نے صوبے کی اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنی انتہائی صلاحیتیں صرف کیں۔ ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ میاں صاحب میں ایک خاص ہیبت اور "دور باش" قسم کی کیفیت تھی جس کی وجہ سے اچھے اچھے قابل اور ذی اثر لوگ بھی ان سے رک کر ملتے اور محتاط ہو کر بات کرتے تھے۔ اس کے برعکس سردار سکندر حیات خاں کی شخصیت میں ایک خاص کشش اور محبوبیت تھی جو مخالفین کو بھی مسحور کر دیتی تھی۔ لوگ میاں صاحب سے مرعوب ہوتے تھے لیکن سردار صاحب سے محبت کرتے تھے۔ پنجاب میں جدید اصلاحات کے ماتحت وزارت مرتب کرنے سے پیشتر سردار صاحب ریونیو ممبر اور عارضی گورنر کی حیثیت سے اپنی محنت اور قابلیت کا ثبوت دے چکے تھے۔ ان کا دو دفعہ قائم مقام گورنر ہونا مسلمانوں کے لیے باعث مسرت ہوا بلکہ گورنری کے زمانے میں جب وہ نماز جمعہ کے لیے شاہی مسجد میں جاتے تو مسلمان پھولے نہ سماتے اور پرجوش نعروں سے مسلمان حاکم صوبہ کا استقبال کرتے۔

سردار صاحب بالا قد، وجیہ و شکیل چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ انگریزی سوٹ بھی پہنتے اور شیروانی شلوار بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں سر پر سفید ململ کی پگڑی باندھتے جس پر پنجاب کے زمینداروں کا امتیازی شان یعنی طرہ دستار بہار دیتا تھا۔ کبھی کبھی گھریلو قسم کی مجلسوں میں ترکی ٹوپی بھی پہن لیتے لیکن طرہ دار سفید دستار ان کا سرکاری و غیر سرکاری لباس تھا۔ بہشت سے نفرت کرتے تھے۔ نہایت جامہ زیب آدمی تھے اور ہمیشہ اعلیٰ درجے کا لباس پہنتے تھے اگرچہ اصلاً وہ ضلع اٹک کے رہنے والے اور خاص کھٹر قبیلے کے زمیندار تھے لیکن لاہور اور علی گڑھ کی تعلیم اور شہری شرفا اور انگریزوں کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے ان کے اوضاع و اطوار رہن سہن اور بات چیت میں دیہاتی انداز کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔ فراخ خرچ اور مہمان نواز آدمی تھے۔ اس لیے اکثر ان کی زمینداری اور ملازمت کی آمدنیاں بھی ان کے مصارف کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں اور عام طور پر مقروض ہی رہتے تھے، چنانچہ مرنے کے وقت بھی کم و بیش لاکھ روپے کے مقروض تھے۔

بعض بد انداز لوگ ان کے اور میاں فضل حسین کے درمیان کشاکش پیدا کرنے کے خواہش مند تھے لیکن سردار صاحب کے دل میں میاں صاحب کا بے حد احترام تھا۔ کیوں کہ میاں صاحب کی قابلیت و صلاحیت مسلم تھی رسوخ و اقتدار بھی زیادہ تھا اور سکندر حیات خاں ان نوجوانوں میں سے تھے جن کی سیاسی تربیت میاں صاحب ہی کے آغوش شفقت میں ہوئی تھی۔ پنجاب کی ملازمتوں کے بعد انھوں نے ریزرو بینک آف انڈیا کی ڈپٹی گورنری کا عہدہ قبول کر لیا تھا۔ اس زمانے کا ذکر ہے کہ ہم ایک دن مولوی غلام محی الدین قصوری سے بات چیت کر رہے تھے کہ میاں صاحب اور سکندر حیات کی کشمکش کا ذکر درمیان میں آ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ لوگ خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ میاں صاحب اور سکندر حیات خاں کے تعلقات و روابط بے حد مخلصانہ ہیں۔ ان ہی دنوں سکندر لاہور آئے تو مولوی صاحب نے کولٹنگ روڈ پر کرنل سوڈھی کی کوٹھی میں سکندر کے ساتھ ہماری ملاقات کا انتظام کیا جہاں دو گھنٹے تک ہم نے جی بھر کے ان سے باتیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پر اس دلفریب شخصیت کے کئی ایسے پہلو

روشن ہوے جو اس سے قبل آنکھوں سے اوجھل تھے اور ہمیں یقین ہوگیا کہ میاں صاحب کے بعد پنجاب کا لیڈر یہی ہو سکتا ہے۔ ایک ملاقات مولوی پرویز الدین (مالک فیروز سنز) مرحوم کے ہاں بھی ہوئی جن سے سر سکندر کا گہرا رابطہ تھا۔

اس کے بعد ہمیں سر سکندر کی طبیعت میں بے حد دخل حاصل ہوگیا اور جب میاں صاحب کے انتقال کے بعد سر سکندر نے پنجاب میں اتحادی پارٹی کی وزارت مرتب کی تو ہم سے اکثر مشورے کرتے اور جو فیصلہ ہوتا اس پر عمل بھی کرتے۔ اس وزارت میں سر سکندر کے علاوہ چودھری چھوٹو رام۔ سر منوہر لال۔ سر سندر سنگھ مجیٹھیا۔ ملک خضر حیات خاں اور میاں عبدالحی شامل تھے۔ جدید اصلاحات کو اس وزارت نے پنجاب میں جس پیمانے پر کامیاب کر کے دکھایا اس کے ضامن صرف سر سکندر تھے جنھوں نے دیانت و خدمت کا بلند ترین معیار قائم کر کے اپنے رفقار کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ سر سکندر اور سر چھوٹو رام نے اسمبلی میں دھڑا دھڑ ایسے قوانین پاس کیے جن سے زمینداروں کو بے حد تقویت پہنچی۔ ساہوکارہ ختم ہو گیا۔ غریبوں کو سود در سود کی تباہ کن مصیبت سے نجات ملی۔ بیسیوں کروڑوں روپے کا قرضہ صاف کر دیا گیا اگر جنگ عظیم کی مصروفیتیں حائل نہ ہو جاتیں تو سر سکندر خدا جانے اور کتنی دور رس اصلاحات اس صوبے میں نافذ کر دیتے۔

انھیں دنوں خبر آئی کہ شوکت حیات خاں زخمی ہو کر دشمن کے ہاتھ قید ہو گئے ہیں لیکن سکندر حیات خاں کے چہرے بشرے اور ان کے معمولات . . . . سے ایک لمحے کے لیے بھی کسی اضطراب کا اظہار نہ ہوا۔ وہ بدستور نیں قوم اور اپنے صوبے کی خدمت میں مصروف رہے۔ غالباً یہ اسی صبر و شکیب اور خاموش دعاؤں کی برکت تھی کہ اپریل ۱۹۴۲ء میں شوکت کی رہائی کی خبر آگئی۔

سر سکندر نے ایک قانون نافذ کرایا جس کا منشا یہ تھا کہ جن اراضی مرہونہ کے رہن پر ساٹھ برس گزر چکے ہیں وہ بغیر کسی ادائیگی کے واگزار کر دی جائیں صرف اس قانون کے اثر سے سردار صاحب کے خاندان کے ہاتھ سے کوئی تین لاکھ روپے کی اراضی نکل گئیں۔ سردار صاحب کو یہ معلوم تھا کہ وہ رہن اگلنی پڑے گی لیکن انھوں نے قومی مفاد کو ذاتی نفع پر ترجیح دی اور یہ نقصان ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔

سردار صاحب نے ۱۹۴۲ء کے اواخر میں اپنے بیٹے عظمت حیات خاں اور اپنی بیٹی طاہرہ بیگم کی شادیوں کا اہتمام کیا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں شوکت حیات بھی میدان جنگ سے آگئے۔ ان کی شادی کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔ ۲۶ر دسمبر کو کوئی ڈیڑھ دو ہزار اکابر و شرفائے پنجاب کو ٹی۔ پارٹی دی گئی جس میں انگریز۔ ہندو مسلمان۔ سکھ۔ حکام۔ شرفا رؤسا۔ علما، مشائخ مدیران جرائد سبھی شامل تھے اور اس عظیم الشان اجتماع سے صاف ظاہر تھا کہ سر سکندر حیات خاں کے عروج اور ہر دل عزیزی کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے۔

اسی دن رات کو وہ دفعۃً حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اور ہنستا کھیلتا۔ لہلہاتا ہوا پنجاب غم و الم کی گھٹاؤں سے تیرہ و تار نظر آنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ متحدہ پنجاب کی شان و شکوہ اور اس کی خوش حالی و خرمی کا آخری دن وہی تھا جس دن سکندر حیات خاں زندگی سے منہ موڑ کر موت کی وادیوں میں روپوش ہوگیا۔

پروفیسر ہارون خان شروانی

حسن الدین احمد

یہ میرا مشاہدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کر لیتا
ہے جس کو حاصل کرنے کی صدق دل سے تمنا کرے۔ جب ایک عوامی وزیر
نے اپنی ایک تقریر میں نہایت سادگی اور صفائی سے یہ اعتراف کیا تھا کہ ان
کی زندگی میں تین خواہشات تھیں کہ ان کے گاؤں کا پٹواری علیحدہ ہو
ان کی اپنی باؤلی پر بجلی کا پمپ نصب ہو اور ان کا اپنا گاؤں تحصیل کا
مقر بنے تو ان کی سادہ لوحی اور صاف بیانی نے مجھے چونکا دیا تھا کہ ایک
انسان کیسی خواہشات رکھتا ہے۔ لیکن خدا اپنے خاص بندوں کو ایسی
توفیق بھی عنایت فرماتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی خواہشات سے بلند ہو سکیں

جب پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے جن سے زائد از ربع صدی
سے مجھے نیاز حاصل ہے میرے نام اپنے ایک خط میں اپنی تین آرزوؤں کی
ان صراحت فرمائی کہ

ا۔ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کا دست نگر نہ بنوں اور نہ کسی پر بار رہوں
اا۔ اپنے دم واپسیں تک خدا تعالیٰ اپنے نزدیک مفید کاموں میں
مجھ معروف رکھے۔
ااا۔ انجام بخیر ہو۔ تو موصوف نے غیر شعوری طور پر ان آرزوؤں کے ذریعہ
اپنی شخصیت کا اظہار اور اپنی بڑائی کا اعلان فرما دیا۔

ایک راز کی بات بتا دوں کہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے
میرا استاد اور شاگرد کا رشتہ ہے لیکن چونکہ یہ رشتہ ۱۹۴۸ء میں نہیں بلکہ
۱۹۔۔ء میں قائم ہوا اس لیے استاد اور شاگرد کے رشتے کے معنی بھی مختلف
تھا۔ موصوف کے لیے میرے دل میں بے پناہ جذبات عقیدت و احترام تو

تھے ہی لیکن جذبات خوف بھی تھے۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۹۴۱ء کے دور کے
اساتذہ کی کوئی خاص تکنیک تھی جس سے بے چارے اس دور کے اساتذہ
قطعاً ناآشنا ہیں۔ یا ۱۹۴۱ء کے دور کے طالب علموں کی اس گرسے ناواقفیت
تھی جس سے دور حاضر کے طالب علم بفضلہ بخوبی واقف ہیں لیکن میں بلا خوف
تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر صاحب نے کسی قسم کی جسمانی یا ذہنی سزا
دیے بغیر اور تادیبی کارروائی یا درشتی سے پیش آئے بغیر اپنے شاگردوں
کے دل میں کچھ ایسا خوف طاری کیا تھا جس کا اثر مدتوں باقی رہا اور مجھے
یقین ہے کہ میرے تمام ساتھی اس خیال کی تائید کریں گے۔

استاد شاگرد کے رشتوں کی اس تبدیلی کو اس دور کے ایک طالب
علم کی حیثیت سے جیسے میں نے محسوس کیا۔ ویسے ہی اس دور کے ایک استاد
نے بھی محسوس کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب "یادوں کی دنیا"
میں اسی صورت حال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں
"آج ہماری درس گاہوں میں جو عام طور پر نظم و ضوابط کا فقدان
ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ سولہ سال میں استادوں کی پرانی
پیڑھی کی جگہ نئی پیڑھی نے لے لی ہے۔
جسے اپنے کام سے جیسی دلچسپی ہونی چاہیے ویسی نہیں ہے۔
دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مذہب و اخلاق کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں
جس کے باعث نوجوانوں میں سرپھراپن بڑھ گیا ہے۔ ان کی نظر میں کسی کا
ادب نہ رہا۔ اپنی علمی اور اخلاقی کوتاہیوں کو دور کرنے کی خواہش ...
...... ان استادوں میں سے اکثر نے غلط پیشے کا انتخاب کیا ہے ان کا دل

اس میں نہیں کہیں اور رہتا ہے اس لیے وہ بیکار ٹالتے ہیں اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کے لیے پارٹی بازی میں پڑ جاتے ہیں اور طالب علموں کو غلط امید دلا کر اپنی سیاست میں مبتلا کرتے ہیں. انہیں طالب علموں سے سچی ہمدردی نہیں اور نہ وہ ان کی اخلاقی اور ذہنی نشو ونما کی طرف توجہ کرتے ہیں. "

آج میں کو ایک مثالی استاد کی زندگی کیسی ہوتی ہے اس کی ایک جھلک پیش کروں گا. اس خاکہ کی جس کی جسارت کرنے کا ارادہ ایک مدت سے تھا مجھے اس وقت کا انتظار کرنا پڑا جبکہ عمر پچاس سال سے تجاوز کر جاتی ہے جس کے بغیر میرا اپنا خیال ہے کہ سینیارٹی یا بزرگی اور خوردی کی سنگینی کم ہو جاتی ہے.

اس وضاحت کے بعد جو دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اپنے مختصر خاکہ میں اس عظیم شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتا جس کی زندگی شاندار کارناموں اور عالمانہ سرگرمیوں کا مجموعہ رہی ہے اپنے طالب علمانہ جسارت کے لیے قابل معافی قرار پاؤں گا.

پروفیسر ہارون خان شیروانی جو خدا کے فضل سے قمری اعتبار سے اپنی عمر کے پچاسی سال پورے کر چکے ہیں. ۳۰ مارچ ۱۸۹۱ء کو تاولی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے.

ام، اے، او اسکول علی گڑھ، ہائی اسکول مراد آباد اور ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول لندن میں ابتدائی تعلیم حاصل کی. ۱۹۱۱ میں آکسفورڈ سے بی. اے آنرز اور ۱۹۱۲ء میں بار ایٹ لا کی تکمیل کی. آپ نے زمانہ طالب علمی ہی سے جو کارنامے انجام دیے اور جو اعزازات حاصل کیے ان کی طویل فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دھن کے پکے اس شخص نے اپنی زندگی کا ایک واضح پروگرام بنالیا ہو. کام کا ایک ضابطہ لائحہ عمل تیار کر لیا ہو اور جلد جلد ایک ایک کام کو انجام دے رہا ہو کہ کوئی کام چھوٹنے نہ پائے. جب آپ آکسفورڈ یونیورسٹی میں طالب علم تھے تو ۱۰-۱۹۱۱ء میں ایڈیسن کلب کے اور ۱۳-۱۹۱۲ء میں لندن انڈین ایسوسی ایشن کے صدر رہے. ۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے رکن رہے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک علی گڑھ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے اعزازی معتمد رہے. آپ انڈین نیشنل کانگریس کے لکھنؤ سیشن (۱۹۱۶ء) کلکتہ سیشن (۱۹۱۷) اور بمبئی اسپیشل کانگریس ۱۹۱۸ میں بہ حیثیت مندوب شریک ہوئے. ۱۹۱۷ میں یوپی صوبائی کانفرنس کے معتمد رہے ۱۹۱۷ء میں ہوم رول لیگ کے رکن رہے. (۱۹۱۹) میں جامعہ عثمانیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا ۱۹۲۹ء میں آپ شعبہ تاریخ اور سیاسیات کے شعبہ کے صدر مقرر ہوئے ۱۹۴۵ء میں نظام کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا. ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ تک آپ اینگلو عربک کالج دہلی سے وابستہ رہے اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ تک جامعہ عثمانیہ میں شعبہ سیاسیات کے صدر رہے

درس و تدریس کا رسمی سلسلہ ختم ہوا لیکن اس "ریٹائرڈ" نے پوری توانائی علمی شغف اور لگن کے ساتھ نہ صرف اپنے علمی کاموں اور سرگرمیوں کو جاری رکھا. بلکہ ان کو کافی وسعت دی. اگر کوئی فی زمانہ یہ جاننا چاہے کہ علم کی خدمت کسے کہتے ہیں کام کی دھن کیا ہوتی ہے اور اپنے مضمون سے انصاف کیسے کیا جاتا ہے تو وہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی زندگی، اور ان کے بے شمار کارناموں کو دیکھے جن میں ایک ایک کارنامہ ایک زندگی چاہتا ہے اور ایک ایک کارنامہ کو سر انجام دینے کے لیے ایک مدت درکار ہے اور یہاں یہ عالم ہے کہ.......

... پروفیسر صاحب نے یہ معرکے ایسے سر کیے جیسے ان کا مطمح نظر ان سے بھی بلند ہو ایسے خاموشی سے جیسے کوئی اپنے عیبوں کو چھپاتا ہے. وہ جب اپنے مطالعہ کے کمرے میں ہوتے تو ان کے انہماک اور محنت کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی طالب علم امتحان کی تیاری کر رہا ہے مطالعہ کے دوران کی سنجیدگی اور استغراق کو دیکھ کر کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ یہ وہی شخصیت ہے جس کی بذلہ سنجی محفلوں کی زینت ہوتی ہے.

ایک مورخ اور تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے آپ نے متعلقہ اداروں سے اپنا ربط برابر قائم رکھا. ۱۹۴۸ میں فرانس کے تاریخ انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی کرسپانڈنگ رکن رہے. زیورک میں اٹھویں بین الاقوامی تاریخی ..... کانگریس منعقد ہوئی تھی تو آپ اس کے غیر یورپی شعبہ کے صدر تھے ۴۵-۱۹۴۰ء کے دوران انڈین جرنل آف پولیٹیکل سائنس کی مجلس ادارت کے رکن رہے. انڈین ہسٹری کانگریس سے

سے مدت رشتہ رہا۔ ۱۹۴۱ء میں آپ اس کے مقامی سکریٹری ۱۹۴۴ء
یہ عہد وسطیٰ کے صدر اور ۱۹۶۳، ۶۴ء میں انڈین ہسٹری کانگرس
کے صدر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انڈین پولیٹیکل سائنس کانفرنس منعقد
آپ نے ہندوستانی وفد کی قیادت کی
۔۔ آپ عہد وسطیٰ کی تاریخ دکن کے پروجیکٹ ۔۔ سے جس کو حکومت
و حکومت آندھرا پردیش نے مشترکہ طور پر چالو کیا ۱۹۶۴ء

میں بہ حیثیت ایڈیٹر وابستہ ہوئے آپ ۱۹۶۹ء میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف
ہسٹاریکل اسٹڈیز کی مجلس عاملہ کے رکن ہوئے ۱۹۶۹ء میں آپ کو پدم بھوشن
کا اعزاز ملا آپ کی زائد از ۲۵ اہم تصنیفات ہیں ان کے علاوہ ۱۹۰ مضامین
اور مختلف کتابوں پر تقریباً ستر تبصرے اور سالانہ نشریات ہیں
آپ کی زندگی اور کارنامے ایسے ہیں جن پر ایک ملک کو ناز ہو سکتا
ہے اور ایک دور فخر کر سکتا ہے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے

"سید کے عمل سے بہت سی دشوار گذار راہیں طے ہوئیں مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایک معلم اور دبستان تھے جس نے ایک قوم کی قوم کو ایک لگن، اور ایک جذبہ اور ایک شرار آرزو دے دیا اور بڑے تہذیبی کاموں کا عشق عطا کر دیا۔ مغرب دشمنی ان کے زمانے میں سیاسی حالات کی وجہ سے عام تھی۔ انھوں نے دشمن کو دل میں جگہ دے کر، اس کی دوستی سے اپنے دل کی دنیا آباد کر لی۔ انھوں نے ادب کو علمی بنایا اور علم کی تلوار میں ادب کی آب و تاب سمو دی، انھوں نے دنیا جہان کی دولت لا کر ہمارے گھروں میں بھر دی اور ہماری انجمن کو حیات و کائنات کے ہر رمز کا محرم بنا دیا۔ انھوں نے نئی تہذیبی اور ادبی فضا دے کر ہمارے سماجی نظام کے افکار و اقدار میں زندگی، حرکت اور توانائی پیدا کر دی۔"

آل احمد سرور

خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر محمد انظار الحق

خلیفہ عبدالحکیم لاہور میں سکونت پذیر ایک متوسط کشمیری خاندان
ہونہار چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہو گئے
ے اور پشمینہ کا کام کرتے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی پیدائش ۱۱ر جولائی
۱۸۰ء کو لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ بچپن ہی سے فطری طور پر بے حد دینی
ر علمی میلان سے حامل تھے چنانچہ ان کے والد خلیفہ عبدالرحمٰن جو اپنے
ائی پیشہ، یعنی پشمینہ کی تجارت سے وابستہ تھے۔ اپنی اولاد میں خلیفہ حکیم کو ان کی
ر اور ذہانت اور شوقِ مطالعہ اور علم کی چاہت کے باعث بے حد عزیز رکھتے
۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی انداز سے
ہیں آئی جس کے اثرات زندگی کے آخری دم تک برقرار و قائم رہے۔

خلیفہ عبدالحکیم کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز "شیراں والے دروازے" کے
سلامیہ ہائی اسکول سے ہوا۔ یہاں ابھی وہ اپنی عمر کے بارھویں ہی
س میں تھے کہ اچانک والد کا سایہ عاطفت ان کے سر سے اٹھ گیا۔ تاہم
کی علمی سرگرمیاں برابر جاری و ساری رہیں۔ اسی اسکول سے انھوں نے
۱۹۰ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ فورمین کرسچین کالج میں
ل ہو گئے۔ اپنے بزرگوں کی خواہش و اصرار اور زمانے کی عام روش کے
ت انھوں نے سائنس کے مضامین میں داخلہ لینا گوارا کر لیا۔ لیکن شاید
کو سائنس سے فطری رغبت یا لگاؤ نہیں تھا۔ ان کا دل کسی اور قسم کے
ت سے سرشار تھا، ان کے حریم دل میں زیادہ لطیف و نازک خیالات کے
ل مضامین کے مطالعہ کی چاہت روشن تھی۔ قدرت نے ان کو ایک نرم
ر حساس دل عطا کیا تھا جو فلسفہ نفسیات اور ادبیات کی جانب ایک خاص قسم کا

فطری رجحان و میلان رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ سائنس کے مضامین کے بار گراں کا
متحمل نہ ہوا اور اس طرح ان کی تعلیمی زندگی کا ایک بیش بہا سال ضائع
ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لاہور سے علی گڑھ آ گئے اور سر سید کے قائم کردہ
ادارہ ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لے لیا۔ سائنس کے مضامین ترک کر کے
آرٹس کے موضوعات کی تعلیم حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہو گئے۔ مطالعہ کا
شوق ان کو شروع ہی سے تھا۔ تقریر کی صلاحیت بھی ان میں بچپن ہی سے
موجود تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انجمن حمایت الاسلام کا ایک اجلاس تھا
جس میں انہوں نے بے دھڑک ایک نظم اس عمر میں سنائی تھی جب کہ ان کا
قد صرف اتنا تھا کہ وہ ڈائس پر میز کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ لہٰذا ان کو میز کے
اوپر کھڑا کر دیا گیا تاکہ سامعین ان کو اچھی طرح سے دیکھ سکیں۔ تقریر میں
ایک فطری ملکہ حاصل ہونے کی ایک اور ابتدائی مثال اس زمانے کی
ہے جب کہ وہ علی گڑھ میں فرسٹ ایر کے طالب علم تھے۔ ایم۔ اے۔ او
کالج میں فی البدیہہ تقریر کرنے کا ایک مقابلہ منعقد ہوا جس میں بی۔ اے اور
ایم۔ اے تک کے طلباء شامل تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم ابھی ایم۔ اے۔ او کالج میں
ایف۔ اے کے سالِ اول میں داخل ہی ہوئے تھے۔ لیکن وہ اس مقابلے میں
شریک ہوئے اور "سیرت و کردار پر ماحول کے اثرات" (THE EFFECTS
OF SURROUNDINGS ON CHARACTER) کے موضوع پر صرف پانچ منٹ
کی تیاری سے دس منٹ کی تقریر کر کے اول انعام کے مستحق ثابت ہوئے
جس سے کالج بھر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ قدرت نے ان کو تقریر کا خاص
ملکہ عطا کیا تھا۔ بڑے سے بڑے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں پل بھر کی

بھی جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی اور ہر موضوع اور ہر زبان میں خواہ اردو ہو یا انگریزی، فارسی ہو یا پنجابی، وہ ایسی دلچسپ تقریر کرتے کہ سامعین میں سے کسی کا بھی اکتا جانا ممکن نہ تھا۔

۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ایک طالب علم کے طور پر وہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے (اس لیے کہ ایم۔ اے۔ او کالج کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی سے تھا) ایف۔ اے۔ کے امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرکے دہلی چلے گئے۔ اب انھیں فلسفہ سے انتہائی شغف پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت شمالی ہند میں فلسفے کے ایک مشہور اور لائق استاد مسٹر این۔ کے سین سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں (جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی سے ملحق تھا) درس و تدریس کے عہدہ پر فائز تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسی کالج میں فلسفے کو اپنا اختیاری مضمون رکھتے ہوئے بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ اپنے شوق مطالعہ اور علمی سرگرمیوں میں غیر معمولی انہماک کے باعث وہ جلد ہی پروفیسر سین کے ایک چہیتے شاگرد بن گئے۔ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے بی۔ اے اور پھر ۱۹۱۷ء میں اسی کالج سے فلسفے میں بڑے امتیاز سے ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ وہ پنجاب بھر میں اول رہے۔ ان کے ایم۔ اے کے ممتحنوں میں علامہ اقبال بھی ایک پرچہ کے ممتحن تھے اور خلیفہ عبدالحکیم ہمیشہ اس بات پر فخر محسوس کرتے رہے کہ اس خاص پرچہ میں انھوں نے امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ اس امتحان میں انھوں نے رومی کے فلسفہ سے متعلق ایک مقالہ پیش کیا تھا جس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں اب تک محفوظ ہے [۱]

دہلی سے ایم۔ اے کرکے خلیفہ عبدالحکیم لاہور چلے گئے۔ یہاں انھوں نے ۱۹۱۹ء میں ایل۔ ایل۔ بی۔ کی سند حاصل کی۔ مگر وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ خواجہ احمد شاہ کے انگریزی "پنجاب آبزرور" (PUNJAB OBSERVER) کی ادارت سے وابستہ رہے۔ ابھی وہ کسی مستقل کام کی تلاش ہی میں تھے کہ اگست ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا قیام عمل میں آیا اور خلیفہ عبدالحکیم فلسفہ کے "مددگار" (ASSISTANT) پروفیسر مقرر ہو کر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد چلے گئے۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی کا تقرر بھی انھیں دنوں جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے "مددگار پروفیسر" کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا۔ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو جامعہ عثمانیہ کی رسم افتتاح عمل میں آیا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے دونوں کو ۲۸ اگست تک حیدرآباد پہونچنا تھا۔ حیدرآباد جاتے ہوئے راستہ میں دونوں کی اچانک ملاقات ہوگئی، جو بہت جلد ایک گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ دونوں آخری دم تک ایک دوسرے کے ساتھ سچی دوستی کے بندھن میں جکڑے رہے۔ حیدرآباد دکن میں خلیفہ عبدالحکیم کے قیام سے متعلق اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے پروفیسر ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ حیدرآباد پہونچے۔ ایک ساتھ اپنے اپنے کام کا جائزہ لیا۔ کئی سال ایک ہی جگہ رہے۔ ایک ہی ہفتے میں دونوں کی شادیاں ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ نے ایک ہی تاریخ میں دونوں کو مبارکبادی عصرانہ دیا، اور پر لطف بات یہ ہے کہ خلیفہ نے اس عصرانے میں میرا بنارسی شملہ زیب سر کیا۔ چنانچہ اس عصرانے میں ہم دونوں کی جو تصویر لی گئی وہ اس وقت تک میرے کمرے میں بھولے بسرے زمانے کی یاد دلا رہی ہے .... وہ جامعہ کے اوقات کے علاوہ اپنا بیشتر وقت (رہائش گاہ سے ملحق) باغ میں بسر کرتے تھے۔ ہمیشہ ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی یا پنسل کاغذ۔ پنسل کاغذ اس لیے کہ کسی شعر یا نظم کے لیے طبیعت موزوں ہو تو کمرے سے لانا نہ پڑے۔ میں نصاب کی کتابوں کا ذرا زیادہ مطالعہ کرتا تو مجھے کمرے سے کھینچ کر لے جاتے اور کہتے بھائی! "ابھی تو صرف انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں ہیں۔ اگر اس وقت مطالعے کا یہ عالم ہے تو جب بی۔ اے اور ایم۔ اے کو پڑھانا پڑے گا تو تم اپنے آپ کو بالکل ہلاک ہی کر ڈالوگے" ۔ خلیفہ کی طبیعت میں جولانی بھری ہوئی تھی .... بہت سے نوجوان فلسفی شعراء کی طرح خلیفہ کے مزاج میں بھی ذرا لاابالی پن تھا، مگر کپڑے وہ نہایت نفیس پہنتے تھے۔ تازہ ولایت قسم کے لوگوں کی طرح پتلون کی شکن، ٹائی، کالر کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ مگر دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ان کا دوپہر کا قیلولہ ناغہ نہیں ہوتا تھا"

"......... یہ زمانہ خلیفہ صاحب کی شاعری کے اوج کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ شام کے وقت ہمارے بنگلے میں کلب کی سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ جامعہ کے اساتذہ، دارالترجمہ کے مترجم اور بعض دوسرے

علم دوست احباب جمع ہوتے تھے۔ اور خلیفہ کی بذلہ سنجی، مزاح انگیزی
حاضر جوابی اور شاعری سے فضا گونج جاتی تھی۔ کبھی کبھی رات کے دو
ڈھائی بجے خلیفہ کے کمرے سے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔ اسی وقت اشعار
موزوں ہوجاتے اور دوسرے دن مغرب کے وقت سنائے جاتے
رفتہ رفتہ خلیفہ کی مانگ حیدرآباد کی محفلوں میں ہونے لگی۔ بیاض
کافی ضخیم تھی اور اکثر گاڑی میں رکھی رہتی تھی اور وقت پر منگائی
جاتی تھی۔ اس بیاض میں قومی، مزاحی، فلمی، سنجیدہ، غرض ہر طرح کی نظمیں
رہتی تھیں۔ اور موقع کی مناسبت سے پڑھ دی جاتی تھیں بعض نظموں
میں مزاح کے پردے میں بڑے کام کی باتیں ہوتی تھیں۔ جب گاندھی
جی نے ہندوستان کی نجات کو چرخے کے ساتھ وابستہ کیا اور چرخہ
کانگریس کے ترنگے پر چھاپا گیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی نظم :

چل میرے چرخے چرخ چوں

موزوں کی جو قوم پرست اور انگریز پرست دونوں کی محفلوں میں
مقبول ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ نظم راقم الحروف کے پاس نہیں ہے ورنہ
اس سے اندازہ ہوجاتا کہ خلیفہ مزاح کے پیرائے میں کتنی گہرائیوں
تک پہونچ جاتے ہیں"

"تقریباً ایک سال بعد .... میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اقامت
خانے کا مودب مقیم (ریزیڈنٹ وارڈن) مقرر ہوا اور مجھے اقامت
خانے میں ہی رہنا پڑا۔ مگر یہاں بھی خلیفہ کا اور میرا ساتھ نہیں چھوٹا
اس لیے کہ وہ میرے ساتھ مودب غیر مقیم مقرر ہوئے اور اس بہانے
ہفتے میں کم سے کم دو روز (جب وہ اپنی مودبی کے فرائض پورے کرنے
کے لیے اقامت خانے آتے) ان سے لطف ملاقات رہتا" ....
اسی دوران ہم دونوں کی شادیاں ہوگئیں اور میں نے مودبی کو خیر
باد کہہ دیا۔ خلیفہ صاحب نے بھی ..... ایک الگ بنگلہ کرائے پر لے لیا مگر
انہیں کہیں نہ کہیں تو اپنی تقریر اور اپنے علم مجلسی کے جوہر دکھانے تھے۔
اب ان کی آماجگاہ اساتذہ کا کامن روم بن گیا۔ شعبہ دینیات کے
منطق کے استاد مولوی سید ابراہیم صاحب اور خلیفہ میں خوب خوب چوٹیں
رہتی تھیں۔ مولوی صاحب کی منطق وہی جامعہ نظامیہ والی منطق تھی
جس پر انہیں لاثانی عبور حاصل تھا۔ حدیث، منطق، فلسفہ، کلام سب کی

درسی کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ یاد تھے۔ ان کے استدلال کے
طریقے خلیفہ کے استدلال کے طریقوں سے بالکل جدا تھے۔ اور بحث ہوتی
تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں گویا میز کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں
اور کوئی ایک دوسرے کو پکڑ نہیں سکتا۔ ؎

اسٹاف کلب کی محفلوں میں کبھی علمی اور ادبی گفتگو ہوتی، کبھی
ملکی و قومی اور مقامی سیاست پر تنقید ہوتی اور کبھی پھکڑ پن تا خالص
پھکڑ جس میں کسی دوسرے فکر کی آمیزش نہ ہوتی۔ ان محفلوں میں
خلیفہ صاحب کی ذات کو، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مرکزی حیثیت
حاصل رہا کرتی تھی۔ خلیفہ صاحب کا خطاب اکثر ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے
رہتا جو عربی کے عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے اور نہایت فاضل
شخص تھے۔ وہ بھی پھکڑ پن میں خلیفہ صاحب سے کم نہ تھے۔ ان کا رنگ گہرا سیاہ
تھا ایسا سیاہ کہ جس میں اودا پن آجاتا ہے۔ خلیفہ صاحب بڑے ہی سرخ
و سفید انسان تھے۔ کلب والے دونوں کو بلیک اینڈ وائٹ کہا کرتے
تھے۔ رنگ و روپ میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے، لیکن پھکڑ کی
حد تک دونوں کی شخصیتوں میں اتحاد تھا جب ان دونوں میں نوک جھونک
ہوتی تو کلب کے دوسرے ممبران تماش بینوں کی طرح لطف اندوز ہوتے اور
خاموش رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ معاملہ برابری کا ہے۔ لیکن یہ کبھی
ایسا ہو جائے کہ ایک سیر تو دوسرا سوا سیر .... ان کا مذاق اکثر
پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی سے بھی رہتا تھا جو ان کے پرانے
ساتھی تھے ...... پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی بعض دوسرے
احباب کے مذاق کی تاب نہ لا کر اکثر اوقات غصہ ہو جاتے اور اٹھ کر چلے
جاتے۔ لیکن خلیفہ صاحب کے مذاق سے وہ بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔
وہی باتیں جو خلیفہ صاحب کہتے تھے اگر کوئی دوسرا کہتا تو پھر اس کی خیر
نہ ہوتی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب کی بات کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ ان سے
کبھی ناراض نہ ہوئے۔ میں نے کئی مرتبہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی
کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ کبھی خلیفہ کی بات میں ڈنک نہیں ہوتا"......
بذلہ سنجی کی ترنگ میں وہ کسی کو نہیں چھوڑتے تھے اور خود اپنے اوپر
بھی وہ بعض اوقات پھبتی کس دیتے تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے تھے سب کی
توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ شگفتہ مزاجی کا یہ حال تھا کہ اگر انہیں مستقل

...نا وبہت سار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا..... میں خلیفہ صاحب کو اپنی پیری
ہ ذہین ترین افراد میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی بذلہ سنجی حاصل ان کی
بے پناہ ذہانت اور جودتِ طبع کی ہی رہینِ منت تھی۔۔۔ پھر خلیفہ صاحب
ں ایک بات یہ تھی کہ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ سب نے
دیکھا ہے کہ جب ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ان کے دوسرے ساتھی
یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے سلسلے میں حیدرآباد گئے تو خلیفہ صاحب کی
بذلہ سنجی کا ان اصحاب کے ساتھ وہی انداز تھا جس انداز سے ہم لوگ عادی
تھے۔ ایک زمانے میں سر اکبر حیدری کا حیدرآباد میں طوطی بولتا تھا۔
جب کبھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں آتے تو خلیفہ صاحب
ان سے اسی طرح بے تکلفی سے گفتگو کرتے جس طرح وہ دوسروں سے
معمولاً کیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کی طرح وہ احتیاط سے بات
کریں، اونچ نیچ دیکھ کر اور ناپ تول کر کے۔ اسی بے تکلفی کی وجہ سے
حیدرآباد کے نواب لوگوں میں انہیں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کا بہت بڑا اور بہترین حصہ حیدرآباد
دکن کی علمی فضا میں گذرا جہاں وہ سیاست سے بالکل الگ تھلگ
علم کی تحصیل و ترویج میں مشغول و مصروف رہے۔ لیکن بیچ بیچ مختلف
قسم کے وقفے بھی آتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں وہ پہلی بار جامعہ عثمانیہ کے
وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے۔ یہاں انہوں نے فلسفۂ رومی پر
تحقیقی کام کیا اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی، ایچ، ڈی
کی ڈگری حاصل کی ان مقالہ میں مابعد الطبیعیاتِ رومی (METAPHYSICS
OF RUMI) مولانا روم کے فلسفہ کا ایک بہترین تجزیہ ہے جو بعد میں
۱۹۳۳ء میں پہلی بار لاہور سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۲۵ء
میں خلیفہ عبدالحکیم فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ہو کر جب
حیدرآباد واپس آئے تو ترقی پاکر عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور
اس کے شعبۂ فلسفہ کے صدر مقرر ہوئے۔

ایک خوش گو شاعر اور فلسفہ کے ایک لائق و مشاق استاد کی حیثیت
سے اپنی ذہانت اور قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر وہ پہلے ہی بٹھا
چکے تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد ان کی علم دوستی میں اور بھی زیادہ اضافہ
ہوگیا۔ علمی اور تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کے شوقِ مطالعہ میں دن
بدن افزائش ہوتی گئی۔ انہیں جس وقت بھی موقع ملتا وہ کسی نہ کسی
نئی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے اور اگر کوئی دوست یا گھر والوں
میں سے کوئی شخص اس موضوع کو چھیڑ دیتا تو بڑے شوق سے گفتگو
جاری کر دیتے۔ وہ اکثر یہی کہا کرتے تھے کہ جب میں کسی عالم فاضل
کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں تو گویا ایک غیر معمولی قسم کی صحبت میں
ہوتا ہوں جو کہ ایک عام صحبت پر قابلِ ترجیح ہوتی ہے۔ فلسفے کی
کتابوں کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم کو ادبِ عالیہ کا بھی گہرا ذوق تھا۔ ان کو
اردو ادب سے تو گہرا شغف تھا ہی۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پر
بھی ان کی بڑی وسیع نظر تھی۔ فارسی زبان و ادب سے بھی وہ اچھی طرح
واقف تھے اور اس میں برجستہ تقریر و تحریر کا جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے
ہیں۔ ملکہ بھی رکھتے تھے۔ فلسفۂ اسلام کی تعلیم اور اس میدان میں
تحقیق و تفتیش کو مفید و کارآمد، معنی خیز اور معتبر بنانے کے لیے انہوں نے
عربی زبان کا علم بھی حاصل کر لیا تھا۔ عربی کے ایک استاد کو عرصے تک
اپنے مکان پر رکھا تاکہ ان سے عربی پڑھیں اور عربی زبان میں گفتگو کریں
انہوں نے عربی زبان میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ وہ بلا تکلف
عربی کتابیں پڑھ اور سمجھ سکتے تھے۔ تاہم عربی زبان و ادب میں اپنی استعداد کو
مزید آگے بڑھانے کی کوششوں میں وہ برابر مصروف رہے۔ اس طرح
مغربی اور اسلامی دونوں فلسفے کے مآخذ تک ان کو برابر کی رسائی
حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر مغربی اور اسلامی فلسفے پر بہت وسیع
تھی اور انہوں نے دونوں نظام ہائے فلسفہ کا تقابلی مطالعہ بڑی گہری
نظر سے کیا تھا۔ جس طرح بذلہ سنجی میں وہ بات میں بات نکالنے کے عادی
تھے اسی طرح علمی اور فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کے دوران بھی معنی آفرینی کی
عجیب اور انوکھی صورتیں نظر آتیں۔ ہر بات میں ان کی غیر معمولی خداداد
ذہانت کا اظہار ہوتا۔ دوسروں کے جیسے چبائے لقموں سے احتراز کرتے
اور جو بات کہتے اس میں ذاتی اُپج اور اجتہاد کا رنگ غالب ہوتا۔
غرضیکہ شگفتہ مزاجی تو ان کی فطرت میں تھی ہی، فلسفیانہ عبوسیت
کی بھی ان سے کسی حالت میں توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

یورپ سے واپسی کے بعد خلیفہ عبدالحکیم نے اٹھارہ برس کا
طویل عرصہ خالص علمی و تعلیمی مشاغل و مصروفیات میں صرف کیا۔

۱۹ میں انہوں نے اردو میں حکمت رومی شائع کی جس میں مولانا
ء افکار و نظریات کی بڑی دلکش اور حکیمانہ تشریح پیش کی گئی ہے
یہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ چنانچہ ان کو لکچر اردو میں
ہتے تھے۔ لیکن اردو میں فلسفے کی درسی کتابوں کا اس وقت بھی فقدان
ور آج نصف صدی بعد بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتی ہے
ی کو دور کرنے کے لیے یونیورسٹی نے ان سے کئی کتابوں کے ترجمے
ائے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے وہبر کی تاریخ فلسفہ کا اردو میں ترجمہ
ا۔ لیکن وہ اپنے طالب علموں کو ہمیشہ انگریزی اور جرمن کی طبع زاد
ی کتابوں کے حوالے سے پڑھانے کے عادی تھے۔ اس زمانے میں ان سے
ض فیضیاب ہونے والے ایک طالب علم حمید الدین خان، جو بعد میں
فیسر اور اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ بیان کرتے ہیں۔
" عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ اسی لیے خلیفہ صاحب کے
ز اردو میں ہوتے تھے۔ لیکن اردو کی درسی کتاب کبھی میں نے ان کے
نے نہیں دیکھی۔ مجھے کانٹ پر ان کے لکچرز خصوصیت سے یاد ہیں۔
THE CRITIQUE OF PURE REASON (انتقاد عقل خالص) کا
ا جرمن ایڈیشن ان کے سامنے پڑا رہتا تھا۔ جرمن عبارت کو وہ برجستہ
و میں منتقل کر کے کانٹ کے مطالب کی تشریح کرتے تھے اور اس تشریح
ا ایک خاص لطف یہ ہوتا تھا کہ خلیفہ صاحب نہ صرف کانٹ بلکہ خود
نے آپ میں ڈوب کر بات کرتے تھے۔ رومی، سعدی، حافظ، غالب،
۔ اقبال کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ کانٹ کے مابعد الطبیعی فلسفے
شرح "در حدیث دیگراں" سن کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی تھی اور
د خلیفہ صاحب اس کیفیت میں سرشار نظر آتے تھے"۔ (ثقافت، ایضاً ص
۵۵۔)

۱۹۴۳ء میں خلیفہ عبدالحکیم عارضی طور سے رخصت لے کر جامعہ عثمانیہ
ا اپنی واپسی کا حق برقرار رکھتے ہوئے، حیدر آباد دکن سے اپنے آبائی
ن کشمیر چلے گئے۔ یہاں پہلے امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل اور پھر
است کے ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) مقرر ہوئے۔ ان سے
ے خواجہ غلام السیدین اسی عہدہ پر فائز رہے تھے۔ کشمیری نژاد اور پھر
ع ہونے کے ناتے خلیفہ عبدالحکیم کو دراصل کشمیر سے خاص محبت تھی۔

ان کا ارادہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی باقی ماندہ زندگی
جنت نظیر کشمیر کے پرفضا ماحول میں بسر کرنے کا تھا چنانچہ انہوں نے
سری نگر میں نسیم باغ کے قریب جھیل ڈل کے کنارے ایک وسیع و عریض
قطعہ زمین خرید کر اپنے لیے ایک دلکش بنگلہ تعمیر کرایا اور حیدر آباد میں بڑے
شوق اور بڑی محنت سے جمع کردہ اپنے تمام تر کتب خانے کو اپنی اس نئی
رہائش گاہ میں لا کر بسا دیا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اول تو خلیفہ
عبدالحکیم کو ناظم تعلیمات کا عہدہ اور اس سے وابستہ کام زیادہ پسند نہ آیا۔
نظامت کا کام، ان کی نظر میں، ہیڈ کلرکی کے مترادف تھا۔ پھر وہ اپنے فطری
میلان اور طبعی دلچسپی کے خلاف زیادہ دنوں تک کوئی کام کرنے کے عادی
نہیں تھے چنانچہ تین سال بعد ہی ۱۹۴۶ء میں وہ اپنے جدی وطن کے شہر
سری نگر سے حیدر آباد واپس لوٹ آئے اور پھر سے تعلیم و تدریس کے
کام میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ جامعہ عثمانیہ کے "میر شعبہ فنون"
(ڈین فیکلٹی آف آرٹس) مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں خلیفہ صاحب وظیفہ
حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے کبھی اس بات کو چھپانے کی
کوشش نہیں کی کہ وظیفے کے بعد وہ پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ
۱۹۴۹ء میں انہوں نے حیدر آباد دکن کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا اور
اپنے پیدائشی شہر لاہور میں آکر آباد ہو گئے۔ بعد میں جب کبھی وہ اپنے
دوستوں سے اس ترک مکان کا ذکر کرتے تو انہیں کشمیر میں تعمیر کردہ
اپنے مکان کے نقصان سے زیادہ اس لائبریری کے ضائع ہونے کا غم تھا
جس کو وہ اپنی ساری علمی زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ خلیفہ صاحب اپنی
بذلہ سنجی، خوش مزاجی اور تعلیمی و تدریسی فرائض میں انہماک کے باعث طلبہ
اور اساتذہ دونوں میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔ طلبہ نے ان کو شاندار
رخصتانہ عصرانہ دیا اور ان کی جدائی پر آنسو بہائے۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس
چانسلر بذات خود ان کے پاس انہیں خدا حافظ کہنے تشریف لائے تھے۔

(۲)

خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کو تین اہم حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
پہلا، طالب علمی کا دور ہے جو اسلامیہ ہائی سکول لاہور سے شروع
ہو کر ایم اے اور کالج علی گڑھ اور سنٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں اعلیٰ تعلیم
کی تکمیل پر ختم ہوا۔ اس زمانے میں وہ ایک ذہین طالب علم، سحر بیان

رہا اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے اپنے تمام ساتھیوں میں ممتاز رہا۔ دوسرا دور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں فلسفے کے مددگار پروفیسر کے طور ان کی تقرری سے شروع ہوا اور تیس سال سے زیادہ عرصے پر مشتمل رہا۔ اسی دور کے اوائل میں وہ جرمنی گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ زمانہ تعلیمی و تدریسی مصروفیات کے ساتھ بڑے سکون و اطمینان اور دلچسپیوں کا دور تھا۔ وہ خود بھی اس زمانے کو اپنی زندگی کا خوشگوار ترین دور کہا کرتے تھے۔ لیکن تخلیقی کام کے اعتبار سے یہ دور زیادہ اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا ہے۔ حیدرآباد دکن میں اپنے تیس سالہ قیام کے دوران انہوں نے مطالعہ تو بہت کیا لیکن لکھا بہت کم تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے مطالعہ کا اوسط یومیہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن ان کا تمام تر تخلیقی سرمایہ دو کتابوں ـــ میٹا فزکس آف رومی (۱۹۳۳) اور حکمت رومی (۱۹۴۵) ـــ کچھ درسیات کے تراجم اور چند علمی مقالات پر محیط تھا۔ ان کے ایک رفیق کار، ڈاکٹر انور اقبال قریشی، جو ان کے ہم وطن اور عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے صدر شعبہ تھے، ایک جگہ اپنے تاثرات یوں رقم کرتے ہیں:

"... میں حیدرآباد میں برابر لکھتا رہتا تھا اور اکثر و بیشتر ان سے (خلیفہ صاحب سے) اصلاح و مشورہ لیتا تھا۔ وہ میرے مسودات بہت دلچسپی اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اکثر میرے قلم کی سختی کو نرم کر دیتے تھے۔ لیکن جب کبھی انہیں خود لکھنے پر اصرار کرتا تو وہ نہایت عمدگی سے ٹال دیتے تھے اور کہتے تھے میاں تمہارا مضمون دال روٹی کا ہے اور تم سبزی ترکاری کے بھاؤ لکھ کر آسانی سے چھوٹ جاتے ہو۔ ان کا معیار اس قدر بلند تھا کہ وہ کوئی ایسی چیز لکھنے پر آمادہ نہ ہوتے جو خود ان کے معیار کے مطابق نہ ہو۔"

خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کا تیسرا اور آخری دور شاید سب سے زیادہ گراں بہا ـــ دور پاکستان میں نقل مکان کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جو در اصل "ادارۂ ثقافت اسلامیہ" (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر) کی تشکیل اور پھر اس کی تنظیم و ترقی میں کوشاں رہنے کا دور ہے۔ اسی زمانے میں ان کے قلم کے جوہر کھلے اور انہوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں اور مقالے تحریر کیے جو جدید مسلم افکار کی تاریخ میں ایک روشن ترین باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "مجھے یہ دیکھ کر، پروفیسر یوسف حسین خاں کے بقول، بے حد مسرت ہوئی کہ پاکستان جانے کے بعد ان کی تخلیقی صلاحیت جو حیدرآباد میں کچھ گھٹ کے رہ گئی تھی، پوری طرح بروئے کار آئی اور انہوں نے دس بارہ سال کے عرصے میں نہایت اعلیٰ پایہ کی متعدد تصانیف شائع کیں جو فلسفہ، تمدن اور شعر و ادب دونوں پر حاوی ہیں۔"

خلیفہ عبدالحکیم نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسے زندگی کے ہر شعبہ کی کسوٹی پر پرکھ پورا پایا تھا۔ انہیں اس بات کا یقین محکم تھا کہ یہی مذہب ہے جو قوانین قدرت کے عین مطابق ہے اور اس لحاظ سے اس کے بنیادی اصول و نظریات دائمی ہیں۔ گو تفاوتِ روزگار اور ملک ملک کی تہذیب و تمدن کے اختلاف کی وجہ سے ان اصول و نظریات کے طریقِ اظہار میں مکمل یکسانیت کا پایا جانا ممکن نہیں ہے۔ وہ اسلامی نظریات و احکام کو دورِ حاضرہ کی روشنی میں دیکھتے، جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور ان کو صحیح معنوں میں عملی شکل دینے کے خواہاں تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بقولِ اقبال تطہیر فکر کی انتہائی ضرورت تھی۔ مغربی علوم و نظریات کی ترویج سے مسلمان نوجوان کا ذہن بڑی حد تک لادینیت سے مسموم ہو چکا تھا اور اس لیے اسلام کی قدیم تعبیر اس کے لیے بیکار ہو چکی تھی۔ اسلام کی خوبیوں کے نظری اعتراف کے باوجود وہ اس کے عملی فوائد سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس صورت حال کی اصلاح اور ازالہ کے لیے ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی شدید ضرورت تھی۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے انہوں نے ۱۹۵۰ء میں لاہور کے مقام پر مسٹر غلام محمد کی مدد سے جو اس وقت پاکستان کے وزیر خزانہ تھے، "ادارہ ثقافتِ اسلامیہ" کی بنا ڈالی۔ اس ادارہ کے بانی اور موسس ہونے کے ناتے وہ اس کے پہلے مینجنگ اور اکیڈمک ڈائرکٹر مقرر کیے گئے اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان کے لیے یہ ادارہ ایک مقصد حیات کا درجہ رکھتا تھا اور زندگی کے آخری دس گیارہ سال انہوں نے اسی ادارہ کی تنظیم و ترقی کے لیے وقف کر دیے تاکہ آگے چل کر یہ برگ و بار لائے اور اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کو فروغ دیتا رہے۔ اس ادارہ کے ساتھ ان کے والہانہ لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی رفیقۂ حیات، بیگم خدیجہ حکیم،

ہیں ؛

"تقسیم ہند کے کچھ عرصے بعد جب ادارۂ ثقافت اسلامیہ
ان کی داغ بیل پڑی تو گویا انھیں اپنا من پسند کام مل گیا۔ اور
ثقافت اسلامیہ ایک ایسا نصب العین سامنے نظر آنے لگا جو نہایت
قدر بھی تھا اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے انتہائی
اسلامی تھا مذہب کا صحیح مفہوم واضح کرنا، فلسفہ اور مشرقی و مغربی علوم
کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو منطبق کرنا اور ان تمام مسائل پر غور و فکر
کرنا جن کو مذہبی احکام اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق حل کرنا ضروری
ہے۔ یہ مقاصد ان کے لیے قابل قدر نصب العین بن گئے اور وہ
اپنے ہم خیال ساتھیوں کی مدد سے ان کو حاصل کرنے کی کوششوں
میں مصروف ہو گئے۔ یہ ادارہ ان کو اس قدر عزیز تھا کہ جب انہیں
پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی گئی تو انہوں نے اس کو
نامنظور کر دیا محض اس خیال سے کہ جو کام وہ اس ادارہ میں رہتے
ہوئے انجام دے رہے تھے وہ نامکمل رہ جائے گا۔"

(ثقافت، ایضاً، ص ۸۶، ۸۷)

خلیفہ عبدالحکیم ادارہ کی طرح اپنے رفقائے ادارہ کو بھی بے حد
عزیز رکھتے تھے اور ان کی صحبت و رفاقت کو حاصلِ زندگی قرار دیتے
تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ روزانہ رفقائے ادارہ سے کم از کم دو تین
گھنٹے جب تک مختلف موضوعات پر علمی گفتگو نہ کر لیتے کسی اور کام کی
طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے۔ دراصل وہ ایک روشن خیال مفکر تھے
جو ملائیت اور حد سے بڑھی ہوئی مغرب پسندی دونوں کو ناپسند کرتے
تھے۔ وہ ایک اعتدال پسند اور میانہ روی پر مشتمل آزاد خیال رکھتے
تھے اور اپنے رفقائے ادارہ کو بھی اسی اندازِ فکر کا حامل بنا
چاہتے تھے، جن میں سے کچھ سب کم و بیش آبائی عقائد کے پیرو تھے
اور ان کے مذہبی خیالات پر بڑی حد تک جمود طاری تھا۔ ان کے
روایت پرستی اور "جمود" کو توڑنے کے لیے وہ بعض اوقات دورانِ گفتگو
بالخصوص سقراطی انداز میں ایسی باتیں کہہ دیا کرتے جو دینیاتی ذہن کو بھی
فلسفیانہ نہج سے سوچنے پر مجبور کر دیا کرتی تھیں۔ ان کی طبیعت سقراطی
مزاج ہوئی تھی۔ ان کے صحیح علمی مقام کا اندازہ ان کی تصنیفات سے کہیں

زیادہ ان کی گفتگو سے ل سکتا تھا۔ ان کے پاس لطیفوں اور چٹکلوں،
اشعار و حکایات اور دلچسپ و کارآمد معلومات کا ایک بے پناہ ذخیرہ موجود
تھا۔ انہیں دلچسپ و سبق آموز گفتگو کرنے کا خاص سلیقہ اور ملکہ حاصل
تھا۔ وہ ہر شخص سے اس کے مبلغ فکر کے مطابق بات کر سکتے تھے۔ وہ گھنٹوں
باتیں کرتے رہتے لیکن نہ تو خود اکتاتے اور نہ ہی شرکائے محفل میں سے کوئی
شخص اکتاہٹ محسوس کرتا تھا۔ کبھی دقیق مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے،
کبھی شعر و شاعری کا ذکر ہو رہا ہے، کبھی لطائف و ظرائف کے شگوفے
کھل رہے ہیں، کبھی فلسفہ، تاریخ، حدیث اور تفسیر کے موضوعات زیرِ
بحث آ رہے ہیں غرض وہ اپنی مجلسوں میں بیک وقت کئی رنگوں کا مرقع
نظر آتے تھے۔ یوں تو وہ گفتگو کے بادشاہ تھے، محفل آرائی میں کمال
رکھتے تھے اور جہاں بھی رہے اپنے حسنِ مذاق کے مطابق ایک ماحول
پیدا کر تے رہے لیکن جو فضا انہیں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ملی وہ
کہیں میسر نہ آسکی کیونکہ یہ مجلس عین ان کی آرزؤں کے مطابق تھی اور
یہاں ان کے سقراطی ذہن کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ اپنے اس سقراطی
اندازِ گفتگو سے انہوں نے اپنے رفقائے ادارہ میں ایک صحت مند قسم کی ذہنی
تبدیلی اور فکری انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے اندر روشن خیالی، بالغ
نظری اور وسیع المشربی کی ضرورت کا احساس بیدار کر دیا۔ ان کے ایک
رفیق، محمد مظہر الدین صدیقی، رقمطراز ہیں ؛۔

"خلیفہ صاحب نے ہم لوگوں کی ذہنی تبدیلی کا کام اس قدر سادگی
اور غیر شعوری طور پر انجام دیا کہ ہم میں سے اکثر کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ ہم
ایک فکری انقلاب کے دور سے گزر رہے ہیں۔ خلیفہ صاحب کی اس کامیابی
کا سبب تھا کہ انہوں نے کبھی ادعائیت اور تحکم سے کام لے کر ہم پر اپنا نقطۂ
نظر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس طرح وہ مجلسی زندگی میں مساوات
اور بے تکلفی برتتے اور اپنے ملنے والوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے
دیتے کہ وہ اپنے کو ان سے اعلیٰ تر خیال کرتے ہیں اسی طرح علمی زندگی
میں بھی کبھی انہوں نے اپنی علمی برتری جتانے کی کوشش نہیں کی۔
وہ ہم لوگوں سے علمی مسائل پر اس طرح بحث کرتے تھے گویا ہم لوگ
علم و فضل میں ان کے ہم پلہ ہیں۔ اختلاف رائے کو کشادہ دل سے برداشت
کرتے تھے اور اپنی بات پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم لوگوں نے

۱ اپنے خیالات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات ان کے
عظمت کا کافی ثبوت ہے کیونکہ جن لوگوں میں علم کی کمی ہوتی ہے
فکر کی پختگی نہیں پائی جاتی وہ اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھنے لگتے
۔ اور دوسروں کو دلائل سے قائل کرنے کے بجائے اپنے شخصی رعب داب
یا ظاہری مرتبہ سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس
سے یکسر پاک تھے .... وہ علم و ادب، شعر و شاعری، فلسفہ اور
تصوف کے جامع تھے۔ مفکر ہی نہ تھے بلکہ مفکر گر بھی تھے۔ انہوں نے بہت
سے اشخاص کے طرزِ فکر اور طریقِ استدلال کو متاثر کیا۔ اور بہت سے لوگوں کو
جمود سے نکال کر حرکت پذیر بنا دیا۔ خلیفہ صاحب اپنے رفقاء اور تلامذہ
کا ایک حلقہ چھوڑ گئے ہیں۔ جن میں سے کوئی شخص بھی ان کے علمی احسان سے
سبکدوش نہیں ہو سکتا۔" (ثقافت ... ایضاً ص ۱۱۲-۱۱۴)

خلیفہ عبدالحکیم کی آزاد خیالی اور فلسفہ آرائی کی روش خشک
مذہبی طبائع کو ناگوار تھی چنانچہ ان کو مذہب میں جدت پسند آزاد خیال گمراہ
اور نہ جانے کیا کیا خیال کیا جانے لگا تھا۔ ان پر منکرِ حدیث ہونے کا الزام بھی
عائد کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ خلیفہ صاحب بڑے فلسفی ہیں انہیں علوم قرآن و
حدیث سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ ان کو مغرب زدگی کا شکار بھی قرار
دیا گیا۔ لیکن خلیفہ صاحب ان تمام تر الزامات سے بے پرواہ اپنے ادارہ کی
خدمت کرتے رہے اور اس کے مقاصد کو فروغ دیتے رہے۔ دراصل ان کی
فضل و کمال کی تمام تر قوتیں اور دل و دماغ کی ساری صلاحیتیں اس کے
ارتقاء و ترقی کے لیے وقف تھیں۔ ان کی انتھک کوششوں سے ادارہ
ثقافتِ اسلامیہ ایک بے انتہا باعمل ادارہ بن گیا ہر وہ شخص جو جرأتِ فکر
رکھتا ہے۔ اور مروجہ عقائد سے ہٹ کر غور و فکر کرتا ہے، مخالفین کی
دشنام طرازی اور پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتا ہے۔ خواہ حقیقت کے
اعتبار سے وہ دین کا بہترین ترجمان ہو۔ خلیفہ عبدالحکیم گرچہ ستم ہائے
زمانہ کے رہین رہے، تاہم ادارہ کی تعمیر و ترقی کے خیال سے کبھی غافل
نہیں رہے۔ جنوری ۱۹۵۹ کی بات ہے۔ اسلام سے متعلق ایک علمی مذاکرے
میں شرکت کے لیے خلیفہ عبدالحکیم لاہور سے کراچی تشریف لے گئے کراچی پہنچ
کر وہ حسب معمول ملاقاتوں، لطیفوں اور نکتہ سنجیوں میں گھرے رہے۔
اور جنوری کو موقع پاتے ہی ادارہ ثقافت اسلامیہ کی خاطر فراہمی سرمایہ
کے لیے معتمد مالیات (فینانس سکریٹری) مسٹر ممتاز حسن سے ملنے
ان کے دفتر گئے۔ وہیں ایک سے بجے انہیں دل میں کچھ گھبراہٹ سی
محسوس ہوئی اور شام بجے ان کے دل کی حرکت ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔
اپنے قائم کردہ ادارہ کی تکمیل و ترقی اور بقاء و قیام کی تمنا لیے انہوں نے
اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور عالم فانی دار جاودانی کو سدھارے

(۳)

علمی خدمات کے اعتبار سے خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کا آخری
دور جو قیام پاکستان کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور جو دس سالوں کی
مدت (۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء) پر مشتمل ہے، ان کی زندگی کا جو انہوں نے بسر کر
کر چکے ہیں، شاید سب سے زیادہ اہم ترین اور گراں بہا دور ہے۔ اس دوران
ان کے نوکِ قلم سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نہایت بلند
پایہ کی علمی و ادبی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔ انگریزی میں ان کی
"اسلامک آئیڈیالوجی" (ISLAMIC IDEALOGY) اور "اسلام اور کمیونزم"
(ISLAM AND COMMUNISM) اس دور کی دو اہم ترین کتابیں ہیں۔
اردو میں "فکرِ اقبال"، "افکارِ غالب" اور "تشبیہاتِ رومی" ان کی تین
ممتاز ترین تصنیفات ہیں۔ انہوں نے ولیم جیمز کی مشہور کتاب ورائٹیز
آف ریلیجیس ایکسپیرینس (VARIETIES OF RELIGIOUS
EXPERIENCE) کا شستہ ترجمہ بھی اسی زمانے میں مکمل کر کے شائع
کیا۔ اس مضمون میں ان کی مذکورہ بالا سب کتابوں پر تفصیلی گفتگو کرنا نہ
تو ممکن ہے اور نہ ہی اس کا کوئی محل۔ تاہم ان کا ایک اجمالی
تجزیہ و خلاصہ ان کے افکار و نظریات سے روشناس ہونے کے لیے بے حد
ضروری ہے۔

"اسلامک آئیڈیالوجی" میں خلیفہ عبدالحکیم نے اسلامی افکار و نظریات
اور عقائد کو "نئی شعوریات" کے ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔
اس میں اسلام کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کا
دنیا کے دوسرے نظریات سے اور اسلامی نظریۂ حیات کا دیگر نظام ہائے
فکر سے موازنہ و مقابلہ کر کے انہوں نے ایک طرف تو مغربی دنیا کو دعوت
فکر و نظر دی ہے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو جمود و بے حسی اور
تقلید پرستی کے طلسم توڑ کر اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ہے

ام کا نظریۂ حیات" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا
سلامک آئیڈیالوجی ہی وہ کتاب ہے جس سے ان کو برصغیر
پاک میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور جس کی وجہ سے وہ دانشمن
لفین و مفکرین کی اس صف میں شامل ہو گئے جس میں سرسید
ان، سید امیر علی اور علامہ اقبال کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ نام ہمارے
ین ناموں میں سے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص
مقام ہے اور ہر شخصیت ایک خاص قسم کی عظمت کی مالک ہے۔
بدالحکیم کا بھی ایک خاص درجہ اور جداگانہ مرتبہ ہے۔ لیکن ان میں
میں کہ ان سبھوں میں ایک بات مشترک ہے، اور وہ تقلید اور
یالات سے آزادی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ان لوگوں جیسا مقام
نہیں کیا اور نہ ہی ان کا قد ان لوگوں کے قدوں کے برابر ہے۔
ن سب سے بہت کچھ حاصل کر کے اپنا ایک خاص مقام ضرور بنا لیا ہے۔
. اسلام اور کمیونزم" میں انہوں نے پہلے اشتراکیت کے بنیادی
ں کا معروضی طور پر جائزہ لیا ہے اور اس کے مابعد الطبیعی، اخلاقی
اشی نتائج کو روسی معاشرہ کی تشکیل کی عملی شکل میں پیش کر کے
کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے بعد اسلام کے معاشرتی اور
دی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اسلامی جمہوری نظام اور
) نظام معیشت کا ایک عملی نقشہ پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔
ں میں انہوں نے اسلامی اور اشتراکی نظریات کا تقابلی مطالعہ پیش
، اور کمیونزم کے اچھے اور برے پہلوؤں کا تجزیہ کر کے اسلامی
ت کو مسلک اعتدال کا حامل قرار دیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم کا شمار اقبال کے خاص مداحوں میں ہوتا ہے لیکن
ناقدوں میں بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ "فکر اقبال" میں
ے نے اقبال کی شاعری اور فلسفے کے تمام اہم پہلوؤں پر الگ الگ
صل بحث کی ہے۔ ان کے بنیادی فلسفے اور اس سے مستنبط اقتصادی
ی، معاشرتی اور دینی نظریات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔
ب ان کے انگریزی خطبات "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل
، کے ہر ایک باب کا ایک عمدہ خلاصہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اس اعتبار
م مشرق کی شاعری اور فلسفہ پر شاید یہ سب سے وقیع ترین کتاب ہے۔
یہ تصنیف اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے
اور اقبال کی فکریات پر ہمیشہ مستند کتاب مانی جائے گی۔

خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب "افکار غالب" بھی اردو ادب میں ایک
قابل قدر اور بیش بہا اضافہ کہی جا سکتی ہے۔ اس میں مرزا غالب کے
فلسفیانہ کلام کی حکیمانہ تشریح پیش کی گئی ہے۔ غالب ایک بڑے شاعر تھے
ان کے یہاں فلسفیانہ حقائق اور نفسیاتی واردات بکثرت پائے جاتے ہیں۔
غالب کی نفسیاتی ژرف نگاری کو ان کے سارے ناقدین نے تسلیم کیا ہے۔
خلیفہ عبدالحکیم کی فلسفیانہ نظر غالب کے کلام کے اس پہلو سے بے حد متاثر ہوئی۔
انہوں نے اس کتاب میں غالب کے فلسفیانہ و نفسیاتی افکار کو ایک مربوط
و جامع انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیالات سے ایک
باقاعدہ نظام فکر مرتب کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ گویا "افکار غالب" میں
انہوں نے غالب کے مضامین کی شرح ایک نئے اور دلنشیں انداز سے
پیش کی ہے جس کو ہر جگہ پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور سراہا گیا ہے۔
خلیفہ عبدالحکیم خواجہ میر درد کے افکار کو بھی اسی انداز میں مرتب کرنے کی
خواہش رکھتے تھے مگر افسوس کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ زندگی
نے ساتھ نہیں دیا۔

خلیفہ عبدالحکیم کو رومی کے کلام اور فلسفہ سے ایک طرح کا فطری
اور گہرا شغف تھا۔ اپنی زندگی کے تینوں ادوار میں انہوں نے رومی
پر خاص توجہ کی ہے۔ "تشبیہات رومی" ان کی آخری کتاب ہے اور
اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اچھوتی کوشش ہے۔ رومی تشبیہ و تمثیل کے
بادشاہ ہیں۔ وہ ہر قسم کے اخلاقی و روحانی مسائل کو سلجھانے اور ہر باریک
نکتے کی وضاحت کرنے کے لیے ایسی دل نشیں تشبیہ دیتے ہیں جو یقین
آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی۔ اس کتاب میں خلیفہ عبدالحکیم نے
ان تشبیہات کی بڑے دلکش اور وجد آفریں انداز میں تشریح کی ہے۔
اور تفصیل سے بتایا ہے کہ رومی سا نباض فطرت معمولی تشبیہوں سے
کام لے کر فلسفۂ حیات اور کائنات و انسان کے اسرار و غوامض کو
کس آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ "تشبیہات رومی" اگرچہ بظاہر رومی کی
تشبیہات ہی سے متعلق ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حکمت رومی کی
وسیع تر تشریح کی منظم صورت ہے جس میں شواہد کی موجودگی سے کتاب بڑی مستند ہو گئی۔

حواشی

۱ خلیفہ عبدالحکیم کا شمار طالب علمی کے زمانے سے ہی قوم کے قابل نوجوانوں میں ہونے لگا تھا، جس کی ملاقات۔ کراچی یونیورسٹی میں فلسفہ اور نفسیات کے سابق پروفیسر قاضی محمد اسلم کے قول کے مطابق وہ بڑی بڑی شخصیات سے تھیں جو خود اعتمادی میں [illegible] تحریر میں، تقریر میں اپنے ہم عصر ساتھیوں میں ممتاز یکتا تھا۔ اور پبلک جلسوں میں کھڑے ہو کر برملا اظہار خیال سے نہیں چوکتا۔" قاضی صاحب نے اپنی طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے اس بات کی پوری عکاسی ہوتی ہے کہ خلیفہ صاحب کے اساتذہ کرام بھی ان کی خداداد ذہانت اور قابلیت کے دل سے معترف اور مداح تھے۔ خلیفہ صاحب کی ممتاز شخصیت کے عنوان سے رقم کردہ اپنے مقالے میں لکھتے ہیں۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ ایک روز ہماری سائنس ایسوسی ایشن کا خاص اجلاس تھا۔ سائنس کے اساتذہ تقریباً سب کے سب اس میں شریک تھے۔ ڈاکٹر ولی محمد، فیروزالدین مراد، مسٹر ایچ کبرال وغیرہم۔ فیروزالدین مراد نے ایک بلیغ خطبہ پڑھا۔ اور ایک جگہ رک کر ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے اس کی تعریف کرنی شروع کی کہ ہماری قوم میں قابلیت کی کمی نہیں۔ اس پر ایک نہایت خوش لباس، خوش شکل، گورا چٹا نوجوان اپنی کرسی میں اپنے آپ کو ذرا درست کرنے لگا۔ منہ پر حجاب کے آثار تھے۔ گویا تعریف سے پانی پانی ہوا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہی خلیفہ عبدالحکیم ہیں جن کا ذکر کئی سال پہلے سے سن رہے تھے۔ بعد میں ان کو یونیورسٹی کی یونین میں تقریر کرتے سنا اور مقابلے میں غصہ اور جوش میں بھی دیکھا۔ واقعی شخصیت بڑی اچھی زبردست شخصیت تھی۔ قدرت نے لیاقت اور ظاہر کی جاذبیت بھی دے رکھی تھی اور کردار کی طاقت اور تیزی بھی۔"

ثقافت۔ لاہور، خلیفہ عبدالحکیم نمبر جون جولائی ۱۹۶۰ء

جلد ۸ شمارہ ۵-۶ صفحہ [illegible]

۲۔ (ثقافت ...... ص ۱۰۴، ۱۰۳)

۳۔ (ثقافت ایضاً ص ۷۶، ۷۷)

۴ اپریل ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ یورپ کے سفر سے واپس آتے ہوئے وہ چند دنوں کے لیے تہران میں قیام پذیر ہوئے۔ ان دنوں راجہ غضنفر علی خاں ایران میں پاکستان کے سفیر تھے اور خلیفہ صاحب کی ان سے غائبانہ دیرینہ ملاقات تھی۔ ۲۱ اپریل کو سفارت خانہ پاکستان میں علامہ اقبال کی تقریب تھی۔ اور ایران کے علماء، فضلا اور ادبا بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اس جلسے میں خلیفہ صاحب نے برجستہ اور فی البدیہہ اقبال پر فارسی زبان میں تقریر کی جس میں حاضرین مجلس کو بتایا کہ اقبال نے ملا اور اس کی کوتاہی پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے نہایت دلچسپ لطیفے اور داستانیں بیان کیں۔ اگرچہ ان کا تلفظ اور لہجہ ایرانی نہیں تھا، مگر وہ الفاظ کو نہایت صاف صاف اور روانی طور سے ادا کرتے تھے جس سے حاضرین کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ سارا ہال قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ یہ تقریر ثقافتی پروگرام کے ساتھ ریڈیو تہران سے تمام ملک میں نشر کی گئی اور پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا کیونکہ ایران میں بھی کم و بیش وہی حالات تھے جن کی اقبال نے تنقید کی ہے۔ (ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، خلیفہ عبدالحکیم ایران میں، ثقافت، ص ۶۳-۶۴)

۵ انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایم۔ اے کے امتحانات میں رومی پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ زندگی کے اپنے دوسرے دور میں یعنی قیام حیدرآباد کے دوران رومی کی مابعد الطبیعات (میٹافزکس آف رومی) پر اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مکمل کیا جو ۱۹۳۳ء میں منظر عام پر آیا۔ آج تک اس موضوع پر کوئی اور کتاب معرض وجود میں نہیں آئی۔ ۱۹۵۵ء میں حکمت رومی طبع ہوئی جس میں انہوں نے مولانا روم کے افکار و نظریات کو آشکارا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مرد دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ مزاج جس کا قلندرانہ
وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ
(آل احمد سرور)

ذاکر صاحب کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے بڑی دقت پیش آتی ہے۔ ...سلسلہ میں یہ طے کرنا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے، کون سی ...صیت پہلے بیان کی جائے اور کون سے زاویے پر سب سے پہلے ...نی ڈالی جائے، خاصا مشکل کام ہے۔ ذاکر صاحب میں بہت خوبیاں ...۔ ان کی شخصیت بڑی جامع اور متنوع تھی۔ ان کی شخصیت بڑی ...ب نظر اور پرکشش تھی۔ ان کی ہر خوبی ایسی کہ اگر اُس پر نظر ڈالیے تو اسی ...رہیے۔ ؎ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

ذاکر صاحب ایک فلسفی تھے، ایک معلم تھے، ماہر تعلیم تھے، ...معاشیات تھے، اردو کے صاحب طرز انشا پرداز اور صاحب اسلوب ...تھے اور یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کبھی کبھی شاعری بھی کیا ...تے، وہ معمار جامعہ تھے، مسلم یونیورسٹی کے مسیحا تھے، وہ ہندوستان ...ترک تہذیب کے بہترین نمائندہ تھے، وہ ایک مخلص، بے ریا بے لوث اور سچے انسان تھے۔ وہ نازش قوم اور فخر ہندوستان تھے۔ ان کی زندگی ایثار و قربانی کا عملی نمونہ تھی۔ ان کی ان تمام صفات کو بیان کرنے کے لیے دفتر چاہئیں۔

ذاکر صاحب کو اللہ نے بے شمار بلندیوں پر فائز کیا تھا۔ خاندان کے اعتبار سے ماحول کے اعتبار سے، تعلیم کے اعتبار سے اور منصب کے اعتبار سے، غرض ہر اعتبار سے ذاکر صاحب ایسی بلندیوں پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں جہاں تک دوسروں کی رسائی ناممکن نہیں تو بے انتہا مشکل ضرور ہے۔ ذاکر صاحب نسلاً آفریدی پٹھان تھے جو پٹھانوں کا سب سے اعلیٰ قبیلہ مانا جاتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ حسین خاں تھے جو "مدہ آخوند" یعنی بڑے استاد کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ محمد شاہ (۱۷۱۰ء - ۱۷۴۸ء) کے زمانے میں ہندوستان آئے اور اتر پردیش کے قصبہ قایم گنج (ضلع فرخ آباد) میں قیام پذیر ہوئے۔ قایم گنج کو ۱۷۱۳ء میں محمد خاں بنگش نے آباد کیا اور اپنے بڑے بیٹے قایم خاں کے نام پر اس کا نام قایم گنج رکھا۔ فرخ سیر (۱۷۱۳ء — ۱۷۱۰ء) نے انھیں چار ہزاری منصب اور 'نواب' کے خطاب سے نوازا تھا۔ انھوں نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد بسایا۔ اس کے بعد یہاں سرحدی پٹھانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں کوہاٹ اور درۂ خیبر سے آنے والے آفریدی پٹھان بھی شامل تھے۔ مدہ آخون حسین خاں اسی آفریدی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی اولاد نے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کے بیٹے احمد حسین خاں اور پوتے محمد حسین خاں۔ دونوں صاحب سیف ہوئے اور بہادری میں خوب نام

پیدا کیا۔ محمد حسین خاں کے صاحبزادے غلام حسین خاں تھے۔ ان کی عرفیت چھمن خاں تھی۔ یہ حیدرآباد دکن میں فوج میں ملازم تھے۔ انھوں نے بھی بہادری میں خوب نام پیدا کیا۔ بڑے دبنگ اور بارعب انسان تھے۔ یہ ذاکر صاحب کے دادا تھے۔ ملازمت سے باعزت طور پر سبکدوش ہونے کے بعد اپنے آبائی وطن قایم گنج واپس آگئے تھے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے۔ عطا حسین خاں اور فدا حسین خاں۔ عطا حسین خاں لاولد رہے۔ فدا حسین کو اللہ نے اولاد سے خوب نوازا۔ ان کے سات بیٹے ہوئے۔ مظفر حسین، عابد حسین، ذاکر حسین، زاہد حسین، یوسف حسین، جعفر حسین، محمود حسین۔ لڑکی کوئی نہیں ہوئی۔
مظفر حسین نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ یہاں سے ایل ایل۔ بی کرکے حیدرآباد چلے گئے اور وکالت شروع کردی۔ پھر مجسٹریٹ کے عہدہ پر ان کا تقرر ہو گیا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۱۹۲۳ء میں صرف ۳۲ سال کی عمر میں بعارضہ تپ دق انتقال کیا۔ ان کے بعد عابد حسین خاں بھی عین عالم جوانی میں تپ دق کا شکار ہوئے۔ ان کے بعد ذاکر حسین خاں تھے۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔
ذاکر صاحب سے چھوٹے زاہد حسین تھے۔ یہ بڑے طاقت ور اور تندرست نوجوان تھے لیکن تپ دق نے ان کا بھی پیچھا نہ چھوڑا اور صرف اٹھارہ برس کی عمر میں یہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس وقت یہ علی گڑھ کالج میں ایف۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان کے بعد یوسف حسین خاں تھے۔ ان کا شمار ہمارے ملک کے صف اول کے دانشوروں میں ہوتا ہے۔ یہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ جرمنی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر دارالترجمہ حیدرآباد سے منسلک ہو گئے پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنے۔ ۱۹۶۶ء میں یہاں سے سبکدوش ہو کر انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈی شملہ کے فیلو مقرر ہوئے۔ ۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ تاریخ، فلسفہ اور ادبیات سے گہری دلچسپی تھی۔ اردو اور انگریزی میں متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔
یوسف صاحب سے چھوٹے جعفر حسین تھے۔ ان کا صرف چھ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مولوی فدا حسین کے سب سے چھوٹے بیٹے محمود حسین خاں تھے۔ یہ ۱۵ر جولائی ۱۹۰۷ء کو قایم گنج میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تاریخ میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں اسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ پھر ۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستانی کابینہ میں وزیر تعلیم بھی بنے۔ ۱۰ر اپریل ۱۹۷۵ء کو کراچی میں وفات پائی۔ کراچی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری آپ ہی کے نام پر "محمود حسین لائبریری" کہلاتی ہے۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی مرکزی لائبریری "ذاکر حسین" لائبریری کہلاتی ہے۔
ذاکر صاحب ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اسکول سرٹیفکٹ میں تاریخ پیدائش ۸ر فروری درج ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ داخلہ کے وقت ان کی عمر کچھ کم تھی اس لیے زیادہ کرکے ۸ر فروری لکھا دی گئی تھی۔ ذاکر حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں داخل کرا دیے گئے۔ اس زمانے میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی الطاف حسین تھے۔ یہ طالب علموں میں بہت مقبول تھے۔ ہر شخص بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ان کے کردار اور شخصیت کا بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ جو آخر وقت تک برقرار رہا۔ یہاں سے ذاکر صاحب نے ۱۹۱۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ آگئے۔ اس وقت ان کے دونوں بڑے بھائی مظفر حسین اور عابد حسین علی گڑھ کالج میں طالب علم تھے۔ ذاکر صاحب علی گڑھ میں نووارد تھے اس کا پہلے پہل انھیں جو تجربہ ہوا اس کی تفصیل خود انھوں نے اُس خطبہ میں بیان کی ہے، جو انھوں نے ۲۴ر جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والے مسلم یونیورسٹی کے خصوصی کنووکیشن میں سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے دیا تھا۔ فرماتے ہیں:

"میرا دھیان اس وقت چوالیس برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا، اپنے دوسرے ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی کیونکہ میرے دو بڑے بھائی پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے، میں نووارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوڑا جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خرید وا دی تھیں۔ شہر گئے تھے ہم

پہیلا، اُدھر سے آئے تھے یہ کہیں، اس لیے کہ ہاتھ میں
سامان اٹھا کر چلنا اُس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا!
مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے بھی بارک کے اپنے کمرے چھوڑ کر
اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ شام
کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔
گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے کرتہ، ترکی ٹوپی،
ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے بغیر کھانا کھانے
کی مشق سولہ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے
میں دیر کی اور دیر کیسے نہ کرتا؟ جوتے کا فیتہ ایک سوراخ
سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا۔ اس میں سلیقہ سے گرہ
دینے کا فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور
جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی، وہ گھبراہٹ
میں سب ذہن سے اتر گیا اور کئی بار کی بست و کشاد سے
ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندہ
کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ
چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے ع

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

نہ جانے کتنی دیر ادھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں
گھنٹوں تلاشِ منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے
ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا، کمرہ بند تھا، دوسرے
کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی، یہ بھی نئی اسی دن
بھائی صاحب نے دی تھی، اس سے پہلے اسکول کے
گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی
جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانا کھانے کی گھنٹی کا جو وقت
بتایا گیا تھا اُسے گذرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں۔
اور اس جانِ ناتواں نے ان آٹھ منٹ میں خود فراموشی
بازیافت، تلاشِ منزل، گم کردہ راہی اور ناکامی سفر
کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے!"

ذاکر صاحب نے یہاں گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا۔ مضامین
سائنس کے منتخب کیے اس لیے کہ اس کے بعد ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ تھا۔
چنانچہ ۱۹۱۵ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد بی۔ ایس۔ سی۔ میں داخلہ لینے
لکھنؤ چلے گئے۔ لیکن وہاں پہنچنے پر سخت بیمار پڑ گئے لہٰذا وہاں تعلیم
کا ارادہ منسوخ کر کے علی گڑھ واپس آ گئے اور یہاں بی۔ اے میں داخلہ
لے لیا۔ اس وقت یہاں گریجویشن کے معیار تک سائنس نہیں تھی۔ لہٰذا
بی۔ اے میں انگریزی ادب، فلسفہ اور معاشیات کو منتخب کیا۔ ۱۹۱۸ء
میں امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ایم۔ اے
معاشیات میں داخلہ لیا۔ ابھی سال اول پاس کر کے سال دوم میں آئے
ہی تھے کہ کالج میں جونیئر لکچرر (معاشیات) کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔
اس زمانے میں کالج میں یہ قاعدہ تھا کہ ایم۔ اے کے آخری سال کے
ہونہار طالب علم کو جونیئر لکچرر بنا دیا جاتا تھا۔ اور اسے اسٹوڈنٹ لکچرر کہا
جاتا تھا۔ اتفاق سے یہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی بے چینی اور انتشار
کا تھا۔ انگریز حکومت کے خلاف سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔
خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں زور و شور سے چل رہی تھیں۔
ترکِ موالات کا اثر تعلیمی اداروں تک پہنچ رہا تھا۔ اسی سلسلے میں دوسرے
رہنماؤں کے ساتھ گاندھی جی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کا دورہ کیا
لیکن ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد گاندھی جی علی گڑھ آئے۔ ان کے ساتھ
حکیم اجمل خاں، علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ طلبا
کی یونین ہال میں جلسہ ہوا۔ اس میں لیڈرانِ قوم نے تقریریں کیں۔ اور
حکومت کے خلاف تحریک کو کامیاب بنانے کی اپیل کی۔ ذاکر صاحب بھی
یونین ہال میں موجود تھے اور بہت غور سے تقریریں سن رہے تھے۔ ان
تقریروں کا ان پر بڑا گہرا اثر ہوا چنانچہ جلسہ کے خاتمہ پر انھوں نے
فیصلہ کر لیا کہ وہ یونیورسٹی کو خیرباد کہہ کر قومی تحریک میں شامل ہو جائیں
گے۔ اس کا نقشہ رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح
کھینچا ہے:

"صبح ہوئی، یونین میں جلسہ ہوا۔ میں اور مرشد بھی ایک
طرف بیٹھ رہے۔ مولانا محمد علی نے حسبِ معمول بڑی
پُرزور تقریر کی، لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔
ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے۔ دوپہر ہونے والی تھی۔

دونوں بھائی قرینہ سے کہیں جانے والے تھے۔ تقریروں کی
آخری اور کمزور موجیں کنارِ ساحل سے ہم آغوش ہونے
والی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ
وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر

سپردم بہ تومایۂ خویش را ؛ تو دانی حسابِ کم وبیش را

پڑھا اور تھکے ہوئے انداز سے جاکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔
مڑکر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔
میں ادم بخود ہوگیا۔ مجمع قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ مرشد
کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔ پوچھا یہ کیا ہوا۔ فرمایا "رشید صاحب!
الوداع! زندگی کا آغاز بخیر ہوا، انجام کے بھی بخیر ہونے
کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف اور
محمود (دو چھوٹے بھائی) کے حوالے کر دیجیے گا۔ کالج
کے کاغذات ہوں گے۔ ان کو واپس بھیجد بیجیے گا۔"

میں نے کہا مرشد اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی۔
آپ اس طریقۂ کار کے کچھ ایسے مؤید بھی نہ تھے۔ آخر یہ
ہوا کیا۔ فرمایا تحریک غلط ہو یا صحیح، اس کے بارے میں
یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل
از وقت بھی۔ مجھے جس بات نے بے دست وپا کر دیا وہ
یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایسی ایک
تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا۔ مجھے
تو یہ بتانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی
ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں، پانسا
پھینکا جا چکا ہے، انجام جو کچھ ہو۔ اچھا، خدا حافظ!"[۱۶]

اس طرح گاندھی کو علی گڑھ میں فقید المثال کامیابی نصیب ہوئی۔
اس تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ طلبا سرکاری اداروں اور سرکار کی
مدد سے چلنے والے تعلیمی اداروں سے اپنا ناطہ توڑلیں۔ چنانچہ ایسے طالب علموں
کے لیے جو ان اداروں سے قطع تعلق کریں گے۔ ان کے لیے ایک علیحدہ قومی
تعلیمی ادارے کا وجود عمل میں لایا گیا جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ یعنی
قومی یونیورسٹی (NATIONAL UNIVERSITY) رکھا گیا۔ اس کا افتتاح
علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کی شاندار جامع مسجد میں ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو
شیخ الہند مولانا محمود حسن کے مبارک ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس طرح
مسلمانوں کے تین عظیم الشان اداروں۔ دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ میں اٹوٹ رشتہ قایم ہوا۔

جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قایم ہوئی۔ ذاکر صاحب بحیثیت استاد اس
نئے ادارے سے وابستہ ہوئے: مولانا محمد علی جوہر نے عارضی طور پر
جامعہ کے لیے نصاب تیار کیا۔ وہی اس کے پہلے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر)
مقرر ہوئے۔ حکیم اجمل خاں صاحب کو اس کا اولین امیر جامعہ (چانسلر)
بنایا گیا۔ مولانا محمد علی نے انگریزی ادب اور تاریخ کی کلاسز بھی لیں۔
ذاکر صاحب کی تحریک پر مسلم یونیورسٹی کے چند اور طلبا نے بھی اس سے
ناطہ توڑ کر جامعہ ملیہ میں داخلہ لے لیا۔ تقریباً پانچ سال جامعہ علی گڑھ میں رہی
اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہوگئی یہاں قرول باغ کے کرائے کے
مکان میں اس کی نئی زندگی شروع ہوئی۔

۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جرمنی چلے گئے۔
وہاں انھوں نے مشہور ماہر معاشیات پروفیسر زومبارٹ (PROF. ZOMBART)
کے زیر نگرانی معاشیات کا مطالعہ کیا اور ۱۹۲۵ء میں
"ہندوستان کی معیشت کا دیہی نظام" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری
حاصل کی۔ اسی دوران جامعہ مالی مشکلات کا شکار ہوگئی۔ اس کے تمام
اخراجات قوم کے چندہ سے چلتے تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحب اور گاندھی جی
اس بوجھ کو برداشت کیے ہوئے تھے۔ لیکن قوم اس طرف سے بے رُخی
برت رہی تھی۔ رفتہ رفتہ چندہ ملنا بالکل ہی بند ہوگیا۔ لہٰذا جامعہ کے
عمائدین نے طے کیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ اس فیصلہ کی اطلاع جرمنی میں ذاکر صاحب
کو ہوئی۔ انھوں نے فوراً حکیم اجمل خاں صاحب کو خط لکھا:

"میں اور میرے چند رفقا جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی
زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہیں۔ جب تک ہم لوگ واپس
نہ آجائیں، اس ادارے کو بند نہ کیا جائے۔"

فروری ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب ہندوستان واپس آئے۔ ان کے
دو اور ساتھی ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب بھی آئے۔ ان
تینوں بزرگوں نے فی الواقع جامعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ذاکر صاحب

۔ کا شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا۔ تین سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔
یسے جیسے جامعہ کے اخراجات بڑھتے گئے اور مالی مشکلات میں
ہوتا گیا، شیخ الجامعہ کی تنخواہ میں، خود ذاکر صاحب کی درخواست پر،
ہوتی گئی حتیٰ کہ کم ہوتے ہوتے صرف پچھتر روپے ماہانہ رہ گئی۔
قرول باغ میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے میں کافی دشواریاں پیش
تیں۔ کرائے کی عمارت تھی، وہ بھی ضروریات کے لیے ناکافی۔ لہٰذا اس
ی کوشش مسلسل کی جا رہی تھی کہ اس کی اپنی عمارت بن جائے۔ اس
، ذاکر صاحب نے ریاست حیدرآباد کا دورہ کیا۔ وہاں نواب اکبر یار جنگ
یاز جنگ اور مسعود یار جنگ (سر راس مسعود۔ سابق وائس چانسلر
د مسلم یونیورسٹی) نے کافی اعانت کی اور ان حضرات کی کوششوں
کر صاحب کے وفد کو خاصی کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور وفد لے کر
احب بہار گئے۔ اس وفد کے ارکان میں ڈاکٹر عبدالعلیم بھی شامل تھے
ریباً چالیس سال بعد ۱۹۶۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔
وفد میں بعد میں حکیم اجمل خاں صاحب بھی شامل ہو گئے اور پھر انھوں
ر مہم کی سربراہی کی۔ یہاں سے بھی ان حضرات کو خوب کامیابی ہوئی۔
دم سے جمنا کے کنارے اوکھلا کی پرسکون بستی کے قریب جامعہ کے لیے
خرید لی گئی۔ اور یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو جامعہ کی عمارتوں کا سنگ بنیاد
لیا۔ اس تقریب کا نقشہ مصر کی مشہور خاتون خالدہ ادیب خانم نے
ہندوستان کے سفرنامے ان سائڈ انڈیا (INSIDE INDIA) جس
ند ترجمہ "اندرون ہند" کے عنوان سے شائع ہوا، میں بڑے موثر
ں میں کھینچا ہے۔ لکھتی ہیں :

"آخری مرتبہ میں نے جامعہ کو اس موقع پر دیکھا جب
اس کے ارکان دہلی کے باہر اپنی نئی عمارت کے سنگ بنیاد
رکھنے جمع ہوئے۔ یہ خاصی بڑی آراضی کے مالک ہیں اور
یہاں ایک جدید تر اور وسیع تر مدرسہ بنانے کی توقع
رکھتے ہیں۔ یہ رسم ایک بڑے شامیانے کے نیچے ادا ہوئی۔
ڈاکٹر انصاری صدر تھے اور بڑے بڑے ہندو مسلمان
کے اکابر جمع تھے۔ بڑی بڑی رقوم ہندوؤں نے دی تھیں
جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ کی تعلیمی قدر و قیمت کے
جس قدر ہندو قائل ہیں، اس قدر خود سربرآوردہ مسلمان
بھی اس کے قائل نہیں۔ لیکن مسلمان عوام نے بھی چندے
دیے تھے اور اپنی قلیل آمدنی میں سے جس طرح بن پڑا،
پابندی سے چندہ آنے اس کام کے لیے نکالے تھے۔ یہ بڑی
تعریف کے قابل ہے۔

سب سے چھوٹا بچہ سنگ بنیاد رکھنے والا تھا۔ وہ
چبوترے پر کھڑا تھا اور اپنے سے بڑوں میں کچھ گھبرایا ہوا
معلوم ہوتا تھا۔ چبوترے کے سامنے میرے ملاقاتی بچے
موجود تھے، ان کا طرز عمل بہت اچھا رہا اور چبوترے
سے جو افتتاحی تقریریں ہوئیں، انھیں صبر سے سنتے رہے
لیکن کچھ دیر کے بعد اکتا گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے،
جلسے میں جو استاد بیٹھے تھے، انھوں نے کچھ نہیں کہا،
غالباً وہ جانتے تھے کہ کیا ہوگا۔ چنانچہ سات سال کی ایک
چھوٹی لڑکی نے نظم قایم کیا۔۔ ۔۔ یہ لڑکی مجھے عہد جدید
کی ہندوستانی عورت کی مثالی شکل نظر آئی جو مردوں کو
راہ راست پر چلانے کی قابلیت دکھا کر اپنے حقوق منوا
رہی تھی۔"[۲]

اس کے بعد باقاعدہ طور پر تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ذاکر صاحب کا
قیام اس زمانے میں قرول باغ میں تھا۔ وہ جامعہ کے کاموں میں بے پناہ
الجھے رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود تعمیری کام میں بھی بھرپور دلچسپی لیتے۔
اس طرح انھوں نے تمام عمارتوں کی تعمیر اپنی نگرانی میں کرائی۔ بقول ضیغم:

"ذاکر صاحب کی قیادت میں رفتہ رفتہ ملک میں جامعہ کی
ساکھ قایم ہوئی۔ اس کی افادیت و اہمیت کا احساس
عام ہونے لگا۔ دلی کے ہجوم و ہیجان اور دارو گیر سے
دور اوکھلے میں ایک وسیع قطعے پر اس کی عمارتیں بننا
شروع ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے ایک اجلی، ستھری
تعلیمی بستی آباد ہو گئی۔ جامعہ کی عمارات دلی کی تاریخی
تہذیبی عمارات کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ذاکر صاحب
کے اعلیٰ تعمیری ذہن اور ذوق کا بھی پتہ دیتی ہیں۔"

ہیئت و ساخت اور ان کے معنی و متن میں ذاکر صاحب
کی امید و عزائم پیوست ہیں۔ حالی نے ایک جگہ لکھا
ہے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو سرسید نے بڑے چاؤ
اور امنگ سے بنایا جیسے کوئی اپنا گھر بناتا ہے اور وہ خود
اس کے انجینیر، معمار، مزدور اور قلی تھے۔ کم و بیش یہی
کیفیت ذاکر صاحب کی تھی۔ جامعہ کو گھر مل گیا، کاموں
میں وسعت اور برکت ہوئی، اس طور پر ملک میں ایک
صحت مند اور امید افزا روایت کا اضافہ ہوا۔"[۳۵]

ذاکر صاحب کو یہاں زیادہ دل جمعی سے کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۵ء
میں جامعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ جامعہ کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی
تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جامعہ کی تاسیس کے پچیس سال پورے
ہوئے۔ چنانچہ طلائی جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لیے ذاکر صاحب
نے ملک کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے جوبلی کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ ۱۵ر
نومبر ۱۹۴۶ء کو جوبلی تقریبات کا افتتاح ہوا۔ اور ۱۷ر نومبر کو خصوصی جلسہ
ہوا۔ اس کی صدارت نواب حمید اللہ والیِ ریاست بھوپال نے کی اور شرکا
میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے زعما شامل تھے۔ ان میں
مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، راج گوپال آچاریہ۔ آصف علی
مسٹر جناح اور نوب زادہ لیاقت علی خاں، جیسے عظیم رہنما خصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔ گاندھی جی کسی سبب شرکت نہیں کر سکے تھے۔ یہ ذاکر
صاحب کی شخصیت کا کرشمہ اور خلوص و ایثار کا ثمر تھا کہ ہر مکتبۂ فکر کے
لوگوں نے جشن میں شرکت کی اور اسے کامیاب اور شایانِ شان بنانے میں
بھرپور حصہ لیا۔ ان تقریبات کے مختلف جلسوں میں بہت سے اکابر
نے تقریریں کیں۔ ان سب نے جامعہ کی خدمات اور ذاکر صاحب کی قیادت
کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ راج گوپال آچاریہ نے تعریفی کلمات کے بعد یہ
اعلان بھی کیا کہ حکومت نے جامعہ کو ساڑھے چار لاکھ روپے دیے ہیں
اور ان کے علاوہ ڈھائی لاکھ روپے استادوں کے مدرسہ کی عمارت
کی تکمیل کے لیے بھی عطا کیے۔ اسی دوران حکومت یوپی کا تار آیا جس
میں اطلاع دی گئی تھی کہ وہ زمین جو جامعہ کی زمینوں سے ملحق ہے اور
حکومت یوپی کے رقبہ میں آتی ہے، اُسے جامعہ کو دیدیا گیا۔ اس کے
علاوہ نواب بہادر پور نے بھی ایک لاکھ روپے جامعہ کو عطا فرمائے

اس موقع پر ذاکر صاحب نے جو خطبہ پیش کیا تھا، وہ ہر لحاظ
سے تاریخی اور یادگار رہے۔ اس میں خلوص، دل کی تڑپ، جذبے کی فراوانی
اور ایک عملی انسان کا عزم محکم سبھی کچھ ہے۔ اس میں شروع میں انھوں
نے جامعہ کی تحریک پر مختصر روشنی ڈالی۔ اس کے مقاصد کا ذکر کیا اور شیخ الہند
مولانا محمود الحسنؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور اسی کے ساتھ جامعہ
کی تاسیس کے تاریخ ساز واقعہ کی یاد دلائی۔ انھوں نے کہا:

"مجھے وہ وقت یاد ہے، اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی،
جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجودِ مقدس قید
جلا وطنی، علالت اور تفکر ملی نے جس کی ہڈیاں گھلادی
تھیں، اس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا
کہ غم کی آنکھ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے،
جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں
کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن مردوں
کی طرح ہمت کی جائے تو مددِ خداوندی سے بہت کچھ
بن سکتا ہے۔ یہ وجودِ مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا
ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو خطاب نہیں کر سکتا
اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی
سناتے ہیں۔

صاحبو! یاد ہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے
تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمانِ محکم
اور اس ایمان کے نتیجے یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی
دیوار تھی اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو خطاب فرما رہے
تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کو ساری
آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی مکان کا
سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح
نہ ہو سکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ
سر و سامان چھوڑ کر بے سر و سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا،
یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا۔

اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی، وہ محنت' مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لیے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔"

اس کے بعد سیاست اور تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے بے سادہ لیکن دل کش انداز میں فرمایا:

"سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے' آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے، جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمیوں میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کر لیتا ہے، سیاست استحکام وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بیتاب، تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشقی ہے، لازماً صبر طلب ہے۔ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی ہے ۔۔۔ سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت اس لیے وہ مخدوم ہے، یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے' تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لیے نہیں ہے، راہرو کا رخ متعین کرتی ہے ؂

ملالِ عالمیاں دم بدم دگر گون است

منم کہ مدت عمرم بیک ملال گزشت۔"

چشم دید حضرات کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب جب یہ خطبہ پڑھ رہے تو سیکڑوں کے مجمع میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ لوگ ساکن و ساکت تھے اور تمام ارباب سیاست اور اکابر ملت ایسے ہمہ تن گوش تھے گویا کوئی ملکوتی نغمہ سن رہے ہوں۔ یہی ذاکر صاحب کی تحریروں کا اعجاز ہے۔

ذاکر صاحب نے جامعہ کی دل و جان سے خدمت کی اور اس کو قومی تعلیم کا مسلمانوں کے لیے مثالی ادارہ بنایا۔ اس میں انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے نئے تجربے بھی کیے۔ اسی لیے ذاکر صاحب کی سربراہی میں جامعہ نے ہمہ جہتی ترقی کی۔ وہ تقریروں، نصیحتوں اور وعظوں کے مقابلے میں عمل کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے جس کام کا بھی بیڑا اٹھایا اس میں کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اس طرح جامعہ کے ذریعہ ذاکر صاحب نے تعلیم کے میدان میں جو خدمات انجام دیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ غلام السیدین لکھتے ہیں:

"۔۔۔ قومی تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایک محدود اور رو ایتی تنگ نالے سے نکال کر زندگی کے سمندر میں لائے تاکہ وہ ان تحریکوں سے متاثر ہو سکے جو زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہو کر اس کو نئے تقاضوں سے مالا مال کرتی رہتی ہیں۔ نظری طور پر ہندوستان میں دوسرے لوگ بھی اس اصول کی تبلیغ کر رہے تھے، لیکن زبانی اور تحریری تلقین کی سہل پسندی کی بجائے ذاکر صاحب نے اپنے لیے عمل کا دشوار گزار میدان پسند کیا۔" [۲۸]

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا، یا یوں کہہ لیجیے کہ ہندوستان تقسیم ہوا۔ جو حصہ الگ ہوا وہ پاکستان کہلایا۔ اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے پاکستان برصغیر کے مسلمانوں، ان کے تہذیبی ورثے اور ان کی زبان 'اردو' کے تحفظ اور بقا کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ لیکن اس سے جو نقصان برصغیر کے مسلمانوں کو پہنچا، اُس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی حالت تو ایسے مریض بے جان کی ہوگئی تھی جو اپنی طویل علالت کے باعث زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور اپنی ساری اُمنگوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد رہنما انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر نئے ملک چلے گئے اور ان سے قطعاً بے تعلقی اختیار کر لی۔ ایسے مایوس کن اور ناگفتہ بہ حالات میں وہی حضرات ان کے کام آئے اور انھوں نے ہی ان کی مسیحائی کی جن کو مسلمانوں کی اکثریت نے مسترد کر دیا تھا۔ ان میں مولانا ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا حفظ الرحمٰن کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ان حضرات نے مسلم قوم میں خود اعتمادی اور احساس تحفظ پیدا کیا اور آزاد ہندوستان میں اپنے صحیح مقام اور کردار کو پہچاننے میں مدد کی۔ ان حضرات کے علاوہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے بھی مسلمانوں کی باز آبادکاری اور ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے تاریخی کردار ادا کیا۔

تقسیم ملک کے بعد جہاں ہندوستانی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوا۔ وہیں ان کی یادگاروں، ان کے اداروں اور معابد پر بھی دشمنوں کی نگاہِ غلط انداز پڑی۔ مسلم یونیورسٹی بھلا اس سے کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔ اس کے وجود کو بھی خطرہ پیدا ہوا۔ اس کے آڑے وقت میں بھی جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ذاکر حسین ہی اس کے کام آئے۔

جواہر لال اور مولانا آزاد ہر قیمت پر یونیورسٹی کو بچانا چاہتے تھے۔ اُس وقت یونیورسٹی کے قایم مقام وائس چانسلر نواب اسمٰعیل خاں تھے جن کا شمار لیگ کے صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ نئے وائس چانسلر کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان دونوں رہنماؤں کی نظرِ انتخاب ذاکر حسین پر پڑی۔ لیکن ذاکر صاحب کو علی گڑھ آنے میں پس و پیش تھا۔ لیکن پنڈت جی اور مولانا آزاد دونوں کے اصرار پر انھوں نے اس پیش کش کو قبول کر ہی لیا۔ لیکن شرط یہ رکھی کہ بحیثیت وائس چانسلر ان کا انتخاب متفقہ طور پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۴۸ء کو نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے وائس چانسلرشپ سے استعفٰی دے دیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کورٹ نے خود نواب صاحب کی تجویز پر ذاکر صاحب کو اتفاق رائے سے وائس چانسلر منتخب کر لیا۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۴۸ء کو ذاکر صاحب نے اپنے نئے عہدہ کا چارج لے لیا۔ بقول ڈاکٹر تاراچند:

"۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم نے کئی پیچیدہ اور مشکل مسئلے پیدا کر دیے تھے۔ اُن میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی مسئلہ تھا۔ یہ یونیورسٹی مسلم لیگ کی سیاست کا مرکز بھی رہ چکی تھی اور اس کے علیحدگی پسندانہ پروپیگنڈے سے منسلک بھی۔ جب ملک تقسیم ہوا، تو یہ یونیورسٹی ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئی جس کے لیے وہ کسی طرح بھی تیار نہیں تھی۔ ملک کی تقسیم اس کے لیے ایک سانحہ تھی اور اس کا اپنا مستقبل تاریکی میں گم ہو چکا تھا، لیکن حکومت ہند نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اس ادارے کو نہ تو منتشر ہونے دیا جائے، نہ برباد۔ لیکن اسے ایک تجربہ کار اور ہوش مند رہنما ہی بچا سکتا تھا اور نئی زندگی سے ہم کنار کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس مشکل اور نازک کام کے لیے انتخاب ہوا۔ یہاں کے مسلمان طرح طرح کے شکوک اور مایوسی کا بری طرح شکار ہو رہے تھے۔ یونیورسٹی بھی اپنے مقصد اور سمت کا احساس کھو چکی تھی۔ حال اور ماضی قریب کے درمیان ایک نہ پٹنے والی خلیج حایل تھی زخمی دلوں اور بیمار روحوں سے اس کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کی تعمیر نو کر سکیں گی۔ یہ ایک چیلنج تھا؛ جسے ذاکر صاحب نے قبول کیا۔ اُن کی دلنواز شخصیت کی گرمی سے بادل چھٹنے لگے۔ ان کے ناقابل شکست جوش اور جذبے نے طالب علموں اور استادوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ یونیورسٹی کے وہ در و دیوار جو ویرانی اور عبرت کا منظر پیش کر رہے تھے، پھر سے نوجوانوں کی بڑی تعداد میں آمد سے گونجنے لگے۔ زخموں کے منہ بند ہو گئے اور امید کی شعاعوں نے اُن راستوں کو منور کر دیا، جو روشن مستقبل کی طرف جاتے ہیں۔ اس ساری تبدیلی کے روح رواں تھے ذاکر حسین، یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر۔"[۵]

ذاکر صاحب علی گڑھ کے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ یہیں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکیوٹیو کونسل اور فنانس کمیٹی وغیرہ کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ اس لیے یونیورسٹی کی فضا ان کے لیے اجنبی اور اس کے مسائل ان سے مخفی نہیں تھے۔ لیکن تقسیم ملک کے سبب جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی، اس سے نبرد آزما ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر ذاکر صاحب کے سیاسی افکار سے یہاں کے اکثر افراد اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ اسٹاف کے زیادہ تر لوگ 'ہجرت' کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ اس کی وجہ سے اکثر شعبے سینیر اور لایق اساتذہ سے خالی ہو رہے تھے۔ یہ بڑی سنگین۔۔

صورت حال تھی۔ ذاکر صاحب کو آتے ہی ان تمام مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ شروع سے ہی انھوں نے تندہی اور لگن سے کام کرنا شروع کیا۔ ایک طرف تو انھوں نے یونیورسٹی کو بیرونی حملوں سے بچایا اور دوسری طرف اندرونی خلفشار سے اسے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ جو اساتذہ یونیورسٹی چھوڑ کر چلے گئے تھے، ان کی جگہ نئے اساتذہ کے تقرر کا مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا۔ مسلم اساتذہ مفقود ہو گئے تھے، غیر مسلم آسانی سے دستیاب تھے۔ ذاکر صاحب کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ جن مضامین کے ماہرین مسلمانوں میں دستیاب نہیں ہو رہے تھے، ان مضامین سے متعلق شعبوں کو بند کر دیا جائے اور اس طرح یونیورسٹی کی ترقی کی راہوں کو مسدود کر دیا جائے، یا پھر بحالت مجبوری وقتی طور پر غیر مسلموں کی خدمات کو حاصل کر لیا جائے اور اس طرح یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیوں کو بحال رکھا جائے۔ ذاکر صاحب ایک عملی انسان تھے۔ وہ یونیورسٹی کو فعال، متحرک اور نامیاتی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ انھیں یونیورسٹی کی ترقی ہر حال میں عزیز تھی۔ لہٰذا انھوں نے موخرالذکر راستہ اختیار کیا۔ اگرچہ مخصوص ذہنیت کے افراد کی طرف سے اس حکمتِ عملی کی مخالفت کی گئی، اور آج بھی اسے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، لیکن ذاکر صاحب نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنے متعینہ راستے پر ثابت قدمی سے گامزن رہے۔ اس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ چونکہ طالب علموں میں مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ ہی بہت زیادہ رہی، اس لیے اساتذہ کی جو نئی نسل تیار ہوئی اس میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ چنانچہ جب غیر مسلم اساتذہ اپنے عہدوں سے سبکدوش یا وظیفہ یاب ہوئے تو ان کی خالی کی ہوئی جگہوں کو مسلم نوجوانوں نے پُر کیا۔ اس طرح ذاکر صاحب کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ یونیورسٹی کو جمود سے بچایا اور اس کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے مواقع فراہم کیے۔ انھوں نے موجودہ شعبوں کو استحکام بخشا اور متعدد نئے ادارے اور شعبے قائم کیے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یونیورسٹی کو اسلامی تہذیب کا گہوارہ بھی بنایا۔ ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کو کیا دیا، اس کی تفصیل رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں:

"ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ کم و بیش آٹھ سال رہا۔ اس عرصے میں کتنے بڑے ادارے میں کتنے بڑے کام انجام پا گئے، ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ طلبہ کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت و نشوونما کے لیے نئے مواقع اور نئی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ درس و تدریس کا کام زیادہ دل سوزی اور یکسوئی سے ہونے لگا۔ لیبورٹریوں کے لیے ضروری اور جدید آلات و سامان فراہم کیے گئے۔ اساتذہ کی بڑی تعداد کو تعلیمی رخصت دے کر باہر بھیجا گیا تاکہ وہ اپنے مضامین میں مزید لیاقت حاصل کر سکیں۔ سنجیدہ تصنیف و تالیف اور توسیعی خطبات کا بڑے پیمانے پر انتظام ہوا۔ طلبہ کی اقامتی زندگی اور سرگرمیوں کو زیادہ بامقصد، دلچسپ اور راحت رساں بنانے پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدابیر کو وسیع پیمانے پر نافذ کیا گیا۔ خوبصورت کارآمد اور ضروری عمارات تیار ہوئیں۔ یونیورسٹی کے خطے کو صحت بخش اور دل کشا بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر چمن بندی کی گئی اور باغات لگائے گئے۔ افتادہ زمینوں میں کاشتکاری شروع کی گئی۔ باہر کی علمی دنیا سے بہتر روابط قایم کیے گئے۔ انھوں نے دینیات و اسلامیات کے نصاب پر مستند علما سے نظرِ ثانی کرائی اور اس کی خاطر خواہ تعلیم کا بندوبست کیا۔ قومی ورثے کی نگہداشت کے پیشِ نظر ایک مربوط اور فکر انگیز نصاب تیار کرایا اور اس کو نافذ کیا گیا۔ اسلامی علوم کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے ادارۂ علوم اسلامیہ قایم کیا۔ شعبۂ تاریخ میں ازمنۂ وسطیٰ کی تحقیق و تدوین کے لیے ایک مستقل شعبۂ تصنیف و تالیف کھولا۔ قومی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے بی۔ اے اور بی ایس سی کی سطح پر لازمی اردو اور ہندی کا مناسب و معتبر نصاب رائج کیا۔ نوجوان طالب علموں کی بہتر جلس ترتیب کے لیے ان کی انجمن اتحاد (یونیورسٹی یونین) کے قواعد و ضوابط میں ایسی ایسی اصلاحات اور اضافے کیے گئے جن سے

اس کا کیرکٹر زیادہ سے زیادہ جمہوری اور نمائندہ ہوگیا۔ اس کی خیابان بندی اس طور پر کرائی گئی کہ طلبہ اطمینان اور یکسوئی سے مطالعہ کریں یا گلگشت سے لطف اندوز ہوں۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی اسکیم منظور کرائی۔ یونیورسٹی لائبریری، بالخصوص مخطوطات کے شعبے کی ازسرنو تنظیم و توسیع ہوئی اور کتب خانہ کے لیے ایک علیحدہ خوبصورت، کشادہ اور مناسب حال عمارت کی تجویز منظور کرائی۔ ۔ ۔ مجوزہ میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیے حکومت کی باقاعدہ منظوری اور اعانت حاصل کی۔ امراضِ چشم کی مخصوص تعلیم اور تحقیقات کے لیے انسٹی ٹیوٹ کھولا ۔ ۔ ۔ ۔ ذاتی اثر و اعتبار سے جتنے کثیر عطیات حاصل کیے، اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے اور کلیتہً بدلے ہوئے حالات میں شاید ہی کبھی جمع کیے گئے ہوں۔ کیمپس کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کے پیش نظر تفصیلی منصوبہ مرتب کیا گیا جس کا بڑا حصہ ذاکر صاحب کے عہد میں نافذ ہوا اور بقیہ بعد میں پورا کیا گیا۔ لائبریری، آرٹس فیکلٹی، جیالوجی اور فزکس کے نئے معمل۔ پالی ٹکنک اور انجینیرنگ کالج میں بڑے پیمانے پر ترمیم و توسیع، یونیورسٹی ہسپتال کی عمارت میں اضافہ اور ضروری ردوبدل، یونین کی عمارت کی توسیع وغیرہ جن کی تکمیل بعد میں ہوتی رہی، ان کا نقشہ اور ان کی تعمیر کے لیے ضروری رقم کی منظوری، یہ سب ذاکر صاحب ہی کے عہد میں طے پا چکے تھے۔"[1]

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے دوران ذاکر صاحب راجیہ سبھا کے رکن، انجمن ترقی اردو ہند اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر، ورلڈ یونیورسٹی سروس (جنیوا) کے چیرمین، نیز یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے ممبر و ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے صدر بھی رہے۔

۱۱ر اگست ۱۹۵۶ء کو خرابی صحت کے باعث ذاکر صاحب نے وائس چانسلر شپ سے استعفیٰ دیدیا۔ ان کا عہد یونیورسٹی کے بہترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے انتہائی پرآشوب اور نامساعد حالات میں یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اس کا وجود تک خطرہ میں تھا۔ ذاکر صاحب نے حالات پر قابو پایا، یونیورسٹی کو استحکام بخشا اور معیار تعلیم، عمومی نظم و نسق اور جملہ امور میں کارکردگی کے لحاظ سے اسے صف اول کی یونیورسٹی بنایا۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی یونیورسٹی کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا۔ ذاکر صاحب کے دور وائس چانسلری میں جن غیر ملکی شخصیتوں نے یونیورسٹی کا دورہ کیا ان میں خادم حرمین شریفین شاہ عبدالعزیز ابن سعود (۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء) شہنشاہِ ایران اور ملکہ ثریا (۲۵ر فروری ۱۹۵۶ء) مصر کے نائب وزیر اعظم کمانڈر جمال سلیم (۱۳ر ستمبر ۱۹۵۵ء) اور انڈونیشیا کے نائب صدر ڈاکٹر محمد حتیٰ (۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان کی جن مقتدر شخصیات کی علی گڑھ میں آمد ہوئی ان میں ونوبا بھاوے، جنرل کری اپا، وی۔ کے آر۔ وی۔ راؤ، خواجہ غلام السیدین، سیدنا طاہر سیف الدین جیسی نادر روزگار ہستیاں شامل ہیں۔

علی گڑھ سے سبکدوش ہوکر ذاکر صاحب پُرسکون زندگی بتانا چاہتے تھے۔ لیکن غالباً وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جنھیں سکون اور آسایش کی زندگی میسر ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مناصب اور عہدے کی تلاش میں نہیں رہتے، بلکہ مناصب خود انھیں تلاش کر لیتے ہیں۔ چنانچہ علی گڑھ سے مستعفی ہوکر ذاکر صاحب کچھ دن توخانہ نشین رہے، پھر علاج کے سلسلہ میں سوئٹزرلینڈ اور جرمنی چلے گئے۔ وہیں پنڈت نہرو کے اصرار پر انھیں گورنر کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ ۶ر جولائی ۱۹۵۷ء کو انھوں نے صوبۂ بہار کی گورنرشپ کا چارج لیا۔ ۱۹۶۲ء تک وہ یہاں کے گورنر رہے۔ اس عہدے کو کو بھی انھوں نے ایک مخصوص شان اور رفعت عطا کی۔ یہ منصب ذاکر صاحب کے معیار سے فروتر تھا۔ انھیں اس سے زیادہ اعلیٰ اور ارفع مناصب پر فائز ہونا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں وہ نائب صدر جمہوریہ ہند بنے اس بار بھی پیش کش پنڈت نہرو کی طرف سے ہوئی۔

۷ رمئی ۱۹۶۲ء کو نائب صدارت کا انتخاب عمل میں آیا جس میں ذاکر صاحب
بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ۱۳ رمئی ۱۹۶۲ء کو پارلیمنٹ
کے سنٹرل ہال میں رسم حلف برداری ادا ہوئی۔ پہلے ڈاکٹر رادھا کرشن
نے بحیثیت صدر حلف لیا۔ بعد میں ذاکر صاحب نے نائب صدر کی
حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اس موقع پر سبکدوش ہونے والے صدر
ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ذاکر صاحب کو پُرزور الفاظ میں خراجِ تحسین
پیش کیا۔ انھوں نے کہا :

"وہ ایک بڑے اسکالر، تعمیری اندازِ فکر رکھنے والے
اور بلند مرتبہ ماہرِ تعلیم ہیں۔ وہ عوامی خدمت کے
مختلف میدانوں کا وسیع تجربہ لے کر اس نئے کام کو
انجام دینے آئے ہیں، جو قوم نے آج ان کے سپرد کیا
ہے۔ میں ان کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

ہندوستان کے دستور کی رو سے ملک کا نائب صدر پارلیمنٹ
کے ایوانِ بالا (راجیہ سبھا) کا چیرمین بھی ہوتا ہے۔ اُسے ایوان کی
کارروائی دستور کے مطابق انتہائی غیر جانبداری سے چلانی ہوتی
ہے۔ لیکن جو حضرات پارلیمانی سیاست کے پیچ وخم سے واقف
ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل اور دشوار گذار ہے۔ برسرِ
اقتدار اور حزب مخالف دونوں گروہوں کو مطمئن رکھنا بڑا مشکل کام
ہے۔ موجودہ زمانہ میں تو پارلیمنٹ میں روزانہ ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔
شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب ہنگاموں کی وجہ سے ایوان کی
کارروائی ملتوی نہ کرنی پڑتی ہو۔ لیکن ذاکر صاحب نے اپنی چیرمین شپ
کے زمانے میں ان کارروائیوں کو ایسے حسن وخوبی اور وقار سے چلایا
کہ کبھی کوئی ناگوار صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔ اس میں ان کے حسن
تدبر اور شخصی رعب کا بھی بڑا دخل تھا۔ بقول ڈاکٹر تاراچند :

"ذاکر حسین نے بے پایاں ہمت اور جرأت کے ساتھ کڑے
دن کی آزمائشوں کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ کبھی کبھار ان کے
ذہنی سکون میں خلل بھی پڑا ہے، پھر بھی انھوں نے
ہمیشہ خاص وقار کے ساتھ کام کیا اور ایوان کے کام
کو بلاوجہ خراب نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ
اس کے صدر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو ایوان
کے سبھی گروہوں کے نمائندوں نے انھیں خراجِ عقیدت
پیش کیا۔ انھوں نے یہ بات ظاہر کردی کہ کس حد تک
برسرِ اقتدار اور مخالف پارٹیوں کے ممبر ذاکر حسین صاحب کی
انصاف پسندی اور ایوان کو چلانے کی صلاحیت کے
معترف ہیں۔"[۵]

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر رادھا کرشن کی صدارت کی میعاد ختم ہوئی
تو ان کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ظاہر ہے اس کے لیے ذاکر صاحب
سے بہتر کوئی اور شخصیت نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ حکمراں جماعت نے
انھیں اپنا امیدوار بنایا۔ اس پر فرقہ پرست عناصر بڑے چراغ پا ہوئے
لیکن مخالفین کی تمام تر کوششیں ناکام ہوئیں اور بھاری اکثریت
سے ذاکر صاحب کامیاب ہوئے اور بقول سابق صدر جمہوریہ ہند شری
وی۔ وی۔ گری :

"اس سے ہمارا ملک دنیا کے سامنے سرخ رو ہوا کہ وہ
خالص سیکولرزم پر ایمان رکھتا ہے۔"

۱۳ رمئی ۱۹۶۷ء کو ذاکر صاحب نے اپنے عہدہ کا حلف لیا۔ اور اس
طرح جمہوریہ ہند کی کرسیِ صدارت پر وہ شخص متمکن ہوا جس کی وجہ
سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے اعلیٰ ترین منصب کو نیا وقار،
نئی شان اور نئی رونق نصیب ہوئی۔

بحیثیت نائب صدر اور بعد میں بحیثیت صدر جمہوریہ ذاکر صاحب
نے دنیا کے بہت سے ممالک کے دورے کیے۔ ان میں کویت، سعودی عرب،
ترکی، یونان، سوڈان، حبشہ، متحدہ عرب جمہوریہ، مراقش، افغانستان،
کمبوڈیا، تھائی لینڈ، ملایا، سنگاپور، امریکہ، روس، ہنگری،
یوگوسلاویہ اور نیپال وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں وہ ممالک بھی شامل
ہیں جن سے ہندوستان کے اچھے تعلقات تھے، اور وہ ممالک بھی ہیں
جن سے ہندوستان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ لیکن ذاکر صاحب
کا کمال یہ تھا کہ وہ جہاں بھی گئے، انھوں نے ملکی اور بین الاقوامی مسائل
کے سلسلہ میں ہندوستان کے موقف کی اس طرح وضاحت کی کہ
یہ ممالک ہندوستان کی پالیسی کے بڑی حد تک ہم نوا ہوگئے۔ ان کے

دوروں سے بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کے وزن و وقار
اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب نے ہندوستان کے مختلف
بوں کے بھی دورے کیے۔ ان میں وہ صوبے بھی شامل ہیں جن میں
بے مخالف کی حکومتیں تھیں اور بہت سے معاملات میں مرکزی حکومت
ر فتشاکی تھے۔ ذاکر صاحب کے دوروں سے ان کے بہت شکوک
ہات دور ہوئے۔ اور مرکز سے ان کے تعلقات میں بہتری کی صورت
ا ہوئی۔ افسوس یہ ہے کہ ذاکر صاحب اپنی صدارت کی مدت پوری
ر سکے۔ ۳ رمئی ۱۹۶۹ء کو انھیں اچانک دل کا دورہ پڑا جو جان
ا ثابت ہوا۔ چند ہی ثانیوں میں وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ ایک
بشن دماغ جو نصف صدی تک علم و حکمت، سیاست و ادب،
بس و تدریس اور تعلیم و فلسفہ جیسے مختلف اور بظاہر متضاد میدانوں
ں ضیا پاشی کرتا رہا اور بے شمار تاریک گوشوں کو منور کرتا رہا، اچانک
بہ گیا۔

ذاکر صاحب کی خوبیاں اتنی زیادہ اور کارنامے اتنے وسیع اور
متنوع ہیں کہ ایک نشست میں اُن سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ البتہ
ان میں سے جو بہت زیادہ اہم اور خاص ہیں ان پر سرسری نظر ڈالی
جا سکتی ہے :

واردھا اسکیم : ذاکر صاحب زبردست ماہر تعلیم تھے۔ جامعہ
ملیہ اسلامیہ میں انھوں نے بچوں کی تعلیم کا جو نظام رائج کیا وہ درس و
تدریس کے میدان میں ان کی ماہرانہ بصیرت کی بہترین مثال ہے۔
گاندھی جی ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ وہ ہندوستان میں
رائج نظام تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ ایسی تعلیم کو رائج کرنا چاہتے
تھے جس میں درس گاہیں بچوں کی تعلیم کے مصارف خود برداشت کر
سکیں۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ دیہات کے بچوں کی تعلیم اس نہج پر ہو کہ
انھیں تلاش معاش کے لیے دیہات چھوڑنا نہ پڑے بلکہ وہ اپنے آبائی
پیشہ کو ہی اپنائے رہیں اور تعلیم حاصل کر کے اس کو زیادہ اچھے طریقہ
سے کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے اخبار 'ہریجن' میں مضامین
لکھے اور ارباب اقتدار کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ ذاکر صاحب
بڑی حد تک گاندھی جی کے خیالات سے متفق تھے لیکن وہ گاندھی جی

اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے تھے کہ تعلیم کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔
اس سے تعلیم کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور ساری توجہ معاشی
پہلو پر مرکوز ہو جائے گی۔ گاندھی جی نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے
کی غرض سے واردھا کے مقام پر ۲۱، ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ایک
کانفرنس منعقد کی اس کی صدارت خود گاندھی جی نے کی اور اس میں
بڑی تفصیل سے اپنے خیالات پیش کیے۔ اس میں کچھ سیاسی حضرات
نے گاندھی جی سے اختلاف کیا لیکن ذاکر صاحب نے مجموعی طور پر
گاندھی جی کے خیالات سے اتفاق کیا۔ کانفرنس میں جو بحث و تمحیص
ہوئی اس کے نتیجہ میں ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ذاکر صاحب کو اس
کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس نے کانفرنس کے سامنے چار نکاتی تجاویز پیش
کیں۔ ان میں کہا گیا تھا :

۱۔ ملک کے لیے عام جبری تعلیم کا انتظام کیا جائے۔
۲۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان میں ہو۔
۳۔ تعلیم کا مرکز کوئی دست کاری ہو جو بچے کے ماحول سے چنا گیا
ہو اور کچھ اس کے علاوہ بھی سکھایا جائے جو اسی ربط اور تعلق
سے ہو۔
۴۔ امید ہے اس طریقۂ تعلیم سے رفتہ رفتہ اتنی یافت ہونے لگے
گی کہ استادوں کا خرچ نکل آئے۔

کانفرنس نے یہ تجاویز منظور کر لیں۔ ان کی روشنی میں نیا نظام
تعلیم مرتب کرنے اور جدید نصاب تیار کرنے کی غرض سے گاندھی جی
نے دس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا صدر ذاکر صاحب
کو بنایا۔ دیگر ارکان میں ونوبا بھاوے، خواجہ غلام السیدین اور
کے۔ ٹی۔ شاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کمیٹی نے بڑی تیزی سے
اپنا کام کیا اور اوائل دسمبر ۱۹۳۷ء میں رپورٹ تیار کر کے گاندھی جی
کو پیش کر دی۔ انھوں نے ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۷ء کی 'ہریجن' کی اشاعت
میں اسے شایع کر دیا۔ یہ رپورٹ 'واردھا اسکیم' کے نام سے مشہور
ہوئی۔ اسے ۱۹۳۹ء میں مکتبہ جامعہ، نئی دہلی نے کتابی شکل میں
شایع کیا۔ یہ رپورٹ بنیادی طور پر پانچ حصوں میں منقسم ہے۔
ان میں پہلا حصہ تمہیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ملک میں رائج

نظام تعلیم پر تنقید کی گئی ہے اور جدید تعلیمی ڈھانچے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں جدید نصاب کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بنیادی تعلیم کی مدت سات سال متعین کی گئی ہے اور مادری زبان میں تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جن علاقوں میں ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے وہاں استادوں اور طالب علموں دونوں کے لیے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا جاننا ضروری ہوگا۔ تیسرے حصہ میں اساتذہ کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ چوتھے حصہ میں امتحانات کے طریقوں میں اصلاح کے طریقے بتائے گئے ہیں اور نئے طریقے کا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے اور پانچویں حصہ میں اسکولوں میں نظم ونسق اور انتظامی امور سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔

اس اسکیم پر موافقانہ اور مخالفانہ دونوں قسم کا ردعمل ہوا۔ کانگریس پارٹی نے فروری ۱۹۳۸ء کے ہری پورہ اجلاس میں اسے منظور کیا۔ اس کے علاوہ عوام کے بڑے طبقہ نے بھی اس کا خیر مقدم کیا۔ البتہ خالص مذہبی لوگوں نے اس میں یہ خامی محسوس کی کہ اس میں مذہبی تعلیم کی گنجایش نہیں رکھی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی نشاندہی کی تھی۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے 'صدق جدید' کی ۲ر جون ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں اس کو سراہتے ہوئے لکھا تھا:

"اسکیم کا سرکاری نام واردھا اسکیم تھا۔ ودیا مندر کا نام اب خیال میں نہیں آتا کہ کس کا چلایا ہوا تھا۔ بہرحال تعلیمات اسلامی کے خلاف اس میں کوئی چیز نہ تھی۔ ... گاندھی جی کی یہ جوہر شناسی اور بے تعصبی تھی کہ ملک کی قومی تعلیم کی اس بڑی اسکیم کے لیے انتخاب ایک مسلمان کا کیا تھا۔"

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہندوستان میں صحیح اور مفید تعلیمی نظام کی بنیاد رکھنے کے سلسلے میں واردھا اسکیم آج ماہرین تعلیم کے لیے ضروری چیز بن گئی ہے۔ ... جہاں تک میں سمجھتا ہوں تعلیم کا مقصد انسان کو اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے پر تیار کرنا ہے جو اس کے احوال اور سماج نے مسلط کر دیا ہو اور ٹھیک یہی چیز تھی جسے گاندھی جی نے اپنی واردھا اسکیم میں پیش کیا تھا۔"[۸]

اسی طرح ایک امریکی ماہر تعلیم 'ایکٹر لارن زیاکس' بھی واردھا اسکیم کو ملک میں بنیادی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا تھا:

"ملک کی ابتدائی تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے کے لیے زبردست جہاد کی ضرورت ہے اور واردھا اسکیم اس مقصد کے لیے مجاہدانہ اقدام ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی کی طرف سے پیش کی گئی ہے جس میں ایسے مجاہدانہ ارادوں کو عملی شکل میں لانے کا جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔"[۹]

مذہبی رواداری: ذاکر صاحب بڑے وسیع القلب اور وسیع المشرب انسان تھے۔ تنگ نظری اور ہر قسم کی عصبیت سے بالکل پاک۔ وسیع النظری اور کشادہ ذہنی ان کی زندگی کے ہر پہلو میں ملتی ہے۔ چاہے کوئی سماجی مسئلہ ہو یا سیاسی ہو ان کے یہاں ہر معاملہ میں میانہ روی ملتی ہے حتیٰ کہ مذہب جیسے خالص جذباتی معاملہ میں بھی ان کے یہاں رواداری اور TOLERANCE کا رجحان غالب رہتا ہے۔ ان کا دل ہر قسم کے کینہ وکپٹ سے پاک تھا۔ ذاکر صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے دل میں بغض نہیں رکھتے تھے جو ذاکر صاحب سے ناراض رہتے تھے۔ ذاکر صاحب سے دوست بنانا اور دوست نوازی کرنا خوب آتا تھا۔ انھیں بہت جلد اندازہ ہو جاتا تھا کہ کون شخص ان سے خلوص سے مل رہا ہے اور کون محض مطلب براری کے لیے تعلقات قایم رکھے ہوئے ہے لیکن وہ دونوں قسم کے لوگوں سے اخلاص سے ہی پیش آتے رہتے تھے۔ دراصل ذاکر صاحب اسلامی تعلیمات اور ان کی روح کو کماحقہ سمجھتے تھے اور ان پر کاربند رہنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ بنیادی طور پر ذاکر صاحب کا مزاج صوفیانہ تھا۔ بچپن سے ہی ان کے دل ودماغ پر خاندانی بزرگ اور درویش صفت

انسان صوفی حسن شاہ صاحب کا گہرا اثر پڑ گیا تھا۔ شاہ صاحب فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن تقریباً ہر روز قایم گنج آیا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے گھر قیام فرماتے تھے۔ یہاں ہر فرد ان کا بے حد ادب و احترام کرتا۔ یہ بھی ہر شخص سے شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ زیادہ تر توجہ ذاکر صاحب پر رہتی۔ شاہ صاحب کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ ہر وقت کتابیں ساتھ رہتیں، جہاں جاتے کتابیں ساتھ لے جاتے۔ اس زمانے میں فارسی کا چلن زیادہ تھا لہٰذا فارسی کی ہی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتیں، موضوع تصوف ہوتا۔ ذاکر صاحب سے وہ ان میں سے اکثر کتابوں کو نقل بھی کراتے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے معانی و مفاہیم بھی سمجھاتے جاتے۔ اس طرح انھوں نے ذاکر صاحب کی روحانی تربیت کی جس کا اثر آخر وقت تک برقرار رہا۔ حسن شاہ صاحب شاہ طالب حسین مجیب فرخ آبادی کے ارشد خلفاء میں تھے جو مشرب صلح کل کے زبردست علم بردار تھے ان کے مریدین اور معتقدین میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات کی بھی کثیر تعداد تھی۔ وہ مذہب اور مسلک کی بنیاد پر کسی کی دل شکنی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان ہی سطور پر انھوں نے اپنے خلیفہ صوفی حسن شاہ کی بھی تربیت کی تھی اور یہی روح حسن شاہ صاحب نے ذاکر صاحب کے دل میں حلول کر دی تھی۔

قومی یک جہتی : ذاکر صاحب مختلف قوموں کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور یک جہتی کے خواہاں تھے۔ ان کا یہ تصور مذہبی اقدار پر مبنی تھا۔ ان کے نزدیک قومی یک جہتی کا بہترین مفہوم یہ تھا کہ تمام اقوام اپنی مذہبی، لسانی اور سماجی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے دوسروں کے جذبات کا احترام کریں اور ان کے ساتھ ہم آہنگی اور میل ملاپ قایم رکھیں۔ کسی کو اس کے مذہب یا سماجی حیثیت کی بنا پر کم تر نہ سمجھیں۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

> "ذاکر میاں نے قومی یک جہتی کے مسئلے پر کافی غور کیا ہے۔ ان کے نزدیک قومی یک جہتی سے ایسا اتحاد مراد نہیں ہے کہ اجزا کی انفرادیت فنا ہو جائے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی انفرادیت کو قابل قدر سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ قومی ورثے سے جدا نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ انھیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا بھی احساس ہے۔ انھیں ملک و قوم کی خدمت میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں کرنا چاہیے اس کے بغیر وہ اپنی تہذیبی انفرادیت کو حق بجانب نہیں ٹھہرا سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کے مسلمان اپنے ہمسایہ ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں اسلام کی زیادہ خدمت انجام دیں گے۔ ان کی اسلام کی اور وطن کی خدمت ساتھ ساتھ ہوگی۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہوگا۔ مثلاً پاکستان کے مسلمانوں کی زیادہ تر توجہ سیاسی اور معاشی امور کی جانب رہے گی۔ اس لیے وہ مذہب و اخلاق کی خدمت کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکیں گے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے وسعتِ نظر حاصل ہوگی جس کا اثر لازمی طور پر اسلام کی توجیہ اور تعبیر پر بھی پڑے گا' جو وہ اپنے لیے قبول کریں گے۔ ان کی فکر اور تخیل دونوں کو ہر وقت نئے نئے چیلنج ملتے رہیں گے جن سے نپٹنے کے لیے وہ اپنی توانائیوں کو مرکوز رکھیں گے جس طرح عالم اسلام دنیا میں اقلیت میں ہے اسی طرح سے ہندوستان کے مسلمان، ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ جن اصول پر وہ اپنے مسایل حل کریں گے، ممکن ہے وہی اصول پورے عالم اسلام کے لیے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دیں جن میں اندرونی اخلاقی اور مذہبی اصلاح بھی شامل ہو اور دنیا کی دوسری قوموں سے ربط و تعلق استوار کرنے کا قرینہ بھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی امیدیں ہیں جس کی زندگی کے مسایل پر بڑی گہری نظر ہے۔ اس کا امکان ہے کہ تاریخ ان امیدوں کی تصدیق کردے۔ تاریخ کی تخلیقی رَو انسانی عمل اور ارادے سے متعین ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے مقاصد اور ان کے ارادوں میں پائیداری رہی تو کیا بعید ہے کہ وہ پورے عالم اسلام کے لیے نمونہ

بن جائیں اور خود اپنی اجتماعی زندگی کو ترقی اور مرفہ
حالی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا دیں۔"[۱۰]

ن خطابت : ذاکر صاحب بہترین مقرر تھے۔ وہ شعلہ بیان مقرر
یں تھے اس لیے کہ وہ جذبانی باتوں اور جذباتی طرز کو پسند نہیں کرتے
ے۔ ان کا طرز گفتگو شگفتہ، شایستہ لیکن سنجیدہ تھا ان کے یہاں
فان کا سا چڑھاؤ نہیں تھا، بلکہ دریا کی سی روانی اور سلامت روی
ی۔ یہی انداز ان کی تقریروں میں بھی برقرار رہتا۔ وہ عام لیڈروں
طرح سامعین کے جذبات سے نہیں کھیلتے تھے، نہ جذباتی باتیں
کے وقتی داد کے خواہاں ہوتے۔ وہ اپنی بات بڑے مدلل اور موثر انداز
سا کہتے تھے۔ اس کے ساتھ الفاظ کے برمحل اور مناسب ترین انتخاب سے
ن کی تقریر میں دلسوزی اور تاثیر پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کی فن خطابت
سکہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہی لوگوں کے دماغوں پر بیٹھ گیا
ا۔ ۱۹۱۸ء میں وہ علی گڑھ کالج کے طلبا کی یونین کے نائب صدر منتخب
وے۔ اس زمانے میں ان کی خطابت کا جادو چل رہا تھا۔ ان کے مقابل
لوگ تھے وہ انتہائی جوشیلی اور جذباتی تقریریں کرتے اور وقتی طور پر
امعین کا دل موہ لیتے لیکن جب ذاکر صاحب تقریر کرتے تو وہ اپنے
نجیدہ اور مدلل انداز سے سب کا اثر زایل کر دیتے اور پھر تمام لوگ ان
ے نقطۂ نظر کے حامی ہوجاتے۔ ان کی تقریر کی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں
تنقید کرنے سے حتی الامکان گریز کرتے اور زیادہ سے زیادہ اپنا
قطۂ نظر واضح کرتے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ یہی انداز ان کا
خر تک قایم رہا۔ خواجہ غلام السیدین کا بیان ہے :

> "ایک دفعہ ذاکر صاحب جامعہ کی جوبلی کے سلسلہ میں
> چندہ کرنے کے لیے رامپور گئے تھے۔ اس موقع پر انھوں
> نے جلسۂ عام میں جو تقریر کی اس میں چندہ مانگنے سے
> زیادہ اہل دولت کی تعلیم مدنظر تھی اور انھیں ان کے
> فرائض کا احساس دلانا تھا۔ تقریر کا بے پناہ اثر ہر کسی
> کے چہرے پر نظر آتا تھا، بلکہ کسی کسی کی آنکھوں سے
> آنسو ٹپکنے لگے تھے۔"[۱۱]

علمی اور ادبی ذوق : ذاکر صاحب کا علمی ذوق بہت بلند تھا
وہ فارسی زبان پر غیر معمولی عبور رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی وہ تقریر
ہے جو انھوں نے ۱۴ر جولائی ۱۹۶۶ء کو کابل یونیورسٹی میں فی البدیہہ
کی تھی۔ ذاکر صاحب کا فارسی کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔
انھوں نے اپنے پسندیدہ فارسی اشعار کی بیاض بھی مرتب کی تھی جس
سے ان کے اعلیٰ ذوق کا پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی اور
اردو کے بھی بہترین انشا پرداز تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں
نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ علی گڑھ میگزین میں R I P کے فرضی نام سے
انگریزی میں ان کے مضامین شایع ہوتے جنھیں عام طور پر بہت پسند
کیا جاتا۔ طالب علم ان کے مضامین کے منتظر رہتے اسی ابتدائی مشق نے
انھیں صاحب طرز انشا پرداز اور اعلیٰ پایہ کا مصنف بنا دیا تھا۔ اسی
طرح اردو میں بھی وہ صاحب اسلوب انشا پرداز، بلند پایہ ادیب،
مصنف اور مترجم تھے۔ ان کے مضامین علی گڑھ میگزین اور ماہنامہ
جامعہ میں شائع ہوتے تھے۔ تصانیف اور تراجم کی تعداد ایک درجن سے
متجاوز ہے۔ ان میں 'معاشیات۔ مقصد اور منہاج' 'تعلیمی خطبات'
'ابو خاں کی بکری' اور 'کچھوا اور خرگوش'، خاص طور پر اہم ہیں۔ اسی
طرح تراجم میں افلاطون کی مشہور کتاب 'ریپبلک' کا 'ریاست'، یا
'تحقیق عدل' اور جرمنی کے مشہور ماہر معاشیات فریڈرش لسٹ
کی تصنیف 'نیشنل اکانومی' کا ترجمہ 'معاشیاتِ قومی' کے عنوان سے
اور ایڈون کینن (پروفیسر معاشیات لندن یونیورسٹی) کی کتاب ELE-
MENTARY POLITICAL ECONOMY کا اردو ترجمہ 'مبادی معاشیات'
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ معرکۃ الآرا کتاب 'ریاست'
ہے۔ یہ محض ترجمہ نہیں بلکہ ان کی تصنیفی و تالیفی صلاحیت کا بہترین
نمونہ ہے۔ اس کے متعلق ذاکر صاحب کے ہم جماعت اور اردو کے مشہور
شاعر اقبال احمد سہیل کی یہ رائے بڑی دلچسپ اور مبنی بر حقیقت ہے
کہ "افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ ترجمہ انتہائی
شستہ اور شگفتہ و رواں اور سلیس ہے۔ ذاکر صاحب کا طرز تحریر خود
اُن کی مرصع اور نستعلیق شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے اسلوب
کی اس شایستگی و شگفتگی اور اثر آفرینی کا راز پروفیسر محمد مجیب
کے بقول یہی ہے کہ "قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں

وہ خوبیاں پیدا کردی ہیں، جو ادیبوں کی تحریر کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہے۔"[۹]

مختصر یہ کہ ذاکر صاحب کی شخصیت مجمع الصفات تھی۔ ان کے معترضین ان میں چند خامیاں بھی نکالتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ ایک انسان تھے اور ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور ہوتی ہیں۔ ذاکر صاحب بھی ان سے مبرا نہیں لیکن جو بات ذاکر صاحب کو عام انسانوں کی سطح سے بلند کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی خامیاں بہت ہی محدود اور خوبیاں لامحدود اور لاتناہی تھیں۔ خواجہ غلام السیدین نے ذاکر صاحب کی ان تمام خوبیوں کا احاطہ اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ اسی پر اس مضمون کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"اگر ایک شخص بہترین مقرر بھی اور مصنف بھی، ماہر تعلیم بھی ہو اور ماہر اقتصادیات بھی، شفیق دوست بھی ہو اور راہبر بھی، اگر وہ میر کارواں کی نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز رکھتا ہو، لیکن لیڈری کی تنگ نظری اور خود پسندی سے پاک ہو، اگر اس کی اصول پسندی، اس کی انسانیت کے گداز اور وہ دمندی کو کند نہ کر سکے اور اس کی مروت اور دوستی اس کی اصول پسندی کے راستے میں حارج نہ ہو، اگر وہ اپنی بیشتر زندگی فقر و ایثار کی حالت میں گزار دے اور قوم کو اس کی سزا نہ دے، قوم پر اس کا احسان نہ رکھے، اگر ایک شخص میں یہ تمام باتیں جمع ہو جائیں تو تنقید کیا کرے؟ جب اقبال کے وہ اشعار پڑھتا ہوں جن میں انھوں نے مرد مومن کی شان بیان کی ہے تو ان کی ذہنی تفسیر ذاکر صاحب کے خدوخال سے کرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی تعریف ہے، لیکن ان کے استحقاق سے بڑھ کر نہیں ؎

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز"[۱۲]

حواشی

۱۔ مضامین رشید۔ نئی دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۸۶ء ص ۱۸۷

۲۔ اندرونِ ہند مترجمہ۔ سید ہاشمی۔ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۳۹ء۔ ص۔ ۱۲۳ – ۱۲۴

۳۔ نذر ذاکر۔ (۱۹۶۸ء) ص ۳۲

۴۔ آندھی میں چراغ۔ دوسرا ایڈیشن۔ نئی دہلی۔ ترقی اردو بیورو ۱۹۸۲ء۔ ص ۲۷۲

۵۔ نذر ذاکر۔ ص۔ ۳–۵

۶۔ نذر ذاکر۔ ص ۳۸ – ۴۰

۷۔ نذر ذاکر ص ۱۴۱

۸۔ بحوالہ خورشید مصطفیٰ رضوی: حیات ذاکر حسین، ص ۹۹

۹۔ 〃 〃 〃 ص ۱۰۰

۱۰۔ نذر ذاکر ص۔ ۱۰۲

۱۱۔ آندھی میں چراغ۔ ص

۱۲۔ آندھی میں چراغ۔ ص ۲۹۷ – ۲۹۸

چارلس ایمبروز اسٹوری

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی

سرسید نے غدر اور اس کے بعد مسلمانوں کی بدحالی کو اچھی طرح سے دیکھا تھا، وہ ایک دردمند دل اور خوددار ذہن رکھتے تھے۔ ان کو اپنی بیدار مغزی سے اس بات کا پورا اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت کے اسباب کیا ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قوم کو جگانے اور اس کی خراب حالت کو سنوارنے کے لیے ایک خاکہ مرتب کیا، جس میں دوسری بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ ایک ایسے کالج کا قیام بھی تھا جو تمام ہندوستانیوں کو اور خاص طور سے مسلمانوں کو علمی اور سماجی میدان میں ترقی کی طرف گامزن کرسکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے مختلف ملکوں میں ہر قسم کی ترقیاں ہو رہی تھیں خاص طور سے ذہنوں کو جلا بخشنے کے لیے علوم و فنون کی طرف بہت توجہ دی جا رہی تھی، سائنسی علوم پر زور زیادہ دیا جا رہا تھا۔ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمان جب تک مغربی علوم خاص طور سے زبان اور سائنس نہ سیکھیں گے ان کے لیے ترقی ممکن نہیں۔ یہی وہ خیالات تھے جنھوں نے سرسید سے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج ANGLO MOHAMMADAN (ORIENTAL COLLEGE) کی اسکیم مرتب کرائی تھی۔ اس کالج کا نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کو خاص طور سے ذہن میں رکھا تھا کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کالج کے طلباء کو علوم جدیدہ سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں شروع ہی سے یوروپین اساتذہ کا تقرر خاص طور پر ہوتا رہا۔ آرنلڈ (ARNOLD) ٹرٹین (TRITON) آٹو اسپیس (OTTO SPAASE) اسٹوری (STOREY) اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے اساتذہ پڑھانے کے لیے یہاں آئے۔

چارلس امبروز اسٹوری علی گڑھ میں تقریباً پانچ سال رہے۔ ان کی پیدائش ۲۱ر اگست ۱۸۸۸ء میں انگلینڈ میں ہوئی، ان کی ابتدائی تعلیم روزل (ROSSAL) میں ہوئی اس کے بعد ٹرینٹی کالج (TRINITY COLLEGE) کیمبرج میں داخل ہوئے اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ان کو پڑھنے لکھنے سے بچپن ہی سے بہت دلچسپی تھی، اپنا زیادہ وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار رہا بہت سے انعامات اور سندیں حاصل کیں ان کے مطالعہ کا میدان قدیم ادب خاص طور سے مشرقی زبانیں تھیں اور ان پر ان کی معلومات مکمل اور بڑی گہری تھی۔ پچیس چھبیس سال کی ہی عمر میں ان کی شہرت علمی دنیا میں ہوگئی تھی اور ان کا شمار دنیا کے چند گنے چنے عالموں میں ہوتا تھا، انھوں نے اپنی پوری زندگی علوم مشرقیہ خاص طور سے عربی اور فارسی کے لیے وقف کردی تھی۔ ان دونوں زبانوں پر ان کو اتنا عبور اور ایسی قدرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے اہل زبان بھی ان کی علمیت اور مہارت کے قائل تھے۔

۱۹۱۲ء میں جب ان کی عمر چھبیس سال کی تھی ان کا تقرر اینگلو محمڈن اورینٹل کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) علی گڑھ میں عربی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تقریباً پانچ سال تک وہ یہاں رہے اور اپنی علمیت اور اعلیٰ قابلیت کا سکہ سب کے دلوں پر بٹھایا۔ ان کی کام کرنے کی لگن اور لیاقت نے بہت جلد ان کو علمی دنیا میں ایک اچھے محقق اور لائق عالم کی حیثیت سے روشناس کرایا، اور ۱۹۱۹ء میں وہ انڈیا آفس لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں ان کو لائبریرین بنایا گیا۔ یہ عہدہ ایک بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا تھا ۱۹۳۳ء میں ان کو کیمبرج یونیورسٹی میں سر تھامس ایڈمس پروفیسر آف عربک (SIR THOMAS ADAMS PROFESSOR OF ARABIC) منتخب کیا گیا جہاں ۱۹۴۸ء تک اپنے اس عہدہ پر فائز رہے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ اس

کے بعد وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن (Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland) کے فیلو منتخب ہوئے اور آخر عمر تک اس سے منسلک رہے۔

پروفیسر اسٹوری نے اپنی ساری زندگی علمی کاموں کے لیے وقف کردی تھی۔ [illegible] میں انہوں نے اپنا پہلا علمی کام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ عربی کی ایک مشہور تصنیف "کتاب الفاخر" کی ترتیب و تصحیح اور اس پر حواشی تھے۔ اس کے مصنف مفضل بن ابی سلمی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے عربوں کے ان تمام محاوروں اور امثال کو جمع کیا ہے جو عام طور پر لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے اصل معانی اور ماخذ سے واقف نہیں ہیں۔ مصنف نے ان کے معانی بیان کیے ہیں اور کلام عرب سے مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ کتاب نایاب تھی اسٹوری نے اسے مرتب کیا، فہرست بنائی جس میں شعرا کے نام، لوگوں کے نام، محاورات اور الفاظ وغیرہ کو شامل کیا۔ اس کے مصنف کے بارے میں بھی ایک جامع نوٹ لکھا اور کتاب میں بہت سی جگہوں پر اصلاحات کیں۔ ان کے اس کام کو اہل علم نے بڑی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا۔

اس کے علاوہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کے عربی مخطوطات کی بھی ایک جامع فہرست مرتب کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے فارسی و عربی مخطوطات کی فہرست تیار کی۔ ان کاموں کے علاوہ بہت سے تحقیقی مقالے مضامین اور تبصرے لکھے۔

لیکن ان کی سب سے اہم تصنیف اور عظیم ترین کام جس نے ان کو زندۂ جاوید بنا دیا وہ ان کی فارسی ادب کے مخطوطات کی مکمل اور جامع فہرست ہے۔ اس فہرست کا انداز وہی ہے جو عربی مخطوطات کی فہرست میں بروکلمان (Brockelmann) نے اختیار کیا ہے۔ اسٹوری بنیادی طور پر ایک اچھے لائبریرین اور کتابیات کے ماہر تھے انھوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی علمی کام کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے بڑی کاوش اور جانفشانی سے فارسی کے تمام موجود مخطوطات کی نشاندہی کی ہے اور ان کے مصنفین کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کا پہلا حصہ [illegible] میں شائع ہوا تھا۔ اور آخری [illegible] میں لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا تھا، عمر کے آخری لمحوں تک وہ اسی دھن میں لگے رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اپنی وصیت میں یہ لکھ دیں گے کہ فہرست کا جتنا حصہ ان کے انتقال کے وقت غیر مطبوعہ ہو اسے ضائع کر دیا جائے۔ لیکن پھر ان کی علم دوستی اور علم پروری نے ان کی رائے بدل دی اور جو بھی غیر مطبوعہ مواد اس فہرست سے متعلق ان کے پاس تھا نہ صرف اس کی اشاعت کی اجازت دی بلکہ اور بھی جو غیر مطبوعہ چیزیں موجود تھیں ان سب کو [illegible] کرنے کی اجازت دے دی۔

ہماری یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سابق صدر پروفیسر مختار الدین ا[illegible] جب راکفیلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ گئے تھے او[illegible] کی لائڈن یونیورسٹی لائبریری کے ایک اہم اور نادر عربی مخطوطہ جمہرۃ الا[illegible] پر پروفیسر گب کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہے تھے تو پروفیس[illegible] کے مشورے پر ڈاکٹر اسٹوری سے بھی ملنے گئے تھے اس لیے کہ ان کو تحقیق[illegible] تصحیح متن کا بہت تجربہ تھا۔ اسٹوری صاحب کا تعلق انڈیا آفس لائبریر[illegible] بہت گہرا تھا اور عربی مخطوطات پر ان کی نظر بہت اچھی تھی، بہت سے م[illegible] مخطوطات مطبوعہ فہرست میں شامل نہ ہو سکے تھے اور جن کے کوائف بھی [illegible] نہیں ہو سکے تھے ان کے متعلق ان سے خاص طور پر مشورہ کرنا تھا اور ان ک[illegible] کا پتہ چلانا تھا جن کی پروفیسر مختار الدین صاحب کو تلاش تھی اور جو ان [illegible] کام کے سلسلے میں بہت مفید اور ضروری تھیں، اسٹوری کا کمال انھوں [illegible] دیکھا کہ اگرچہ وہ ضعیف ہو چکے تھے صحت بھی بہت اچھی نہیں معلوم ہو[illegible] عربی کے کام سے ہٹ کر فارسی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور پرشین لٹریچر کی تا[illegible] میں بے حد منہمک تھے لیکن انھوں نے متعدد ایسے عربی مخطوطات کا انھیں [illegible] جو انڈیا آفس میں موجود تھے اور فہرست مطبوعہ میں ابھی شامل نہیں ہو[illegible] اور جن کے بارے میں لوگ لاعلم تھے۔ پروفیسر مختار الدین صاحب نے ا[illegible] تصنیف "کتاب الفاضل" کا خاص طور سے ذکر کیا جو ان کے لیے بہت م[illegible] ثابت ہوئی۔ تیس سال گزرنے کے بعد بھی اس کتاب کا کوئی اعلیٰ ایڈیشن تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔

اسٹوری سے گفتگو کے بعد مختار الدین صاحب کو ان کے تبحر علمی کا [illegible] ہوا اور وہ ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر واپس لوٹے کہ ایک طالب علم [illegible] انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود ایک پوری شام گزار دی۔ واپ[illegible] وقت جب ان کا شکریہ ادا کرنے لگے تو اسٹوری ان سے لپٹ گئے [illegible] بولے شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ تم آکسفورڈ سے یہاں ایک ا[illegible] ہوئے قصبہ میں مجھ سے ملنے آئے ہو اور تمہاری ملاقات سے ہندوس[illegible] اور خاص طور سے علی گڑھ کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اسٹوری ا[illegible] علی گڑھ میں گزارے ہوئے دنوں کا بہت محبت سے تذکرہ کرتے ر[illegible]

ان دوستوں کو یاد کرتے رہے جو ان کے علی گڑھ میں رفیق تھے ۔ مرحومین پر اظہارِ افسوس کرتے رہے اور جو ابھی تک علی گڑھ میں موجود تھے ان کی خیریت پوچھتے رہے ۔ خاص طور سے عبدالعزیز میمن صاحب اور بشیر الدین صاحب لائبریرین لائبریرین کے اخلاق کا ذکر کیا۔

شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر اکمل ایوبی نے مولانا روم اور قائم الانوار کے ترکی اشعار پر کام کیا' اشاعت کے بعد آف پرنٹس علی گڑھ سے تعلق کی بنیاد پر پروفیسر اسٹوری کو بھیجے ۔ اپنے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے اکمل صاحب کے کام کو سراہا اور اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں نہ صرف ترکی زبان و ادب کی تعلیم ہوتی ہے بلکہ اس پر تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے ۔

پروفیسر اسٹوری کے ہندوستانی شاگردوں میں ڈاکٹر عبدالمعید خاں صاحب کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جنھوں نے ان کی نگرانی میں کتاب التشبیہات ابن ابی العون البغدادی مرتب کی اور جس پر انھیں کیمبرج یونیورسٹی لنڈ اکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں گِب میموریل سیریز کی طرف سے شائع ہوئی ۔ ڈاکٹر خان بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر' اسلامک کلچر کے ایڈیٹر اور دائرۃ المعارف اسلامیہ حیدرآباد کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے ۔ موصوف کا علی گڑھ سے گہرا علمی تعلق اور یہاں کے مختلف شعبوں سے ان کے روابط اچھے ہیں ۔

پروفیسر اسٹوری ساری عمر غیر شادی شدہ رہے' وہ بڑے نرم مزاج خاموش طبع اور حساس تھے ۔ اپنے علمی مشاغل میں پوری طرح سے ڈوبے رہتے تھے ۔ بے حد شرمیلے تھے' لوگوں سے میل جول کم رکھتے تھے' یہی وجہ تھی کہ ان کا حلقۂ احباب بہت ہی مختصر تھا ۔ عمر کے آخری حصے میں زیادہ تنہائی پسند ہو گئے تھے' کسی بہت ہی ضروری کام سے یا کھانا کھانے کے لیے کسی قریبی ہوٹل میں چلے جاتے تھے ۔ لیکن ان سب کے باوجود اپنے شاگردوں سے یا جو لوگ ان سے اپنے علمی کاموں کے سلسلے میں ملتے تھے وہ ان کی پوری پذیرائی کرتے اور حتی المقدور ضروری مدد اور ہمت افزائی بھی کرتے ۔

پروفیسر اسٹوری کا انتقال ۲۴ر اپریل ۱۹۶۷ء میں اپنے گھر لارنس روڈ ہو (Lawrence Road Hove) انگلینڈ میں ہوا ۔ انتقال کے وقت انھوں نے سوائے چند معمولی چیزوں کے اپنی تمام جائداد' اپنا گھر اور سب سے زیادہ اہم اور ساری عمر کا قیمتی سرمایہ اپنی بہت ہی کارآمد اور شاندار لائبریری' فارسی ادب کے مخطوطات کا غیر مطبوعہ حصہ اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی اہم علمی و ادبی فائلیں اور اہم معلوماتی و تحقیقی کارڈ سب کچھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو دے دیے ۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن پر آئندہ بڑے علمی و تحقیقی کاموں کی بنیاد رکھی جا سکے گی ۔ سوسائٹی کے لیے یہ بڑا نادر اور بیش قیمت سرمایہ ہے ۔

ناموران علی گڑھ

کی

دوسری جلد

قیمت: بیس روپے

اس شمارے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ سر آغا خاں
۲۔ نواب مزمل اللہ خاں
۳۔ قاضی سید رضا حسین
۴۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی
۵۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
۶۔ خواجہ محمد یوسف
۷۔ خواجہ غلام الثقلین
۸۔ ڈاکٹر سید محمود
۹۔ مولوی محمد عزیز مرزا
۱۰۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد
۱۱۔ مولانا وحید الدین سلیم
۱۲۔ مولوی عبدالحق
۱۳۔ مولانا سید طفیل احمد منگلوری
۱۴۔ نواب محمد اسحٰق خاں
۱۵۔ سر محمد فیاض علی خاں بہادر
۱۶۔ سر شاہ سلیمان
۱۷۔ سر والٹر رالے
۱۸۔ مسٹر سڈنس
۱۹۔ بابو جادو چندر چکرورتی
۲۰۔ اولڈ ابیس
۲۱۔ پرنسپل جے۔ ایچ۔ ٹول
۲۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم
۲۳۔ سر راس مسعود
۲۴۔ مہاراجا محمد علی خاں
۲۵۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں
۲۶۔ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ
۲۷۔ جسٹس کرامت حسین
۲۸۔ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ
۲۹۔ سر رضا علی
۳۰۔ مولوی عنایت اللہ
۳۱۔ خاں بہادر مولوی بشیر الدین
۳۲۔ خاں بہادر مولوی حاجی حبیب اللہ خاں
۳۳۔ میر ولایت حسین
۳۴۔ مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی
۳۵۔ خوشی محمد ناظر
۳۶۔ نواب حمید اللہ خاں
۳۷۔ نواب سید محمد علی

رفیع احمد قدوائی

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

رفیع احمد قدوائی ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے جلیل القدر سپوتوں میں ہیں جنھوں نے اپنے عظیم ناقابل فراموش اور مہتم بالشان کارناموں سے نہ صرف سارے ملک میں ہر کہو مہ سے خراج تحسین وصول کیا اور زندۂ جاوید بن گئے بلکہ انھوں نے مادر علمی کی عظمت و وقار کو اپنے درخشاں اور ناقابل فراموش خدمات عالیہ سے نہ صرف بلند کیا بلکہ اس میں چار چاند لگا دیے اور یہ دکھا دیا کہ اس مادر علمی کے سپوت کس طرح سنگین سے سنگین مسئلہ اور عقدۂ لاینحل کو حل کر دیتے ہیں آج بھی مرحوم کے شاندار کارناموں اور بیش بہا خدمات کی وجہ سے ملک کے کروڑوں باشندوں کے دلوں میں ان کی یاد تازہ ہے۔ اور جب بھی ملک کسی بڑے مشکل اور نہ حل ہو سکنے والے معاملہ یا بحران سے دو چار ہوتا ہے تو مرحوم کا نام زبانوں پر بے ساختہ آتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اگر مرحوم اس وقت ہوتے تو یہ مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا۔

یہ عظیم شخصیت جسے دنیا رفیع احمد قدوائی کے نام سے جانتی ہے ہیولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں حاصل کی۔ چونکہ بوجہ سرکاری ملازمت ان کے والد شیخ امتیاز علی صاحب برابر تبادلے ہوتے رہتے تھے اور ان کی تعیناتی بارہ بنکی سے باہر ہوتی رہتی تھی اس لیے ان کے چچا ولایت علی صاحب جو بارہ بنکی میں وکالت کرتے تھے انھیں بارہ بنکی لے آئے اور انھیں کی نگرانی و تربیت میں بارہ بنکی گورنمنٹ ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔

ولایت علی صاحب ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے بڑے ممتاز و معروف اولڈ بوائے تھے اور مولانا محمد علی جوہر کے بڑے گہرے دوستوں اور بڑے معتمد لفٹننٹوں میں تھے اور وہ سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کا شمار بھی ان نوجوان مسلم لیڈروں میں تھا جنھیں علی گڑھ اسکول کی سیاست یعنی برطانوی

حکومت سے غیر مشروط وفاداری اور کانگریس کی مخالفت سے شدید اختلاف تھا۔ وہ مولانا محمد علی کے شہرۂ آفاق انگریزی ہفتہ وار کامریڈ میں بمبوق کے قلمی نا[م] سے گپ کا کالم لکھتے تھے اور ان طنزیہ تحریروں سے انگریزیا دیبوں سے خراج تحسین وصول کرتے۔

ولایت علی صاحب کے نہ صرف مولانا محمد علی بلکہ بہت سے ہندو مسلم لیڈروں سے گہرے مراسم تھے مثلاً ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت گوکرن ناتھ مصرا، چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بعد میں حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور جنھیں ناظر یار جنگ کا خطاب ملا ان کا گھر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان برادران وطن کے دوش بدوش انگریزی حکومت سے ہوم رول یا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کریں اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اس مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرے۔ ان کا مسلم لیگ ا[ور] کانگریس دونوں جماعتوں سے بڑا گہرا تعلق تھا اور دونوں جماعتوں کے سرگرم مم[بر] تھے اور ان کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے نہیں بلکہ انگریز دشمنی کی [...] سے ان کا بعض انقلاب پسندوں سے بھی تعلق تھا۔ ان سیاسی سرگرمیوں کی [...] سے وہ گورنمنٹ کی نظروں میں مشکوک تھے اور ان پر مستقل سی آئی ڈی نگاہ رکھی [...]

رفیع صاحب کی تعلیم و تربیت بمبوق صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔ ان[...] ان سے گہرا تعلق تھا۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ ان کے شفیق چچا تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ان کی شخصیت سے بے انتہا متاثر ہو گئے تھے اور ان کے خیالات کا ان پر بڑا گہرا اثر پڑا اور انھوں نے اپنی شخصیت کو بھی ان کی شخصیت کے سانچے میں ڈھالا۔ طالب علمی ہی کے اثر سے وہ بھی اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ سے بڑے سرگرم [...]

ہو گئے۔ اور ان میں انگریز دشمنی رچ بس گئی وہ ان کے سیاسی خیالات کے نہ صرف پورے طور سے مؤید ہو گئے بلکہ ان کے چچا ان کے رہنما بھی تھے۔

رفیع صاحب نے ۱۹۱۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کر لیا تو بھوق نے انھیں اپنے مادرِ علمی یعنی ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں پڑھنے بھیجا۔ رفیع صاحب ذہین طالب علم تھے لیکن انھیں پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپی کالج کی یونین کی سرگرمیوں سے تھی۔ جب تک وہ کالج کے طالب علم رہے انھوں نے اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن ان سرگرمیوں کا تعلق تقریروں یا مباحثوں سے نہ تھا کیونکہ وہ تقریر یا خطابت کے مردِ میدان نہ تھے ان کا خاص میدان یونین کا الکشن تھا۔ ان کے دورانِ قیام علی گڑھ میں یونین کا کوئی الیکشن نہ تھا جس میں رفیع صاحب نے اپنے امیدوار نہ کھڑے کیے ہوں اور یہ ان کی زبردست تنظیمی صلاحیت تھی کہ تقریباً ہر الیکشن میں ان کے امیدوار کامیاب ہوئے۔

اپنے امیدواروں کو کھڑا کرتے وقت وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ یہ امیدوار اپنے خیالات میں بے باک اور جری ہو اس سے بڑھ کر ان کا معیارِ انتخاب یہ تھا کہ یہ امیدوار کس حد تک اور کہاں تک برطانوی حکومت کا مخالف ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے ہی امیدواروں کو کھڑا کیا جو خیالات کے اعتبار سے پختہ نیشنلسٹ اور اینٹی برٹش تھے۔

ان کے کالج کے ہم عصروں، دوستوں، کلاس فیلوز اور ہوسٹل فیلوز کے خاص حضرات میں حیدرآباد کے احمد محی الدین صاحب جو حکومتِ ہند کے وزارتِ ہوابازی کے وزیرِ مملکت رہے میر اکبر علی خاں صاحب سابق گورنر اترپردیش و اڑیسہ سید احمد صاحب سابق ممبر راجیہ سبھا، الحاج مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سابق ٹریژرار مسلم یونیورسٹی و حال جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ٹینس کے عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی احمد حسین، سبحان انصاری گورکھپوری جو ۱۹۳۷ء میں یو۔پی۔ کی پہلی کانگریسی وزارت میں پارلیمنٹری سکریٹری ہوئے، بڑے گاؤں کے رہنے والے اور رفیع صاحب کے عزیز دہلی کے مشہور کانگریسی لیڈر شفیق الرحمٰن قدوائی جو ۱۹۵۲ء کی دہلی کی پہلی وزارت میں وزیرِ تعلیم تھے اور سعید الرحمٰن صاحب قدوائی تھے۔ ان سب حضرات نے کسی نہ کسی شعبۂ زندگی میں شہرت حاصل کی۔

رفیع صاحب کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور ساتھیوں کی ہر قسم کی مدد کرتے تھے خاص کر مالی۔ ان کا سارا روپیہ دوستوں کی ضرورتوں پر یعنی ان کے کالج کی واجبات کی ادائیگی میں ان کی کتابوں کے خریدنے پر ان کے علاج معالجہ پر دواؤں اور مختلف ضروریات پر خرچ ہوتا تھا۔ رفیع صاحب کے پاس جب روپیہ نہیں ہوتا تھا اور کسی دوست کو کوئی ضرورت شدید لاحق ہوتی تھی تو وہ اپنے چچا صاحب سے بذریعہ تار روپیہ منگوا لیتے تھے یہ کہہ کر کوئی نہ کوئی شدید ضرورت ظاہر کرکے منگواتے۔ شفیق چچا کو بھتیجہ کی یہ شاہ خرچی ناگوار ہوتی چنانچہ انھوں نے ناگواری کے خط لکھے اور جب وہ چھٹیوں میں بارہ بنکی جاتے تو ان کے چچا ان کو سختی سے ڈانٹتے لیکن وہ ساری ڈانٹ ڈپٹ خاموشی سے سن لیتے اور انھوں نے کبھی بھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا کہ وہ ان سے منگوائی رقم اپنے دوستوں کی مدد یا ان کی ضرورتیں پوری کرنے پر صرف کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ سے انھوں نے دوسروں کی مدد کرنا ہمیشہ فریضہ خصوصی سمجھا۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی دوست نوازی اور اس کے طالب علموں کی عدیم المثال باہمی محبت اور برادرانہ جذبہ نے مرحوم کی اس صفت کو بہت زیادہ جلا دی۔

اپنے دوستوں کے ساتھ وہ سیر و تفریح کے لیے دہلی جایا کرتے اور اس سفر میں اپنے دوستوں کے سارے مصارف اپنے ذمہ لے لیتے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ احمد حسن صاحب کے ساتھ دلی گئے قیام ایک ہوٹل میں کیا سارا روپیہ خرچ ہو گیا۔ احمد صاحب بہت پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا؟ علی گڑھ کیسے واپس جائیں گے؟ لیکن رفیع صاحب مطلق پریشان نہ ہوئے اور انھوں نے ہوٹل کے منیجر کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان دونوں کو علی گڑھ جانے کے لیے روپے دے۔۔ وہ علی گڑھ پہنچ کر بھیج دیں گے۔ رفیع صاحب اپنے چچا کے سیاسی خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے اور وہ انگریزی حکومت کے بہت زیادہ مخالف تھے اور ان کی دوستی ایسے ہی طالب علموں سے تھی جو پختہ نیشنلسٹ اور انتہائی برطانیہ دشمن تھے وہ ان اخبارات کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے جو آزاد خیالی اور حکومت کی مخالفت میں بڑے ممتاز تھے اور جو اس زمانہ میں چلتے ہوئے انتہاپسند سیاسی نصب العین یعنی ہوم رول کے علمبردار تھے۔ مولانا محمد علی کا شہرۂ آفاق انگریزی ہفتہ وار کامریڈ اور مسز اینی بسنٹ کے اخبار "کامن ویل" اور ہمدرد، انڈیا اور کامریڈ کے بند ہونے کے بعد نیو ایرا جو کامریڈ کے سب ایڈیٹر ماجد غلام حسین کی ادارت میں شائع ہوتا تھا ان کے محبوب اور پسندیدہ اخبار تھے۔

ان کا کمرہ کالج کے ان تمام طالب علموں کا مرکز تھا جو انگریز دشمنی اور حکومت کے شدید مخالف ہونے کی وجہ سے بڑے شوریدہ سر اور خطرناک سمجھے جاتے تھے رفیع صاحب اس گروپ کے لیڈر تھے۔ اس طرح ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں آزادی کا علم بلند کیا۔

وہ تقریر یا خطابت کے مرد میدان نہ تھے اور نہ پڑھائی لکھائی میں ممتاز تھے بس امتحان کے قریب رات دن محنت کرکے پاس ہو جاتے تھے۔ وہ بڑی خاموشی و استقلال سے اپنا کام کرتے تھے ان کا سب سے بڑا امتیازی وصف ان کی بے پناہ تنظیمی صلاحیت تھی اور اس کے ساتھ وہ زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ دشواریوں یا مشکلات سے وہ گھبراتے نہ تھے اور بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا خندہ پیشانی سے کرتے تھے ان کے ان اوصاف کو ایم اے او کالج کی تربیت نے اور جلا دی۔

وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں فوڈ مانیٹر بھی ہوگئے اور ان کی کوششوں سے کھانا بہت اچھا ہونے لگا اس سے ان کی دھوم مچ گئی اور اس سے ان کی ہر دل عزیزی میں اور زیادہ اضافہ ہوا اور انھوں نے اس خیال کو غلط ثابت کیا کہ ڈائننگ ہال کا وہی نحوہ رہے گا اور اس میں کسی بھی قسم کی کوئی اصلاح یا بہتری ممکن نہیں۔ کیا معلوم تھا کہ ڈائننگ ہال کا مسئلہ حل کرنے والا کالج کا یہ [illegible] بہت آزاد جمہوریہ ہند کے غذائی مسئلہ کو اس طرح حل کر دے گا کہ اس کا نام [illegible] زندہ رہے گا۔ اردو کے مایہ ناز ادیب جلیل القدر انشاپرداز اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کے لفظوں میں انھوں نے ہندوستان کے ایک پیچیدہ ترین مسئلہ رزق کو جس طرح حل کر دکھایا اور رزاق مطلق کے نائب کی جو تجلی اس عالم ناسوت میں دکھا دی اس لحاظ سے اگر انھیں میکائیل ہند کہا جائے تو بجا ہے۔ مرحوم کو جو مقام رفیع ملک کی تاریخ میں حاصل ہے اس میں بہت کچھ دخل ایم اے او کالج کی تربیت کو بھی ہے۔

"ہر قوم کی زندگی میں مدوجزر کے دور آتے رہتے ہیں مگر جب
تک اس کے اندر قوت حیات کے سوتے بالکل خشک نہیں ہوتے ہیں، ہر
جزر مد کا، ہر زوال عروج کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ انیسویں صدی
کے نصف آخر میں جب عام طور سے ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کی
ذہنی، معاشرتی اور اخلاق پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور زندگی کا دھارا
سکڑتا چلا جاتا تھا، یکایک تہ کے اندر سے نئی لہریں ابھرنے لگیں جنھوں
نے اسے پھر سے بڑھا کر اچھا خاصا دریا بنا دیا۔ مسلمانوں میں زندگی کی نئی
رو سید احمد خاں اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کی اپچ سے اٹھی اور جس
قدر پھیل سکتی تھی پھیلی۔"

ڈاکٹر، سید عابد حسین

پروفیسر رشید احمد صدّیقی

مالک رام

حضرت آپ کا سال ولادت کیا ہے؟ کوئی ۱۸۹۸ء لکھتا ہے، کوئی ۱۸۹۶ء کوئی ۱۸۹۴ء اور ایک صاحب نے ۱۸۹۲ء بھی لکھا ہے۔ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟

"۱۸۹۲ء"

"مہینہ "

"دسمبر "

"تاریخ "

"۲۴ "

"سبحان اللہ آپ تو حضرت یسوع مسیح سے بھی ایک دن پہلے پیدا ہوئے"

چونکہ یہ فقرہ ان کے مذاق کے مطابق تھا، اس پر انہوں نے مسرت کا اظہار کیا اور مخصوص انداز میں کھل کر مسکرا دیے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ گفتگو میرے اور رشید احمد صدیقی مدظلہ کے درمیان ہوئی تھی یہ ۱۹۶۶ء کی بات تھی مہینہ غالباً مئی کا تھا۔

تو یہ طے ہو گیا کہ قبلہ رشید احمد صدیقی کی تاریخ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء ہے۔ اس کے بہت دن بعد انہوں نے پھر ایک مرتبہ بتایا کہ انہیں اپنے پرانے کاغذوں میں ایک عزیز کی کوئی پرانی یادداشت ملی تھی، اس میں بھی یہی تاریخ ولادت درج تھی۔

مشرقی اتر پردیش کے ضلع جون پور کا ایک قصبہ منڈیاہو ہے۔ یہ جون پور سے ۱۷ میل دور ہے اور تحصیل کا صدر مقام بھی۔ حضرت پیر ذکریا دادا کا مزار یہاں کا بہت مشہور تاریخی مقام ہے۔ اب تو تعلیم کا رواج عام ہو گیا، اور لوگ خاص کر تعلیم یافتہ لوگ، ہر ایک چیز کے انکار اور روایات شکنی ہی کو روشن خیالی کی دلیل سمجھنے لگے ہیں۔ پہلے منڈیاہوں میں شادی بیاہ کے موقع پر یہ رواج تھا کہ دولہا پہلے اس مزار پر سلام کے لیے حاضری دیتا۔ سلام پیش کر کے نذر پیش کرتا، اس کے بعد بارات روانہ ہوتی۔ ان بزرگ کے اخلاف جس محلے میں مقیم ہیں وہ آج بھی محلہ پیر ذکریا کہلاتا ہے۔

یہی حضرت پیر ذکریا ہمارے رشید صاحب کے جد اعلیٰ تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ سترہویں صدی عیسوی میں تبلیغ دین کی غرض سے ترکستان سے ہندوستان آئے تھے پہلے چند سے پنجاب میں قیام کیا جب وہاں کے حالات نے مجبور کیا، تو دلی اور الہ آباد ٹھہرتے ہوئے جون پور پہنچ گئے اور بالآخر منڈیاہوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد حکومت وقت کی ملازمت میں داخل ہو گئی۔ اور بیشتر نے فوج سپہگری کے پیشے کو ترجیح دی۔ انہیں میں رشید صاحب کے اسلاف بھی تھے۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے والد جناب عبدالقدیر صاحب پولیس کے محکمہ میں ملازم تھے۔ وہ مدتوں بلیا اور غازی پور، جون پور کے اضلاع میں تھانیدار رہے۔ قیام جون پور کے آخری زمانے میں وہ کوتوال شہر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ پولیس کا محکمہ اپنی سخت گیری اور بدعنوانیوں کے لیے مشہور رہا ہے اور آج تک بجا طور پر بدنام ہے، لیکن عبدالقدیر صاحب کی نیکی اور دینداری کا شہرہ تھا۔ یہ صوم و صلوٰۃ کے

پابند، اور مشہور زمانہ صوفی حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (ف ستمبر ۱۸۹۰ء) کے مرید تھے۔ اسی سے ان کے رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

عبدالقدیر صاحب کا نکاح مچھروئی (ضلع بنارس) کے سید باسط علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ ان کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں سائرہ، طاہرہ، آمنہ، عبدالصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی، نذیر احمد صدیقی۔

جناب عبدالقدیر اپنی ملازمت کے سلسلے میں بیریا (ضلع بلیا) میں تعینات تھے۔ جب خدا نے انہیں دوسرا بیٹا دیا جس کا نام انہوں نے رشید احمد رکھا، یہی ہمارے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ ان سے بڑے بھائی عبدالصمد وکیل تھے، ان کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے جناب نیاز احمد صدیقی ابھی حال تک محمد حسن کالج جون پور کے پرنسپل تھے، بفضلہ حیات ہیں۔ سب سے چھوٹے نذیر احمد کم عمری ہی میں رحلت کر گئے تھے۔

رشید احمد صدیقی صاحب اپنے بچپن میں بہت کمزور اور نحیف الجثہ تھے۔ مدتوں مختلف عوارض کا شکار رہے۔ طرح طرح کے علاج معالجے اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ لیکن ان کی علالت کا سلسلہ بہت دن تک چلا۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی دیر میں شروع ہوئی کیونکہ اندیشہ تھا کہ جسمانی کمزوری کے باعث یہ ذہنی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔ جیسا کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے شریف گھرانوں کا دستور تھا ان کی تعلیم بھی گھر ہی پر اور وہ بھی دینیات اور عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ اسی دور میں انہوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی کچھ کتابیں عربی کے چند رسالے، دینیات کے کچھ اسباق اور قرآن شریف پڑھا۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے، تو اردو اور حساب، پہاڑے وغیرہ سیکھنے کو مقامی پرائمری اسکول میں چلے جاتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس اسکول میں جو مدرس انہیں اردو پڑھاتے تھے، وہ خود اردو سے نابلد تھے، اردو میں ان کی ساری کائنات دستخط کر لینے تک محدود تھی۔ اگرچہ ان مدرس کو پڑھنے سے کچھ تعلق تھا، نہ پڑھانے سے، اور مذہباً بھی وہ کٹر قسم کے برہمن تھے، لیکن بحیثیت انسان بہت بلند تھے، شریف النفس اور خادمِ خلق

اور ہمدرد۔ جب وہاں طاعون کا موسم آتا اور یہ ہر سال تو مدرسہ اپنی عمارت سے اٹھ کر گاؤں کے مندر میں منتقل ہو صاحب کی روزانہ کی صحبت اور سال بہ سال اس مندر میں م کرنے۔ بلکہ مندر کے چھوٹے موٹے کام بھی سرانجام دینے کا نتیج رشید صاحب کے دل میں ہندو دھرم، بلکہ تمام دوسرے مذا لیے رواداری کے جذبات پیدا ہوگئے اور خوشگوار لینت اور اور بردباری ان کے مزاج کے گویا اجزائے ترکیبی بن گئے۔

پرائمری اسکول سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور بھیجا گیا۔ یہاں سے انہوں نے میں دسویں درجہ کی سند حاصل کی اور یہ سند تو انہوں نے جو حاصل کر لی، لیکن ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جہاں اور تمام مض ان کا نتیجہ ہمیشہ اچھا رہا، ریاضی میں یہ ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ ش وجہ یہ ہے کہ انہیں ریاضی اور حساب کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں، غرض اب سوال تھا آئندہ کا لیکن چونکہ یہ جون پور کا تشکیل ان کی بقیہ زندگی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کے اثرات و نتائج سے متعلق چند لفظ لکھنا بے محل نہ ہوگا۔

جون پور کو "شیراز ہند" کہا گیا ہے اور واقعی وہ اس نام تھا۔ شاہان شرقی کے عہد میں اس نے مختلف علوم و فنون میں جو ترقی کی، اس کے آثار آج تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ حکومت وقت کی نگرانی جون پور میں یگانۂ روزگار علماء و فضلاء کو جمع کر دیا تھا۔ وہ آئے ا انہوں نے مدارس اور مکاتب کھول دیے۔ رشد و ہدایت کی مجل قائم کر دیں، اور یوں ہر طرف علم اور اس کی شاخوں کا چرچا عا ہوگیا۔

حکومت نے شہر کی ظاہری تزئین و تہذیب پر بھی خاص توجہ کی۔ عالی شان عمارات، مساجد، مقابر، سرائیں جو اس زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں سے بیسیوں کی باقیات آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ سطوت و جلال ماضی کے یہ سب آثار رشید احمد صدیقی نے دیکھے ان کا اپنا خاندان بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کی ابتدائی اور گھریلو تعلیم بھی بیشتر مذہبی نوعیت کی تھی۔

طبیعت بھی حساس اور دردمند اور غور و فکر کی عادی تھی
ں پر جون پور میں جن ساتھیوں سے اور ان کے واسطے ان کے
لوں سے تعلق پیدا ہوا وہ بھی اسی کاروانِ رفتہ کی یادگار تھے۔ جاگیر
، نظام میں لوگ لاکھ کیڑے ڈالیں، لیکن اس کی خوبیوں سے چشم
، کرنا بھی قرینِ انصاف نہیں۔ ادب آداب کی پابندی، رکھ رکھاؤ کے
نہ، بزرگوں کی شفقت اور ان کا خوردوں سے محبت سے پیش آنا،
ں دور کا مابہ الامتیاز تھا۔

جون پور میں بیشتر گھرانے شیعہ عقائد کے تھے، رشید صاحب کے
نہ پڑھنے والے ان ہی خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ساتھ ان
مروں پر جانے ان سے محبت اور شفقت کا سلوک تو ہونا ہی چاہئے
اس کے ساتھ وہاں انہیں شعرا کا کلام، مرثیے اور سوز اور سلام سننے
پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس سے گویا ان کی اردو دوستی کی بنیاد پڑی اور
رادیب بننے کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ وسطِ شہر میں دریائے
ں بہتا ہے۔ اس کے کنارے ایک دومنزلہ عمارت میں ایک اچھا خاصا
ب خانہ تھا۔ رشید صاحب باقاعدگی سے اس کتاب خانہ میں جاتے
گھنٹوں وہاں بیٹھتے۔ اور اردو انگریزی کے ناول وہاں پڑھا کرتے۔
، رہی سہی کسر اس مطالعے نے پوری کر دی اور وہ اردو ادب کے خاصے
ے حصے سے واقف ہو گئے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب سے بے تکلفانہ ملنے کا موقع ملا ہے۔
ضرور جانتے ہوں گے کہ معنوی پہلو سے ان کے شوق و شغف کے
موضوع تین رہے ہیں: اسلامیت، پرانی اقدار و تہذیب، اردو اور اگر
ر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد ان کے قیام
ن پور کے زمانے میں پڑی تھی۔ بعد کو وسیع ذاتی مطالعے اور دوست
باب سے تبادلۂ خیالات، نیز تہذیب کے انحطاط اور نئی نسل
خلاق باختگی کے نظارے سے ان میں ان موضوعات کے زمانہ
ں سے تقابل اور ان کے بارے میں غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی
ن جون پور کے یہ تین چار سال ان کی زندگی اور ذہنی نشوونما کے
ملے کے لیے بہت اہم زمانہ ہے۔
جون پور گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد

اب مستقبل کا مسئلہ درپیش تھا۔ گھر کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں رہی تھی
کہ ان کی کالج کی تعلیم کا بار برداشت کر سکتی۔ مجبوراً نوکری کرنا پڑی۔
خوش قسمتی یہ تھی کہ اس کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑا وہیں جون پور کی عدالت
دیوانی میں کلرک مقرر ہو گئے۔ یہ ملازمت عارضی تھی اور مشاہرہ پندرہ
بیس روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ اگرچہ سب لوگ ان کے ملازم اور گھر کا
کماؤ فرد بن جانے پر مطمئن اور خوش تھے، لیکن رشید صاحب اس سے
سخت بیزار تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر سال بھر بعد
وہ رسی تڑا کر بھاگ نکلے۔ اور علی گڑھ آکر دم لیا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔
اسکول کے زمانے میں انہیں کھیل کود کا چسکا تھا۔ کرکٹ ہاکی اور
فٹ بال ان کے دل پسند کھیل تھے اور وہ اپنے اسکول کی ان تینوں
ٹیموں کے کپتان تھے۔ علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کھیل کود
پر خاص توجہ تھی۔ اور یہاں کے طلبا کی اس میدان میں دور دور
شہرت تھی۔ جیسا کہ خود انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے، رشید صاحب
دراصل علی گڑھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے تھے۔ جتنا یہاں کے
کھیل کا چرچا سن کر۔ لیکن یہاں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا۔ اس
زمانے میں یہاں ان کھیلوں کے کھلاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور کالج
میں ان کا ایک سے ایک اچھا کھیلنے والا موجود تھا۔ ناچار انہوں نے
ٹینس پر توجہ کی اور رفتہ رفتہ اس میں بھی بہت اچھی مہارت پیدا
کر لی۔ کھیلوں میں انہیں برج کا بھی شوق رہا ہے۔
علی گڑھ کالج میں وہ چھ برس پڑھے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک۔ ۱۹۱۹ء
میں بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے۔ اس زمانے میں یہ کالج الہ آباد سے
ملحق تھا اور یہاں کے طلبا کو وہیں کا نصاب پڑھایا جاتا اور وہیں جا کر
امتحان دینا پڑتا تھا۔ رشید صاحب نے بھی یہ امتحان الہ آباد یونیورسٹی
سے پاس کیے تھے
طالب علمی کا دور مالی پہلو سے بہت پریشان کن رہا۔ والد پنشن
پر ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، اور ان کی پنشن ایک بڑے کنبے
کی ذمہ داریوں کے ساتھ، ان کی تعلیم کے مصارف بھی برداشت کرنے
سے قاصر تھی۔ اس کا حل رشید صاحب نے یہ نکالا کہ ہر سال گرمی کی
تعطیلات میں اتنا کما لاتے کہ تنگی ترشی سے سال بھر کے خرچ کے لیے کفایت

کرتا۔ کالج میں ۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر تک تین مہینے گرمی کی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ ان ایام میں بنارس جاتے اور وہاں دیوانی کی کشتی عدالتوں میں کلرکی کرتے۔ ان کا کام بیشتر مسلوں کی نقل کرنا تھا۔ یہ اسی زمانے کی مشق کا نتیجہ تھا کہ رشید صاحب زود نویس بھی ہو گئے اور خوشخط بھی۔ یہ "مشقت" پانچ برس تک جاری رہی۔ جس صبر و شکر سے انہوں نے یہ زمانہ بسر کیا اور جس آن بان سے انہوں نے ہم چشموں میں اپنا سر اونچا رکھا، وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج محض ایک درسگاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تہذیبی ادارہ، ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنگ میل اور ہندوستانی مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہاں ملک کے ہر گوشے سے نونہالان قوم جمع ہوتے اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے تیاری کرتے۔ رشید صاحب جب یہاں پہنچے تو قدرتی طور پر وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصہ بن گئے۔ حسن اتفاق سے ان کی اس سے پہلے کی ساری تعلیم و تربیت نہ صرف علی گڑھ کی روایات کی منافی نہیں تھی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ معراج ہونا ہی علی گڑھ چاہئے تھا

علی گڑھ میں رشید صاحب کے حلقۂ احباب میں اقبال احمد خاں سہیل (ف ۱۹۵۵ء) بھی تھے۔ سہیل صاحب اردو فارسی کے فاضل اور برگزیدہ شاعر اور غیر معمولی طور پر ذہین اور فطین شخص تھے۔ رشید صاحب اور سہیل مرحوم کا تقریباً چار سال تک ساتھ رہا۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا، رہن سہن ایسا کہ من تو شدم تو من شدی کا مضمون ہو گیا۔ بلا خوف تردید و شبہہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب کی تصنیفی صلاحیتوں کے ابھارنے اور اجاگر کرنے اور بڑھانے میں سہیل مرحوم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ رشید صاحب اپنے جون پور کے زمانۂ طالب علمی ہی میں نثر لکھنے لگے تھے۔ شاید نذیر غازی پوری اسی زمانے کے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے نوجوان رشید صاحب کی رہنمائی کی۔ اور انہیں ادب میں راہ راست پر لگا دیا۔ علی گڑھ آئے تو یہاں سہیل نے انہیں اس اسلوب تحریر کی راہ دکھائی، جس کے لیے وہ ازل سے منسوب ہو چکے تھے یعنی طنز و مزاح کا اسلوب۔

رشید صاحب پہلے کالج کے سکتر مقرر ہوئے اور پھر علی گڑھ منتھلی" (کالج کا سرکاری جریدہ) کے مدیر۔ یہ ماہانہ دو زبانوں (انگریزی اور اردو) میں شائع ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے کہنے پر اس کا نام بدل کر "میگزین" رکھا گیا۔ ان سے پہلے دونوں حصوں کے مدیر الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ انگریزی اور اردو دونوں کی ادارت ایک ہی شخص اور وہ بھی ایک طالب علم (رشید صاحب) کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب دونوں حصوں کے مضمون لکھا کرتے اردو میں اپنے نام سے اور انگریزی میں بوہیمین (آوارہ گرد) کے نام سے۔ سہیل ہی نے انہیں سب سے پہلے طنزیہ مضامین لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں علی گڑھ میں ان کا قیام "مچھی بارک" نامی ہوسٹل میں تھا۔ رشید صاحب نے اس سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین "مرگل" کے عنوان سے لکھا۔ یہی مضمون ان کے طنز و مزاح کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔

کالج میں ایک ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن القرض) قائم تھی اسے سر سید کی زندگی ہی میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (ف جنوری ۱۹۳۰ء) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں (۱۸۹۰ء) شروع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد کالج کے نادار لیکن ہونہار طلباء کی مالی امداد کے لیے مستقل سرمایہ جمع کرنا تھا۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ جو وفود روپیہ جمع کرنے کو بھیجے جائیں وہ کالج کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔ رشید صاحب اس انجمن کے ممتاز رکن تھے۔ اس انجمن کے وفود ہر سال چھٹیوں کے ایام میں ملک کا دورہ کرتے تھے۔ وہ چندہ بھی جمع کرتے اور تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعہ سے کالج کے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ رشید صاحب نے انجمن کے ۱۹۱۷ء کے وفد کے ساتھ شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ برما میں بھی موٹر کا سفر کیا۔ واپسی پر انہوں نے "سیاحت برما" کے عنوان سے چند مضامین لکھے، جو میگزین میں شائع ہوئے تھے۔

ڈیوٹی سوسائٹی کی خط و کتابت بھی بہت حد تک رشید صاحب کے سپرد تھی۔ نیز مختلف مباحث اور موضوعات پر مضامین اور خطبے اور کتابچے بھی لکھنا پڑتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے انہیں کتنا فائدہ پہنچا۔۔۔ اور ان کی تحریر اور اسلوب میں کیسے پختگی پیدا ہو گئی۔

کالج کے زمانۂ طالب علمی میں ایک اور بات نے ان کی مدد کی۔ ان کے انگریزی کے مدرس انعام اللہ خاں صاحب۔ وہ اپنے عہد کے بہت ممتاز اور ماہر انگریزی داں سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انگریزی ایسی مرصع اور مسجع اور ثقیل بولتے تھے کہ سننے والوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ رشید صاحب انعام اللہ خاں کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بیشتر انگریزی مضامین کا ترجمہ اردو میں انہیں کا کیا ہوا ہے۔

۱۹۲۱ء میں انہوں نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دسمبر ۱۹۲۱ء میں عارضی طور پر صرف تین مہینے کے لیے اردو پڑھانے کے لیے مقرر ہو گئے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں اردو "مولوی کہلاتا تھا" اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ جگہ مستقل نہیں تھی۔ اور معلوم نہیں تھا کہ اصحاب مجاز کس دن کس بات سے ناراض ہو کر نکال باہر کر دیں اس کے بعد جب یونیورسٹی بنی اور اس میں اردو لیکچرر کی جگہ نکلی، تو انہوں نے بھی درخواست دی۔ بعض اصحاب نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح کے اعتراض کیے۔ ان کے اس مستقل اسامی پر تقرر کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی۔ اس پر اتمام حجت کے لیے انہوں نے مقالہ "طنزیات و مضحکات"، لکھا جو پہلے ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد کے سہ ماہی رسالے "ہندوستانی" میں بالاقساط چھپا اور پھر کتابی شکل میں بھی وہیں سے شائع ہوا۔ خیر قرعۂ فال ان کے نام پڑا۔ اور یہ عارضی طور پر مقرر ہو گئے۔ بڑے جوڑ توڑ اور سفارشوں کے بعد کہیں ۱۹۲۶ء میں وہ مستقل لیکچرر (مدرس) مقرر ہوئے۔ منجملہ اور اصحاب کے علامہ اقبال نے بھی ان کی سفارش کی تھی۔ نو سال بعد ترقی ملی اور ریڈر ہوئے، اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر جو کسی یونیورسٹی میں گویا نقطۂ معراج ہے۔ یہیں سے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے جب سے آخر زمانے تک علی گڑھ میں مقیم رہے جہاں انہوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے بھی۔ جو ان سے تین برس پہلے ۱۹۱۲ء میں کالج میں آ چکے تھے۔ بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اس بات پر افسوس کیا کرتے تھے کہ اردو میں معیاری رسالے ناپید ہیں اور پھر خود ایک بہترین رسالہ جاری کرنے کی اسکیم مرتب کرتے۔ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس کا نام "شمع" ہو یا "سہیل" کہ دونوں میں روشنی کا تصور ہے۔ اور نہ صرف خود روشن ہیں، بلکہ اپنے چاروں طرف نور کی بارش کر دیتے ہیں۔ اسی سے خیال کیجیے کہ ان کے نزدیک پرچے کا معیار اور مقصد کتنا بلند تھا تو خیر۔ ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ اور پروفیسر محمد حبیب مرحوم (ف جون ۱۹۷۱ء) نے بعض اصحاب کے تعاون سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا نام "شمع" رکھ دیا۔ رشید صاحب نے سنا تو افسوس کیا کہ دو ناموں میں سے کسی ایک کے انتخاب کرنے میں جو لذت تھی، وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ لیکن انہیں اطمینان تھا کہ خیر سہیل تو ہے ہی، جب پرچہ جاری کریں گے اس کا یہ نام رکھ لیں گے۔ اس زمانے میں سجاد حیدر یلدرم (ف اپریل ۱۹۴۳) یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ ایک دن رشید صاحب ان سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ اردو میں اچھے پرچے کم ہیں، ایک پرچہ "سہیل" کے نام سے نکالنے کا خیال ہے، تو یلدرم مرحوم نے کہا کہ ہاں یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے۔" رشید صاحب یہ سن کر گھبرائے کہ شمع تو ہاتھ سے گیا ہی تھا، اگر یلدرم نے "سہیل" پر بھی ہاتھ صاف کر دیا تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔

ذاکر صاحب بھی یورپ میں ہیں ان سے کسی اور نام کے لیے مشورہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ عنقریب سہ ماہی "سہیل" شائع ہونے والا ہے۔ سہیل انجمن اردوئے معلیٰ، مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی آرگن کی شکل میں ۱۹۲۶ء کے آغاز میں جاری ہوا۔ لیکن آج تک کوئی اچھا پرچہ الا ماشاءاللہ اردو دانوں اور اردو حلقوں کو راس نہیں آیا۔ نہ ان کا تعاون ہی حاصل ہوا۔ یہی حشر "سہیل" کا بھی ہوا۔ سب نے اس کے مضامین کے بلند معیار، اعلیٰ کتابت و طباعت دیدہ زیب شکل و صورت کی تعریف کی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے صرف چھ شمارے شائع ہوئے اور وسط ۱۹۲۷ء میں اس نے مالی مشکلات کے باعث دم توڑ دیا۔

رشید صاحب نے اس پر بھی ہار نہیں مانی۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں انہوں نے پھر اسے جاری کیا۔ اب اعلان کیا کہ یہ ہر سال کے آخر میں یعنی دسمبر میں ایک مرتبہ شائع ہوگا۔ لیکن افسوس کہ دسمبر ۱۹۳۵ء کا

پیشمارہ اس نئے سلسلے کا بھی اکلوتا پرچہ ثابت ہوا۔

رشید صاحب ۔ بجا طور پر اردو ادب کے مسلم اور مایہ ناز نثر نگار اور طنز و مزاح کے منفرد مصنف تھے۔ انہوں نے اپنے بیشتر مداحوں اور پڑھنے والوں کو خوش وقت کیا ۔ ان کی زندگی کی اداس اور بے کیف گھڑیوں کو مسرت و انبساط سے رنگین کیا ۔ وہ خود بہت کم آمیز اور کم سخن ہیں۔ لیکن انہوں نے دوسروں کو آپس میں ملنے جلنے کا سلیقہ اور شائستہ بات چیت کرنے کا ہنر سکھایا۔ یوں اگر ان کی طویل تصنیفی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے اگر آپ وسیع و عریض کھارے سمندر کو متھ کر اس میں سے خالص شیریں امرت کا ایک گھونٹ بھی پیدا کر لو تو اس کی ابدی کیفیت پر سمندر کی ناپیدا کنار کمیت سو مرتبہ قربان کی جا سکتی ہے۔ یہی مثال رشید صاحب کی نگارشات پر صادق آتی ہے۔

ان کی ادبی فتوحات کی جو پذیرائی اور قدر، اور خود اس ملک کے اہل علم و فن طبقے نے جو محبت کی ہے، اس کی آواز بازگشت "پدم شری" کا وہ اعزاز ہے، جس سے حکومت ہند نے انہیں یوم جمہوریہ ۱۹۶۳ء کے موقع پر نوازا تھا۔ ۱۵ر جنوری کو وہ اس دنیا سے گذر گئے۔

کے۔ ایم۔ سردار پانیکر

پروفیسر محبّ الحسن

مادھوا کو الم پانیکر کوالم کے گاؤں میں جو کیرالہ کے امبلاپورہ تعلق میں واقع ہے ۳ر جون ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اس علاقہ میں معزز سمجھا جاتا تھا اور گاؤں میں صدیوں سے مدرس زیادہ تر اسی خاندان سے ہوتے تھے۔ کیرالہ میں اس وقت مادری نظام مروّج تھا اس وجہ سے پانیکر کی پرورش ان کے ماموں کے گھر ہوئی اور ان کی شروع کی تعلیم اسکول میں ہوئی اور ان کے منجھلے ماموں نے بھی دی۔ چونکہ یہ ناکافی تھی وہ اپنے سب سے چھوٹے ماموں کے پاس تریوندرم بھیج دیے گئے، وہاں پنجم کلاس تک پڑھا۔ اس کے بعد کوٹایم کے ایک اسکول میں دو برس تک پڑھا اور میٹرک کا امتحان دیا۔ لیکن اس میں فیل ہو گئے۔ پھر میٹرک کا امتحان مدراس میں جاکر دیا اور پاس ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ چرچ کالج میں داخل ہوئے اور تاریخ کے مضمون میں ۱۹۱۷ء میں فرسٹ ڈویژن سے آنرس کیا۔ یہ بڑی کامیابی تھی اس لیے کہ اوّل درجہ بہت کم ہندوستانی حاصل کر پاتے تھے پانیکر نے دوران تعلیم میں انگریزی رسائل اور ہندوستانی اخباروں میں مضامین لکھنے شروع کر دیے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مجلس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کو مولانا محمد علی نے اپنے زمانۂ تعلیم میں قائم کیا تھا اور یہ ہندوستانی قومیت کی حامی تھی۔ پانیکر اس کے سرگرم ممبر تھے۔

پانیکر ڈگری لینے کے بعد ۱۱ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں پہلی جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ ان کے جہاز کو جرمنوں نے تارپیڈو کر دیا جس کی وجہ سے ۲۷۳ لوگوں میں جو اس جہاز میں سفر کر رہے تھے صرف ۵۲ لوگ بچے۔ بچنے والوں میں پانیکر تھے اس حادثہ کی وجہ سے پانیکر کو لندن واپس جانا پڑا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو ان کی شادی ان کے ماموں کی لڑکی کے ساتھ ہو ان کی بچپن کی منگیتر تھی، ہو گئی۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں ملازمت کریں۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے بھائی کے دوست راما نگا ریڈی اس وقت میسور کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے پانیکر کی سفارش راس مسعود سے کی۔ راس مسعود جو سرسید کے پوتے تھے اس وقت حیدرآباد میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ راس مسعود پانیکر سے بہت متاثر ہوئے اور پانیکر پر بھی راس مسعود کی قابلیت، اخلاق اور شخصیت کا بہت اثر ہوا۔ اور راس مسعود نے ان کی ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں تاریخ کی پروفیسری کے لیے سفارش کی۔ اس وقت تمام یوروپین اسٹاف نے استعفیٰ دے دیا تھا اور چونکہ ہسٹری کی پروفیسری خالی تھی، پانیکر ملازم رکھ لیے گئے اور وہ آخر مارچ ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے۔ کالج کے سکریٹری نواب محمد علی نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ پانیکر کو اپنے خاندان کا ایک فرد خیال کرتے تھے۔ راجہ محمود آباد جو علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ ان کا بہت خیال کرتے تھے اور ان سے سکریٹری کا کام لیتے تھے۔ پانیکر راجہ محمود آباد کی شرافت اور دیانت کے بہت قائل تھے۔ پانیکر کا کہنا ہے کہ علی گڑھ کا زمانہ ان کے لیے بہت خوشگوار تھا۔ اداس پر ان کو فخر تھا۔ نہ تو اساتذہ میں اور نہ طلبا میں فرقہ وارانہ جذبات تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ غلام السیدین، نور اللہ اور ان۔ ال احمد ان کے شاگرد تھے ۱۹۲۱ء میں کالج یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا تو پانیکر شعبۂ تاریخ کے صدر مقرر ہو گئے۔ پانیکر کا یہ کہنا کہ انھوں نے کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی۔ درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ دوسری شخصیتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔

اسی درمیان خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اور قوم پرست مسلمان لیڈروں نے جامعہ ملیہ قائم کیا۔ اس میں گاندھی جی کا مشورہ اور ان کی مدد شامل تھی۔ پانیکر کا پہلے یہ ارادہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی چھوڑ دیں اور چند اور اساتذہ کی طرح جامعہ ملیہ میں ملازمت کر لیں لیکن یہ خیال کر کے کہ وہ ہندو ہیں اور ان کا یہ اقدام غلط سمجھا جائے گا، انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور مسلم یونیورسٹی سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ مولانا محمد علی اور گاندھی جی سے جب پانیکر نے مشورہ کیا تو انھوں نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن حسب عادت وہ کہیں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جون ۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی سے استعفیٰ دیدیا اور مدراس واپس جا کر سوراجیہ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن ان کے اور اخبار مالکوں کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا۔ مدراس گورنر سے بھی اختلاف ہو گیا اس کے علاوہ اس زمانے میں برہمنوں اور غیر برہمنوں کے درمیان تعلقات خراب تھے اور پانیکر غیر برہمنوں کے طرفدار تھے۔ پانیکر قوم پرست آدمی تھے اور اس پالیسی کا پرچار کرتے تھے ان کے خلاف جو لوگ تھے وہ ان کی پالیسی کے بھی خلاف تھے اس وجہ سے فروری ۱۹۲۴ء میں پانیکر اخبار سے علیحدہ ہو گئے

اسی درمیان پنجاب میں سکھوں اور انگریزی حکومت کے درمیان تصادم کا امکان ہو گیا اس لیے کہ سکھوں کی اکالی پارٹی گردواروں پر اپنا کنٹرول چاہتی تھی اور حکومت اس کے خلاف تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا گاندھی جی نے بیڑا اٹھایا اور سردار پانیکر کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تاکہ وہ سکھ لیڈروں اور انگریزوں سے بات کر کے مصالحت کرا دیں۔ آخر میں پانیکر نے ایسی تجویز پیش کی جس کی وجہ سے سکھوں اور حکومت کے درمیان سمجھوتا ہو گیا۔ سکھ پانیکر کی اس بات سے اتنے خوش ہوئے کہ ایک انگریزی اخبار جو وہ نکالنا چاہتے تھے اس کا ان کو ایڈیٹر بنا دیا۔ سکھ چاہتے تھے کہ اخبار امرتسر سے نکلے لیکن پانیکر کے مشورہ سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کو دہلی سے جو ایک مرکزی جگہ ہے اور جہاں کوئی اخبار بھی نہ تھا نکالنا چاہیے۔ اس اخبار کا نام ہندوستان ٹائمس رکھا گیا۔ پانیکر نے اس کی ادارت اس شرط پر قبول کی کہ اس کی پالیسی قومیت پر مبنی ہوگی۔ اخبار کے ڈائرکٹروں نے اس کو مان لیا اور گاندھی نے اس کا افتتاح کیا۔ لیکن چوں کہ سکھوں کو اب انگریزوں سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی ان کی دلچسپی اس اخبار سے ختم ہو گئی اور انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کو فروخت کردیں۔ پانیکر چاہتے تھے کہ پنڈت موتی لال نہرو اس کو خرید لیں اور پنڈت جی نے رضامندی بھی ظاہر کی۔ لیکن منگل سنگھ نے جو اس کے مالک تھا اسے لالہ لاجپت رائے اور مدن موہن مالویہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس کا پانیکر کو بہت افسوس ہوا اس لیے کہ لالہ لاجپت رائے ان کے نزدیک فرقہ پرست تھے۔ پانیکر اور اخبار کے نئے مالکوں کے درمیان اختلاف رائے تھا۔ اس وجہ سے پانیکر نے استعفیٰ دے دیا۔

اب ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ کیا کریں۔ ان کی عمر تیس برس سے کم تھی۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ لندن جا کر بیرسٹری کا امتحان دیں اور واپسی پر بیرسٹری کریں کیوں کہ اس میں ترقی کرنے کے بہت امکانات تھے۔ چنانچہ اس غرض سے وہ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء کو دوبارہ لندن پہنچ گئے۔ لیکن وہاں مالی دشواری کی وجہ سے انھوں نے انگریزی اخباروں میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ مضمون نویسی کے لیے جنوری ۱۹۲۶ء میں پیرس کو اپنا مرکز بنایا اور وہاں ایک فرانسیسی خاتون جوبین مارینگ ...ring Germain کی مدد سے فرانس کے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھنے شروع کیے اور جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ دونوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

اس زمانہ میں خود مختار ریاستوں کے حقوق اور اختیارات اور ان سے انگریزی حکومت سے تعلقات کا سوال زیر بحث تھا اس موقع پر ۱۹۲۶ء کے وسط میں پانیکر کی کتاب Princely States شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے انگریزی حکومت کے نظریہ

PARAMOUNTEY کی مخالفت کی۔ اس کتاب کی بدولت پانیکر ۳ر جنوری ۱۹۲۸ء کو مہاراجہ کشمیر کے مشیرکار ہو کر ملازم ہو گئے۔ ہندوستان کی حکومت نے اس زمانہ میں ایک کمیٹی زیر صدارت ہارکورٹ بٹلر مقرر کی تاکہ وہ والیان ریاست کی قانونی پوزیشن متعین کریں۔ ساتھ ہی ساتھ CHAMBER OF PRINCES نے ایک کمیٹی کرنل ہکسر کی صدارت میں بنائی تاکہ وہ ان کو قانونی مسائل کے سلسلہ میں مشورہ دے۔ بٹلر کمیٹی اپریل ۱۹۲۸ء میں سر ہی انگلینڈ پہنچی اور پانیکر والیان ریاست کی کمیٹی کے ساتھ لندن جانے کے لیے منتخب ہوئے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے ان کو ہندوستان کی تاریخ پر چند لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔

پہلی گول میز کانفرنس میں والیان ریاست کو شرکت کرنے کی دعوت دی گئی۔ مہاراجہ پٹیالہ مجلس والیان ریاست کے چانسلر اور کرنل ہکسر ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور پانیکر ڈپٹی ڈائرکٹر اور والیان ریاست کا جو وفد گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا پانیکر اس کے سکریٹری مقرر ہوئے اور ستمبر میں لندن پہنچ گئے۔ انہیں کے ساتھ ساتھ وہ مہاراجہ پٹیالہ کے وزیر بھی تھے۔ پٹیالہ میں انھوں نے ۱۹۲۷ء میں ملازمت کی۔ وہ فیڈریشن کے حامی تھے۔ چنانچہ پہلے دن جب گول میز کانفرنس کا افتتاح ہوا تو ان کی ایک کتاب فیڈریشن پر شائع ہوئی۔ چیمبر آف پرنسز chamber of princes کے سکریٹری کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے علمی کام جاری رکھا۔ ہندو مذہب اور ہندوستانی قومیت پر کتابیں لکھیں۔ اپریل ۱۹۳۹ء کو پٹیالہ چھوڑ کر بیکانیر کے مہاراجہ گنگا سنگھ کے وزیر ہو گئے۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد دیوان کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ بیکانیر میں پانیکر نے لوکل سلف گورنمنٹ میں ریفارم کیا۔ اور قانون ساز جماعت میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ بیکانیر میں ٹھاکروں کا دور دورہ تھا اور وہ کاشت کاروں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ زمین پر ان کا کوئی حق نہ تھا اور لوگوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد تھے۔ پانیکر نے ریفارم کی کوشش کی۔ انھوں نے تعلیم کو فروغ دینے کی بھی کوشش کی اور ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی لیکن اختلاف رائے کی وجہ سے اس وقت یہ یونیورسٹی نہ بن سکی۔ بعد میں جے پور میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ گنگا سنگھ کے انتقال کے بعد سے پانیکر کے تعلقات والیان ریاست سے زیادہ خراب ہو گئے۔

پانیکر نے کامن ویلتھ کانفرنس میں حصہ لیا۔ لیکن ان سے اور والیان ریاست سے اختلافات تھے وہ قوم پرست تھے اور وفاق کے حامی۔ ۱۹۴۳ء میں نواب بھوپال مجلس والیان ریاست کے چانسلر ہو گئے۔ پانیکر سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ اس لیے کہ نواب بھوپال فیڈریشن کے خلاف تھے اور جب کرپس مشن آیا تو نواب صاحب نے راجستان پٹے کی اسکیم پیش کی۔ یعنی ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ ایک راجستان بھی قائم ہو جس کے والیان ملک ممبر ہوں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو والیان ملک آزاد ہو جائیں گے۔ پانیکر اس نظریہ کے خلاف تھے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا تو پانیکر مجلس اقوام متحدہ میں پہلے ہندوستانی وفد کے ممبر تھے جو وجیا لکشمی پنڈت کی زیر صدارت گیا تھا۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۴۸ء کو پانیکر چین میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے یہ چیانگ کائی شیک کا زمانہ تھا۔ لیکن جب ان کا دور ختم ہوا اور چین میں اپریل ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں کا اقتدار قائم ہوا تو ہندوستانی حکومت نے پانیکر کو دوبارہ اپنا سفیر مقرر کیا۔ انھوں نے چار برس چین میں (۱۹۴۸-۵۲ء) سفارت کی اور ہندوستان اور چین کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کیے۔ ہندی چینی بھائی بھائی کی بنیاد پانیکر ہی نے ڈالی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۵۲ء میں پانیکر مصر میں سفیر کی حیثیت سے بھیجے گئے وہاں وہ دسمبر ۱۹۵۳ء تک رہے۔ پاکستان کے پروپگنڈے کی وجہ سے ہندوستان اور مصر کے تعلقات کچھ خوشگوار نہ تھے۔ پانیکر نے جنرل نجیب سے ذاتی تعلقات بڑھائے اور سوڈان اور اسرائیل کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ مصر اور انگریزوں کے درمیان جو سوڈان کے سوال پر اختلاف تھا اس کے حل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن عرب اور اسرائیل کے اختلافات کو دور نہ کر سکے۔

پانیکر STATES REORGANISATION COMMITTEE کے

۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک ممبر رہے اور وہ جنوب کے چاروں صوبوں کے بنانے میں کافی مفید ثابت ہوئے۔ کیرالا کی تشکیل میں ان کا کافی ہاتھ تھا اگرچہ کرشنا مینن ان کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ کیرالا کو تامل ناڈو میں شامل کردیا جائے۔ جون ۱۹۵۶ء کے آخر میں پانیکر فرانس کے سفیر مقرر ہوئے اور وہیں ان پر فالج کا دورہ پڑا۔ اگرچہ تھوڑے دنوں بعد صحت یاب ہوگئے لیکن پہلے کی طرح ان کی تندرستی واپس نہیں آئی۔ فرانس سے واپسی پر پنڈت نہرو نے ان کو راجیہ سبھا کا ممبر بنادیا۔ اور جموں وکشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوگئے۔ وہاں جون ۱۹۶۳ء تک رہے۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۶۳ء میں میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے لیکن چند مہینے کے بعد ۱۰ر دسمبر کو ان کا انتقال ہوگیا۔

سردار پانیکر بہت قابل، ذہین اور روشن خیال آدمی تھے ان کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ ان کو اسلام اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ سے خاصی واقفیت حاصل تھی۔ وہ نہ صرف مورخ تھے بلکہ ادیب بھی تھے۔ اپنی مادری زبان ملیالم میں شاعری کرتے تھے انھوں نے اپنے دیوان کی چار جلدیں شائع کیں۔ اس کے علاوہ دو ڈرامے اور چار ناول لکھے۔ لیکن زیادہ تر ان کی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں۔ انھوں نے ہندو مذہب اور تہذیب پر کتابیں لکھیں انھوں نے مالابار کی بھی تاریخ لکھی۔ لیکن ان کی تصانیف زیادہ تر سطحی ہیں اور تحقیق اور تدقیق سے خالی ہیں اور ثانوی ماخذ کی مدد سے لکھی گئی ہیں۔ مگر ان کی دو کتابیں بہت اہم اور قابل ذکر ہیں ایک تو ہندوستان کی تاریخ ہے۔ ASURVEY OF INDIAN HISTORY

پانیکر نے چند سو صفحات میں ہندوستان کی پوری تاریخ (قدیم زمانہ سے حال تک) کا جائزہ لیا ہے اس میں ذرا بھی تعصب نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستانی قومیت کے نظریہ سے لکھی ہے۔ اس میں جو ہندو اور اسلامی تہذیب کا امتزاج مغلوں کے عہد سے شروع ہوا اس کا خاص کر ذکر کیا ہے۔ دوسری کتاب جس نے پانیکر کو بہت شہرت دی وہ ایشیا پر مغرب کا تسلط ہے ASIA AND WESTERN DOMENION پانیکر پہلے ہندوستانی مورخ ہیں جنھوں نے ایشیا پر مغرب کے تسلط کا تجزیہ کیا اور اس کے اقتصادی معاشی اور سماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب کی تعریف نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی ہوئی یہ پانیکر کی سب سے اچھی تصنیف ہے۔ اس کتاب سے پانیکر کے لیے دو نتائج ہوئے۔ ایک تو پنڈت نہرو اس کتاب سے بہت متاثر ہوئے اور پانیکر کو STATEREORGANISATION COMMETEE؟ کا ممبر بنادیا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ UNESCO نے ان کو انسان کی تہذیب کی تاریخ کی چھٹی جلد کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس کے علاوہ ان کو مختلف یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں اور ۱۹۵۵ء میں انڈین ہسٹری کانگریس کے سالانہ اجلاس کی کلکتہ میں صدارت تفویض ہوئی

سردار پانیکر بہت اچھے مقرر تھے اور بڑی اچھی اور دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ ان کی ایک اور خصوصیت تھی۔ ان پر ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو کو بھروسا تھا۔ اور ان کو بڑے بڑے معزز عہدوں پر مقرر کیا اور دوسری طرف وہ مہاراجہ پٹیالہ، کشمیر اور بیکانیر کے معتمد تھے۔ پانیکر بہت بڑے مردم شناس اور ذہین انسان تھے۔

ڈاکٹر عبدالسّتار صدّیقی

ضیاء الحق چودھری

ڈاکٹرعبدالستار صدیقی بلاشبہ علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزندوں میں سے ایک ہیں۔ مدرسۃ العلوم کے فضلا نے علوم کے ہر شعبہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور ملک و قوم کی جو خدمت کی ان سے ملک و ملّت کی تاریخ کے ابواب روشن ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسے ہی افراد میں سے ہیں جنھوں نے اپنے علمی تبحر سے نہ صرف علی گڑھ کو بلکہ دوسرے علمی اداروں کو بھی سیراب کیا اور اپنے پیچھے کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے۔ وہ علوم مشرقی کے ماہر ہونے کے ساتھ ایک نہایت نیک سیرت انسان بھی تھے اور اپنے ہم عصروں، دوستوں، شاگردوں، اعزا اور اقربا کے ساتھ اُن کا سلوک انتہائی شریفانہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب عربی، فارسی اور اردو کے مُسَلّم استاد تھے۔ اور تحقیق کے میدان کے شہسوار تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی ڈاکٹر صاحب کے مجموعۂ مضامین "مقالات صدیقی" (پہلا حصہ) کے "دیباچہ" میں تحریر فرماتے ہیں "اردو میں جدید تحقیق کا آغاز سرسید سے ہوتا ہے۔ موجودہ صدی میں جن بزرگوں نے تحقیق کو ایک مستقل فن بنا دیا اُن میں محمود شیرانی، عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، مسعود حسین رضوی ادیب اور امتیاز علی عرشی کا نام سرفہرست ہے۔ آج ایسا کوئی محقق نہیں ہے جس نے ان بزرگوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض نہ حاصل کیا ہو اور ان کے نقشِ قدم کو مشعلِ راہ نہ بنایا ہو۔"

پروفیسر محمود الٰہی اُن کی محققانہ حیثیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "محمود شیرانی اور عبدالستار صدیقی کا دائرۂ تحقیق ادب تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ دونوں لسانی تحقیق میں بھی یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ مآخذ کی چھان بین، مسائل کی تفریع اور نتائج کے استنباط میں اُن کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کر دیتی ہے۔"

گو بحیثیت ماہر ادب و لسانیات ڈاکٹر صاحب کی شہرت ملک کے حدود سے نکل کر بیرونی ملکوں میں بھی پھیل چکی تھی مگر ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود نام و نمود کی خواہش سے پاک تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے مسلم صدیقی صاحب "مقالات صدیقی" (پہلا حصہ) میں "عرضِ مرتب" کے تحت تحریر فرماتے ہیں "ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ہندوستان کے اُن چند گوشہ نشین اہلِ علم میں سے تھے جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر خاموشی سے اپنے کام میں ہمہ تن معروف رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ ساری عمر شہرت پسندی اور خودنمائی سے کوسوں دور اور دوسروں کی رہنمائی ہی میں مسرور رہے۔"

آئیے اب ڈاکٹر صاحب کی حیات و غیر معمولی ادبی خدمات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

ڈاکٹر صاحب اودھ کے ایک مشہور و مردم خیز قصبہ سندیلہ (ضلع ہردوئی، اتر پردیش) میں ۲۶؍دسمبر ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔

اُن کے والد مولوی عبدالغفار (متوفی ۱۹۱۸ء) ریاست حیدرآباد میں
بحیثیت سررشتہ دار مال تعینات تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے
ابتدائی تعلیم مدرسہ فوقانیہ گلبرگہ، سٹی ہائی اسکول حیدرآباد
اور چادر گھاٹ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ مسلم صدیقی (عرض
مرتب) تحریر فرماتے ہیں۔ "ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ابتدائی
تعلیم حیدرآباد میں ہوئی جہاں انھوں نے فارسی زبان اور
خطاطی کے نکات اپنے ماموں منشی عالم علی شوختی سے سیکھے
جب علی گڑھ پہونچے تو مولوی خلیل احمد اور پروفیسر جوزف
ہورووِتس کی شاگردی سے فیض حاصل کیا۔"
میٹریکلیشن کے بعد وہ حیدرآباد سے علی گڑھ آگئے۔
وہاں سے ۱۹۰۷ء میں بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے۔ کے پہلے سال
میں داخل ہوگئے۔ چند وجوہات کی بنا پر صوبہ متوسط میں
ملازمت کرلی اور وقتی طور پر ایم۔ اے چھوڑ دیا۔ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۱ء
گورنمنٹ ہائی اسکول کامٹی اور ہیٹوردھن گورنمنٹ ہائی
اسکول ناگپور میں فرسٹ اسسٹنٹ ماسٹر رہے۔ ۱۹۱۲ء
میں وہ ملازمت سے مستعفی ہوکر علی گڑھ واپس آگئے اور عربی
میں ایم۔ اے مکمل کرلیا۔ اُن کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر
سرکار ہند نے جرمنی میں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ
دیا اور وہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اشتراس بورگ یونیورسٹی
میں داخل ہوگئے۔ وہاں انھوں نے پروفیسر لیتمان سے
عربی اور سریانی، پروفیسر نولدیکے سے فارسی اور پروفیسر
ہیبش سے قدیم فارسی پڑھی۔ ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء وہ گوئے ٹنگن
یونیورسٹی میں رہے اور وہاں پروفیسر لیتمان سے عربی، سریانی
اور ترکی پڑھی۔ پروفیسر الف سے عبرانی اور سریانی، پروفیسر
اندریاس سے اَوستا، پہلوی اور جدید فارسی، پروفیسر
مودس باخ سے انگریزی صوتیات اور لڈن برگ سے
سنسکرت صرف و نحو اور ڈاکٹر ہگن سے فنون لطیفہ کی تاریخ
کا درس لیا۔ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لاطینی زبان کا امتحان پاس
کیا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے امتحان میں اعلیٰ اعزاز
کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ مقالے کا عنوان تھا "قدیم عربی میں دخیل
فارسی الفاظ" ۱۹۱۹ء میں مقالہ شائع ہونے پر پی۔ ایچ۔ ڈی
کی باضابطہ سند عطا ہوئی۔ "عرض مرتب" میں ہے کہ "طالب
علمی کے زمانے سے ہی پروفیسر صدیقی صاحب کو تحقیق الفاظ
صرف نحو، صحت املا اور علم لسانیات کے اُصول سے گہری
دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ...."
۱۹۱۲ عیسوی میں وہ حکومت ہند کے وظیفے پر عربی
کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے اور پہلی جنگ عظیم کے بعد
۱۹۱۹ عیسوی میں وطن واپس آئے۔ یورپ کے اِس طویل قیام
نے اُن کو مختلف قدیم زبانوں جیسے عبرانی، سریانی، لاطینی،
یونانی، سنسکرت اور پہلوی وغیرہ کو وسیع معلومات حاصل
کرنے کا موقعہ فراہم کیا اور "تقابلی لسانیات" کے اُصول سے
کماحقہ روشناس کرایا۔ وہاں پروفیسر نولدیکے، اندریاس
اور لیتمان جیسے مشہور اساتذۂ فن کی شاگردی کا شرف حاصل
ہوا جس نے اُن کے ذوقِ تحقیق پر صیقل کا کام کیا۔" اِس
دوران ڈاکٹر صاحب احادیث میں مستعمل الفاظ کا انڈکس بنانے
میں یوروپی مستشرقین کے ساتھ شریک رہے اور کامیاب
و کامران وطن کو لوٹے اور فروری ۱۹۲۰ء سے ستمبر ۱۹۲۰ تک
اپنی مادر درسگاہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر
رہے۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا قیام عمل میں تو ڈاکٹر صاحب
اُس کے پہلے پرنسپل ہوئے اور ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۴ء حیدرآباد
میں رہے۔ اُس کے بعد ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۸ء وہ ڈھاکہ یونیورسٹی
میں عربی اور اسلامیات کے شعبے میں صدر رہے۔ وہاں کے
قیام کے دوران انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لائڈن) کے
لیے چند مضامین قلمبند کیے۔ ۱۹۲۶ء میں اورینٹل کانفرنس
الٰہ آباد کے عربی و فارسی شعبے کے صدر ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں
بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر "ولسن فلولاجیکل خطبے دیے۔
۱۹۲۸ تا ۱۹۴۶ء ڈاکٹر صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی
و فارسی شعبے کے پروفیسر و صدر رہے اور ریٹائر ہونے پر امریٹس

پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ لنگوئسٹک سوسائٹی آف انڈیا کے اساسی ممبر اور نیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کے لائف ممبر تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر صاحب کو اُن کی بیش بہا ادبی خدمات کے لیے ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند نے اعزاز اور خلعت سے نوازا۔

"عرض مرتب" میں تحریر ہے کہ "پروفیسر صدیقی کو اردو زبان سے ہمیشہ بڑا شغف رہا اور وہ سہل اور سادہ زبان لکھنے کے حق میں تھے۔ اپنی تحریروں میں عربی، فارسی کے بوجھل الفاظ پر سیدھے سادے اردو، ہندی لفظوں کو ترجیح دیتے تھے صرف، نحو اور املا کے قواعد مرتب کرنے اور جزیوں سے کلیے قائم کرنے میں مہارت حاصل تھی اور اصل الفاظ کی کھوج لگا کر غلط نظریوں اور مفروضوں کی اصلاح کرتے رہتے تھے یہ بھی التزام تھا کہ ہر تحریر حتیٰ کہ نجی خطوں میں بھی اعراب پابندی سے لگایا جائے"

"عبدالستار صدیقی لغت پرداز بھی تھے، تنقید نگار بھی مگر وہ اول سے آخر تک ایک معلم تھے اور بڑے سوچ بچار کے بعد رائے قائم کرتے تھے۔ اس لیے ان کا ہر مشورہ غور اور عمل کرنے کے لائق ہوتا تھا۔ مثلاً لکھتے ہیں:"..... اردو کا معیار اردو ہی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ جب عربی، فارسی، ہندی، پراکرت، سنسکرت، انگریزی غرض کہ دنیا بھر کی زبانوں پر عبور ہو تب کہیں اردو بولنا آئے۔ ایسی اردو سے ہم باز آئے....." یا "..... سب سے بڑی خدمت ہماری زبان کی یہ ہوگی کہ اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دیجیے..... لوگ اکثر گنتی فارسی میں لکھتے ہیں، "فصل دوم" "باب پنجم" وغیرہ حالانکہ تھوڑی ہی دور چل کر فارسی گنتیاں کام نہیں آتیں اس لیے کہ فارسی کے بہت سے لفظ "شانزدہم، ہیژدہم" وغیرہ اردو کے لیے ایک بار ہیں"

ڈاکٹر صاحب اردو املا کے قواعد پر بہت زور دیتے تھے اپنے گرانقدر مضمون "اردو املا" میں تحریر فرماتے ہیں: "ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور اُن قاعدوں کی بنیاد صحیح اصول پر ہو۔ اگر قاعدے معین نہ ہوں تو زبان کی یک رنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہونچنے کا اندیشہ لاحق ہوگا اور اردو اس وقت اسی قسم کے خطرے میں ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی، غرض کہ ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں، ہر لکھنے والا اُن کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ املا کی خرابی یا بیقاعدگی کی صورتیں جب کسی متمدن قوم کو پیش آئیں تو اس کے زبان دانوں نے فوراً ان کی اصلاح کی۔ ترقی کرنے والی قومیں اس زمانے میں بھی اپنے زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں۔" اس کے بعد اردو املا کے بارے میں اپنے زرّیں خیالات بڑے دل نشیں پیرائے میں تحریر فرمائے ہیں۔ چند برس قبل اردو کی مشہور شخصیت پروفیسر رشید حسن خاں صاحب نے اردو املا پر ایک ضخیم کتاب مرتب کی اور اس کو ڈاکٹر صاحب کے نام نامی سے معنون کیا اور اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو جو ہدایات دی تھیں اور حوصلہ افزائی کی تھی اُس کے لیے تہ دل سے تشکر کا اظہار کیا۔

"مقالات صدیقی" (پہلا حصہ) میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پاروں کے عنوانات اس طرح ہیں: "اردو املا"، "تماہی کی ترکیب"، "ہندستان بغیر واؤ کے صحیح ہے (مع ضمیمہ)"، "ذال معجمہ فارسی میں"، "جز اور جزو کی بحث"، "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق"، "بغداد کی وجہ تسمیہ"، "افسوس (لفظ کا ایک بھولا ہوا مفہوم)"، "معرب لفظوں میں حرف 'ق' کی حیثیت"، "لفظ سعد کی تحقیق"، "اردو صرف۔ نحو کی ضرورت"، "اردو میں ضمائر مفعولی"، "احوال اسم"، "ولی کی زبان"، "وضع اصطلاحات پر تبصرہ"، "معائب سخن کلام حافظ کے آئینے میں"، "اصلاح سخن پر تبصرہ" اور "ضمیمہ مکتوب (شامل اصلاح سخن)"۔ ان مضامین میں سب سے پرانا "اردو صرف۔ نحو کی ضرورت" (۱۹۱۰ء) ہے اور سب سے بعد کا "معرب لفظوں میں حرف 'ق' کی حیثیت"

(۱۹۶۱ء) اور "وضع اصطلاحات" پر تبصرہ (۱۹۶۱ء) ہیں۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کے متنوع خیالات اور ادبیات سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نصف صدی پر پھیلے ہوئے یہ اوراقِ ادب پر کتنا بڑا احسان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو لکھنے کا شوق اوائل جوانی سے ہی تھا۔ اُن کے اوّلین مضامین میں سے ایک بعنوان "ہم نیکی کیوں کریں؟" علی گڑھ منتھلی (جلد ۵، نمبر ۵، مئی ۱۹۰۷ء) میں چھپا تھا۔ اس میں صدیقی صاحب نے بڑے دلکش انداز میں بیان فرمایا ہے کہ نیکی کرنا کیوں ضروری ہے۔ یہ ضرورت مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی ہے۔ اس کا جواز ہر جگہ موجود ہے اور اس پر معاشرے کی بقا کا انحصار ہے۔ مضمون سے اُن کے خیالات و تحریر کی پختگی عیاں ہے گو کہ ان کی کم عمر تھی۔ جب اردو زبان میں تحقیق کا کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تھا تو اپنے وقت کے بڑے بڑے صاحبانِ قلم ڈاکٹر صاحب سے رجوع کرتے تھے اور اُن کی رائے کو تقریباً حرفِ آخر کا درجہ حاصل تھا۔ انیسویں صدی ع کے آخر اور بیسویں صدی ع کی پہلی چوتھائی میں مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی آسمانِ ادب کا ایک روشن ستارہ تھے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی وہ غالباً بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمت کے بعد دوسرے نمبر پر ہو (اگر اردو کے اولین معمار دن یعنی سر سید اور اُن کے رفقار کی خدمات کو الگ کر کے دیکھا جائے)۔ مولوی وحید الدین سلیم کی مشہور تالیف "وضع اصطلاحات" نے اردو کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں :- "وضع اصطلاحات" کی تالیف ۱۹۲۱ء میں ختم ہوئی۔ کتاب اُسی سال انجمن ترقی اردو کو سپرد کر دی گئی۔ علی گڑھ میں چھپی۔ کتاب کے سرورق پر ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۱ء درج ہے (یعنی یکم فروری اور ۳ ستمبر کے درمیان کسی وقت) مگر حقیقت میں اس کی اشاعت کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ مصنف نے جو غلط نامہ پہلے بنایا تھا ناکافی ثابت ہوا اور دوسرے غلط نامے کے چھپوانے میں اور زیادہ تاخیر کا احتمال

تھا۔ انہوں نے مزید اصلاح اپنے قلم سے کر کے چند نسخے صحیح کیے جن میں سے ایک نسخہ مجھے دیا، اس فرمائش کے ساتھ کہ میں اسے غور سے مطالعہ کر کے کتاب کے بارے میں جو میرا خیال ہو لسے قلم بند کر دوں۔ جہاں تک یاد ہے یہ ۱۹۲۳ء کا آغاز تھا، جب کہ جامعۂ عثمانیہ میں بی۔ اے کا پہلا امتحان ہونے کو تھا اور اگلے تعلیمی سال کے آغاز میں ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام درپیش۔ مولانا نے خود کہا کہ تبصرہ کا کام فرصت ہونے پر رکھنا مناسب ہوگا۔ ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی خدمت قبول کر کے میں وہاں چلا گیا جس سے التوا کو کچھ اور طول ہو گیا۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں تبصرہ ہو سکا اور میں نے ان کے حیدر آباد کے پتے پر خط بھیجا۔ اس کے جواب میں اُن کا ۲۲ مئی کا لکھا خط آیا تو تبصرہ بریلی بھیج دیا۔ رسید ۱۴ جون کے خط نے دی۔ اُس کے بعد کوئی خط نہ آیا کئی مہینے گذر گئے تو اندیشہ ہوا کہ تبصرہ شاید پسند نہیں آیا۔

کچھ دن انتظار کر کے میں نے انھیں لکھا کہ اگر تبصرے میں کوئی بات آپ کو پسند نہ ہو تو براہِ کرم اُس کی مجھے اطلاع دیجیے تاکہ میں کچھ عرض کر سکوں۔ اس کے جواب میں ان کا تیسرا عنایت نامہ صادر ہوا ......"

جواب یہ تھا :- "مخدومی جناب ڈاکٹر صاحب۔ تسلیم بعد تعظیم۔ مدت کے بعد گرامی نامہ وصول ہو کر باعثِ اعزاز ہوا۔ آپ کی عنایتوں اور محبتوں کا نشہ ایسا نہیں ہے جیسے کوئی ترشی اُتار سکے۔ حالانکہ ترشی کی کوئی صورت آج تک پیش ہی نہیں آئی۔ میں آپ کا وہی خادم ہوں جو علی گڑھ میں تھا اور جو حیدر آباد میں رہا۔ "وضع اصطلاحات" پر آپ نے تکلیف اٹھا کر جو رائے دی اس کا شکریہ میں کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ آپ کے اس تبصرہ کو اوّل سے آخر تک پڑھنے کے بعد بھی کوئی خیال میرے دل میں بجز شکر گذاری اور احسان مندی کے پیدا نہیں ہوا۔ آپ نے جو کچھ لکھا اس سے میری بہت سی رایوں کو تقویت حاصل ہوئی اور جہاں آپ کی نظر میں کوئی خامی تھی اُس کو کیا آپ نے ظاہر کر دیا۔ آپ کی تنقید سے فائدہ اٹھا کر میں نے

وضع اصطلاحات" کی ترمیم شروع کردی تھی اور بہت سا کام دگیا تھا مگر ابھی مولوی عبدالحق صاحب اس کو چھاپنے کے لیے ارنہیں ہیں. کچھ اور کام ان کو درپیش ہیں اور اس لیے میرا کام ابھی ملتوی کر دیا گیا ہے. آپ بھولے سے یہ خیال میری طرف سے اپنے دل ں نہ لائیں کہ میں آپ کی تنقید سے خدانخواستہ ناراض ہوگیا ہوں. معاذاللہ. میں تو آپ کی اس تکلیف فرمائی کا اس قدر شکرگذار وں کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا. تمام ہندوستان میں صرف پ ہی ہیں جو ایسے علمی کاموں میں میری مدد کر سکتے ہیں اور میری ناطر دیدہ ریزی کے ساتھ رائے دینے پر آمادہ ہیں. خدا آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ زندہ وسلامت رکھے اور آپکے اہل وعیال کو بھی. اس کو میری غفلت اور سہل انگاری کے سوا اور کسی بات پر محمول نہ فرمائیے کہ میں نے وطن سے واپس آنے کے بعد کوئی عریضہ آپ کی خدمت میں نہیں لکھا. امید ہے کہ میری اس خطا کو معاف فرمائیں گے.....

اس مکتوب سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا وحیدالدین سلیم کے دل میں ڈاکٹر صاحب اور انکی علمیت کی کتنی قدر تھی. یہی حال بابائے اردو مولوی عبدالحق کا تھا. جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ ڈاکٹر صاحب کی رائے معلوم کرتے اور اس پر عمل کرتے تھے. ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد کسی صاحب قلم نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اگر "بابائے اردو کا پیغمبر" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا.

ڈاکٹر صاحب نے الہ آباد میں شہر کی گھما گھمی سے الگ گنگا کے کنارے ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کرائی تھی جو ان کے اعلیٰ مذاق کی آئینہ دار ہے. یہاں وہ پرسکون ماحول میں اپنے کو مطالعہ میں معروف رکھتے تھے. ان کے ہم عصر ادبا، شعرا اور صاحبانِ قلم جب الہ آباد آتے تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے ضرور آتے اور اکثر ڈاکٹر صاحب کے ہی مہمان ہوتے اور ان کی مہمان نوازی کا پورا لطف اٹھاتے. ان کی زندگی معمولات سے پُر تھی. صبح اٹھ کر ٹہلتے، پھر فراغت کے بعد ناشتہ کرتے، اخبار دیکھتے اور مطالعہ میں معروف ہو جاتے. دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ آرام فرماتے، شام کی چائے پیتے اور پھر ٹہلتے اس کے بعد پھر مطالعہ میں معروف ہو جاتے. رات کے کھانے اور کچھ ٹہلنے کے بعد بھی مطالعہ کرتے اور ۱۰ اور ۱۱ بجے کے درمیان بستر پہ جاتے. کھانے کے معاملے میں بھی وہ بہت پابند تھے اور یہی ان کی صحت، تندرستی اور درازی عمر کا راز تھا. ان کے ذاتی کتب خانے میں ہزاروں نادر ونایاب کتب تھیں جن سے استفادہ کے لیے اساتذہ اور طلبا برابر ان کے پاس آتے تھے اور وہ ان کی پوری مدد کرتے تھے. نادار طلبا کی خاموشی سے امداد بھی کرتے تھے اور ایسے بہت طلبا ان کی وجہ سے ہی پڑھ، لکھ کر اعلیٰ درجوں کو پہنچے. ان کی خدمت قطعی بے لوث ہوتی تھی.

ڈاکٹر صاحب کو اپنی مادرِ درسگاہ علی گڑھ سے بہت محبت تھی. گوکہ وہ اواخر عمر میں سفر سے پرہیز کرنے لگے تھے مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی جب میٹنگ ہوتی تو وہ ضرور شریک ہوتے اور اپنے بیش بہا خیالات سے ارباب حل وعقد کو مستفید فرماتے تھے.

عمر کے آخری سالوں میں انھیں نسیان کی شکایت پیدا ہوگئی تھی. کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد یہ آفتاب درس وتدریس غروب ہوگیا. ۲۸ر جولائی ۱۹۷۲ کو آپ نے الہ آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے. علمی حلقوں میں ان کا سوگ منایا گیا اور یہ عام خیال تھا کہ ؎

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

علی گڑھ اپنے ایک مایۂ ناز فرزند سے محروم ہوگیا.

حوالہ:- "مقالات صدیقی" (پہلا حصہ) عبدالستار صدیقی، مرتب مسلم صدیقی، اترپردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، (سلسلہ مطبوعات:- ۷۹)

”سرسید کی جامعیت خود ان کے عہد میں بھی بالغ نظر اصحاب پر آشکار ہو چکی تھی، بعض انگریزوں نے اس لحاظ سے انھیں اکابر یورپ پر ترجیح دی. غیر مسلم برادران وطن مسلمانوں کے مقابلے میں دولت، تعداد، تعلیم، کاروبار، اثر و رسوخ غرض ہر اعتبار سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ تاہم ایک حق شناس غیر مسلم نے اقرار کیا کہ ہمارے بیس اکابرین بھی مل جائیں تو ایک سرسید کے برابر نہیں ہو سکتے۔

بے شبہ سرسید ایک ہی وقت میں اسلام کے داعی اور مبلغ بھی تھے، محقق و مفسر بھی۔ مورخ بھی تھے اور اُردو زبان کے صاحب طرز ادیب بھی. انہی کی وجہ سے اُردو کو ہمہ گیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ وہ نئی تعلیم کے سرگرم عمل دار بھی تھے اور سوشل رفارمر بھی۔ انھوں نے سیاسی معاملات میں بھی نمایاں حصّہ لیا. کتابیں بھی تصنیف کیں۔ مضمون نگاری بھی فرمائی اور ایسے انداز میں یہ کام انجام دیا کہ تحقیق و دانش اور متانت و وقار کا ایک بلند معیار قائم ہوگیا۔ “

——— غلام رسول مہر

سیّد سجّاد حیدر یلدرم

پروفیسر ثریّا حسین

سید سجاد حیدر یلدرم قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے
شندے تھے اور علی گڑھ کے ساختہ و پرداختہ۔ ان کے
دا میر احمد علی غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لڑے
ھے اور پھانسی کی سزا پائی تھی جو بعد میں ملکہ وکٹوریہ کے عام
انی نامے کے تحت منسوخ ہوئی۔ ان کے والد خان بہادر
سید جلال الدین حیدر اپنے دور کے بڑے نیک نام پولس
سر تھے۔ بنارس کے ہندو مسلمان عوام نے ان کے کارناموں
ے متعلق گیت بنائے تھے۔ ان کے انصاف اور نیک
ں کے واقعات مراد آباد پولس ٹریننگ کورس کے نصاب
ں شامل تھے۔ وہ ریاست ٹونک کے آئی۔ جی۔ پولس
رمدار المہام بھی رہے۔ وہیں ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔

سید سجاد حیدر ۱۸۸۰ء میں قصبہ کانڈ ہر ضلع جھانسی
ں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم جھانسی میں ہی حاصل کی
ہاں ان کے والد کوتوال شہر تھے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں
درستہ العلوم علی گڑھ کے نویں درجہ میں داخل ہوئے۔ ان
ے ریاضی کے استاد میر ولایت حسین تھے۔ جنہوں نے ایک
بیٹنگ سوسائٹی قائم کی اس کے جلسوں میں سجاد حیدر،
د علی اور راجہ مہندر پرتاپ سنگھ پیش پیش رہے بعد میں
سرت موہانی بھی شامل ہوئے۔ سجاد حیدر اردو اور
ریزی دونوں میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ انہیں ۱۹۰۱ء
ں ہیرلڈ کاکس کیمبرج اسپیکنگ پرائز ملا جو ان سے قبل
احب زادہ آفتاب احمد خاں، خواجہ غلام الثقلین، مولانا شوکت علی،
رشیخ عبداللہ کو مل چکا تھا۔ وہ ایم۔ اے۔ او کالج یونین
کے نائب صدر رہے۔ صدر اس وقت کالج کا انگریز پرنسپل
ہوتا تھا۔ پروفیسر طامس آرنلڈ اور شبلی نے ایک انجمن
"اخوان الصفا" قائم کی۔ وہ اس کے بھی سرگرم رکن رہے۔
سجاد حیدر پروفیسر موصوف کے پسندیدہ شاگرد تھے۔
آرنلڈ کا کہنا تھا کہ سجاد حیدر اپنے دور کے طلبا میں ذہین
ترین تھے اور ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا
اسی زمانے میں ان کے مضامین "پانیر" میں بھی شایع ہوئے۔

۱۸۹۸ء میں جب شبلی اور مولانا وحید الدین سلیم
نے علی گڑھ سے رسالہ "معارف" کا اجرا کیا تو اسی سال
اکتوبر کے شمارے میں سجاد حیدر کا طویل مضمون اردو
ناول کی افسوس ناک حالت پر چھپا۔ جس سے اس نوجوان
طالب علم کے غیر معمولی مطالعے اور تنقیدی صلاحیت کا اندازہ
ہوتا ہے اور ان کے شدید حسِ مزاح کی آئینہ دار وہ مشہور
نظم "مرزا پھویا" ہے جو انہوں نے حسرت موہانی کے کالج میں
داخلے کے متعلق لکھی تھی۔ "معارف" میں ان کا مضمون اردو
ہندی کے مسئلے پر بہت فکر انگیز ثابت ہوا اور اسی رسالے
میں ان کا مشہور مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"
شائع ہوا جو ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ تھا۔

اسی زمانے میں سجاد حیدر حاجی اسمٰعیل خاں شیروانی
کے سیکریٹری رہے۔ ان کو انگریزی پڑھائی اور بطور معاوضہ
ان سے ترکی سیکھی۔ معارف میں چند ترکی ناولوں کے تراجم
جو انہوں نے اور حاجی صاحب نے کیے تھے بالاقساط
شائع ہوئے وہ "معارف" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔

سجاد حیدر انجمن اردوئے معلیٰ کے بانی تھے اور سن ۱۹۰۱ء میں اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ سن ۱۹۰۱ء میں سجاد حیدر نے بی۔ اے پاس کیا اور متعدد ترکی ناولٹ کو اردو میں منتقل کرکے ترکی کے ترقی یافتہ فکشن سے اہل اردو کو روشناس کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے قانون میں داخلہ لیا شیخ عبداللہ اور دوسرے روشن خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر تحریک تعلیم نسواں کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں ان کا مضمون "اردو کا نیا شاعر اقبال" شائع ہوا جس سے اقبال کے افکار و علائم پر غور و خوض کا آغاز ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں بحیثیت "ڈریگومین" (ترجمان) "برطانوی قونصل" بغداد کے لیے منتخب کر لیے گئے اور عراق روانہ ہوئے جہاں کے راستے میں انہوں نے اردو کا پہلا رپورتاژ تحریر کیا۔ بغداد سے وہ رسالہ مخزن لاہور میں مضامین لکھتے رہے جو مقبول ہوئے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں رسالہ "اردوئے معلیٰ" (جو حسرت موہانی نکال رہے تھے) میں "مصاحبت ادبیہ" مع انگریزی عنوان Literary Gossip ایک قابل توجہ مضمون شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے لکھا "اردوئے معلیٰ کہاں ہے، اس سلسلے میں علم و ادب کے ایک ادنیٰ شیدائی کے پیش اس خیالات و ملاحظات کو کبھی کبھی قید کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ گاہ بہ گاہ کے مصاحبوں میں مجھے بھی شمار کیجیے۔ میں ادب کا ادنیٰ اور گمنام شیدائی ہوں اور اس پر ستم یہ کہ مہجور اور وطن سے دور۔ تاہم زبان اور ملک کی جو محبت دل میں جاگزیں ہے وہ اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ بیابان عرب میں بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالا کروں۔"

قلمی نام رکھنے کا رواج بھی بقول پطرس ان سے ہی عام ہوا۔ انہوں نے یلدرم (ترکی لفظ بہ معنی بجلی) کو بطور قلمی نام اپنایا۔

یلدرم کی طبع زاد کہانیاں "صحبت ناجنس" (۱۹۰۵ء) "احمد علی گڑھ کا ایک قصہ" (۱۹۰۶ء) "چڑیا چڑے کی کہانی" (۱۹۰۷ء) "حکایت لیلیٰ مجنوں" (مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۷۔ اپریل، مئی ۱۹۰۸ء) رومانی کہانیاں نہیں ہیں۔ جس مریضانہ رومانیت سے بعد میں یلدرم کا نام منسلک کر لیا گیا، اس سے مختلف ہیں "صحبت ناجنس" اور "احمد" معاشرتی و سماجی، "چڑیا چڑے کی کہانی اور اس کے بعد "قوت" (۱۹۲۳ء مطبوعہ ہمایوں لاہور) علامتی افسانے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی اب تک افسانہ ناول کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ گو شورٹ اسٹوری کا ترجمہ مختصر افسانہ کر لیا گیا تھا یلدرم کی کہانیاں پہلی بار قصہ کے بجائے افسانہ کہلائیں۔

یہاں ان نثر پاروں کا ذکر نہیں کیا گیا جو اسی زمانہ میں منظر عام پر آئے اور جن کو باقاعدہ افسانہ نہیں کہہ سکتے یلدرم کی اولین کتابیں "ثالث بالخیر"، "زہرا"، "مطلوب حسینان" سنہ ۱۹۰۲ء میں کالج بک ڈپو علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔ یہ ترکی ناولوں کے اردو تراجم تھے جن کے اسٹائل نے فن ناول نویسی کو متاثر کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو پر یلدرم کے احسانات سے آج تک پوری طرح نہ واقفیت حاصل کی گئی ہے اور نہ ہی ان کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ان کے مجموعہ "حکایات و احساسات" جس میں یلدرم کا دوسرا رپورتاژ "زیارت قسطنطنیہ" (۱۹۱۱ء) بھی شامل ہے، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ حکایات میں بقول مصنف ترکی سے بہ تصرف تراجم اور احساسات میں طبع زاد مضامین اور نثر پارے شامل تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۵ء میں "جلال الدین خوارزم شاہ" ترکی ڈرامہ کا ترجمہ ۔ایم۔ یو پریس سے چھپ چکا تھا۔ ایک ترکی ناولٹ کا ترجمہ "آسیب الفت" علی گڑھ ہی سے ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا اور اسی سال "پرانا خواب" (ترکی ڈرامہ) علی گڑھ سے ہی شائع ہوا۔ اور یہیں سے ۱۹۳۲

ں ایک ترکی ڈرامہ کا ترجمہ "جنگ وجدال" کے نام سے
پا۔ اسی سال انہوں نے "ہما فانغ" فارسی ناول از
مجازی کا ترجمہ اسی نام سے ادارۂ ادبیات حیدرآباد سے
ہوایا۔ ان کے متعدد مضامین مختلف رسالوں مثلاً
رنگ خیال، زمانہ، مخزن، کہکشاں، ہمایوں،
گڑھ میگزین اور نقاد میں برابر چھپتے رہے۔

سجاد حیدر یلدرم کی طبع زاد کہانیوں اور مضامین
طرز بیان انتہائی سادہ، رواں دواں اور سلیس ہے
میں شاعری کارفرما ہے۔ ان کے گہرے سماجی، سیاسی
ناقدانہ شعور کی مثالیں ان کے ابتدائی مضامین ہی سے مل
تی ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارے سب ہیرو
شہزادے اور نواب زادے ہوتے ہیں۔ اردو میں ابھی غربت
نقشہ کھینچا جانا باقی ہے۔

ان کا مجموعہ "خیالستان" ۱۹۱۱ء میں شایع ہوا۔
اس کے بعد ہی اردو میں "جمالستان" "نگارستان" اور
ارستان" وغیرہ کا دور شروع ہوتا ہے۔

علی گڑھ میگزین سے یلدرم کا تعلق بہت پرانا تھا۔
یہ میگزین ۱۸۹۱ء سے نکلنا شروع ہوا لیکن مالی مشکلات کی
سے پرنسپل موریسن نے اسے بند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا
سے سجاد حیدر اور پروفیسر عبدالقادر نے اپنے طور پر نکالنے
ہیہ کیا۔ چنانچہ پرنسپل موریسن کی ہمت افزائی پر ولایت
ین، پروفیسر عبدالقادر اور سجاد حیدر کی کوششوں سے یہ
الہ "علی گڑھ منتھلی" کے نام سے شایع ہوا۔ بعد میں یہی
یہ "علی گڑھ میگزین" کہلایا۔

یلدرم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سرگرم سکریٹری
ج سے ٹرسٹی اور کورٹ کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء سے
۱۹۲۹ء تک مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار رہے۔ شعبۂ
ردو کی بنا ڈالی اور ۱۹۲۹ — ۱۹۲۲ اس شعبے کے پہلے
ریڈر کے فرائض انجام دیئے۔ رشید احمد صدیقی اسی

زمانے میں شعبے میں لیکچرر متعین کیے گئے اور یلدرم کے ایما پر
۲۳-۱۹۲۲ء میں اقبال اردو ڈپارٹمنٹ کے پہلے بورڈ
آف اسٹڈیز کے اکسٹرنل ممبر ہوئے۔

علی گڑھ سے وہ یوپی سول سروس میں واپس چلے
گئے۔ جزائر انڈمان نکوبار کے اسسٹنٹ ریونیو کمشنر کی حیثیت
سے پورٹ بلیئر میں قیام کیا۔ واپسی پر غازی پور اور اٹاوہ
میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ اور ۱۱
اپریل ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔

وہ آخر دم تک بحیثیت اولڈ بوائے علی گڑھ اور سرسید
تحریک کی خدمت میں لگن سے مصروف رہے۔ ان کو ساری
عمر علی گڑھ، اردو، ترکی اور تعلیم نسواں سے قلبی لگاؤ رہا۔
مولانا عبدالحلیم شرر کی طرح وہ بھی تعلیم نسواں کی حمایت اور
پردے کی مخالفت میں اپنے وقت سے بہت آگے تھے اور
ان پر برابر اظہار خیال کرتے رہے۔ اردو نثر میں انہوں
نے نئے نئے تجربے کیے۔ بہت سے نئے الفاظ استعمال
کیے۔ جدید اصناف نثر کو متعارف کیا اور اردو ٹائپ کی
پرزور تائید کی۔

یلدرم نے بحیثیت انشا پرداز غیر معمولی شہرت حاصل
کی اور نیاز فتحپوری سے لے کر حجاب امتیاز علی تک ایک پوری
نسل کو متاثر کیا۔

پروفیسر محمود الہٰی لکھتے ہیں کہ مہدی افادی نے "اردو
لٹریچر کے عناصر خمسہ" میں جہاں نذیر احمد، حالی، شبلی اور
محمد حسین آزاد پر مضمون لکھنے کی ذمہ داری چند اہل قلم حضرات
کے سپرد کی تھی۔ سرسید پر نگاہِ عکس ریز ڈالنے کے لیے
یلدرم کو منتخب کیا۔ اپنے معاصر یلدرم کو اس سے بڑا
خراج عقیدت وہ اور کیا پیش کر سکتے تھے کہ انہیں
اردو لٹریچر کے نشاۃ ثانیہ کے ہیرو کو موضوع قلم بنانے
کی دعوت دی۔

افسوس کہ اردو والے بھی یلدرم کو بھولے رہے اور

مادر درسگاہ علی گڑھ بھی۔ عرصہ دراز سے ان کی کتابیں ناپید ہیں۔ حال میں شعبۂ اردو علی گڑھ نے ان مقالات کا مجموعہ شایع کیا جو یلدرم سیمینار کے موقع پر یہاں ۱۹۸۱ء میں پڑھے گئے تھے بعد ازاں یلدرم کی کتابوں کو بڑی جستجو اور دقت کے بعد چند کتب خانوں سے دستیاب کیا گیا اور ان کا ایک انتخاب اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے زیر اہتمام ۱۹۸۵ء میں شایع ہوا۔ اس کتاب میں راقم الحروف کے ایک مضمون کے علاوہ قرۃ العین حیدر کا ایک مفصل مضمون مغرب اور مشرق میں رومینٹک تحریک کے متعلق بعنوان "داستان عہد گل" بھی شامل ہے۔ ایک کتاب "مطالعہ یلدرم" پاکستان سے بھی طبع ہوئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی افسانے کی حمایت میں لکھا ہے کہ "یلدرم کی تاریخی اہمیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کئی میدانوں میں اپنے نقوش چھوڑے۔ افسانے میں وہ پریم چند سے پہلے ہیں۔ ادب لطیف کہی جانے والی نثر میں وہ نیاز فتح پوری سے مقدم ہیں اور مزاح میں ان کا اثر پطرس کے یہاں جا بجا نظر آتا ہے۔ انسانی نفسیات بھی کہانی کا موضوع بن سکتی ہے یا کہانی کے ذریعہ انسانی نفسیات کے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس نکتے کی طرف سب سے پہلے یلدرم ہی نے اشارہ کیا۔۔۔ یلدرم کئی باتوں میں اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔۔۔ عورت اور جنس کے بارے میں بعض تصورات پر پابندی کی وجہ سے ہم نے ایسی بہت سی بصیرتیں فراموش کر دیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے بزرگوں کے شعور میں جاگزیں تھیں۔ اور جنھیں بہت بعد میں محمد حسن عسکری، منٹو اور عصمت نے دوبارہ دریافت کیا۔ یلدرم کے ہاں ان بصیرتوں کا ہلکا سا احساس ملتا ہے"۔[۱]

---

[۱] شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، مطبع مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ ۱۹۸۲ء۔ صفحہ ۱۸۵ تا ۱۸۶

ڈاکٹر عابد حسین

ڈاکٹر صغریٰ مہدی

کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے وجود سے اس دنیا کو معنویت دیتی ہیں جو اپنی ذات میں نہ جانے کتنے ادارے سمیٹے ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کچھ خداداد صلاحیتوں کا حصہ ہوتا ہے کچھ خاندان و درس گاہوں کا اور زیادہ تر خود ان کی اپنی کوششوں کا ایسے ہی لوگوں میں ڈاکٹر سید عابد حسین بھی تھے۔

ان کا تعلق یوپی کے مشہور مقام قنوج کے قریب بسے ایک چھوٹے سے گاؤں دامی پور سے تھا۔ ان کے خاندان میں کاشت کاری ہوتی تھی اور گھر کے بعض افراد ملازمت میں بھی تھے۔ خاندان کا رجحان حصول زر سے زیادہ عبادت الٰہی اور شعر و ادب کی طرف تھا۔ ان کے دادا سید مہدی حسین ریاست بھوپال میں ناظم تھے۔ اور والد سید حامد حسین بھی وہیں ملازم تھے۔ والد اور دادا دونوں فارسی اور عربی کی اچھی استعداد رکھتے تھے والد شاعری بھی کرتے تھے اور تاریخ گوئی میں خاص مہارت رکھتے تھے ان کی والدہ سلطان بیگم کا تعلق موہان کے تعلقدار سادات خاندان سے تھا۔ عابد حسین صاحب بھوپال میں ۲۵ جولائی ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن بھوپال، دامی پور اور لکھنؤ میں گزرا جہاں ان کی نانہال تھی۔ ان کے ددھیال میں بے عملی اور توکل میں زیادہ فرق نہیں کیا جاتا تھا اس لیے بہت تنگی اور عسرت میں بسر ہوتی تھی۔ نانہال البتہ خوشحال تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر میں اور گاؤں کے مدرسے میں ہوئی اور ثانوی تعلیم بھوپال میں۔ میٹرک میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور وظیفہ لیا۔ اور بی۔ اے کے لیے الٰہ آباد میور سینٹرل کالج میں داخلہ لیا۔

۱۹۲۰ء میں بی۔ اے میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے علی گڑھ کالج میں انگریزی ایم اے میں داخل ہوئے۔ ابھی ایم۔ اے مکمل نہیں کیا تھا کہ ریاست بھوپال سے وظیفہ مل گیا اور وہ بغرض حصول اعلیٰ تعلیم ولایت روانہ ہو گئے۔

عابد صاحب کا علی گڑھ میں قیام اگرچہ بہت مختصر رہا، لیکن یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہاں ہی انھوں نے اپنی زندگی کے مقاصد کا دھندلا سا ہی سہی مگر نقشہ بنا لیا تھا۔ علی گڑھ کالج اس زمانے میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا اور مسلمانوں کی تعلیمی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا مرکز تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی نئی نسل یا تو علی گڑھ کی تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھی اور جو اس میں تعلیم نہیں پا رہے تھے وہ بھی علی گڑھ سے ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ عابد صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا۔ بی۔ اے کے بعد انھوں نے علی گڑھ کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا۔ اس کے بارے میں اپنی خودنوشت میں میں لکھتے ہیں:

> "ان دنوں میں علی گڑھ کالج تعطیل کلاں کے بعد غالباً ستمبر یا شروع اکتوبر میں کھلتا تھا۔ بی۔ اے کا نتیجہ جہاں تک مجھے یاد ہے شروع جون میں نکلا تھا۔ اس چار مہینے کے وقفے میں مجھے علی گڑھ جانے کی تیاری

کرنی تھی۔ جس کا سب سے اہم جز ایسے کپڑے بنوانا تھا جنھیں پہن کر میں ایم۔ اے او کالج کے خوش وضع اور طرح دار ماحول میں کھپ سکوں۔ اپنے مقامی وظیفوں سے میں نے کسی نہ کسی طرح اتنی رقم بچالی کہ سیاہ رنگ کے خاصے قیمتی کپڑے کی شیروانی اور چاندنے جوڑے کہتے پاجامے بنوا سکوں اور ایک اچھی ترکی ٹوپی خرید سکوں۔"[1]

اس سلسلے میں آگے چل کر اپنے ایک مضمون رشید و مرشد میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ۱۹۱۸، ۱۹۱۹ میں ایم۔ اے۔ او کالج کے ان طالب علموں میں جو بی اے کا امتحان دینے الہ آباد آئے تھے اور مسلم ہاسٹل میں ٹھہرائے گئے تھے رشید احمد صدیقی بھی تھے۔ میں اس ہوسٹل میں ۱۹۱۷ سے رہتا تھا اور علی گڑھ سے جو مہمان آئے تھے ان سے معمولی صاحب سلامت ہو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح رشید احمد صاحب سے بھی ہوئی۔۔۔ مجھے خیال آیا کہ ان کو خط لکھوں اور یہ درخواست کروں کہ ایم اے او کالج اور ہوسٹل میں داخلے کے مراحل طے کرنے میں میری مدد کریں چنانچہ جی کڑا کر کے میں نے انھیں خط لکھ ڈالا۔ پانچ چھ دن میں ان کا جواب آگیا جس کے ہر لفظ سے خلوص اور گرم جوشی ٹپکتی تھی۔ علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ رشید صاحب سید محمود کورٹ کے اتالیق کی حیثیت سے آدم جی پیر بھائی منزل کے اندرونی حصے میں رہتے ہیں۔ وہاں پہنچا تو اس طرح ملے جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں اور اصرار کر کے اپنے پاس ٹھہرایا۔"

"اس وقت یونیورسٹی میں جو سیاسی کھلبلی مچی ہوئی تھی اس کا ذکر کرنے کے بعد اس مضمون میں عابد صاحب لکھتے ہیں کہ رشید صاحب کے یہاں سہ پہر سے شام تک ان کے کچھ خاص احباب کی ایک بزم بے تکلف برپا ہوتی تھی۔ اس کے بے ضابطہ صدر ذاکر صاحب ہوتے تھے۔ جن کو رشید صاحب اور ان کی بازگشت کے طور پر دوسرے دوست بھی "مرشد" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے حسن صورت اور حسن سیرت جودت طبع تقریر کی لذت اور مجموعی شخصیت کا ذکر پہلے بھی سن چکا تھا اور شاید مسلم ہوسٹل الہ آباد میں بی۔ اے یا ایم۔ اے پریویس کے امیدواروں میں جو علی گڑھ سے امتحان دینے آئے تھے ان کی ایک جھلک بھی دور سے دیکھی تھی مگر ملاقات کا شرف اب تک حاصل نہیں ہوا تھا۔

رشید صاحب کے یہاں اپنے قیام کے پہلے یا دوسرے دن سہ پہر کو بزم بے تکلف میں ان کی زیارت ہوئی اور واقعی ایک ملاقات نے میرے دل و جگر کو موہ لیا۔ ان صحبتوں میں طرز کلام عام طور پر گپ شپ، نوک جھونک قہقہوں، چہچہوں کا ہوتا تھا مگر موضوع کلام اکثر سنجیدہ مسائل ہوتے تھے۔ خصوصاً ترک تعاون کی تحریک اور ایم۔ اے او کالج پر اس کے امکانی اثرات۔ شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی شرکائے بزم ترک تعاون کو ملک کے لیے خاص طور سے تعلیمی اداروں کے لیے مضر بلکہ مہلک سمجھتے ہیں مگر جب ہم لوگوں نے یونین ہال میں سیاسی لیڈروں کی ہیجان خیز اور ولولہ انگیز تقریریں سنیں اور جامعہ ملیہ کے تاسیس کے جلسے میں جو کالج کی مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کا بصیرت افروز اور دلدوز و جاں سوز خطبہ سنا تو ہم میں سے بعض کے دل و دماغ میں رد و قبول کی کشمکش نے ایک طوفان اور ہیجان برپا کر دیا۔

کالج کی عام فضا سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس تاثر کو غالب کے ایک شعر کی تضمین میں ظاہر کیا جس کے اس وقت صرف چند شعر یاد آرہے ہیں۔

دنیا میں کچھ عجیب تلاطم ہے ان دنوں
اس کشمکش میں دیکھتا ہوں بحر و بر کو میں
دل بھی ہے ایک چھوٹی سی دنیا بجائے خود
ہلچل میں یاں بھی پاتا ہوں ہر دشت و در کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں تو تھوڑے ہی دن بعد کالج سے جو اس دوران یونیورسٹی بن گیا تھا رخصت ہو گیا۔" [۲]

اپنے علی گڑھ کے اس مختصر قیام میں عابد صاحب نے علی گڑھ میگزین میں کئی مضامین اور نظمیں لکھیں۔ اس میں ایک کا ایک ترجمہ بھی شائع ہوا۔ انھوں نے الہ آباد میں ایک نظم "شرح درد اشتیاق" لکھی تھی وہ جب علی گڑھ میگزین میں چھپی تو اس کو پڑھ کر اکبر الہ آبادی نے ان کو ایک خط لکھا جسے ایڈیٹر علی گڑھ میگزین نے اپنے نوٹ کے ساتھ میگزین میں شائع کیا۔

"یہ صحیفۂ کرامت ہمارے مکرم سید عابد حسین کے نام صادر ہوا ہے۔ ان کی نظم "شرح درد اشتیاق" کے متعلق فرمایا ہے۔ "آپ کی نظم نے مجھ کو آپ کا بہت مشتاق کر دیا ہے۔ خصوصاً آخر کے تین بند تو ایسے ہیں کہ میں نے بے اختیار کہا ؎

آپ کی ہستی تو راہِ ذوقِ عرفاں میں کٹی
کاش چھوڑے آپکے دامن کو یونیورسٹی

ماشاءاللہ نہایت اعلیٰ قابلیت ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے زندہ رہا تو ضروری ملنا ہوگا۔" [۳]

انھوں نے اپنی جس تضمین کے چند اشعار کا ذکر "رشید و مرشد" میں کیا ہے وہ "تصویر تلون" کے عنوان سے علی گڑھ میگزین میں ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تو اس کے ایڈیٹر رشید احمد صدیقی نے اس پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا۔

"ہمارے مکرم دوست سید عابد حسین صاحب میور سنٹرل کالج الہ آباد سے اسی سال نہایت اعزاز کے ساتھ بی۔ اے۔ پاس کر کے ہم میں آملے ہیں۔ "تصویر تلون" آپ کی ذہانت اور ذکاوت کی خاموش تفسیر لیکن بولتی ہوئی تصویر" ہے۔ ناظرین اس کا مطالعہ کرنے کے بعد خود یہ رائے قائم کر لیں گے کہ ہمیں سید صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بالکل خاموش رہنا چاہیے یا اس سے زیادہ کہنا چاہیے تھا۔"

اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عابد صاحب نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا علی گڑھ میگزین سے کی۔

جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے اپنی خدمات جامعہ ملیہ کے لیے پیش کر دیں جامعہ کا علی گڑھ سے گہرا تعلق تھا جو لوگ جامعہ کو چلا رہے تھے وہ علی گڑھ کے طالب علم تھے اور اس کے سرپرست بھی کسی نہ کسی طرح علی گڑھ سے وابستہ تھے۔ ایک جگہ عابد صاحب نے لکھا ہے "جامعہ ملیہ دو تحریکوں کے ملنے سے وجود میں آئی ایک تو تعلیمی آزادی اور ذہنی آزادی کی تحریک جو مسلمانوں کے دینی مدارس کی شکل اور دنیوی مدارس میں خاص طور سے علی گڑھ کالج میں ایک نصب العین کی صورت میں موجود تھی، دوسری سیاسی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک جسے مسلمانوں نے پہلی جنگ کے بعد اختیار کیا تھا۔" [۴] اس طرح وہ لوگ جو جامعہ میں تھے وہ علی گڑھ کے اس نصب العین تک پہنچنے کی سعی کر رہے تھے۔

عابد صاحب کا علی گڑھ سے باضابطہ تعلق نہ ہونے پر بھی وہ شروع سے آخر دم تک علی گڑھ سے وابستہ رہے اور ان لوگوں کا ساتھ دیتے رہے جو علی گڑھ کی بقا اور تعمیر کے لیے کوشاں تھے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے عابد صاحب کو جرنل

ایجوکیشن کے لیے میٹریل تیار کرنے کے لیے علی گڑھ آنے کی دعوت دی مگر ذاکر صاحب کے دوران قیام میں وہ وہاں نہیں جاسکے اور جب کرنل زیدی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے تو ۱۹۵۶ء میں تین سال کے لیے عابد صاحب علی گڑھ آگئے اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ وہ جب وہاں گئے تو یونیورسٹی کو کیا مسائل درپیش تھے: "وہاں تین خاص مسئلے تھے یونیورسٹی اور مرکزی حکومت کے مابین غلط فہمیاں۔ دوسری حکومت یو۔پی۔ اور یونیورسٹی کے مابین پھیلی ہوئی بدگمانیاں۔ غیر مسلموں کے ایک بڑے طبقے کا یونیورسٹی کی طرف جارحانہ رویہ......... میں نے حکومت کے شکوک کا ازالہ کرنے میں حکومت کی جانب سے مقرر کردہ انکوائری کا سامنا کرنے میں، یونیورسٹی کے خلاف تمام الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے میں اور اسی کے ساتھ بہتر اور پہلے سے زیادہ خوشگوار پبلک تعلقات قائم کرنے میں وائس چانسلر کی مدد کی۔"[۲] اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کو علی گڑھ سے کس قدر تعلق تھا۔ اور ان سے جو کچھ بھی ہو سکا انھوں نے اس کے لیے کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

۱۹۲۶ء میں جرمنی سے آکر ۱۹۵۶ء تک انھوں نے جامعہ ملیہ میں مختلف کام کیے۔ انتظامی کام بھی اور تدریس کا کام بھی۔ تصنیف و تالیف کے کام بھی۔ یہاں سے نکلنے والے پرچے "جامعہ" کی ایک عرصے تک ادارت بھی کی اس کے لائف ممبر اور ٹرسٹی بھی رہے اور جامعہ سے منصبی تعلق نہ رہنے پر بھی آخر دم تک جامعہ سے متعلق رہے اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔

گاندھی کی واردھا اسکیم کے تعلیمی سنگھ کے ایک مدت تک ممبر رہے ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی اور ان کے حقوق کے تحفظ میں آواز اٹھانے کے لیے ایک پندرہ روزہ "نئی روشنی" نکالا۔ آفیشل لینگویج کمیشن کے ممبر رہے۔ ریڈیو کے ساہتیہ صلاح کار رہے۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور ادبی و تہذیبی انجمنوں کے ممبر رہے۔ مگر ان کی اصل توجہ تصنیف و تالیف پر رہی اس سلسلے میں ان کا ایک اہم کام مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر اردو انگریزی لغت کی تدوین ہے۔

ان کا اصل میدان ترجمہ تھا۔ انھوں نے بہت سی اہم کتابوں کے ترجمے کیے۔ جرمن زبان سے اردو میں اور انگریزی سے اردو میں گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی اہم تصانیف کا ترجمہ کرکے انھیں اردو داں طبقے سے روشناس کرایا۔ انھوں نے گوئٹے کی شہرۂ آفاق تصنیف "فاؤسٹ" کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے لیے جو میدان چنا وہ بہت اہم اور مشکل تھا۔ یعنی ہندوستانی تہذیب اور تمدن اور اس کے پیچیدہ مسائل۔ ان کی سب سے اہم کتاب "قومی تہذیب کا مسئلہ" ہے جو انگریزی میں بھی NATIONAL CULTURE OF INDIA کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی آخری کتاب "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" اور انگریزی میں DISTINY OF INDIAN MUSLIMS ہے۔ یہ کتاب عابد صاحب کا اس اہم کام کی طرف پہلا قدم تھا جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ISLAM AND THE MODERN AGE SOCIETY قائم کرکے کیا۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ سب مذاہب ایک دوسرے کے قریب آئیں اور اسلام کے پیرو جدید زمانے کے چیلنج کا مقابلہ کریں اور آخر ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔

انھوں نے اپنی ادبی تحریروں میں جو تعداد میں زیادہ نہیں ہیں ادب کے اہم مسائل کو پیش کیا۔ اور اس علمی نثر کی روایت کو آگے بڑھایا اور جس کی داغ بیل سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے ڈالی تھی۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عابد صاحب نے اپنے طور پر اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں کے لیے اس طرح کے کام کیے جو سرسید نے کیے تھے یا کرنا چاہتے تھے۔

عابد صاحب نے اپنی منزل کا تعین ابتدا سے ہی کر لیا تھا اور پوری زندگی اس منزل کو پانے کی سعی میں گذار دی۔ انھیں یقین تھا کہ انھوں نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا ہے وہ صحیح ہے اس لیے اس راہ میں آنے والی کٹھنائیوں کو پامردی اور خوش دلی سے جھیلا وہ ایک مفکر بھی تھے اور ایک عملی انسان بھی ان کے یہاں فکر و عمل کی راہیں الگ الگ نہیں تھیں۔ انہوں نے مذہب، انسانیت، ملک، قوم و ملت اور خاندان سب کے فرائض ادا کیے مگر اپنی ذات کو بھی فراموش نہیں کیا مگر اس کی محبت کو کبھی غالب نہیں آنے دیا۔

---

[۱] حیات عابد صفحہ ۹۰ مرتبہ صغرا مہدی ۱۹۸۴ء علی گڑھ میگزین ۱۹۸۳ء صفحہ ۵۰

[۲] علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۷۹

[۳] ایک سوالنامہ سے

مولانا ابوبکر شیث

محمد صابر صبرحدی

شیراز ہند "جون پور" یوپی کا ایک متوسط درجے کا شہر ہے لیکن
س کی مٹی میں وہ تاثیر ہے کہ یہاں علما، صوفیا، صلحا، ادبا اور شعرا
ی تعداد میں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیت
وجہ سے اقوام عالم پر غیر فانی نقش مرتسم کیے، جن میں مولانا افضل،
احمد، مولانا باب اللہ، مولانا عبدالرشید، مولانا الہ داؤد،
لانا سخاوت علی اور ملا محمود وغیرہ کے نام نامی خاص طور پر قابل ذکر
ہیں۔ ملا محمود عربی کی مشہور کتاب شمس بازغہ کے مصنف بھی ہیں
ر تقریباً سبھی حضرات نے کثیر تعداد میں تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا جو
ن حضرات کی ذہانت اور عبقریت کی غماز ہیں طوالت کی وجہ سے ان
احاطہ ممکن نہیں ہے۔

یہ ہستیاں گرچہ سپرد خاک ہو چکی ہیں مگر ان حضرات کے علمی و
دبی، اور دینی و مذہبی کارنامے آج بھی کتابی شکل میں موجود ہیں اور
صرف یہ کارنامے گزرے زمانے کے اوراق پارینہ ہیں، بلکہ وہ منارۂ
رہی ہیں جن سے قوموں کے سفینے نشان راہ تلاش کر سکتے ہیں کیونکہ
سلاف کے ذکر کا مقصد صرف فخر نہیں ہوتا بلکہ ان کے کارناموں کی روشنی
ن ذہنی و فکری تبدیلی بھی ضروری ہے اور ہم اپنے عمل و گفتار اور کردار
ے یہ ثابت کر دیں کہ ہمیں ان سے محبت اور عشق ہے۔ اس کے علاوہ
ماہان شرقی کی تعمیر کردہ وہ عمارات ہیں جو ان کی عظمت رفتہ کی نشاندہی
رہی ہیں ان عمارات کے دیکھنے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ فن تعمیر
یہ متعلق ان کا ذوق کس قدر بلند تھا۔

مسلم اقتدار کی یہ اہم خصوصیت رہی ہے کہ ان کے دور حکومت
میں ارباب کمال کی ہر ممکن پذیرائی ہوا کرتی تھی چنانچہ اموی دور سے
مغلیہ دور تک ہمیں اس کی بے شمار نظیریں ملتی ہیں۔ مغلوں کے ہر زمانے
میں اہل علم، اصحاب فن اور ارباب کمال کا جو جمگھٹ رہتا تھا اس
سے نہ صرف بادشاہ کے دولت و اقتدار کو دوام حاصل ہوتا رہا بلکہ
اسلامی ثقافت بھی اپنی منزلیں طے کرتی رہی اور عوام الناس کو اپنی
افادیت اور اہمیت کا گرویدہ بناتی رہی۔ ؎

ہر کجا بود چشمۂ شیریں ؛ مگس مور، ملخ می آیند

مولانا ابوبکر شیث اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے جن کی
پیدائش اسی مردم خیز شہر کے محلہ قضیانہ میں ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ یہ
محلہ قاضیوں اور اہل علم کا مسکن تھا مردم خیزی کی یہ صفت صرف
جون پور شہر تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ اس کے دیہاتوں کی مٹی سے بھی
وہ لعل و جواہر پیدا ہوئے جنہوں نے علمی و مذہبی دنیا میں برتری
حاصل کی انہیں نامور ہستیوں میں "جنتی حور" کے مصنف عبداللہ شاہ
(صبرحدی)، ہندی اور فارسی کے مایہ ناز صوفی شاعر نور محمد شاہ کامیاب
(صبرحدی)، جن کی دو مشہور کتابیں "اندراوت" اور "انوراگ بانسری"
ہیں جو ہندی شاعری میں اہل علم کے نزدیک سنگ میل کی حیثیت
رکھتی ہیں یہ دونوں کتابیں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں موجود
ہیں۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ مولانا سلیم، مولانا امیر علی،
مولانا عبدالعلی "بحرالعلوم"، مولانا حسین علی بھی اسی قصبہ صبرحد

سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا حسین علی اپنے وقت کے جید عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے اور مولانا امانت اللہ فصیحی غازی پوری کے حلقۂ ارادت سے منسلک تھے اور انہیں کے حکم کے مطابق صوبہ بہار "کدرا" کے نواح میں رشد و ہدایت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور آخری آرام گاہ بھی کدرا کی جامع مسجد کو منتخب کیا۔ مشہور صوفی الہی شاہ کا روضہ آج بھی صبر حد میں ہر خاص و عام کے لیے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

محلہ قضیانہ میں مولانا ابو بکر شیث کے علاوہ اور بھی قابل قدر مفتی، قاضی، فقیہہ اور محدث پیدا ہوئے۔ جو اپنے زمانہ ترقی کے آفتاب و ماہتاب تھے اور آج بھی زمانہ ان کے سرچشمۂ فیوض و برکات سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم ان کے والد مولانا ابوالخیر اور سید امین بن طہ شریف کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے بعد حفظ قرآن کیا حفظ قرآن کے بعد قصبہ "آرہ" میں علامہ شیخ عبد اللہ غازی پوری کی خدمات میں مزید حصول علم کے لیے حاضر ہوئے اور اس وقت کی مروجہ درسی کتابوں کا درس لیا۔ اس کے بعد قاضی محمد بن عبد العزیز مچھلی شہری سے صحیح بخاری اور بلوغ المرام کا درس لیکر وطن مالوف واپس آگئے اور جون پور شہر میں دو سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر مدرسہ قرآنیہ جون پور کے مہتمم مقرر ہوئے۔

مولانا کی زندگی کا دوسرا دور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شروع ہوتا ہے جس کا ذکر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "گنجہائے گرانمایہ" میں تفصیل سے کیا ہے۔

مولانا حد درجہ قناعت پسند تھے اور گھر پر اتنی زمین جائداد تھی جو ان کی گذر بسر کے لیے کافی تھی مگر رشید صاحب کے اصرار پر علی گڑھ میں دینیات کی تعلیم اور اس شعبہ کی نظامت کے لیے راضی ہو گئے اور شرط یہ رکھی کہ میری تقرری کے سلسلے میں کسی کی خوشامد نہ کرنا اور میں کسی کے سامنے انٹرویو کے لیے نہیں جاؤں گا۔ بالآخر اسی شان بے نیازی کے ساتھ علی گڑھ تشریف لائے اور شعبۂ دینیات کی صدارت و نظامت سنبھال لی۔ مولانا نے اپنی زندگی کے تیرہ سال مسلم یونیورسٹی میں گزارے اور شعبۂ دینیات جس میں کتابوں کی تعداد محدود تھی اس کے لیے جہاں کہیں بھی سراغ ملتا کہ کوئی نئی کتاب حدیث، تفسیر، فقہ پر شائع ہوئی ہے اس کے لیے فوراً خط لکھ کر لائبریری کے لیے منگواتے اس طرح شعبۂ دینیات میں اچھی خاصی کتابوں کا ذخیرہ ہو گیا۔ یونیورسٹی کا قبرستان جہاں آج ہر طرح کی سہولت ہے یہ سب مولانا ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے ورنہ میت کے غسل کے لیے قبر کھودنے کے لیے کوئی معقول انتظام نہ تھا اور قبرستان میں کوئی سایہ دار درخت بھی نہ تھا مولانا نے اس کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور ہر چیز کا انتظام کیا۔ یونیورسٹی ہالس کی مساجد میں نماز کی پابندی کا اہتمام کرنے میں پوری کوشش کی اور خود لوگوں کے اصرار پر یونیورسٹی کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ مولانا کی علمی صلاحیت، اصابت رائے اور خلوص نیت کے سبھی معترف تھے ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ ان کے حسن اخلاق، اعلیٰ ظرفی اور معاملہ فہمی کی بدولت عصری علوم کے ماہرین اور جدید علوم کے پرستاروں کی نگاہ میں علما اور مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا اور ان لوگوں کے بارے میں اچھی رائے قائم ہوئی۔

کچھ شخصیتیں اپنے اندر مقناطیسی قوت رکھتی ہیں جن سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ مولانا اردو، فارسی اشعار کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان کو موقع و محل کے لحاظ سے مجالس میں سنا کر مجلس کو کشت زعفران بنا دیتے مولانا کا تصنیفی سرمایہ کم ہے جن میں "سیرت رسول" "اصول حدیث" اور کچھ رسائل ہیں مگر اس کے علاوہ فن خطاطی، علم ہندسہ، علم تقویم سے خاص شغف تھا۔

عقائد اسلام کے بنیادی اصولوں کے بارے میں سخت تھے البتہ فروعی مسائل میں نرم رویّہ اختیار کرتے تھے اور علمائے سلف کے عقیدہ پر قائم تھے اور امام احمد بن عرفان شہید کے متبعین میں سے تھے اور سید ضیاء النبی حسنی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔

مولانا مجموعی خصوصیات کی بنا پر اپنا جواب آپ تھے تواضع، انکساری اور تقویٰ ان کے اوصاف حمیدہ میں شامل تھے ان سے ایک بار ملنے کے بعد ہر شخص دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ بشیر الدین صاحب جو اس وقت مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

میں لائبریرین تھے۔ ان کو کچھ مخطوطات کی نقل اور فہرست تیار کی
ی کیونکہ عبارت صاف نہیں تھی بشیر صاحب نے مولانا سے کہا
می آپ کی نگاہ میں ہو تو اس کا نام بتائیے تاکہ اس کے سپرد
یا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں خود حاضر ہوں بشیر صاحب نے کہا
یشان ہو جائیں گے مگر مولانا نے نہایت خاموشی اور مستعدی سے
و کر کے بشیر صاحب کے سپرد کر دیا جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔
ہ جب کوئی طالب علم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا اور گذارش
ا آپ سے کچھ پڑھنا چاہتا ہوں مولانا بلا تکلف خوشی خوشی اس
، کی اجازت دیتے اور نہایت دلجمعی کے ساتھ اس کو بغیر کسی
کے پڑھاتے۔ مولانا سیاسی طور پر جمعیۃ العلما کے ایک رکن
س کے اجلاس میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ جنگ آزادی
ہ خلوص وثبات سے حصہ لیا وہ اپنی زندگی ہی میں ملک کو آزاد
یا ہتے تھے اور سیاسی جدوجہد کے معاوضہ میں نہ ستائش کی
نہ صلے کی پرواہ سے بے نیاز رہے کیونکہ ان کے مزاج میں حد

درجہ سادگی تھی جس کی وجہ سے وہ نام ونمود سے دور بلکہ کوسوں دور رہنا پسند کرتے تھے۔

آخر وہی ہوا جس کا اعلان قرآن نے بہت پہلے کل نفس ذائقة الموت کی شکل میں کر دیا ہے چنانچہ گلے کے مہلک مرض "کینسر" میں مبتلا ہوئے اور طویل علالت کے بعد ۱۹۸۰ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور آبائی قبرستان "جون پور" میں تجہیز وتکفین ہوئی۔ جس نے ماں کا شکم دیکھا ہے اس کو قبر کی تنہائی سے بھی دوچار ہونا ہے۔ انتقال کے وقت عزیز واقربا کے علاوہ شہر کے ہر مکتب فکر کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جنازے میں شریک تھے اور سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اور زبان پر علامہ اقبال کے یہ اشعار تھے ؎

موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں
آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حواشی

سید عبد الحی ـــ نزہۃ الخواطر دائرۃ المعارف الاسلامیہ
جلد ہشتم حیدر آباد ۱۹۷۰ء
۲۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ـــ گنجہائے گرانمایہ
۳۔ مولانا رحمن علی ـ تذکرہ علمائے ہند۔ پاکستان
۱۹۶۱ء

"سرسید نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی اور ایک ایسے کام
کی طرف ہماری توجہ دلائی جس کو کوئی دوسرا انجام نہیں دے رہا تھا۔ ان مسائل
سے متعلق چاہے ہم کسی نتیجہ پر پہنچیں، لیکن ان کی جسارت فکر ان کے خلوص
نیت اور اس راہ میں ان کی اولیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی عظمت
کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ زمانۂ حال کے تمام اسلامی مفکرین نے ان
خیالات اور اجتہادات سے خوشہ چینی کی ہے اور آج ان کے نیچری ہونے پر
کفر کا فتویٰ دینے والا طبقہ بھی اسلام کو دین فطرت ماننے پر مجبور ہے۔"

—— محمد عمر الدین

پروفیسر ابوبکر حلیم

جلیل قدوائی

پیچھلے دنوں پروفیسر ابوبکر احمد حلیم کا ہمارے درمیان سے
دیکھتے ہی اٹھ جانا پاکستان کے سر پر جس کی حالت اہل علم وفضل کے
ے کسی طرح قابل رشک نہیں کہی جا سکتی قیامت کا گزر جانا ہے۔ اگرچہ
ے ملک میں خود رو اور خود ساختہ قسم کے ،،پروفیسروں،، کی کمی نہیں
یم صاحب پروفیسروں کے پروفیسر اور پیروں کے پیر تھے۔ مرید
ہ اہل صفا کے پیر ہوئے۔

ابھی ڈاکٹر ممتاز حسن اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کی موت پر قوم کے
شک نہ ہوئے تھے کہ اسے اس سانحۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔ نواب
ملک کے مرثیہ میں خوشی محمد ناظر خاں نے کس قدر حسب حال لکھا تھا
ا ہم سے چھینے بے بہری قضا نے ⁂ وہ علم کے دفینے وہ عقل کے خزانے
اس شام میری سب سے چھوٹی بیٹی تنزئین کی مہندی کی رسم
اور دوسرے دن اس کا نکاح تھا جس میں انہیں شریک ہونا تھا
ے ہاں کی تقریبوں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ میرے بیٹے
خالد قدوائی کے نکاح میں پچھلے دنوں شریک ہوئے تھے۔ تنزئین
ل مہندی کی شرکت کی غرض سے میرے ایک عزیز اپنی خواتین کو لے
ے پاس بیٹھتے ہی آہستہ سے بولے۔ "لیجئے ہمارا ایک ستون اور گر گیا"
ہا نہیں تو فرمایا آپ نے پانچ بجے شام ریڈیو پر نہیں سنا کہ حلیم صاحب کا
ل ہو گیا اور آج ہی رات انہیں پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان
ن کر دیا جائے گا۔ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی، دماغ کو ایک
سا لگا اور دل پر کیا کہوں کیسی اداسی چھا گئی۔

اس کے جاتے ہی یکایک جو اداسی کا سماں چھا گیا رات کو محفل پہ سے کیا معلوم
کیسی حال میں وہ شام اور رات بسر ہوئی اور کس طرح دوسرے
روز نکاح کی تقریب انجام کو پہنچی! کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا ہو رہا ہے، کیا ہو گیا
سارا عرصہ میرا حال۔ "دل من داند و من دانم و داند دل من" کے مصداق رہا۔
میت و جنازہ میں شرکت ناممکن تھی۔ سویم میں ان کے سابق دولت کدہ
پر گیا۔ ایک پارہ پڑھ کر ان کی روح کو بخشا۔ اس کوٹھی پر از خود یا ان کی
طلبی پر جاتا ہی رہتا تھا اور سناٹے میں بیٹھ کر ان سے باتیں کر کے چلا
آتا تھا مگر آج وہاں کا حال ہی کچھ اور تھا۔ سوگواروں کا ازدحام تھا۔

کراچی کے تعلیمی و ثقافتی حلقوں، سرکاری حکام، سوشل کارکنوں،
یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کا ہر طرف ہجوم تھا۔ اور خاص طور پر حلیم صاحب
کے بہاری حلقے کے احباب اور کم و بیش سارے ہی مقامی قابل ذکر
علی گڑھ اولڈ بوائز جمع تھے، نڈھال، فگار، با چشم پر آب! مگر زندگی میں
پہلی بار علی گڑھ والوں سے ملنے کی جی میں کوئی امنگ نہ پیدا ہوئی۔ خیر
نظریں ملیں تو جلد احسان رشید، پروفیسر مجتبیٰ کریم، ایس ایس جعفری
میجر آفتاب حسن، میجر امرار حسن خاں اور ابرار حسن خاں سے دو دو چار چار
باتیں کرتا، نہ جانے کتنوں سے آنکھیں چراتا، چپکے سے وہاں سے آنکھیں
چراتا چل دیا اور برادرم اشفاق الرب سائل کے ساتھ ان کی موٹر پر
ان کے ساتھ واپس آ گیا۔

مرحوم کے پس ماندگان اور دیگر اعزا سے پرسش احوال کی ہمت
نہ ہوئی۔ وہ ہی تین دن پہلے ان کی دریافت خیریت کے سلسلے میں ہسپتال گیا تھا

ان کی بیگم نے بتایا کہ حالت اطمینان بخش ہے اور ڈاکٹروں نے کہدیا ہے
کہ وہ دو دن بعد واپس گھر جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اسی بھی خبر
دوسرے دن اخبار میں پڑھ لی کہ جمعہ کو گھر چلے جائیں گے۔ بھارت سے
ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنے چچا ڈاکٹر محمود حسین خاں مرحوم کی تعزیت کے
سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ انہیں لے کر ڈاکٹر احسان رشید انجمن ترقی اردو
میں آئے۔ حلیم صاحب کا ذکر آیا اور میں نے ان کی صحت کا حال بتایا اس پر
صدر انجمن جناب اختر حسین نے فرمایا کہ وہ گھر واپس تشریف لے آئیں تو ہم
ان سے ملاقات کرنے جائیں گے۔۔۔

مگر کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا!

دراصل ان کے دل پر حملے کا سان گمان بھی نہ تھا کبھی بلڈ پریشر کی شکایت
بھی سننے میں نہ آئی تھی۔ یہ شاخسانہ یکایک نہ جانے کہاں سے نکل آیا۔
احباب کو علم ہے کہ ان کے ٹخنوں اور پنڈلیوں میں تکلیف رہنے لگی
تھی۔ درد ہوتا تھا اور سنبھل سنبھل کر چلتے تھے۔ عرصے سے جسم قدرے بھاری
ہو گیا تھا۔ حال ہی میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اندرون
سندھ گئے تھے۔ واپسی پر تکلیف بڑھ گئی۔ ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کو
منع کر دیا۔ بلکہ بستر پر لٹا دیا تھا اسی کا علاج ہو رہا تھا اور بس یہی ساتھ
ان کی وفات کی وجہ ہے جگر صاحب کے الفاظ میں ہے

جب سے اس نے پھیر لیں نظریں رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی، آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہئے!

والا معاملہ خاص طور پر اس لیے ہے کہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کئی سال سے
حلیم صاحب سید راس مسعود مرحوم کی لائف اور کارناموں پر ایک کتاب
کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ مسعود مرحوم کو مسلمانان برصغیر کی تعلیم کے
میدان میں سرسید کا جانشین اور مادری زبانوں میں ذریعہ تعلیم کے
اصول کا سب سے پہلا اور بہت بڑا مینار سمجھتے تھے۔ مسعود سے ان کی
بڑی عقیدت تھی جس کی بنا پر حلیم صاحب نے موصوف کی کتاب "سفرنامہ
جاپان" (انگریزی) پر جسے ۱۹۶۰ء میں راس مسعود سوسائٹی نے مرکزی
حکومت کی امداد سے شائع کیا تھا اور مقدمہ لکھا تھا۔ اس سلسلے میں
پروفیسر ایم ایم احمد، حلیم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے فون پر
مجھ سے بڑی حسرت سے فرمایا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور میں نے
کچھ نہ کیا اگر اپنے مرنے سے پہلے راس مسعود مرحوم پر کتاب مکمل نہ کی۔ نیز
راس مسعود سوسائٹی کے اعزازی معتمد کی حیثیت سے انہوں نے اس
کام میں مجھ سے اشتراک چاہا وہ خود سوسائٹی کے ایسوسی ایٹ ممبر تھے چنانچہ
میں نے نہ صرف سوسائٹی کی جملہ مطبوعات بلکہ موضوع متعلقہ کے بارے میں جو
کچھ بھی مسالا میرے پاس تھا ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

کام شروع ہوا تو ایک لمبی فہرست پاکستان اور بھارت میں مسعود
مرحوم کے قدر دانوں اور نام لیواؤں کی تیار ہوئی، کئی صفحات کا ایک
مکمل سوال نامہ جو حلیم صاحب کے مراسلات کے ساتھ ان سب حضرات کو
بھیجا گیا۔ کچھ جوابات وصول ہوئے جنہوں نے نہیں بھیجے انہیں یاد دہانی
کے خطوط لکھے گئے۔ کم و بیش دو درجن ان مطبوعہ کتابوں کی فہرست تیار
ہوئی جن میں مسعود کے حالات زندگی متفرق اور منتشر طور پر بکھرے ہوئے
ملتے تھے پرانے اخبارات کے تراشے اور بعض رسائل میں مطبوعہ مضامین
جو مسعود پر کتاب کی تیاری میں مدد دے سکتے تھے جمع کیے گئے۔ ان سب کا
مطالعہ کر کے نوٹ لینے یا ان کا خلاصہ بنانے کا کام جاری تھا۔ مسعود کے
بعض متعلقین اور اہل خاندان مثلاً بیگم چھتاری (سابق لیڈی
مسعود)، سید اکبر مسعود (اب مرحوم)، سید انور مسعود، ہاشم محمد علی،
ڈاکٹر احسان رشید، جناب ہارون رشید نیز بھارت سے بھی ڈاکٹر
سید محمود اور خواجہ غلام السیدین، پاکستان تشریف لائے تو ان ہر دو
سے بھی تفصیلی انٹرویو لیے گئے پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اپنے
بیانات قلم بند کر کے عطا کیے۔ ان سب کے خلاصے تیار ہو رہے تھے۔
بیگم اکبر مسعود کے ہاں جا کر خاندان سرسید کے دیگر بیش قیمت نوادر
کے علاوہ وہ رجسٹری شدہ دستاویز دیکھی گئی۔ جس کی رو سے سرسید
نے راس مسعود کو ان کی رسم بسم اللہ کے موقع پر کلام پاک، دیوان حافظ اور
بعض وظائف کے قلمی نسخوں کی ایک ایک جلد ہبہ کی تھی یہ نسخے بھی
دیکھے گئے۔ اور آخری علالت سے چند دن پہلے تک یہ پروگرام تھا کہ
حلیم صاحب اور میں تھوڑے وقفہ سے اتوار کے دن بیگم چھتاری اور
احسان رشید کے دولت کدہ پر جاتے اور راس مسعود مرحوم کے چھوڑے
ہوئے کاغذات سے اپنے مفید مطلب دستاویزات برآمد کرتے تھے
دراصل انہیں اس کام سے اس قدر شغف تھا کہ ہر ایک ملاقات

نہ ہوسکنے کی صورت میں دیر دیر تک مجھ سے فون پر باتیں کر لیتے تھے. اور جو تفویض کیے ہوئے معاملات کے بارے میں رفتار کار کی رپورٹ مانگتے تھے. کوئی نکتہ ذہن میں آتا یا کسی معاملے میں یاد دہانی کرنی ہوتی تو اس کے سلسلے میں باتیں کرتے اور یہ باتیں خاصی طولانی ہوتیں. وہ بڑی تفصیل میں جاتے بلکہ بعض دفعہ نہایت دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی. جیساکہ احباب کو معلوم ہے. ان کی کوٹھی ریلوے لائن سے ملی ہوئی تھی اور مقامی ٹرینیں ادھر سے ادھر جلد جلد آتی جاتی تھیں. ان کی وجہ سے شور ہونے لگتا اور گفتگو کے درمیان یکایک وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں فرماتے "ذرا ٹھہر جایئے ٹرین آرہی ہے" اور ہماری گفتگو کا سلسلہ چند منٹ کے لیے رک جاتا. ٹرین نکل جانے کے بعد پھر باتیں شروع ہوتیں. ان کے فون عموماً بعد مغرب میرے گھر پر آتے. سچ تو یہ ہے کہ ان کے علاوہ مجھے پوچھنے والا کوئی نہ تھا. اِلّا ماشاءاللہ اور جب شام کو گھر پر فون کی گھنٹی بجتی میں سمجھ جاتا حلیم صاحب ہوں گے. اور یہ خیال واقعی صحیح نکلتا. افسوس اب شام کو میرے گھر پر کوئی فون شاید ہی آتا ہو

حلیم صاحب کے بارے میں لوگوں کا عام خیال ہے کہ ان سے کام لینا بہت مشکل تھا مگر جیساکہ اوپر عرض کیا گیا میں نے ان سے سفرنامہ "جاپان" پر مقدمہ لکھوا لیا تھا. بے شک وہ کام ختم کرنے میں بہت وقت لیتے تھے مگر اس کی ایک وجہ تو ان کی عمر اور ہمہ جہتی مصروفیات تھیں دوسرے وہ لکھنے سے پہلے اپنے ہر موضوع کے ہر پہلو کے بارے میں پورا اطمینان کر لینا چاہتے تھے. ادھر ادھر سے سنے ہوئے واقعات یا غیر ذمہ دار لوگوں کے بیانات کا اعتبار نہ کرتے تھے. وہ ہر چیز مطبوعہ دیکھنی چاہتے تھے. پھر راوی اور مصنف کی حیثیت جانچتے، بیان کے سیاق و سباق پر غور کرتے اور جس موضوع یا شخص پر وہ لکھنے والے ہوتے اس کے ساتھ اپنی عقیدت اور لگن کی رو سے اس کا جو تصور یا معیار ان کے ذہن میں ہوتا اس میں اور بیان متعلقہ کے درمیان تطبیق اور عدم تطبیق پر غور کرتے اور اس طرح مطمئن ہو جانے کے بعد قلم اٹھانے کا ارادہ کرتے. تحقیق کے سلسلے میں ان کی جانفشانی کا یہ حال تھا کہ اگرچہ بابائے اردو کی "چند ہم عصر" اور مولوی عبدالرزاق کانپوری کی "یادِ ایام" میں متفرق طور پر ادھر ادھر راس مسعود کی رسم بسم اللہ کے بعد اور ان کے لیڈی اور سر تھیوڈر ماریسن کو سپرد کیے جانے کے درمیانی زمانے میں بعض استادوں کا ذکر ملتا ہے. جو مسعود کی ابتدائی گھریلو یا مذہبی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے. مگر حلیم صاحب آخر تک اس سلسلے میں مطمئن نہ ہوئے اور مفصل اور معتبر معلومات کی جستجو میں رہے.

اسی طرح علی گڑھ سے راس مسعود صاحب کے مستعفی ہونے کا مسئلہ تھا. حلیم صاحب مسعود صاحب کے زمانے میں اور ان کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے. مسعود صاحب سے اور ان سے قریبی تعلقات بھی رہے تھے انہیں اس زمانے کے حالات اور یونیورسٹی کی سیاست کا پورا پورا علم تھا. ــــــ "مرقع مسعود" شائع کردہ راس مسعود سوسائٹی میں پہلی بار اس مسئلہ پر کھل کر کچھ لکھا تھا اور علی گڑھ کے اس عہد کے بعض بااختیار اصحاب سے بھی اس مسئلہ پر ان کی باتیں ہو چکی تھیں. مگر معلوم ہوا کہ مسعود صاحب کے ایک عزیز کے پاس وہ خط بھی موجود ہے جو اپنے استعفیٰ کے سلسلے میں مسعود صاحب نے ان کے والد کو لکھا تھا اور جس میں مستعفی ہونے کے کچھ اور اسباب لکھے ہیں. چنانچہ حلیم صاحب نے اس خط کو دیکھنے اور مسعود صاحب کے ان عزیز سے ملاقات کرنے کے سلسلے میں خاصا وقت اور زور صرف کر دیا. ظاہر ہے کہ ہر ایسے محتاط اور ذمہ دار محقق کو جیسے کہ حلیم صاحب تھے اپنے کاموں کی تکمیل میں ہمیشہ دیر لگتی ہے. مگر نتائج کی کامیابی اور گوہر مقصود ہاتھ آنے کی امید میں اس ناگوار تاخیر کو گوارا بنانا پڑتا ہے.

حیرت ہوتی تھی اپنی دیگر کثیر مصروفیات کے باوجود (شاید ہی کوئی دن خالی ہو جاتا کہ "انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز" اور "موتمر عالم اسلامی، پاکستان" کے جن دونوں کے وہ صدر تھے تقریبوں سے نمٹنے کے علاوہ شہر میں کسی نہ کسی جلسۂ عام کی صدارت یا اس میں شرکت نہ کرتے ہوں) اس عمر میں وہ مسعود مرحوم کے کام کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے تھے. راس مسعود صاحب کے کم و بیش ایک درجن اسٹیل کے بکسوں میں سے ابھی صرف دو بکس دیکھے جا سکے تھے مگر انہیں میں سے بڑے بڑے نوادر ہاتھ آئے. سر سید، نواب محسن الملک، جسٹس محمود، نواب امداد امام اثر، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، سر شاہ محمد سلیمان، سر تیج بہادر سپرو، آفتاب احمد خاں، حکیم اجمل

نواب اسمٰعیل خاں، مارشل ولی خاں، شاہ محمود خاں (افغانستان) محمد ایوب خاں، بعد میں فیلڈ مارشل صدر پاکستان، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی مولوی عبدالباری ندوی، وغیرہم کی تحریریں اور خطوط سر آغا خاں کی سرکردگی میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے فراہمی چندہ کے وفد کی کراچی میں آمد اور خود راس مسعود مرحوم کراچی میونسپلٹی کی طرف سے پیش کیے گئے خطبۂ استقبالیہ کے بارے میں یادداشتیں، چودھری خوشی محمد خاں ناظر کا سر سید کی وفات پر لکھا ہوا ایک نادر مرثیہ غرض کر کہاں تک تفصیل لکھی جائے۔ ان سب سے کام لینا تھا۔ اور مسعود مرحوم کے بقیہ بکسوں سے کاغذات کی تلاش جاری تھی کہ ناگہاں حلیم صاحب کو خدائے تعالیٰ نے شاید اس دنیا کے کاموں سے بڑا کام انجام دینے کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ افسوس۔

من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال

سمجھ میں نہیں آتا کہ مسعود کے بارے میں مرحوم کا یہ منصوبہ اب کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچے گا انہوں نے تو اپنی وفات سے پہلے مجھ سے صرف دس بارہ دن کے لیے آرام کی "مزید" اجازت چاہی تھی۔ اور اس کے بعد اس کام پر تبادلہ خیال کرنے اور کام کی بعض تفصیلات طے کرنے کی غرض سے قطعی طور پر ہم سب یعنی بیگم چھتاری، احسان رشید، اور ہاشم محمد علی کو اور مجھے نام بنام اس بار اپنے گھر بلانے کا وعدہ کیا تھا

اب یہ وعدہ انہیں کیونکر یاد دلایا جائے۔
اور وعدہ خلافی کی شکایت کیسے کی جائے ؟

میں نے اس مضمون کی ابتدا میں حلیم صاحب کو پروفیسروں کا پروفیسر اور میروں کا میر کیا غلط لکھا ہے ؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں پاس ہوا اور یونیورسٹی کے بالکل ابتدائی تقررات میں ۱۹۲۱ء میں وہ بحیثیت پروفیسر و صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات تعلیمی عملہ میں شامل ہوئے۔ یعنی لیکچرر یا اسسٹنٹ پروفیسر یا ریڈر وغیرہ کی اسامی سے ترقی کر کے پروفیسری پر نہیں پہنچے، بلکہ ابتدا ہی سے پورے پروفیسر رہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ یہ شعبہ اتنا بڑا تھا کہ بعد میں اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کی پروفیسری حبیب صاحب کے سپرد کی گئی، حتیٰ کہ رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق پرو وائس

چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے علی گڑھ یونیورسٹی کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر چلے جانے کے بعد راس مسعود مرحوم کے بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ آنے پر اساتذہ کی قابلیت، کارکردگی اور تجربہ پر نظر ثانی و تحقیقات مزید کے نتیجے میں جو شکست و ریخت ہوئی اس میں بھی انہیں کوئی ہلا نہ سکا، حالانکہ ملازمت سے برطرفی کے ساتھ ساتھ بعض سینیر اساتذہ کی کم از کم عہدوں سے تنزلی کی مثالیں میری نظر کے سامنے کی ہیں ۔

۱۹۳۲ء میں میں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے سے میری ان سے نیاز مندی رہی۔ ابتدائے ملازمت سے ایک مقتدر اور برگزیدہ استاد بلکہ ایک مثالی مرد مومن کی جو روایت انہوں نے قائم کی بقول اقبال۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ..... رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اسے مرتے دم تک ہمواری کے ساتھ نباہا۔ انہوں نے اپنی اعلیٰ علمی قابلیت اور حسین و دل نواز شخصیت و سیرت کے فیض سے برصغیر کے مسلمانوں کی کم از کم دو نسلوں کی تربیت کی۔ ہزارہا طلبا کی رہبری اور دستگیری کی اور انہیں اپنی مثال سے اعلیٰ ظرف رکھنے والی زندگی کا نصب العین دکھایا۔ انہوں نے سیکڑوں اعلیٰ حکام اور منتظمین اپنی نگرانی میں علی گڑھ سے نکالے اور ان کے اثر و سایہ میں آنے والے طلبا میں سے دو تو پاکستان اور بھارت کے صدر مملکت بھی ہوئے کتنے ہی پروفیسر بھی ہوئے۔ اور اس میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ قائد اعظم کی رہبری میں پاکستان کے لیے خود ان کی اپنی خدمات کے علاوہ علی گڑھ کی وہ نسل جس نے مسلمانوں کی اس مملکت کے حصول کے لیے جنگ کی وہ ساری کی ساری ان کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی

علی گڑھ میں وہ ایک دبلے پتلے چھریرے جسم کے جوان تھے، اور زیادہ تر انگریزی سوٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ وہ انگریزی زبان کے ایک خوش گفتار مقرر تھے۔ پاکستان میں انہوں نے مستقل طور پر شیروانی پہننا شروع کی۔ اور شستہ و رفتہ اردو میں تقریر کرنے لگے۔ اردو سے انہیں عشق ہو گیا تھا۔ پروفیسر ایم ایم شریف مرحوم کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہوئے۔ انہیں کے زمانے میں ۱۹۴۳ء میں شعبہ اردو میں

میرا تقرر ہوا اور انہیں کی اجازت سے میں ۱۹۳۶ء میں حکومت ہند کی ملازمت پر گیا۔ میں اسے کیسے بھلا دوں کہ انہوں نے میری زندگی بہتر بنانے کے خیال سے یونیورسٹی سے پہلے طولانی رخصت دلانے اور پھر میرا استعفیٰ منظور کرانے میں کتنی آسانیاں مہیا کیں۔ میں نے یونیورسٹی سے رخصت ہوتے وقت اپنا نہایت عزیز ذخیرۂ کتب، اپنی مادر علمی کی نذر کیا تھا۔ انہوں نے اس واقعہ کا اپنی سالانہ رپورٹ میں خاص طور پر ذکر کیا اور اس عطیہ کی بنا پر مجھے یونیورسٹی کورٹ کے الکشن کا حق دار بنانے کے لیے میرا نام معطیان کے حلقے میں شامل کر لیا۔ اگر سر سید مرحوم نے میری زندگی سدھارنے کے لیے راہ ہموار کی تو پروفیسر حلیم نے مجھے اس راہ پر چلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

پھر تقسیم سے قبل کراچی آ کر انہوں نے تن تنہا سندھ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد کراچی فیڈرل یونیورسٹی کا ڈول ڈالا۔ وہ ان دونوں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہے مگر ان کی سادگی اور منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ کراچی یونیورسٹی نے خود کو معزز بنانے کے لیے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تو انہوں نے اس کی خاطر شکنی سے بچنے کے لیے قبول تو کر لی مگر اپنے نام کے ساتھ اسے کبھی شامل نہ کیا۔

میرے بڑے اصرار پر سر راس مسعود مرحوم کی متذکرہ کتاب "سفر نامہ جاپان" کے سرورق پر مقدمہ نگاری کے اعلان کے سلسلے میں اپنے نام کے ساتھ ڈی لٹ کے اضافے کی اجازت دی۔

جب ہم پروفیسر حلیم جیسے پاک باطن، خوش صفات، وضع دار، بلند کردار علما و فضلا کی رحلت پر آنسو بہاتے ہیں تو دراصل ایک فرد کے اٹھ جانے پر نہیں بلکہ ان کی اقدار کے زوال پر بہاتے ہیں جن کی بزرگی خوبصورت علامت ہوتے ہیں۔ اور ان چراغوں کے گل ہو جانے پر بہاتے جن کی روشنی نے ایک غریب قوم کی پوری پوری نسلوں کی رہنمائی کی ہوتی پیچھے رہ جانے والوں کو آگے بڑھایا ہوتا ہے۔ گرتے ہوؤں کو تھام لیا ہوتا

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اور اس لیے افسوس کرتے ہیں کہ جیسا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں: کا عفریت لمبے لمبے ڈگ بھرتا، ان بیش بہا قدروں کو توڑتا، پھوڑتا، گراتا، پامال کرتا، روندتا چلا آتا ہے اور آہ! کہ وہ وقت دور نہیں جب انہیں نیست و نابود کر کے ہی دم لے گا

مٹ رہی ہیں دل یا دیار دنگار عیش کی ٭ اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کبھی

۱۔ حلیم صاحب کے بھانجے تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر فلسفہ و ڈین فیکلٹی آف آرٹس۔ عارضی وائس چانسلر بھی رہے۔ علی گڑھ میں مجھ سے جونیئر مگر میرے بڑے مخلص دوست تھے۔

۱۔ کچھ عرصہ سے ماہنامہ "قومی زبان" کراچی میں میرے حواشی کے ساتھ ان میں سے بعض کاغذات کی اشاعت جاری ہے۔

۱۔ یہ اور بات ہے کہ ان صاحب نے مذکورہ خط کے علاوہ بعض دوسری اہم متعلقہ دستاویزات کو دکھانے کا وعدہ کرنے اور حلیم صاحب کو اور مجھے پیہم انتظار اور تقاضے کرانے کے باوجود دور سے بھی ان چیزوں کی جھلک نہ دکھائی۔ نہ لکھ ہی کر کچھ دیا۔ افسوس کہ مسعود مرحوم کے کچھ دیگر اعزا اور اہل خاندان نے بھی ہمارے نیک کام میں بالکل امداد بہم نہ پہنچائی۔

۲۔ اس سلسلے میں ذرا آجکل کے "محققین" کے سہل انگاری اور کاتا اور لے دوڑی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، ایک خاصے معروف صحافی اور اہل قلم نے ایک خاص موضوع پر کتاب تیار کی۔ بعض امور میرے مرتب کردہ مجموعے سے بھی حاصل کیے گئے۔ ایک نامور ادارہ نے شائع کی بڑے دھوم دھام سے "تعارفوں" کے مطابق کتاب کی رونمائی ہوئی۔ "دانشوروں اور اخبار نویسوں نے تالیاں بجائیں"، جلسے کی خبریں چھپیں۔ تصویریں شائع ہوئیں۔ میں نے کتاب دیکھی تو مرتب صاحب سے پوچھا آپ نے اس میں فلاں خط کا مسودہ اس میں شامل نہیں کیا۔ نہ اس کا حوالہ ہی دیا جو آپ کے موضوع پر حرف آخر ہوتا۔ اور آپ کے ہیرو کو حیات ابدی بخش دیتا۔ حالانکہ مسودہ مذکورہ میں نے اپنے دوسرے مرتب کردہ مجموعے میں آپ کی کتاب چھپنے سے تین چار سال پہلے شائع کر دیا تھا۔ فرمایا حضور آپ نے مجھے وہ مجموعہ ہی کب بھیجا تھا؟ حالانکہ کتاب ریویو کے لیے ان کے ہاں حسب معمول بھیجی گئی تھی۔ نہ بھی بھیجی گئی ہوتی تو تحقیق کی ذمہ داری ان کی تھی۔

۱۔ مثلاً نوشاہ علی خاں مرحوم اول الذکر میں آتے ہیں اور پروفیسر ایم شریف مرحوم دوسری ذیل میں جو ریڈر بنا دیئے گئے تھے۔

"ایک تعلیم گاہ کی حیثیت سے علی گڑھ کو سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے کوئی خاص تعلق نہ ہونا چاہیے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی گئی تو مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دینے کا ایک مقصد یہ بھی قرار پایا کہ وہ برطانوی دور کے سماجی اور سیاسی تقاضوں سے کماحقہ باخبر ہو جائیں۔ یعنی علی گڑھ کے نوجوان جب زندگی میں داخل ہوں تو پورے جوش اور ولولے کے ساتھ خود بھی آگے بڑھیں اور مسلمانوں کو بھی آگے بڑھائیں۔ چنانچہ تقریباً نصف صدی تک علی گڑھ نے مسلمانوں کی تمدنی اور کلچرل تحریکوں کے علاوہ سیاسی اداروں کی بھی رہنمائی کی۔"

(ڈاکٹر) محمد اشرف

مولانا احسن مارہروی

ڈاکٹر ظفرالاسلام

مولانا احسن مارہروی (سید شاہ علی احسن بن شاہ مجتبیٰ حسن) نہ صرف ایک ادیب، شاعر اور مصنف کی حیثیت سے معروف ہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ان کی گہری وابستگی اور ایک استاد کے روپ میں ان کی خدمات بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے آبا و اجداد کا اصل وطن بلگرام تھا۔ شاہ برکت اللہ جو ان کے جداعلیٰ کی حیثیت سے ذکر کیے جاتے ہیں اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں بلگرام سے مارہرہ (ایٹہ، یو۔پی) منتقل ہوئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور عالم اور مصنف مولانا آزاد بلگرامی بھی بلگرام کے اسی سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مارہرہ میں شاہ برکت اللہ کے دو لڑکوں نے دو خانقاہیں قائم کیں جو بڑے اور چھوٹے بھائی کی نسبت سے سرکار کلاں اور سرکار خورد کہلائیں۔ احسن مارہروی چھوٹے بھائی (شاہ نجات اللہ) کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے سرکار خورد سے منسلک تھے۔ ان کی جائے پیدائش مارہرہ اور تاریخ پیدائش ۲۲ شوال سنہ ۱۲۹۲ھ (۱۰ نومبر ۱۸۷۶ء) ہے ان کے والد ایک صوفی صفت عالم اور شاعر تھے۔ ان کا خاندان قدیم مشرقی روایات اور مذہبی اقدار کا حامل تھا، انہیں روایات کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت پایۂ انجام کو پہونچی۔ ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن، درگاہ برکاتیہ کے مکتب سے مکمل کیا اور عربی و فارسی زبان اور دیگر مروجہ علوم کی تحصیل کے لیے اپنے والد اور بعض دوسرے معاصر علماء سے کسب فیض کیا۔ ان کے علمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں خاندانی خانقاہ کے کتب خانہ نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ وہ انگریزی تعلیم سے بھی بہرور ہونا چاہتے تھے لیکن اپنے والد کی عدم رضامندی کی وجہ سے وہ اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں

۱۸ سال کی عمر میں انہیں اپنے والد کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی سفر کے دوران انہوں نے مکہ معظمہ میں قرأت و تجوید سیکھی اور اگلے سال رمضان شریف کے موقع پر تراویح میں انہیں مسجد اقصیٰ میں قرآن سنانے کا شرف حاصل ہوا۔ مکہ میں قیام کے دوران ہی ان کی والدہ ماجدہ جاں بحق ہوئیں اور ہندوستان واپسی پر بمبئی میں ان کے والد مکرم انتقال کر گئے۔

احسن مارہروی ایک صوفی خاندان کے چشم و چراغ تھے جس میں پیری و مریدی کا سلسلہ برسہا برس سے جاری تھا۔ والد کے انتقال کے بعد انہیں موروثی طور پر خانقاہ برکاتیہ کی سجادہ نشینی بھی حاصل ہوئی لیکن ان کا فطری رجحان، علمی ذوق اور تحقیقی و تنقیدی ذہن اس دنیا سے میل نہیں کھاتا تھا اس لیے عملی طور پر اسے اختیار کرنے کے بجائے وہ میدانِ علم و ادب سے وابستہ ہوئے اور آخر عمر تک اس میں سرگرداں رہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مذہبیت، قدامت اور تصوف کے مثل شاعری بھی ان کی خاندانی روایات کا ایک جز تھی ان کے والد خود شاعر تھے اور حسن تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ شاہ برکت اللہ سے بھی ایک فارسی دیوان منسوب کیا جاتا ہے۔ سید احسن نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا جس میں ان کے میلان طبع کو بھی خاص دخل تھا عام طور پر ان کی شاعری کی ابتدا عہد طفولیت سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا اولین دستیاب نمونہ کلام سنہ ۱۸۹۱ء سے تعلق رکھتا ہے جب انہوں نے اپنے والد کے انتقال پر فارسی قطعات کہے جو "تواریخ حزن و بکا" کے تاریخی نام سے موسوم ہوئے اس وقت ان کی عمر انیس سال تھی۔ احسن مارہروی نے شعر و شاعری کی دنیا میں

قدم رکھا تو اس وقت شاعری کے دو دبستان (دہلی و لکھنؤ) جاری تھے ایک کے میر کارواں حضرت داغ اور دوسرے کے روح رواں امیر مینائی تھے۔ احسن اپنی ذہنی مناسبت کے مطابق دہلی اسکول سے وابستہ ہوئے اور ۱۸۹۶ء سے داغ سے اکتساب فیض شروع کیا۔ ابتداً خط و کتابت کے ذریعہ ان کی شاگردی اختیار کی اور اسی وسیلہ سے ان سے اپنے اشعار پر اصلاح بھی حاصل کرتے رہے۔ لیکن استاد سے تعلق خاطر اور شعر و شاعری سے دلچسپی نے کچھ ہی عرصہ بعد نصف ملاقات کو مصاحبت میں تبدیل کر دیا۔ ۱۸۹۸ء میں وہ اپنے گھر و جائداد کی نگرانی ایک عزیز کے سپرد کر کے حیدرآباد چلے گئے اور ۱۹۰۳ء تک وہاں مقیم رہ کر انہوں نے حضرت داغ سے براہ راست استفادہ کیا اور اپنے ذوق شاعری کو جلا بخشا۔ حیدرآباد میں پانچ چھ سال قیام کے دوران شروع کا عرصہ محلہ دارالشفا میں گذرا جو استاد کے مکان سے ذرا دور تھا لیکن آخر میں دو ڈھائی سال داغ کے مکان سے متصل ہی ایک کمرے میں بسر ہوئے تھے۔ داغ سے اکتساب فیض کے علاوہ اس سفر کی ایک قابل ذکر یادگار داغ کی زندگی کے روزمرہ واقعات کی یادداشت تیار کرنا ہے جو بعد میں "جلوۂ داغ" کے نام سے مرتب کی گئی۔

۱۹۰۳ء میں احسن مارہروی وطن واپس ہوئے لیکن علمی و ادبی دلچسپیوں سے مجبور ہو کر دو سال بعد ۱۹۰۵ء میں پھر عازم سفر ہوئے۔ پہلے حیدرآباد کا قصد تھا لیکن استاد کی وفات کی خبر پاکر یہاں کا سفر ملتوی ہو گیا اور کچھ دنوں بعد وہ لاہور کے لیے روانہ ہوئے جہاں وہ تقریباً سوا برس مقیم رہے۔ اس عرصہ میں وہ لالہ سری رام کے شریک کار رہے جو ان دنوں "خم خانۂ جاوید" کی جلد اول کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے۔ اسی دوران انہوں نے اپنے استاد کی یادگار میں ایک ماہنامہ "فصیح الملک" جاری کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مارہرہ واپسی پر یہ رسالہ ۱۹۱۱ء تک وہیں سے شائع ہوتا رہا اور احسن کی دوسری علمی و ادبی سرگرمیاں بھی یہاں جاری رہیں۔ ۱۹۱۴ء کی ایک مشہور تخلیقی یادگار علامہ شبلی و مولانا حالی کا مرثیہ "کسوف الشمسین" ہے جو اسی سال ۱۸ر نومبر و ۳۱ر دسمبر کو بالترتیب ان کے انتقال پر قلمبند کیا گیا۔ علمی کاموں نے انہیں چین نہ لینے دیا اور ۱۹۱۷ء میں انہوں نے دوبارہ حیدرآباد کا قصد کیا اور وہاں کچھ دنوں مقیم رہ کر کتب خانۂ آصفیہ میں دیوان ولی کے ایک نادر نسخے کا مطالعہ و موازنہ کیا تھا۔

احسن مارہروی کو علم و فن سے جو گہری دلچسپی تھی اس نے انہیں آخر گہوارۂ علم و آگہی علی گڑھ تک پہونچا دیا اگرچہ وہ خود عصری علوم حاصل نہ کر سکے تھے لیکن انہیں ان علوم کی اہمیت و افادیت کا بخوبی احساس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو ان علوم سے مزین کریں۔ حسن اتفاق کہ ۱۹۲۳ء میں مسلم یونیورسٹی میں اردو کے ایک استاد کی حیثیت سے ان کی تقرری نے اس کا بہترین موقع فراہم کر دیا اور خاندانی روایت کے برخلاف انہوں نے ملازمت اسی مقصد کے تحت قبول کی۔ وہ جذب عالم پوری کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں، "میرے خاندان میں مجھ سے پہلے کسی نے ملازمت نہیں کی اور میں بھی پچاس برس کے بعد اتفاقاً اس سلسلہ میں منسلک ہو گیا۔ بچوں کی تعلیم مدنظر تھی الحمدللہ کہ اس سے فارغ ہو چکا ہوں"۔ احسن مارہروی پہلے انٹر میڈیٹ سیکشن میں استاد مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن جب ۱۹۲۳ء میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم براہ راست یونیورسٹی سے متعلق ہو گئی تو وہ بحیثیت لکچرر باقاعدہ شعبۂ اردو سے منسلک ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال کی تجویز کی روشنی میں رشید احمد صدیقی، احسن مارہروی اور جلیل احمد قدوائی بالترتیب لکچرر گریڈ اول اور لکچرر گریڈ دوم مقرر کیے گئے تھے۔ احسن مارہروی ۱۹۳۰ء تک یونیورسٹی میں بحیثیت استاد اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ علی گڑھ قیام کے دوران تدریسی مصروفیات کے علاوہ ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ وہ آخر تک لکچرر ہی کی حیثیت سے یونیورسٹی کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن وہ اپنی اہمیت و صلاحیت اور حسن کارکردگی کی وجہ سے شعبۂ اردو کے لیے باعث عزت اور یونیورسٹی کے لیے وجہ افتخار بنے رہے۔ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں ان کی سروس کی معیاد ختم ہو گئی تھی لیکن انہیں دو سال کی مزید توسیع دی گئی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ مستقل طور پر اپنے وطن مارہرہ میں قیام پذیر رہے۔ البتہ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے ان کے سفر کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی سلسلہ کی آخری کڑی جولائی ۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں جو برہان پور میں منعقد ہوئی تھی ان کی شرکت تھی۔ یہاں سے واپسی پر پشت پر کچھ دانے نکل آئے جو بعد میں کاربنکل کی شکل اختیار کر گئے۔ اگست ۱۹۴۰ء کے شروع میں وہ اپنے بڑے صاحبزادے سید محمد احسن اسسٹنٹ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ کے پاس علاج کی غرض سے آئے اور یونانی علاج شروع ہوا لیکن
مرض میں کچھ افاقہ نہ ہونے پر ۱۸ اگست کو انہوں نے پٹنہ میڈیکل کالج کا
قصد کیا جہاں ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر انعام حسن سرجن تھے۔ وہاں
کے علاج سے بھی کچھ صحت یابی نہ ہو پائی۔ ۲۹ اگست کو ان کی طبیعت زیادہ
خراب ہوئی اور ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء (۲۵ رجب ۱۳۵۹ھ) کو ۶۶ سال کی عمر میں
وہ جاں بحق ہوگئے۔ ان کا جسد خاکی پٹنہ سے علی گڑھ اور پھر مارہرہ لے
جایا گیا جہاں انہیں آبائی قبرستان میں مدفون کیا گیا۔ اس طرح پردیس
میں وفات پانے کے باوجود انہیں ابدی آرام کے لیے اپنے وطن کی سرزمین
نصیب ہوئی۔ ان کی وفات پر متعدد شعرا نے تاریخی قطعات قلمبند کیے
صدیق حسن صدیق کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو ؎

کیف زا نغمے تھے گویا سحر تھا آواز میں ☆ شاعر شیریں سخن کیا عندلیب باغ تھا
کر دیا خاموش لیکن آج اس کو موت نے
آہ جو احسن جہاں میں یادگار داغ تھا

احسن مارہروی قدیم مشرقی روایات کا ایک نمونہ تھے ان کی شخصیت
شرافت و متانت، جرأت و صداقت، شفقت و محبت اور انکساری و سادگی
جیسی صفات کی جامع تھی وہ نفاست پسند و خوش پوشاک تھے۔ لیکن
تکلف و بناوٹ کے بہت خلاف تھے۔ وہ نام و نمود اور خود ستائش کو سخت
ناپسند کرتے تھے اور تصویر کھنچوانا اسراف سمجھتے تھے۔ بغض و کینہ بھی ان کی
فطرت کے منافی تھا وہ اپنا شیوہ اس شعر سے ظاہر کرتے تھے۔ ؎

کفر است در طریقۂ ما کینہ داشتن ☆ آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

وہ بذلہ سنج اور خوش مذاق بھی واقع ہوئے تھے اور ہر شخص سے ایسے
انداز سے پیش آتے اور گفتگو کرتے کہ چھوٹے بڑے سبھی ان سے محظوظ ہوتے
تھے بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی "ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی
جگہ لطف اندوز ہوتا تھا بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے کہ جیسے بوڑھے
خود ان کو بزرگ سمجھتے ہوں نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے
معلوم ہوتے تھے کہ جیسے ان میں ان سے دلچسپ اور کوئی نہیں۔"[۴] دوسروں
کے کام آنا اور حاجتمندوں کی مدد کرنا یا کرانا ان کا محبوب شیوہ تھا۔ اس ضمن
میں وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ انتہائی فراخدلی کا ثبوت دیتے تھے۔
دسمبر ۱۹۳۸ء میں دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہونے والی تھی اس میں
احسن مارہروی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے ان کے ایک قدیم شاگرد صغیر احمد
بھی اس میں شریک ہونے والے تھے۔ دہلی میں عام طور پر خلف اصغر سید
کے یہاں احسن مارہروی قیام کیا کرتے تھے جب صغیر حسنی نے کہیں اور اپنے قیام
کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے اپنے شاگرد کو ان الفاظ میں مخاطب کیا
"عزیزم! ۲۵، ۲۶، ۲۷ تک دہلی کا قصد ہے تمہاری جگہ دل میں ہے او
اور دل بظاہر "دلی" سے ایک حرف کم رکھتا ہے مگر گنجائش باطنی اس سے
بہت زیادہ ہے لہذا دہلی اگر میرے پاس ہی آنا پھر دیکھا جائے گا۔"[۳]
مبتدیوں کی ہمت افزائی اور چھوٹوں کی صلاحیتوں کو ابھارنا او
اجاگر کرنا جو ہمیشہ ایک کمیاب اور قابل قدر خوبی رہی ہے احسن مارہروی
میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی لیکن وہ جھوٹی تعریف اور بیجا ستائش کے
قائل نہیں تھے اور غلط بیانی کے ذریعہ کسی کی حوصلہ افزائی کو سخت
ناپسند کرتے تھے۔ رواداری اور نرم دلی بھی ان کے خصائل میں شامل تھی
لیکن اگر کوئی چیز اس سے مستثنیٰ تھی تو وہ زبان و بیان کی غلطی جسے وہ
گوارا نہیں کر سکتے تھے اور بلا تکلف و برملا اس کی اصلاح فرماتے تھے
ان کی روزمرہ کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اپنے آپ کو کبھی
بیکار نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی کوئی نہ کوئی (بالخصوص علمی) مصروفیت ضرور
جاری رہتی تھی ایک دفعہ کسی نے ان کے معمولات دریافت کیے تو اس کے
جواب میں "دستور العمل" کے نام سے ایک پوری نظم کہہ ڈالی اس نظم سے
واضح ہوتا ہے کہ ان کا روزمرہ کا ایک نظام الاوقات تھا بطور مثال اس کے
چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یا صبح کو ہوگا وہ مصلی پہ نمایاں ☆ یا خدمت کسی گوشۂ میداں میں ملے گا
جب تک نہ ڈھلے دوپہر اس وقت تک اس کو ☆ ڈھونڈو گے تو اطفال و دبستاں میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک ☆ سویا ہوا بیٹھا ہوا ایواں میں ملے گا
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک ☆ معروف ملاقات عزیزاں میں ملے گا
ہوگی پس مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر ☆ پڑھتا ہوا کچھ بزم شبستاں میں ملے گا
ہوگا انہیں اوقات میں جو وقت میسر ☆ سرگرم عمل شعر کے میداں میں ملے گا

احسن مارہروی کا پسندیدہ مشغلہ کتابیں جمع کرنا اور ان کا مطالعہ
تھا کتابوں سے ان کی دلچسپی عشق کی حد تک تھی۔ کتابیں جمع کرنے کے ساتھ
ان کی حفاظت کا اہتمام بھی کرتے تھے اسی لیے دوسروں کو کتابیں عاریتاً

دیکھنے میں انہیں بہت تکلف ہوتا تھا۔ ان کے اسی ذوق و شوق اور عزم واحتیاط کا نتیجہ تھا کہ ان کے پاس مختلف علوم کی کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ ان کا یہ ذاتی کتب خانہ اس وقت مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں "ذخیرہ احسن" کے نام سے محفوظ ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف اس کے مخطوطات کی تعداد ۲۳۲ ہے جو عربی فارسی و اردو مختلف زبانوں میں ہیں اور علوم اسلامیہ سیر و تاریخ، شعر و ادب، طب و ریاضی اور لغت و گرامر جیسے متعدد مضامین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں ان کے اپنے قلمی نسخوں کے علاوہ بعض ایسے نوادر بھی موجود ہیں جو کہیں اور دستیاب نہیں۔

احسن مارہروی ایک دینی و مذہبی گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے اور خود ان کی زندگی میں اس کے بھرپور اثرات نمایاں تھے۔ وہ بچپن ہی سے صلوٰۃ و صوم کے پابند تھے۔ حفظ قرآن اور حج بیت اللہ کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ ہر سال رمضان کے موقع پر تراویح میں قرآن سنانے کا اہتمام کرتے رمضان المبارک کے احترام اور اس کی سعادت کی طلب کا یہ عالم تھا کہ وہ اس مہینہ میں شعر و ادب کے مشاغل سے قطع نظر کرکے عبادت و ریاضت میں اپنے کو معروف رکھتے تھے لیکن علی گڑھ میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد اس میں کچھ فرق آگیا تھا جیسا کہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے
وہ شعراء کی جانب سے مذہبی طبقہ کے لوگوں بالخصوص واعظ و محتسب کی تضحیک کو سخت ناپسند کرتے تھے اور وہ اسے ایرانی شاعری کا شاخسانہ تصور کرتے تھے۔ ان کے مذہبی شعور کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ وہ تنقید و تبصرہ میں بھی دینی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے ایک صاحب کی رباعیات پر تبصرہ کرتے ہوئے بطور تمہید لکھتے ہیں۔
فطرت انسانی تو یہی چاہتی ہے کہ مصنف کی تعریف ہی تعریف کی جائے مگر قوت ایمانی یہ کہتی ہے کہ انسان کو فرشتہ نہ بنایا جائے، مثلاً دینی و مذہبی مزاج کے علاوہ اسلامیات پر ان کی گہری نظر بھی تھی۔ اس کا ثبوت علی گڑھ قیام کے دوران ان کی مجالس کی تفصیلات، ان کے خطوط کے مضامین اور ان کتابوں سے ملتا ہے جو ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں

احسن مارہروی کو مسلم یونیورسٹی سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس کی فلاح و بہبود کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ اپنی منظوم تخلیقات کے ذریعہ نہ صرف اس کی خوبیوں و کمالات کو نمایاں کرتے بلکہ وہ انہیں کے وساطت سے یونیورسٹی کے مسائل کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کراتے۔ ان کی یہ روش یونیورسٹی سے رسمی تعلق سے پہلے ہی جاری تھی۔ اس کا ثبوت ان کی ان نظموں (قوم کا مطالبہ۔ علی گڑھ کالج کی فریاد) سے فراہم ہوتا ہے جو ۱۹۲۰ء میں اس ادارہ کو تحریک ترک موالات کے جابرانہ اثرات سے دور رکھنے کے لیے لکھی گئیں۔ یونیورسٹی میں ایک استاد کی حیثیت سے انہوں نے اردو زبان کی اصلاح و ترقی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں اور اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ طلبہ میں علم و فن کی سچی طلب پیدا ہو اور محنت و مشقت کی عادت پروان چڑھے۔ وہ طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اور محنتی و ہونہار طلبہ کے لیے ان کی خصوصی عنایتیں ہوتی تھیں۔ وہ شاگرد و استاد کے مابین روایتی تعلق کے قایل تھے اور تعلیم و تعلم کی دنیا میں پیشہ ورانہ ذہنیت کے سخت مخالف تھے۔ لیکن انہیں خود احساس تھا کہ زمانہ کی قدریں اب بدل چکی ہیں اور وہ اپنے احساس کو علامہ اقبال کے اس شعر سے ظاہر کرتے تھے

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض ٭ دل چاہتا تھا کہ ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق ٭ کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

وہ طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کے لحاظ سے بھی ان کی زندگی کی تعمیر میں دلچسپی لیتے تھے یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ طلبہ کو نیاز فتحپوری کے رسالہ "نگار" کے مطالعہ سے محض اس بنا پر منع کرتے تھے کہ انہیں ذہنی بے راہ روی اور اخلاقی خرابی نہ آنے پائے۔ علی گڑھ قیام کے دوران طلبا کی تعلیم و تربیت کے علاوہ تلامذہ کے اشعار کی اصلاح، ادبی استفسارات کے جواب کی تیاری اور مشاعروں کا اہتمام بھی ان کی گوناگوں مصروفیات کے کچھ پہلو تھے اور ان کی یہ سرگرمیاں بھی شعبہ اردو اور یونیورسٹی کی نیک نامی کا باعث بنیں۔ انجمن حدیقۃ الشعرا کے صدر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس انجمن کے زیر اہتمام علی گڑھ میں بڑے بڑے مشاعرے منعقد کرائے۔ خود ان کی علمی صلاحیت اور معروف شخصیت بڑے بڑے شعرا کے لیے باعث کشش ہوتی تھی۔ علی گڑھ کے لیے ان کی ایک خدمت یہ بھی تھی کہ انہوں نے طلبہ کے لیے نصابی کتابیں تیار کیں اور خاص طور سے نظم و نثر کے کئی ایک انتخاب ترتیب دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے

یت و استعداد کو مسلم یونیورسٹی کے لیے مختلف مفید کاموں میں استعمال
سے بھی بجا طور پر اس عظیم ادارہ کی خدمت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے
ل میں یونیورسٹی کی جو قدر و منزلت تھی وہ کبھی کبھی الفاظ کے
ں ڈھل کر نظم کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ان کی نظم " سرسید کا دل"
ادارہ اور اس کے بانی کے تئیں ان کے جذبات کی بخوبی عکاسی
ہے۔

شہرت کب علی گڑھ کو نصیب   کوں جس کا ایک پرانا نام ہے
ہم جہاں ہیں کا یہ فیض سے   ہر اشارہ جس کا ایک الہام ہے
س شہر کو دارالعلوم   اب یہ گویا مرکز اقوام ہے[۲۱]

قومی و ملی مسائل سے احسن مارہروی کی دلچسپی صرف مسلم یونیورسٹی
ر دود نہ تھی بلکہ اجتماعی فلاح و بہبود کے دیگر مسائل کی جانب بھی
، نے توجہ دی اور ان کی ترجمانی کے لیے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو
، کیا وہ ان شعراء میں سے نہیں تھے جو صرف حسن و عشق کی داد یوں میں
لوچۂ جاناں میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ ان کا تعلق شعراء کے اس طبقہ
ا جو سماج و معاشرت کا ترجمان اور ملک و ملت کے مسائل کے تئیں
، تھا۔ وہ اس میدان میں مولانا حالی کے مکتب فکر سے وابستہ نظر
ں، معاشرتی و قومی مسائل پر انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں
د حقیقی" قومی اتفاق، چپ کی فریاد، نقش عبرت، سرگرا بیاں۔
ی دیسی" "خدمت خلق"، "دورنگی مسلم" "بیاد حالی" اور حقیقت
" قابل ذکر ہیں۔ ملی مسائل میں احسن مارہروی نے اتحاد و اتفاق پر
زیادہ زور دیا اور اپنے اشعار کے ذریعہ مختلف پیرایہ میں یہ حقیقت گوش
رنے کی کوشش کی کہ اجتماعی قوت کے حصول کے لیے بھائی چارگی اور
ہی کے جذبہ کو پروان چڑھانا ضروری ہے جیسا کہ خود اسلامی تاریخ
شاہد ہے وہ مسلمانوں کو اپنی نظم "قومی اتفاق" میں اس انداز
طب کرتے ہیں۔

ہو تم نام لیوا جن کے ہو تم یادگار   ان میں کیا پاس اخوت ان میں کیا ایثار تھا
ا ہو اگر اس کو تو قرآن میں پڑھو   سورۂ انساں کہ جس کی ابتدا ہے ہل اتیٰ
اصحاب ہند کوئی پوشیدہ نہیں   کیا کیا کرتے تھے ان کے ساتھ قومی اغنیاء
قوم سے مطلب یہی ہرگز نہیں   بیٹھ کر دو چار کچھ کہہ دیا کچھ سن لیا

بلکہ باہم بالعمل اس طرح رہنا چاہیے   جس طرح شیر و شکر مل کر نہیں ہوتے جدا
احسن مارہروی حب الوطنی کے جذبہ سے بھی معمور تھے۔ وہ اہل وطن
کو بار بار اس کی تلقین کرتے تھے کہ وہ زبان و ادب، تہذیب و تمدن اور
رہن سہن میں غیر ملکیوں کی نقالی کرنے کے بجائے اپنے قومی و ملکی ورثہ
کو اختیار کریں وہ اس ضمن میں اس نکتہ پر خاص زور دیتے ہیں کہ اہل برطانیہ
ہندوستان میں طویل عرصہ سے رہتے ہوئے بھی یہاں کی چیزوں کو محبوب
نہیں رکھتے اور علم و فن کی ترقی کے باب میں بھی انہیں اپنی ہی چیزیں زیادہ
عزیز ہیں۔ ان کا یہ جذبۂ حب قومی ہندوستانیوں کے لیے یقیناً قابل مثال
ثابت ہوا۔ ان کے اس احساس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

بیش و کم دو سو برس سے ہند پر ہیں حکمراں   لیکن اس مدت میں اپنا ڈھنگ کچھ بدلا نہیں
علم و فن کے قائل و ناشر ہیں وہ بے شک مگر   اپنے لٹریچر پر ہے ان کی توجہ سر بسر

مولانا حالی کی طرح انہوں نے بھی اپنے اشعار میں جا بجا ملک و
ملت کے افراد کو عمل و جد و جہد پر ابھارا ہے اور سرگرمی عمل کو اجتماعی
و انفرادی دونوں زندگی میں کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے وہ مولانا
حالی کی زمین میں کہتے ہیں۔

ناکارہ ہستیوں کی کیا زندگانیاں ہیں   ہاں کام کرنے والے جان جہانیاں ہیں
دنیا میں ہیں وہ شاداں دنیا ہے ان کی خواہاں   کاموں پر جن کے نازاں خود کامرانیاں ہیں
"کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا[۲۲]
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں"

مولانا حالی ہی کی مشہور نظم "چپ کی داد" سے متاثر ہو کر انہوں نے
عورتوں کے مسائل بالخصوص تعلیم نسواں پر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے
"چپ کی فریاد" پیش کی اور اس مسئلہ کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کی[۲۳]
مذکورہ بالا اوصاف و کمالات کے علاوہ احسن مارہروی شعر و ادب
کے میدان میں اپنی نمایاں خدمات کے لیے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا تصور
شاعری بہت وسیع و بلند تھا وہ شاعری کو صرف حسن و عشق کی داستان کا
ترجمان، فراق و وصال کے جذبات کا مظہر یا تغزل اور ترنم کا مجموعہ نہیں
بلکہ وہ اسے سماجی و معاشرتی حالت کی عکاسی اور اخلاقی و تہذیبی قدروں
کی ترجمانی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک اچھے معاشرہ
کی تعمیر میں شعراء بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم جذبۂ شاعر میں

میں ان شعراء پر سخت تنقید کی ہے جن کے اشعار صرف جام و مینا کے تذکرے اور مے نوشی و مدہوشی کے جذبات سے معمور ہوتے ہیں اور اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ شاعری کے ذریعہ حق و صداقت کی دعوت دینے والے شاذ و نادر ہی ملتے ہیں[۲۴] گرچہ ان کی شاعری کا خاص میدان غزل تھا لیکن دوسرے اصناف میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی اور ایک ایسا منظوم ورثہ یادگار چھوڑا جو قیمتی ہونے کے ساتھ مختلف النوع بھی تھا۔ جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے احسن مارہروی قدیم مسلک کے پیرو تھے وہ ردیف و قافیہ اور ان تمام لوازم کی رعایت ضروری تصور کرتے تھے جو شاعری کی قدیم دبستان کی دین تھیں۔ لیکن وہ نئے اسالیب اور جدید افکار سے نا آشنا نہ تھے اور اس نقطۂ نظر کے زبردست حامی تھے کہ زمانہ کے تغیر سے نہ صرف اسلوب بیان اور طرز ادا میں تبدیلی واقع ہوتی ہے بلکہ افکار و خیالات کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے ان کی رائے میں شاعر کو اظہار خیال کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے۔ اسی نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے وہ اپنے ایک شاگرد راز حسنی کو لکھتے ہیں ”شاعر مصور جذبات ہوتا ہے اور ہر زمانہ کے جذبات مخصوص ہوتے ہیں۔ اب دور از کار خیالات اور فرسودہ تشبیہات و مفروضات پسند نہیں کیے جاتے۔ مسی و سرمہ چوٹی، زلف و گیسو کے الجھاؤ کو چھوڑیئے۔ پاکیزہ اور اخلاقی جذبات اور مفید خیالات پیش نظر رکھئے اور انہیں کو شاعرانہ مجاز اور استعارے میں کہیے“[۲۵] احسن مارہروی کے کلام سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری سے متعلق ان احساسات کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ صنف غزل سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان کی غزلوں میں وہ شوخی و رنگینی نہیں ملتی جو داغ کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے جذبات کی ترجمانی یقیناً پائی جاتی ہے لیکن ان میں بوالہوسی، عریانیت اور سوقیانہ پن نہیں ہے۔ داغ کے قریب ترین شاگرد ہونے کے باوجود انہوں نے غزلوں میں خیالات یا مضامین کی حد تک استاد کا رنگ اختیار نہیں کیا[۲۶] اس متانت کے ساتھ ان کا کلام پختگی سے بھی خالی نہیں ہے بائیس تیئیس سال کی عمر میں انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ بھی پختگی کا نمونہ پیش کرتی ہیں بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہجر میں دل کا نہ تھا ساتھی کوئی   درد اٹھ اٹھ کر شریک غم رہا
پیچ تاک میں ایک شوخ کی دزدیدہ نگاہیں   اللہ نگہباں ہے اب جان حزیں کا
آبلوں کو سر اٹھانے کی ذرا ہمت نہیں   ہے کرم صحرا نوردی میں یہ نوک خار کا
یوں نکل جائے درد پہلو سے   یہ تو ہمان ہے میرے دل کا[۲۷]

نثر کے مثل نظم میں بھی احسن زبان کی صحت اور الفاظ کے صحیح استعمال پر خاص زور دیتے تھے۔ اشعار میں محاورات و مصطلحات کا بکثرت استعمال بھی ان کے کلام کی ایک خصوصیت تھی۔ برمحل ضرب الامثال کے ذریعہ اشعار میں لطیف معنی پیدا کرنے پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ درج ذیل اشعار ان کی اس مہارت کا پورا پورا ثبوت فراہم کرتے ہیں

احسن اچھا ہے رہے مال عرب پیش عرب   دے کے دل تم نہ گرفتار بلا ہو جانا
احسن کا دل اگر نہیں اچھا نہ ہو مگر   وہ مفت مل گیا جو تمہیں کیا برا ہوا
خواب کا دیدار کیا تھا؟ ایک خیالی نقش تھا   اوس سے کیا پیاس بجھتی لب ذرا تر ہو گیا

اشعار میں سلاست و روانی احسن مارہروی کو بہت عزیز تھی وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے ثقیل الفاظ اور بھاری بھرکم تراکیب کے استعمال سے احتراز کرتے تھے وہ آسان سے آسان اور مختصر الفاظ میں اہم و مشکل مضمون ادا کر دیتے تھے

مجھ کو اے پیماں شکن پاس وفا کچھ بھی نہیں   بار ہا تو نے کہا سب کچھ کیا کچھ بھی نہیں
فنا بغیر بقا کا مزا نہیں ملتا   خودی مٹاؤ نہ جب تک خدا نہیں ملتا

احسن مارہروی کی شاعری پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تبصرہ بہت ہی متوازن معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں ”مولانا (احسن) قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے اور شاعری کے ان لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کو پیش رو سے ان تک پہنچی تھیں، بایں ہمہ وہ اردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب و تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔“[۲۸]

احسن مارہروی کی منظوم تخلیقات میں سب سے اہم ان کا دیوان ”احسن الکلام“ ہے جو پہلی بار ۱۹۶۰ء میں کتاب منزل لاہور سے شایع ہوا اگرچہ ترتیب زمانی کے اعتبار سے سب سے پہلے ان کی نظم ”اردو شکریہ“ میں نظامی پریس بدایوں سے طبع ہوئی۔ اسی پریس سے ان کی ایک منظوم تخلیق ”کسوف الشمسین“ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء[۲۹] منظر عام پر آئی۔ یہ ۵۹ بند

لامہ شبلی و مولانا حالی کا مرثیہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا دونوں
ں ان کے جذبات کی ترجمانی اس بند سے ہوتی ہے۔

سنہ ہجری میں رہی تھی ایک شب ۔ کی ہوئی شبلی مرحوم کی جنت سے طلب
سال بھی ہونے لگا رخصت یہی جب ۔ دے گئے حالی مغفور غم و رنج و تعب

نسبت یک جہتی کر گئے ظاہر دونوں
سال آخر کی طرح ہو گئے آخر دونوں

د قومی مسائل پر ان کی مشہور نظم "قوم کا مطالبہ" ۱۹۲۰ء میں مسلم
ٹی پریس سے شایع ہوئی علی گڑھ قیام کے دوران انہوں نے میر عثمان
ں نظام حیدر آباد کی فرمائش پر ان کی دو فارسی تحریروں کو اردو
امہ پہنایا جو ۱۹۳۶ء میں "شاہکار عثمانی" کے نام سے زیور طبع سے
وئی نظام حیدر آباد کی یہ نثری تحریریں ان کی خدمت میں قرآن کریم
ے خوش نما نسخے کے پیش کیے جانے اور پھر جدید تاریخی عمارت "جوبلی
ں" میں اسے خیر و برکت کے طور پر رکھنے کے خیال اور اس کی تکمیل کے
کے واقعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ احسن کا ایک اور مختصر شعری مجموعہ
نامۂ غم" ان کی وفات سے دو سال قبل ۱۹۳۸ء میں اشاعت پذیر
ہ شہدائے کربلا کی یاد میں مرثیوں سلاموں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔
اسکالرس نے اسے ان کے مذہبی کلام سے تعبیر کیا ہے[۳۰] اس مجموعہ
ر میں ان کی مشہور نظم "خدمت خلق" بھی شامل ہے۔

خود اپنی تخلیقات کے علاوہ شعر و شاعری کے میدان میں احسن
روی کا دوسرا اہم کارنامہ بعض دوسرے ممتاز شعرا کے کلام کی ترتیب
ین تھا۔ اس نوع کی ان کی اولین کوشش اپنے مورث اعلیٰ شاہ برکت اللہ
رسی دیوان "مجمع البرکات" کی ترتیب تھی جسے انہوں نے صاحب
ں کی سوانح عمری سے بھی مزین کیا۔ ترتیب و تدوین کے میدان میں
ں سب سے اہم خدمت اردو شاعری کے باوا آدم ولی کے دیوان کے ایک
و صحیح نسخہ کی تیاری ہے۔ انہوں نے جس کد و کاوش سے مختلف
بریوں اور ذخیروں میں دیوان ولی کے قلمی نسخوں کی چھان بین اور
موازنہ کیا وہ ان کے تحقیقی ذوق اور تنقیدی مزاج کا غماز ہے اس سے
ہ کر انہوں نے اس پر جو مقدمہ لکھا وہ آج بھی ولی کی سوانح عمری
ن کے کارناموں پر ایک اہم ماخذ کا کام دیتا ہے[۳۱]۔ یہ دیوان "کلیات ولی"
کے نام سے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۲۷ء میں شایع ہوا۔ خود
اپنے استاد گرامی کے دو مجموعۂ کلام بھی انہوں نے مرتب کیے ایک "یادگار داغ"
کے نام سے معروف ہوا اور دوسرا "منتخب داغ" کہلایا جو داغ کے مختلف
دواوین کا انتخاب ہے۔ موخرالذکر کی طباعت احسن کی زندگی ہی میں انوار
احمدی پریس الہ آباد سے شروع ہوئی تھی جو ان کے انتقال کے بعد خلف اصغر
سید احسن کی نگرانی میں انجام کو پہنچی۔

اس میں شک نہیں کہ احسن مارہروی کی اصل جولانگاہ شاعری
تھی لیکن نثر کے میدان میں بھی ان کی خدمات کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مختلف
شعری مجموعوں پر تنقیدی و معلومات افزا مقدمہ و تعارف لکھنے کے
علاوہ ان کی متعدد نثری تصانیف بھی ملتی ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات
میں ترتیب زمانی کے اعتبار سے "جلوہ داغ" کو اولیت حاصل ہے جو
مطبع شمسی حیدر آباد سے ۱۹۰۲ء میں شایع ہوئی۔ اس میں داغ کی
شخصیت کی جلوہ نمائی کی گئی ہے۔ حضرت داغ کے شاگرد ہونے کے ساتھ
ساتھ احسن نے ان کی صحبت میں کئی سال رہ کر ان کی زندگی کو بہت قریب سے
دیکھا تھا اس لیے داغ کے حالات سے واقفیت کے لیے یہ کتاب بہت
اہمیت رکھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "داغ پر جب کوئی
سوانح نگار یا ناقد قلم اٹھائے گا اس کی راہبری کرنے کے لیے پہلا سنگ راہ
یہیں سے ملے گا"[۳۲] داغ نے خود اس کتاب پر قطعہ تاریخ رقم کیا تھا۔

زندگی کے میرے احسن نے سوانح لکھے ۔ گھر کے باغ کا آنکھ سے جلوہ دیکھا
داغ نے مصرع تاریخ کہا برجستہ ۔ جلوۂ داغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھا
۱۳۱۵ھ

حیدر آباد قیام کی دوسری یادگار تالیف "فصیح اللغات" ہے
یہ اردو الفاظ و محاورات کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ محاورات و ضرب الامثال کے
استعمال پر انہوں نے استاد سے سیکڑوں اشعار کہلوائے تاکہ ان پر مہر
تصدیق ثبت ہو سکے۔ حضرت داغ کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے یہ لغت
مکمل نہ ہو سکی اس کے اجزا بعد میں رسالہ فصیح الملک میں قسط وار شایع
ہوتے رہے۔

نثریات کے ضمن میں احسن مارہروی کی سب سے اہم و معرکۃ الآرا تالیف
"تاریخ نثر اردو" ہے یہ اردو نثر کے آغاز و ارتقا کی جامع و مفصل تاریخ
ہے جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے تاریخ نثر اردو کو چھ ادوار میں

تقسیم کر کے اس پر محققانہ بحث پیش کی ہے اور اردو نثر کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور ہر عہد کی خصوصیت بھی واضح کی ہے۔ اس کتاب کی امتیازی شان یہ ہے اس میں ہر عہد کے نثری نمونے مختلف النوع تحریروں سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں کتابیں، رسائل، اخبارات، سرکاری کاغذات اور مراسلات و خطبات بھی شامل ہیں۔ مزید براں ہر عہد کے نمونے کے ساتھ اس عہد کے متعلقہ متروک الفاظ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا تحقیقی و علمی کارنامہ ہے جو تنہا صاحب کتاب کا نام زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے[۳۳]۔ اس کا تاریخی نام "نمونۂ منثورات" ہے جس سے اس کا سن تکمیل ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۹ء) نکلتا ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں شایع ہوئی۔ ان اہم و وقیع نثری تالیفات کے علاوہ احسن نے "انشاء داغ" کے نام سے داغ کے خطوط کا مجموعہ مرتب کیا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام ۱۹۴۱ء میں اشاعت کے مرحلے سے گذرا۔ احسن مارہروی کے تصنیفی و تالیفی کارناموں میں طلبہ کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری بھی شامل ہے۔ انہوں نے اس نقطۂ نظر سے نظم و نثر کے کئی ایک انتخاب تیار کیے جن میں "احسن الادب" اور "احسن الانتخاب" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

احسن مارہروی نے اردو ادب کی توسیع و ترقی کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کا ایک اہم حصہ رسائل کا اجرا رہا۔ سب سے پہلے انہوں نے ۱۸۹۵ء میں مارہرہ سے "ریاض سخن" نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ یہ رسالہ غزلوں کے لیے وقف تھا اور اس میں خصوصیت سے نواب محبوب علی خاں والی دکن اور ابراہیم علی خاں نواب ٹونک کا کلام شایع ہوتا تھا۔ موخر الذکر نے اپنے تخلص کی رعایت سے اس کا نام بدل کر "ریاض خلیل" رکھ دیا تھا[۳۴]۔ دوسرا رسالہ "فصیح الملک" اس سے زیادہ معروف ہوا۔ یہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک جاری رہا۔ "فصیح اللغات" کی قسط وار اشاعت کے علاوہ احسن نے اس رسالے کے ذریعہ اپنے ادبی نظریات اور تنقیدی افکار سے دوسروں کو روشناس کرایا۔ اردو زبان کو سلیس و آسان بنانے کے لیے داغ نے جو تحریک شروع کی تھی احسن نے اس رسالے کی وساطت سے اسے اور آگے بڑھایا۔ اس رسالے کے ہر شمارہ پر شعار کے طور پر یہ لکھا ہوتا تھا "جو بولو وہی لکھو"۔ اس کے علاوہ لغوی غلطیوں کی اصلاح اور صحیح الفاظ کے استعمال پر زور اس رسالے کی ایک قابل تعریف ادبی خدمت تھی[۳۵]۔

ان تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ احسن مارہروی نے اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے مختلف پیرایہ میں کوشش کی۔ ان کی ادبی خدمات کا سب سے نمایاں پہلو زبان کی اصلاح ہے جس میں اسے آسان بنانے کی مہم اور صحیح الفاظ کی ترویج دونوں شامل ہیں۔ یہاں یہ ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کو مختلف قسم کی گراں باریوں سے پاک و صاف کرنے کے حق میں تھے لیکن وہ یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اردو کا نام بدل کر "ہندوستانی" یا کچھ اور رکھ دیا جائے اور اس طرح اس کا تشخص ختم کر دیا جائے[۳۶]۔ وہ خود الفاظ کی تحقیق و تفتیش میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ایک لفظ و محاورہ کی تحقیق میں وہ کئی کئی دن گذار دیتے تھے۔ لغات و ذخیرہ مصطلحات کے مطالعہ میں ان کا انہماک بھی اسی دلچسپی کا مظہر تھا۔ زبانی گفتگو اور عام بات چیت میں الفاظ کی تصحیح اور زبان کی درستگی کے علاوہ انہوں نے اپنی تحریری صلاحیتوں کو بھی اس خدمت کے لیے وقف کیا اور اپنی کتابوں و مضامین میں اردو زبان کی اصلاح کے اس پہلو کو خاص طور سے نمایاں کیا۔ ان کے مکاتیب کے مجموعہ میں سیکڑوں خطوط ایسے ملتے ہیں جن میں کسی لفظ یا ترکیب کی غلطی کی اصلاح کی گئی ہے یا کسی لفظ کی اصلیت اور اس کے مروجہ استعمال سے بحث کی گئی ہے۔ یا کسی لفظ کی تذکیر و تانیث کی تعیین کی گئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی لغوی و لسانی اصلاحات کو لغات اور اشعار کے حوالے سے مدلل کیا ہے۔ ان اصلاحات کی نوعیت و اہمیت واضح کرنے کے لیے ان کے خطوط سے چند مثالیں دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ... "دائم اور مریض دونوں اسم فاعل ہیں ان دونوں کا بقاعدہ عربی (بادخال الف لام) استعمال صحیح نہیں۔ دائم الصوم کی جگہ دائم الصائم اور دائم النوم کی جگہ دائم النائم کہنا غلط ہے"[۳۷]...... "خسرو" بروزن "جو، آؤ" صحیح ہے "ہرزہ" کے وزن پر صحیح نہیں جس نے لکھا غلط لکھا[۳۸]...... "پروا" فارسی لفظ ہے اور اس میں "ہ" نہیں ہے یہ پنجاب کا ایجاد ہے "پرواہ"۔ "آپ نے لکھا "ہنود" کی جگہ "اہل ہنود" غلط ہے صرف ہنود صحیح ہے جیسے مسلم نہ کہ اہل مسلم"[۳۹] ...... "بھول کو ناسخ نے مونث لکھا ہے مگر ہماری زبان پر مذکر ہے اور فرہنگ آصفیہ دہلی نے بھی مذکر لکھا ہے"[۴۰]...... "نقطہ و نکات" کے باب میں سب سے پہلے ان حضرات کی رائے سے اتفاق ہے جو بکسر اول صحیح سمجھتے ہیں اگر کسی لفظ

صحت و عدم صحت کا مدار لغت پر ہے تو غیاث اللغات کی یہ عبارت پڑھی جائے "نکات" بکسر اول جمع نکتہ و بعض محض غلط چو اگر در آن فعال بفتح اول زان جمع نیست"۔[۴۳]

اردو ادب کے لیے ان کی ایک اور قابل ذکر خدمت یہ ہے کہ انہوں نے بے لاگ تبصرہ و بے باک تنقید نگاری کو فروغ دیا۔ وہ بے جا تعریف و مداحی کے سخت مخالف تھے اور کسی بھی تالیف یا تصنیف پر اظہار خیال کرتے وقت وہ اس کے محاسن و معائب دونوں کی نشاندہی اپنا فرض سمجھتے تھے خود انہیں کے الفاظ میں "اس میں شک نہیں ریویو یا تقریظ کی اصل غایت یہی ہے کہ کسی کتاب یا مضمون پر ریویو لکھنے والا صحیح رائے ظاہر کرے اور اس کی تصنیف کے تمام عیب و صواب بغیر کسی ذاتی رعایت اور تعصب کے سنائے...... یہ غلطی اور بڑی بھاری غلطی ہے اگر کوئی مصنف اپنی کتاب کی غلطیاں سن کر برا مانے۔ غلطی بشریت ہے اور اس کی اطلاع پر برا ماننا جوانیت ہے"[۴۴] انہوں نے جو تقریظات و تبصرے لکھے ہیں ان میں اسی نقطۂ نظر کی صاف جھلک نظر آتی ہے اور کمال یہ ہے کہ ان کی بے لاگ تنقیدات میں تنقیص یا دل آزاری کا بھی شائبہ نہیں ملتا۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ احسن مارہروی کی شخصیت گوناگوں اوصاف و کمالات کی حامل تھی۔ ایک با اصول و خلیق انسان، شفیق و تجربہ کار استاد اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک عمدہ نثر نگار اور بے باک نقاد بھی تھے۔ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف ان کی پسندیدہ مصروفیات تھیں۔ شعر و شاعری کے میدان میں انہوں نے روایت پرستی اور جدت پسندی کے بین بین توازن کی راہ اختیار کی۔ ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف ہوئیں۔ اردو زبان کی اصلاح اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے ان کی جدوجہد کسی تحریک یا مشن سے کم نہ تھی۔ علم و فن کے میدان میں ان کی نمایاں خدمات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علمی دلچسپی کو فروغ دیا۔ تحقیقی ذوق کو پروان چڑھایا اور تنقیدی شعور کو بیدار کیا۔ ان کے ادبی مشاغل "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے سماج" کے نظریہ کے تحت جاری رہے۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ جوہر اور قلمی صلاحیتوں کو اخلاقی و معاشرتی اقدار کو اجاگر کرنے اور علم و عمل کی دعوت عام کرنے کے لیے استعمال کیا۔ قومی و ملی مسائل میں ان کی دلچسپی شعری تخلیقات کے ذریعہ بھی ظاہر ہوئیں۔ ملی اتحاد، قومی بیداری، تعلیمی سرگرمی و عملی جدوجہد جیسے مضامین خاص طور سے ان کی نظموں میں مرکزی خیال بنے۔ مسلم یونیورسٹی سے تعلق و لگاؤ ان کے رگ و جاں میں پیوست رہا۔ اپنی نگارشات کے ذریعہ اس کے فیوض و برکات اور مسائل کو واضح کرنے کے علاوہ وہ عملی طور پر بھی اس کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں و سرگرداں رہے۔[۴۵] ایک اہم عصر محمد سعید خاں سعید نے بڑے اچھے انداز میں ان اشعار میں ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کیا ہے؎

الحاج بھی حافظ بھی تھے سید بھی تھے احسن
شاعر بھی تھے اور عالم جید بھی تھے احسن
سیدؔ نے بنا ڈالی تھی جس علم و ادب کی
احسن نے یہاں آکے اسے اور جلا دی
تحقیق بھی یکتا تھی مبصر تھے بھی کامل
تاریخ بھی شاہد ہے یہ دعویٰ نہیں باطل
محتاج بیاں اس کے نہیں کارنمایاں
جو خود فلک علم کا ہو مہر درخشاں[۴۶]

سید احسن مارہروی کے علمی و ادبی کارناموں سے قطع نظر اس وقت ان کی خاندانی یادگاروں میں دو صاحبزادگان (ڈاکٹر سید انعام احسن صاحب۔ اور سید احسن صاحب (جو کراچی میں سکونت پذیر ہیں) اور ایک نبیرہ (جناب عزیز احسن صاحب، کیرٹیکر مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) باحیات ہیں۔ موخر الذکر اس اعتبار سے خصوصی ذکر اور شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس مضمون کے لیے مواد کی فراہمی میں مجھے بھرپور تعاون سے نوازا۔

حواشی و مراجع

1. مکاتیب احسن (مرتبین ڈاکٹر عنوان چشتی و صغیر احسنی جلال آبادی) اردو سماج نئی دہلی، ۱۹۷۰ء (مکتوب بنام محمد محسن بلگرامی) ص ۲۹۰
2. محمد ایوب قادری، احسن مارہروی عظیم شاعر و صاحب طرز ادیب، روزنامہ مشرق، کراچی، ۱۹۶۲ء
3. مقدمہ مکاتیب احسن، ص ۱۳۔۱۴
4. احسن مارہروی۔ "داغ احسن"، علی گڑھ میگزین مارچ ۱۹۳۴ء ص ۱
5. احسن مارہروی، کلیات ولی (مقدمہ) انجمن ترقی اردو (دکن) ۱۹۲۷ء ص ۲۰
6. بعض سوانح نگار اور تذکرہ نویس یونیورسٹی میں ان کے تدریسی مشاغل کی ابتدا ۱۹۲۱ء سے منسوب کرتے ہیں لیکن خود احسن مارہروی نے اپنے مختلف خطوط میں یہاں کی ملازمت کا نقطہ آغاز ۱۹۲۲ء ذکر کیا ہے (دیکھئے مکاتیب احسن۔ ص ۱۹۱، ۲۱۱)
7. مکاتیب احسن (مکتوب بنام جذب عالم پوری) ص ۹۹
8. شعبہ اردو۔ ماضی، حال و مستقبل، شائع کردہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۲ء ص ۸
9. مکاتیب احسن (مکتوب بنام ڈاکٹر غلام مصطفی خاں) ص ۲۸۶
10. علی گڑھ میگزین، احسن نمبر۔ جلد نمبر ۱۹ ستمبر ۱۹۴۱ء۔ ص ۱
11. مکاتیب احسن (بنام صغیر احسنی) ص ۲۵
12. رشید احمد صدیقی، احسن مارہروی مرحوم، علی گڑھ میگزین احسن نمبر ص ۲۸
13. مکاتیب احسن (مکتوب بنام صغیر احسنی)، ص ۲۵
14. احسن الکلام (مرتبہ سعید احسن مارہروی) مکتبہ تخلیق ادب، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۱۹
15. دیکھئے فہرست مخطوطات ذخیرۂ احسن مارہروی (مرتبہ سید محمود حسن قیصر امروہوی)۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۳ء
16. مکاتیب احسن (مکتوب بنام راز احسنی)۔ ص ۱۴۳
17. مقدمہ کلیات ولی، ص ۴۲
18. مکاتیب احسن (مکتوب بنام جذب عالم پوری) ص ۹۲
19. مولانا طفیل احمد، حضرت احسن کی یاد میں، علی گڑھ میگزین احسن نمبر ص ۱۸
20. نیاز فتحپوری، احسن مارہروی، روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء
    صغیر جلال آبادی، احسن الاخلاق، علی گڑھ میگزین احسن نمبر ص ۲۳، ۲۴
21. احسن الکلام، ص ۱۸۹
22. ایضاً۔ ص ۱۸۵
23. اس نظم پر مفصل تبصرہ کے لیے دیکھیے احمد علی کا مضمون اخبار "خواتین" کراچی ۳۰ اگست تا ۵ ستمبر ۱۹۶۹ء
24. ایضاً ص ۱۹۷۔ ۱۹۸
25. مکاتیب احسن (مکتوب بنام راز احسنی) ص ۱۴۱۔ مختلف ادوار میں شاعری کے مزاج میں تبدیلی پر احسن کے خیالات کے لیے دیکھیے۔ احسن مارہروی مرحوم، اردو کی موجودہ شاعری، روزنامہ جنگ کراچی۔ ۳۱ اگست ۱۹۶۲ء
26. نیاز فتح پوری، احسن مارہروی۔ روزنامہ جنگ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۴ء
27. احسن الکلام۔ ص ۴۸۔۴۹
28. علی گڑھ میگزین، احسن نمبر، ص ۳۶ نیز دیکھیے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مولانا احسن مارہروی روزنامہ جسارت، ۲۷ فروری ۱۹۸۱ء
29. مکاتیب احسن کے مقدمہ (ص ۳۶) میں اس کا نام "کسوف الشمس" لکھا ہوا ہے جو صحیح نہیں ہے۔
30. جوش ملسیانی کارنامۂ غم، علی گڑھ میگزین احسن نمبر ص ۱۰۵۔۱۰۶
31. ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مولانا احسن مارہروی، روزنامہ مشرق (کراچی)، ۳۰ اگست ۱۹۷۸ء
32. حضرت احسن مارہروی کا ذوق علمی اور ان کے بعض علمی شاہکار ے علی گڑھ میگزین احسن نمبر۔ ص ۱۹۲۔ ۱۹۳
33. طفیل احمد، احسن نمبر محولہ بالا۔ ص ۱۹
34. ڈاکٹر غلام مصطفی خاں۔ مقدمہ احسن الکلام، ص ۳۶
35. تمر بدایونی۔ حضرت شاہ میاں احسن مرحوم کی یاد میں۔ علی گڑھ میگزین احسن نمبر۔ ص ۵

ـه مکاتیب احسن (مکتوب بنام جذب عالم پوری) ص۱۳۱۔ اردو زبان کے جوہر و کمالات پر احسن مارہروی کے خیالات کے لیے دیکھیے جلیل قدوائی، ترجمہ کی مشکلات، روزنامہ جنگ کراچی، ۱۳ اگست ۱۹۶۳ء

ـه مکاتیب احسن، ص۲۵۴

ـه ایضاً، ص۲۳۰

۳۹ه ایضاً، ص۱۶۸

۴۰ه ایضاً، ص۲۳۵

۴۱ه ایضاً، ص۱۸۲

۴۲ه احسن مارہروی، "ریویو"، علی گڑھ میگزین احسن نمبر ص۱۴۲، ۱۴۳

۴۳ه علی گڑھ میگزین احسن نمبر ص۱۶۲

"سرسید کی تعلیمی نظریہ کے متعلق عجیب قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مذہبی لوگ ان میں روحانیت کا فقدان پاتے ہیں۔ سیاسی عقائد والے انھیں ایک مخصوص طبقہ وارانہ ذہنیت کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ معاشری خوبیوں کی قدر کرنے والے ان کے خیالات کو مغربی تہذیب و معاشرت کا ایسا عکس کہتے ہیں جو کسی ناہموار آئینے میں نظر آرہا ہو۔ افادی تعلیم کے پرستار اس میں پیشہ ورانہ رجحان کی تلاش کرتے ہیں اور جب وہ اس تعلیمی موجد کے شاہکار کو اپنے ذہن کے دھندلے اور حقیقت سے دور نقوش کے مطابق نہیں پاتے تو اعتراض کرنے کے لیے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ وہ مونالزا کی تصویر، اس کے پھولے پھولے سے گالوں پر کیوں نہیں اعتراض کرتے۔ وہ تاج محل کے دائیں بائیں کی جوابی عمارتوں پر نکتہ چینی کیوں نہیں فرماتے، اس لیے کہ وہ تخلیق کا شاہکار ہیں۔ علی گڑھ بھی ایک حد تک اسی لحاظ سے سرسید کا شاہکار ہے۔ ایک بلند تخیل، ایک تخلیقی جذبے کا کارنامہ ہے۔ وہ جذبہ جو اسے راتوں کو سونے نہ دیتا تھا اور اس کے دنوں کو رات سے زیادہ تاریک اور افسردہ بنائے رکھتا تھا۔"

چودھری عبدالغفور

اقبال سُہیل

ڈاکٹر اخلاق احمد

ستر ہویں صدی عیسوی یعنی عہد جہانگیری اور عالمگیری سے اعظم گڑھ کے اندر راجاؤں کا خاندان آباد ہونا شروع ہوا اسی دور کے شروع میں ابھی من رائے، اور اس کے بھتیجے ہربنس رائے ماہیں پرگنہ کی زمینداری اعظم گڑھ کے اندر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے قبل راجہ خاندان کے لوگ مینہہ نگر تپہ دوبیٹھا پرگنہ نظام آباد سرکار جونپور کے شریک دار تھے۔ مختلف اوقات میں راجپوت مینہہ نگر میں آباد ہوتے رہے اور زمین داری قائم کرتے رہے، حالات کے تحت اس خاندان کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا جس کی وجہ سے سرکاری عہدے حاصل کرنے اور زمینداری قائم کرنے میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ اپنی حفاظت اور اثر قائم کرنے کے لیے بہتر انتظام اور فوج کا انتظام کیا۔ ایک قلعہ بھی تعمیر ہوا جس کا کھنڈر آج بھی مینہہ نگر کورٹ کے نام سے مشہور ہے۔

راجپوتوں کی طرح مسلمانوں کے بھی مختلف قافلے سرزمین اعظم گڑھ اور اطراف میں ٹھہر چکے تھے۔ اقبال سہیل کے مورث اعلیٰ حسن خاں سورت سے چل کر جونپور کے ’ارنی‘ جنگل میں آکر رہے اس کے بعد حکومت کی جانب سے یہ جنگل اور قرب کے مختلف مواضع عنایت ہوئے۔ اس خاندان کی فراخ دلی اور بلند ہمتی مشہور تھی اس خاندان کے لوگ پہلی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ اس جنگ کی مشہور ہستی بہار کے کنور سنگھ کو کافی دنوں تک اپنا مہمان بنا رکھا تھا۔ کنور سنگھ نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ علاقائی گیتوں میں کنور سنگھ کا نام آج بھی سنائی دیتا ہے۔ جیسے کہ:

لڑت بائے کنور سنگھ دیکت باسے دنیا

اقبال سہیل کے پردادا ضیاء الدین خاں کی شادی اعظم گڑھ میں موضع بر ہرہ (جس کو عرف عام میں بڈھیریا کہتے ہیں) میں ہوئی تھی۔ اب جونپور کے علاقہ کھیتا سرائے کو چھوڑ کر یہیں آباد ہو گئے اور عدالت میں مختاری کا پیشہ کر لیا۔ معاشی خوش حالی کے لحاظ سے پڑوس میں موضع بواوہ خرید لیا گیا۔ سہیل گیارہ ربیع الآخر کو [illegible] میں بڈھیریا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عزیز اللہ خاں نے ابوالظفر نام پسند کیا اور یہی نام پڑ گیا لیکن دادا امان اللہ خاں بچے کو اقبال کہہ کر پکارنے لگے دادا کی موجودگی میں باپ کی کیسے چل سکتی تھی بعد میں سہیل کی روشنی میں دونوں کے چہرے منور ہوئے۔ روایت کے مطابق دینی تعلیم گھر پر شروع ہوئی۔ کسی مدرسے میں نہیں بھیجے گئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے والد مولانا شفیع صاحب اس کام کے لیے موضع سید حا سلطان پور سے بلائے گئے۔ مولانا مشہور دینی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بانی، سیرت صحابہ کے نقش ثانی اور علم میں لاثانی تھے۔ مولانا شفیع کے علاوہ ابتدائی تعلیم کے لیے مولانا یعقوب بھی تھے۔ والد نے بیٹے کی عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی پر زیادہ زور دیا اس لیے اسلام کی رغبت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب پر بھی دسترس ہوئی۔ یہاں تک کہ دس سال کی عمر میں فارسی زبان

ں شعر کہنے لگے۔

ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد سہیل بڈھیریا گاؤں سے اعظم گڑھ شہر میں اپنے نانا عبدالرحیم کے پاس آگئے آپ مسلم پٹی کے مشہور وکیل مرزا محمد نعیم کے محرر تھے۔ مرزا صاحب پیشۂ وکالت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ آپ کی مرکزی شخصیت سے شبلی منسلک تھے۔ سہیل کی والدہ کی خالہ مرزا صاحب سے منسوب تھیں اس لیے سہیل خود بخود اس مرکز کی طرف کھنچ گئے۔ شبلی نے سہیل کو صرف عربی ادب کی اعلیٰ کتابوں کا سبق ہی نہیں پڑھایا بلکہ ادبی ذوق بھی پیدا کر دیا۔ مشرقی علوم کی تحصیل کی غرض سے سہیل علی گڑھ پہنچے۔ مولانا حمیدالدین فراہی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ ان دنوں۔ ایم اے۔ او کالج کے اساتذہ کی رہائش کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے حسب منشا رہائش گاہ تلاش کر لی جاتی۔ مولانا فراہی علی گڑھ شہر کے محلہ اسرائیلیان میں رہا کرتے تھے۔ وہیں پر حسرت موہانی بھی رہتے تھے۔ اس لیے ادبی ذوق اور شعر و شاعری کے رشتے سے سہیل کے ان سے اچھے مراسم ہو گئے۔ علی گڑھ گزٹ کے اڈیٹر وحیدالدین سلیم پانی پتی، مولوی رشید احمد انصاری کے ساتھ رسل گنج سے چل کر شام کے وقت مولانا حمیدالدین فراہی کے ساتھ چائے پیا کرتے تھے۔ سہیل کو ان بزرگوں اور عالموں سے ملنے کے مواقع میسر تھے۔ اسی دوران سہیل کی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی۔ سہیل کے مشرقی علوم کی تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۹۰۹ء تک چلتا رہا۔ اس طرح علی گڑھ سے ان کا تعلق دو حیثیتوں سے رہا۔ ایک مشرقی علوم کی تحصیل کے لیے دوسرا تعلق ۱۹۱۴ء میں نئے علوم حاصل کرنے کے لیے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا۔ اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور ان دونوں سلسلوں کو ملا دیتے ہیں۔ اس طرح پانچ برس کا وقفہ غائب ہو جاتا ہے۔ سہیل کے علی گڑھ سے دونوں رشتے جدا جدا اور مختلف نوعیت کے ہیں۔

مشرقی علوم کی تکمیل کے بعد سہیل کی شادی حفیظ اللہ خاں کی بیٹی صورۃ النسا سے ہوئی چونکہ خسر صاحب بحیثیت مختار بنارس میں رہتے تھے۔ اس لیے سہیل کو بھی بنارس میں رہنے کا موقع ملا بنارس میں اس خاندان کا ماحول اعظم گڑھ کے ماحول سے مختلف تھا۔ یہاں زمانے کے نیے رجحانات سے کافی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ راقم السطور کی والدہ عالیہ بیگم حفیظ اللہ خاں کی بھانجی تھیں۔ وہ بھی بنارس میں اپنے والد عبدالصمد صاحب کے ساتھ محلہ مدن پورہ میں رہا کرتی تھیں اس لیے بہت کچھ معلومات آپ کی ذات سے وابستہ ہیں آپ ہی نے مجھ کو زمین داری کے جھمیلوں سے الگ کیا اور تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ سہیل کے گھر والے نئی تعلیم کے حق میں نہ تھے۔ سہیل کے خسر حفیظ اللہ خاں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کو انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔ ہائی اسکول میں ایک سال ناکامی ہوئی لیکن ماحول اور ذہانت نے حوصلہ شکن نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں نئی تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ آئے، یہاں بھیجنے کے سلسلے میں سسرال والوں کا ہاتھ تھا۔ حفیظ اللہ خاں تھے تو مختار لیکن پیشے میں دلچسپی لینے کی وجہ آمدنی کافی تھی ایک مرتبہ کسی طوائف نے گلے میں ساڑی کا پھندا لگا کر خودکشی کر لی۔ لاش اس طرح سے لٹکی ہوئی تھی کہ اس کے پیروں کے انگوٹھے زمین کو چھو پاتے تھے کوئی دل گرفتہ اس واقعہ کی زد میں آ گیا اور اس نے اپنا مقدمہ مختار صاحب کے سپرد کر دیا۔ مختار صاحب نے ثابت کر دیا کہ وہاں موقعۂ واردات پر پیروں کے انگوٹھوں کے نشانات کے علاوہ کسی اور کے پیروں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے نہ کہ قتل کا۔ حاضر دماغی دلچسپی اور محنت کی وجہ سے بنارس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی آپ کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی اور جاتے تھے۔ فراخ دلی اور بلند نظری کی وجہ سے سہیل کو علی گڑھ بھیجنے پر آمادہ ہو سکے۔

سہیل کی تعلیم اور قابلیت پر جہاں ان کے گھر والے فخر کرتے تھے وہاں ان کی سسرال والوں کو بھی آسودگی اور ناز تھا۔ کیونکہ مختار صاحب کی اولاد تو کمائی ہوئی دولت کو خرچ کرنے کی فکر میں لگ گئی اور سہیل نے اپنی تعلیم، ذہانت، قابلیت اور وکالت سے سب کو نہال کر دیا۔ علی گڑھ آنے کے بعد سہیل کی ملاقات

رشید احمد صدیقی سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے کہ
"مولانا سہیل (اقبال احمد خاں ایم۔ اے۔ ایل ایل بی علیگ) سے
میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی اس زمانہ میں مولانا شاعری کرتے تھے،
یونین کا الیکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے" "یہ معجون زیادہ تر
بنارس سے تیار ہو کر آتی تھی۔ سہیل جسمانی طور پر کافی دبلے اور کمزور
تھے۔ اس لیے اس قسم کا تعاون ان کے لیے ضروری تھا۔ گھر والے بھی
سہیل سے غافل نہیں تھے۔ وہ سہیل کے علی گڑھ کی زندگی میں بھی
شامل حال رہے لیکن ان کا خاص رجحان صرف دینی تعلیم اور عربی
و فارسی ادب تک محدود تھا۔ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے نئی تعلیم
کی ذمہ داری ان کے خسر نے اپنے سر لے لی۔ اور گھر والوں نے کوئی مخالفت
نہیں کی۔ گھر والوں کو بھی کوئی معاشی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ والد
عزیز اللہ خاں بڑے منکسر المزاج اور مخیر آدمی تھے۔ انسان دوست
اور غریب پرور تھے۔ ان کی مہمان نوازی اور تواضع کی مثال آج بھی
دی جاتی ہے۔ کیا مجال جو کوئی راہگیر کھانا کھائے بغیر آپ کے مکان کے
سامنے سے گذر جائے۔ اوسط درجے کا کھانا ہر وقت سب کے لیے
موجود رہتا تھا۔ گنجی کی (جو اور گیہوں کے آٹے کی بنی ہوئی) روٹی
دال، کوئی سبزی اور چاول ضرور پیش کیا جاتا تھا اگر کوئی دوسری
چیز موجود ہوتی تو اس کو پیش کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔
زمینداری اور کچہری کی آمدنی کی بنا پر کوئی معاشی دشواری نہیں
تھی۔ سہیل کی تعلیمی اور ازدواجی زندگی سکون سے گذرتی رہی۔
بیگم سہیل کی پاکیزگی اور نفاست پسندی ان کے معیار زندگی سے
بڑھی ہوئی تھی۔ سہیل کے دو بیٹے اسلام احمد خاں اور معین الاسلام
تھے۔ علاوہ بریں پانچ لڑکیاں تھیں ایک لڑکی مسلمہ اقبال آج کل اعظم گڑھ
نسواں کالج کی پرنسپل ہیں۔ والد کی فارسی دانی آپ کے ورثے
میں آئی ہے۔

اعظم گڑھ کے وکلا اور پڑھے لکھے لوگ زیادہ تر دیہی علاقوں
سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن رہائش گاہ ان کی اعظم گڑھ شہر میں ہوا
کرتی ہے۔ بنارس اور اعظم گڑھ دونوں اضلاع کی جغرافیائی یکسانیت
اور قربت کی وجہ سے لوگ بنارس کی رہائش بھی حسب منشا و ضرورت
پسند کرتے ہیں پریم چند بنارس کے رہنے والے تھے لیکن ان کی کوئی
رشتہ داری اعظم گڑھ کے جنوبی حصے میں کسی گاؤں میں تھی۔ یہی
وجہ ہے کہ ان کے مشہور ناول "گئودان" کے سمجھنے میں اعظم گڑھ
والوں کو صرف آسانی ہی نہیں ہوتی بلکہ لطف بھی آتا ہے۔ ہوری کا
پورا کیریکٹر اعظم گڑھ کے کسی گاؤں والے کسان کو ہی زیب دے
سکتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں اب سہیل ایم۔ اے۔ او کالج کے طالب علم بن کے آئے تو
انہوں نے اپنے پرانے ماحول سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ الیکشن کے
ہنگامے، علمی ادبی بحثیں، نئے ماحول کی برکتیں، دوست احباب کی
محفلیں، تبادلۂ خیال کی وسعتیں، تجربات کی منزلیں جیسے سہیل کا
انتظار کر رہی تھیں۔ علی گڑھ میں جن مایۂ ناز ہستیوں سے ملنے کا
موقع ملا سہیل ان سے فیضیاب اور متاثر ہوئے۔ مثلاً حبیب الرحمٰن
خاں شیروانی، علامہ اقبال، خواجہ کمال الدین، مسز سروجنی نائیڈو،
وحید الدین سلیم، پانی پتی۔ مولانا طفیل احمد منگلوری، مولانا الطاف
حسین حالی وغیرہ اور ساتھیوں میں رشید احمد صدیقی ڈاکٹر ذاکر حسین
حاذق صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اعتراف ہے
"بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ طالب علمی کے زمانہ میں جن شخصیتوں نے
مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا ان میں سہیل کسی سے پیچھے نہیں تھے"
سہیل کی اولاد ان کے آنگن کی کیاریوں میں کھلے ہوئے پھول تھے
جس کی باغبانی میں وہ ہمیشہ مشغول رہے۔ رشید احمد صدیقی کو جس
قدر اپنے باغ میں گلابوں سے دلچسپی تھی اس سے کہیں زیادہ سہیل
کو اپنے باغ کے پودوں یعنی اولاد سے محبت تھی باپ کی حیثیت
سے زیادہ وہ دوست کی حیثیت سے اپنے بچوں میں پائے گئے۔
انہیں اچھا کھانا کھانے کے مقابلے میں کھلانے کا زیادہ شوق تھا
خاص امراض کی وجہ سے سبزی پر زیادہ گذر ہوتا تھا۔ لیموں کی پسند
نرالی تھی۔ پان سے رغبت کا یہ عالم تھا کہ کام و دہن کے ساتھ پیرہن
بھی رنگین رہا کرتے تھے۔ دسترخوان وسیع اور مستقل ہوتا تھا پھلوں
میں آم سے اس قدر شوق تھا کہ آم کا باغ لگوا کر باغ باغ رہا کرتے
تھے۔ اپنے گاؤں سے جو گنودندی کے کنارے آباد ہے ان کو بڑی

انسیت اور محبت تھی۔ ہر سنیچر کی شام کو وہ اپنے گاؤں جاتے اور پیر
کے روز صبح اعظم گڑھ شہر کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ اسٹیشن سے گھر
تک کا سفر اکے سے ہوتا۔ ان کے ذاتی اکے میں مخصوص صندلی گھوڑی
استعمال ہوتی تھی۔ پیشہ وکالت تھا۔ وکیل اور موکل کا رشتہ کم
پیرو مرشد کا رشتہ زیادہ نظر آتا تھا۔ جس طرح اب بہت سے پیر
بغیر مطالعہ کے دینی علوم کا دعوے دار ہوتے ہیں اسی طرح سہیل بغیر
مطالعہ کے کامیاب وکیل تھے۔ اپنے حافظہ اور ذہن کے سہارے
جرح کے اندر صرف باریکیاں ہی نہیں نکالتے تھے بلکہ کامیابی بھی
حاصل کرتے تھے۔ اور ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ ایک
مرتبہ کسی کمیشن کے سلسلے میں ایک گاؤں میں جانا ہوا۔ موکل نے
ان کی خاطر تواضع کا کچھ ایسا انوکھا انتظام کیا تھا کہ وہ اسے ساری
عمر نہیں بھولے اور اکثر اپنے عزیزوں اور دوستوں کو مزے لے لے
کر سنایا کرتے تھے۔ لطف کا پہلو یہ تھا کہ جس چھپر میں ان کے ٹھہرنے
کا انتظام کیا گیا تھا اس کے اندر کی آرائش و زیبائش کے علاوہ چھپر کے
اوپر بھی قالین بچھائے گئے تھے۔ محنتانہ طلب کرنے کے بجائے جو
کچھ موکل تھما دیتے تھے وہ منظور کر لیتے تھے۔ کمزور یا اہم مقدمات
میں زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ عرضی دعوی قلم برداشتہ لکھتے تھے
یا املا کراتے تھے جو ہر طرح مربوط و مکمل ہوا کرتا تھا۔

سہیل نرم دل اور مروت والے انسان تھے۔ جاہ و حشم
و اقتدار کے قائل نہ تھے۔ پیسہ جمع کرنے سے زیادہ خرچ کرنے میں
راحت محسوس کرتے تھے۔ اخیر عمر میں کہا کرتے تھے کہ ان ہاتھوں
نے تقریباً تین لاکھ روپے کمائے لیکن آج ایک پیسہ بھی جمع نہیں
ہے۔ ایک مرتبہ گھر میں کوئی بیمار پڑ گیا۔ بیماری نے طول پکڑا تو کہنے
لگے شاید کسی کے پاس کوئی رقم جمع ہو گئی ہے۔ پتہ چلا کسی عزیزہ کے
پاس ڈیڑھ سو روپے ہیں فوراً ان کو خرچ کرنے کو کہا گیا تاکہ بیماری
سے نجات ملے۔ جب مشرقی علوم کے طالب علم تھے تو مشرقی لباس
میں ملبوس نظر آئے۔ شیروانی پائجامہ اور چہرے پر داڑھی تھی
لازمے۔ اور کالج میں داخل ہونے کے بعد داڑھی مونچھ کے علاوہ
ساری چیزیں برقرار رہیں۔ چھوٹے قد اور اکہرے بدن کے اور کشادہ
پیشانی چمکتے چہرے پہ ابھری ور روشن آنکھیں، چہرے سے ہر وقت
سرشاری، بے خودی اور مدہوشی ٹپکتی تھی۔ کمزور ضرور تھے مگر بیمار
نہیں تھے۔ ہر کام میں جسمانی محنت سے پرہیز، نماز سے احتراز اور روزے
کی پابندی تھی۔ کیونکہ روزہ ان کے نزدیک ترک عمل تھا۔ راقم الحروف
کو بھی ان کے ترک عمل سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ کسی قلمی رسالے کے لیے
مجھے ان کی قلمی تحریر درکار تھی۔ میں جب بھی ان سے درخواست کرتا
تھا تو کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتے تھے۔ غرض کہ مہینوں کی تگ و دو
کے بعد بڑھیریا میں جاکر چند جملے اور ایک مصرعہ لکھوانے میں کامیابی
ہوئی۔ جملے تو یاد نہیں البتہ مصرعہ یاد ہے جو رسالہ کے مستقبل کی
غمازی کرتا ہے، ع

یہ قطرہ پھیل کر اک روز بحر بے کراں ہوگا

ترک عمل کا سب سے جانکاہ منظر وہ تھا جب ایک شکار پارٹی
کے ساتھ تھک کر بیٹھ گئے تو پھر ان کے لیے ایک چارپائی کا انتظام کیا
گیا جس پر وہ لیٹ گئے اور کچھ لوگ انہیں چارپائی پہ اٹھائے ہوئے
شکاریوں کے ساتھ چلتے رہے۔ غسل نہ کرنا بھی ان کی بے عملی میں
شامل تھا۔ کبھی تنہا پیدل چلتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ کوئی نہ کوئی
ان کے ساتھ ضرور ہوتا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر جب کچہری جاتے تو ارد
گرد بڑے صاحبزادے اسلام احمد خاں اور محرر عین الحق صاحب
سنبھالے ہوئے لے جاتے اور اسی طرح یہ امانت شام کے وقت واپس
بھی لائی جاتی تھی۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلرشپ کے دوران
سہیل علی گڑھ گھومنے آئے۔ اسٹیشن پر حاذق صاحب مل گئے تو ان
کے پاس جاکر ٹھہر گئے۔ حاذق صاحب نہ ملے ہوتے تو وہ ذاکر صاحب کے
یہاں ٹھہرتے۔ ذاکر صاحب کا ڈرائیور بابو خاں کار لیے ان کی خدمت
میں ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ اب ان کو اس بات کا کافی احساس
تھا کہ ان کو ادبی خدمات انجام دینا چاہیے۔ ارادہ تھا کہ اب اعظم گڑھ
جاکر وکالت کا پیشہ چھوڑ کر ادبی خدمات انجام دینا چاہئے لیکن
زندگی بھر کی تن آسانی نے عملی قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ علی گڑھ میں
وہ کافی چست اور تیز تھے۔ اگر قدرت ان کی قوت حافظہ چھین
لیتی تو شاید کچھ عمل پیدا ہوتے۔ ایک لاغر جسم کے ساتھ اکہتر برس

تک زندگی زندہ دلی کے ساتھ گزرتی رہی۔ آخر ایام میں کچھ تو ضعیفی کے اثر سے کچھ اپنے داماد مشتاق احمد کی موت اور کچھ گھریلو معاملات کی وجہ سے آزادی طبیعت کو گھن لگ گیا۔ دو سال علیل رہنے کے بعد بالآخر آٹھ نومبر ۱۹۵۵ء کو اعظم گڑھ میں دار فانی سے ابدی رخصت اختیار کی۔

دنیا طبقاتی نظام اور سماج میں تبدیلی محسوس کرتی ہے لیکن طبقاتی مزاج اور علاقائیت کی وبا سے مفر کوئی آسان چیز نہیں۔ اعظم گڑھ کے اعلیٰ طبقے میں وکلا، ڈاکٹر، رؤسا، اونچے عہدے دار و تعلیم یافتہ لوگ شامل ہیں۔ اس طبقے نے سہیل کو اس طرح گھیر رکھا تھا جس طرح مقناطیسی ذرات تیز چھری کی دھار کے گرد جمع ہو کر اسے کند کر دیتے ہیں۔ علاقائیت کی ردا اوڑھ کر دھوکہ دینا آسان ہوتا ہے۔ اس طبقے نے چپکے سے علی گڑھ کا چمن سہیل سے چھین لیا وکالت جیسے پیشے کی طرف متوجہ کیا۔ سہیل نے آفاقیت کو علاقائیت کے قدموں پر نثار کر دیا۔ لامحدود ہوتے ہوئے بھی خود کو محدود کیا۔ خود فراموشی کی جال میں پھنس کر اپنے بال و پر اس طرح کتروا لیے کہ پرواز کی طرف مائل نہ ہو سکے۔

مرزا احسان بیگ سہیل کے ہم عصر اور ہم پیشہ تھے ان کی سخن وری کو امتیاز و استناد کا درجہ حاصل تھا۔ وہ زندگی کے ضابطوں کے پابند تھے۔ شہرت سے زیادہ شرف کے قایل تھے۔ دار المصنفین کے اہم رفقا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ سہیل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں "اور وکالت کا عذاب نازل ہو رہا جس کی بدولت ان کی حیرت انگیز استعداد و قابلیت کی شان دنیا کے سامنے جلوہ گر نہ ہو سکی۔" لہٰذا آج بھی اعظم گڑھ کی نسل سہیل کو جھک کر سلام کرتی ہے اور ان کا یہ شعر بڑے فخر و ترنگ کے ساتھ پڑھتی ہے ؎

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

انسانی زندگی میں بہت سارے رشتے ہوتے ہیں لیکن ہمارا رشتہ بہت اہم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ عقیدت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ سہیل پر شبلی کی شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ شبلی کے مکتب فکر میں ابو الکلام آزاد، ظفر علی، سجاد حیدر، مہدی افادی۔ عبد السلام ندوی خاص طور سے نمایاں ہیں۔ نکتہ دانوں اور محقق کی صف میں سید سلیمان ندوی، عبد الباری، عبد الماجد دریابادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سہیل شبلی کی چھوٹے پیمانے کی تصویر ہیں لیکن بے عملی اور بے ساختگی کی وجہ سے تصویر کے تخفیف میں کچھ خاص پہلو اوجھل ہو گئے۔ شبلی کی وجہ سے اسلامی تاریخ کی فہم رکھتے ہوئے اور بالغ النظر ہوتے ہوئے بھی تاریخ کے میدان میں عمل پیرا نہیں ہوئے۔ شبلی نے تحصیل علم کے بعد پیشۂ قانون اختیار کر کے مختاری و وکالت کی سندیں حاصل کیں جس کی وجہ سے چند روز تک ضلع بستی میں قیام کیا لیکن میلانات طبیعت علمی مشاغل کی طرف تھا اس لیے اچھے ادیب اور شاعر بنے۔ شبلی کو علی گڑھ میں سولہ سال کی اقامت حاصل رہی لیکن سرسید اور شبلی کے درمیان مکمل طور سے یک دلی اور یک جہتی نہیں تھی اس لیے ان کو علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ کالج ہے۔ مگر انھوں نے نہ مانی۔ پھر لکھنؤ پہونچ کر ندوہ کو ترقی دی بعد میں ندوہ والے ہی ان کے مخالف ہو گئے۔ مجبوراً اپنے وطن اعظم گڑھ واپس ہوئے لیکن علی گڑھ سے بہت کچھ حاصل کر چکے تھے۔ ذاتی صلاحیت اور عمل پیہم کی وجہ سے دار المصنفین وجود میں آیا۔ اسی طرح حالات اور امکانات کے باوجود سہیل بھی علی گڑھ نہیں ٹک سکے اور اعظم گڑھ واپس آگئے۔" ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ نے علی گڑھ سے کیا حاصل کیا؟ یہ سننا تھا کہ اٹھ بیٹھے کہا یہ پوچھو علی گڑھ نے مجھ سے کیا لیا تو بتلادوں"
اس میں کوئی شک نہیں کہ سہیل کے حسن و شعور، قابلیت و ذہانت کی طغیانی سے علی گڑھ کی زرخیز زمین سیراب ہوئی لیکن علی گڑھ نے بھی ان کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام کیا۔ سید سلیمان ندوی نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا "علی گڑھ جا کر تو اقبال سہیل صاحب خوب کھلے۔ وہاں ہم مذاق احباب کے اجتماع یونین کی مجلس اور بزرگوں کی صحبت نے اون کا اصلاحقہ، بکنکا . ۱ ۹ ـ

سہیل نے کتاب حقیقت الربا لکھی مولانا طفیل احمد منگلوری نے خاص طور سے اس پر دیباچہ لکھا۔ کیونکہ مولانا خود غیر مسلموں سے سود لینا ضروری سمجھتے تھے اس سلسلے میں وہ خواجہ غلام الثقلین سے متاثر ہوئے تھے۔ مولانا نے اس سلسلے میں پانچ کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کے علاوہ وحید الدین سلیم پانی پتی تجارتی کاموں میں جو رقم خرچ کی جائے اس پر سود لینے کو جائز سمجھتے تھے۔ خود سرسید اس بات کے قائل تھے کہ اگر گورنمنٹ یا کمپنی ملک کی ترقی کے لیے قرض لے کر قرض خواہ کو ادا کرے یا رفاہ عام کے کاموں کے لیے چندہ کی رقم سود پر اٹھانا اور وہ رقم رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کرنا جائز سمجھتے تھے نلہ ان حضرات کے یہاں سرمایہ پرستی کے بجائے قوم پرستی پائی جاتی تھی۔ دردمندان قوم کی حیثیت سے قوم کی زبوں حالی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے شاہراہ سے ہٹ کر سوچنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی حقیقت الربا تھی۔

سہیل کی نثر نگاری اور شاعری کا جائزہ نہ لیا جائے تو تعارف نامکمل رہے گا۔ اصغر گونڈوی کے مجموعہ کلام "نشاط روح" پر سہیل کا تبصرہ اردو نثر کا اہم سرمایہ ہے۔ پیکر خیالی کو دلکش انداز میں پیش کرنے کے باوجود زبان کا ثقل ہے وہ اس لیے نہیں زائل ہو سکا کہ سہیل سن و شعور کی پختگی کے بعد علی گڑھ پہنچے تھے اس لیے سرسید اور حالی کی زبان پھیکی نظر آئی۔ سیرت شبلی کے عنوان سے ان کے کچھ مضامین رسالہ' الاصلاح' سرائے میر میں سنہ ۱۹۳۴ء سے سنہ ۱۹۳۷ء تک کے نمبروں میں گاہے گاہے چھپتے رہے۔ لیکن ان کی سیمابی طبیعت کو قرار ہی کب تھا کہ سیرت شبلی کو حیات شبلی بنا دیتا سیرت شبلی لکھنے کا یہ انداز تھا کہ ایک تخت کے اوپر جس پر کبھی کبھی کھانا بھی کھایا جاتا تھا، سفید کاغذات کے ساتھ ایک پنسل بندھی ہوتی۔ جب طبیعت کا میلان ہوا تو کچھ لکھ دیا گیا۔ اس طرح قوت حافظہ پر مکمل اعتماد کی وجہ سے کچھ جھلکیاں پیش ہوتی رہیں۔

شبلی کی طرح سہیل نے بھی شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن قومی، ملی سیاسی، نعتیہ، مذہبی نظموں اور قصائد کی طرف زیادہ توجہ کی۔ وہ شیعہ سنی چشمک میں کافی دلچسپی لیتے تھے لکھنؤ شیعیت کا گڑھ ہے۔ یہاں سنیوں کی جانب سے مدح صحابہ کے مشاعرے اور مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ سہیل کو خاص طور سے بلایا جاتا تھا اور وہ شریک ہوتے تھے۔ جہاں ان کی خاطر خواہ بزرگانہ پذیرائی ہوتی تھی۔ شاعری کے علاوہ تقریروں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ مدح صحابہ سے متعلق سہیل کی شاعری میں ان کے عقیدے اور فن کا فنکارانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی انفرادی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک چاروں اصحاب کرام کی عظمت برابر تھی۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔ ؎

بڑا ان کا رتبہ ہے اللہ اکبر
ابوبکرؓ و فاروقؓ، عثمانؓ و حیدرؓ

علی گڑھ میں یونین کا الیکشن لڑانے میں سہیل ہمیشہ پیش پیش رہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں اعظم گڑھ سے یوپی اسمبلی کا الیکشن جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے لڑے۔ مسلم لیگ کے امیدوار لکھنؤ کے سید علی ظہیر ان کے مدمقابل تھے۔ سید علی ظہیر نے پانی کی طرح دولت بہائی۔ سہیل نے اپنی نظموں کی ناؤ چلائی۔ اس کے علاوہ علاقائی گیتوں میں بھی الیکشن کے بارے میں ایک نئی دھن سنائی دی۔ اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں

بدیسی کو کیوں دیس کے ووٹ جائیں۔ جو راے وطن ہو پرائے وطن ہو
تو غیروں کے پھندوں سے آزاد ہو۔ پشیمان باہر کا صیاد ہو
غلامی سے مٹ جائے دامن کا داغ۔ جلے گھر میں مسجد سے پہلے چراغ
بدیسی کی فرماں بری چھوڑ دے۔ غلامی کی زنجیر کو توڑ دے

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ الیکشن جیت گئے۔ سہیل بہ حیثیت شاعر مشہور نہ ہو سکے۔ شہرت اور ناموری سے خود دور بھاگتے تھے شاعری ان کے نزدیک پیشہ نہ تھی بلکہ فن کی اپج تھی۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا فن زندہ ہے۔

حواشی

۱۔ افتخار اعظمی، سہیل اور ان کا ماحول، افکار سہیل، شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ سنہ ۱۹۵۶ء ص ۴۹۔۵۰

۲۔ حافظ عبد الحمید اعظمی، حالات زندگی، افکار سہیل ص ۳۹

۳۔ رشید احمد صدیقی، مولانا سہیل، مضامین رشید، نئی دہلی، سنہ ۱۹۸۶ء ص ۳۳

۴۔ ذاکر حسین تاثرات، سہیل نمبر محمد حسن کالج میگزین جونپور، سنہ ۱۹۵۳ء

۵۔ محمد حنیف خاں، مولانا سہیل کی شخصیت کا ایک انوکھا پہلو بدیہہ گوئی اور مزاح، افکار سہیل ص ۳۶

۶۔ مرزا احسان احمد، اقبال میری نظر میں، معارف فروری سنہ ۱۹۵۶ء جلد ۷۷، عدد ۲، ص ۹۸، ۹۹

۷۔ عبد الحلیم شرر، مجموعہ نظم شبلی اردو مع سوانح عمری، مرتب ظہور الحسن، دہلی، سنہ ۱۳۲۵ھ ص ۵۱

۸۔ ابو علی اعظمی، ایک وحید عصر، افکار سہیل ص ۱۳

۹۔ سید سلیمان ندوی، تابش سہیل، سہیل نمبر محمد حسن کالج میگزین الف

۱۰۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء ص ۵۲۶

"سرسیّد اور ان کے رفقاء جہاں اپنے دل میں قومی درد اور تہذیبی و معاشرتی زندگی میں انقلاب لانے اور اسے عصرِ جدید کے امکانات سے ہم آہنگ کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے وہاں ان کے ذہن تخلیقی جوہر سے بھی مالامال تھے۔ وہ عمل کی تلوار سے بھی آشنا تھے اور قلم کے جادو سے بھی اصلاح قومی کے ان پیغمبروں نے اپنے افعال و اعمال سے ہی اپنے زمانے کو رام نہیں کیا بلکہ ان پر "کتابیں" بھی نازل ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کی بدولت اُردو شعر و ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے نشاۃ الثانیہ کہا جائے تو غلط نہیں۔ سرسید کے عہد کی سیاسی شورشوں اور ان کی عملی جد و جہد اور کارگزاریوں کو دیکھئے اور پھر لاتعداد موضوعات پر ان کی تصانیف کو تو اس دیوقامت شخصیت پر حیرت ہوتی ہے۔"

—— خلیل الرحمٰن اعظمی

خواجہ غلام السیّدین

صالحہ عابد حسین

سیدین صاحب نے اپنی خود نوشت میں شروع میں لکھا ہے ۔۔۔

"سب سے اہم چیز جس کے لیے میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر میں خود انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات فخر کے ساتھ نہیں بلکہ انکسار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ نعمت مجھے بغیر استحقاق کے ملی" اور کیوں سیدین صاحب کو اس خاندان میں پیدا ہونے پر شکر و فخر کا جذبہ تھا؟ یہ بات بہت سے لوگ جانتے ہیں مگر نئی نسل کے بیشتر لوگ نہیں جانتے وہ بچہ جسے دنیائے ادب و علم کے سورج کی گود میں بیٹھنے اور اس سے شرافت و انسانیت سیکھنے اور علم و عمل کا درس لینے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ یعنی الطاف حسین حالی جو ان کے پرنانا تھے۔ خواجہ سجاد حسین علی گڑھ کے پہلے گریجویٹ اور علی گڑھ کی علم و عمل کی زندگی میں روشن چراغ کی طرح روشن ہستی، ان کے نانا تھے ان کے باپ خواجہ غلام الثقلین جنہوں نے علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم پائی۔ اور پانی پت اور علی گڑھ کی تعلیم و تربیت، ذاتی اپج، بے مثال ذہانت، علم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ مطالعے کے ایسے رسیا کہ شبلی نعمانی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ کتابیں جمع کرنے کے ایسے شوقین رہے کہ ہر علم و ادب اور زبان کی نہ صرف مطبوعہ کتابیں بلکہ مخطوطات بھی ایسے چھوڑے جن کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی، انسانوں کی اور علی گڑھ کی خدمت دل و جان سے کی اور اگرچہ ۴۲ سال کی عمر میں خدا کو پیارے ہوگئے، مگر وہ کچھ کر گئے جس کے لیے لوگوں کو صدیاں بھی ناکافی ہوتیں۔ پھر خواجہ غلام الحسنین اور غلام السبطین جیسے چچاؤں کی تربیت اور تعلیم پائی۔ ان میں اول الذکر مشرقی اور مذہبی علوم میں ید طولیٰ رکھتا تھا انگریزی میں بھی ایسی ہی قابلیت تھی کہ اسپرٹ سپنسر کی کتاب کا اس زمانے میں ترجمہ کیا جب لوگوں کا خیال تھا کہ اردو اس کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ اور پچاسوں کتابیں اور کتابچے اردو، عربی، انگریزی میں مذہب اور تعلیم کے بارے میں لکھ ڈالیں۔ فنا فی العلم ان ہی جیسے انسانوں کو کہا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے چچا خواجہ غلام السبطین نے تعلیم بی اے تک پائی تھی مگر دماغ بہت اعلیٰ تھا۔ اور مذہب، انسانیت، مظلوموں دکھیوں کی سیوا کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی روشن خیالی، اصلاح معاشرت کی جدوجہد، عورت کو اس کے سچے حقوق دینے اور دلانے کی کوششیں اور اعلیٰ اخلاقی معیاروں کو خاندان اور سماج میں رائج کرنے کی جدوجہد مثالی تھی۔ نہایت بے غرض اور بے لوث۔ ایسے بزرگوں کی صحبت اور خاندان جس کو نصیب ہو وہ کیوں نہ کہے کہ "میں خود بھی اس سے بہتر انتخاب نہیں کر سکتا"(۱)

یہ بچہ پانی پت میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو مشتاق فاطمہ(۲) کی گود میں چاند بن کر اترا۔ اس وقت بھی وہ خاندان بھر کے لیے انتہائی مسرت اور خوشی کا پیام لایا تھا۔ یہ بات تو پردۂ خفا میں تھی کہ فخر خاندان ہو کر ساری دنیا میں اپنی چمک پھیلائے گا۔

سیدین صاحب کی ابتدائی تعلیم تو حسب دستور عربی فارسی اردو کے ماہروں کی زیر نگرانی ہوئی۔ کلام پاک کی تلاوت اور حفظ کی دولت ہندوستان کے مشہور عالم قرأت مولانا مولوی محی الدین

گرانی ہوئی۔ عربی فارسی کچھ تو اپنے چچا سے پڑھی کچھ اسکول میں
کچھ و مو میرے اساتذہ سے۔ ان کا پہلا درجہ پانی پت کا ایک نیم سرکاری
اسکول تھا۔ جو حالی نے کھولا تھا۔ جب مولانا حالی کی وفات کے بعد
کی یاد میں ان کے بیٹے نے مسلم ہائی اسکول قائم کیا، تو پانی پت کے
تر طالب علموں کی طرح سیدین بھی اس میں داخل ہو گئے۔ خوش قسمتی
کئی اساتذہ خاص کر شاہ عالم خاں ان کو ایسے ملے کہ انہوں نے ان
ذہانت اور علم کے بے پناہ شوق کو پہچانا اور اس ہونہار پر خاص توجہ
ی۔ اور خود سیدین صاحب کو اپنے ان اساتذہ سے بے حد عقیدت تھی۔
سیدین صاحب نے یوں تو علی گڑھ کا نام بچپن سے سنا ہوگا مگر
سطہ ان کو علی گڑھ سے اس وقت پڑا جب وہ آٹھویں یا نویں کلاس
ن حالی مسلم ہائی اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے اسکول کے بہترین
البعلم ہی نہیں بہترین مقرر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ آل انڈیا
ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے حالی مسلم ہائی اسکول کو یہ دعوت ملی
، ہمارے ہاں ایک تقریری مقابلہ ہے اس میں شرکت کے لیے اپنے
ی طالب علم کو بھیجیں۔ سیدین صاحب کے والد اور نانا علی گڑھ
کے بہترین مقرر رہ چکے تھے۔ اور اس زمانے کا بہترین مقرر کا انعام
ہیرلڈ کوکس اینڈ اسپیکنگ پرائز جیت چکے تھے۔ اور خواجہ غلام
ثقلین بھی یونین کے نائب صدر رہ چکے تھے۔ بہر حال اسکول نے
طے کیا کہ سیدین کو اس مقابلے کے لیے بھیجا جائے۔ وہاں پہنچ کر انہوں
نے جو کچھ محسوس کیا۔ اس کا ذرا سا ذکر خود سیدین صاحب نے بھی کیا
ہے۔ وہ چنانچہ دھڑکتے دل اور امید و بیم کے چکر میں گرفتار وہاں پہنچا
پہلی دفعہ علی گڑھ کو دیکھنے کا موقع ملا جس کو سرسید احمد نے قائم
کیا تھا اور جس کا ذکر اکثر سنا تھا۔ اس کی عمارتوں کو، طلبہ کو، دفتروں کو،
عالی شان مسجد وغیرہ کو دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں کہ ایسی تعلیم گاہیں بھی
ہوتی ہیں۔ خیر اگلے دن جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر کانفرنس
کی عمارت میں جو بیگم بھوپال کے نام سے سلطان جہاں منزل کہلاتی تھی۔
تقریروں کا مقابلہ شروع ہوا جس میں بیس پچیس طلبہ
شریک تھے۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا کہ قومی زندگی میں فضول خرچی،
منحوسی سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔

اگرچہ سیدین لکھتے ہیں کہ کوئی خاص چیز تقریر میں نہیں تھی مگر جب
وہاں کے دانش وروں اور یونیورسٹی اور قوم کے رہبروں نے دیکھا کہ
ایک دبلا پتلا چھوٹے قد کا شرمیلا نوعمر لڑکا کھڑا بول رہا ہے۔ اور
اس طرح سے کلام پاک کی آیتیں پڑھ کر تقریر شروع کرتا ہے اور جیسے جیسے
آگے بڑھتا ہے۔ تقریر میں روانی لہجے میں خوشی سے زیادہ خلوص اور اعتماد،
زبان کا حسن اور اس پر دلائل کی مضبوطی بڑھتی جاتی ہے۔ تو سارا ہال
مسحور ہو گیا۔ اور پہلا انعام اس نوعمر لڑکے کو ملا۔

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے انہیں منبر پر کھڑا کر دیا اور ہال
میں خواجہ سجاد حسین اور غلام الثقلین کے جاننے والے بھی موجود تھے۔
لوگوں نے بے اختیار کہا کہ ایسے باپ اور ایسے خاندان کا ایسا ہی بیٹا
ہونا چاہیے۔

یہ تھی سیدین صاحب کی علی گڑھ سے پہلی ملاقات اور یہیں سے
ان کا علی گڑھ سے عشق شروع ہوا تھا۔

جب سیدین صاحب نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں
دوسری پوزیشن لے کر پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا تو ان کو وہاں
سے اچھے قسم کا وظیفہ ملا۔ ظاہر ہے وہ اس لیے تھا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی
میں تعلیم حاصل کریں لیکن سیدین صاحب کے دل میں علی گڑھ سے
تعلیم پانے کی خواہش تھی۔ آخر چار پشت کا تعلق اور محبت تھی۔ حالی کی
جد و جہد اور آرزوؤں کا مرکز، سجاد حسین کی تعلیم گاہ، جو وہاں کے پہلے
گریجویٹ تھے، خواجہ غلام الثقلین کی مادر علمی، جس کا نام انہوں نے
چالیس سال کی عمر میں ہی اتنا روشن کیا کہ دنیا حیران رہ گئی، ملک
ان کا بیٹا نوعمر تھا مگر یہ سب سمجھتا تھا، بے شک والد کے انتقال کے
بعد گھر کے مالی حالات سازگار نہ تھے، مگر سیدین صاحب کی والدہ
مضبوط کیرکٹر اور انتہائی ہمت والی دانش مند عورت تھیں۔
انہوں نے کہا کہ تم جاؤ اور اپنے باپ کی مادر علمی ہی میں تعلیم حاصل
کرو۔ جو ہوگا میں دیکھ لوں گی۔ اور پھر انہیں علی گڑھ سے بھی تھوڑا
سا وظیفہ مل گیا اور وہ اس قدر درویش ذہنیت کے آدمی تھے کہ
فضول خرچی لہو و لعب جیسی چیز سے حتیٰ کہ اچھے کھانے سے بھی انہیں
کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے انتہائی کفایت اور جفاکشی سے علی گڑھ میں

سال گزارے اور کس شان سے گزارے، کیا نام پیدا کیا۔ جس میدان
قدم رکھا فتح ان کی ہوئی۔ یہ داستان تو علی گڑھ کا کوئی ان کا ساتھی
سنا دے یہی سنا سکتا تھا۔

ابتدا میں وہ پریشان تھے۔ کم گو، کم آمیز، دبلے پتلے متوسط قد کے
ک انداز کے فیشن ایبل، متمدن ماحول سے آئے اور سر پھرے اور
بہت قسم کے طالب علم جو نئے آنے والوں کے لیے مصیبت بن جاتے تھے۔ اور اس
ت کے علی گڑھ کا تصور اس سے بڑھ کر تھا جیسا ہندوستانی طالب
م کے لیے آکسفورڈ کا ہوتا تھا۔ بہرحال سیدین کو اپنی ذات پر اور بزرگوں
شہرت پر بھروسہ تھا۔ وہ علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں بی اے
سٹ پوزیشن اور فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسی کے دوران سیدین
احب کی شخصیت نہ صرف یونیورسٹی میں جانی پہچانی ہو گئی تھی بلکہ
ن کی تقریری صلاحیتوں، تحریری قابلیت، علمی ذوق، مطالعے کا
ے پناہ شوق کھیل کود میں زیادہ نہ سہی مگر ٹینس کھیل کر اپنے کو
اتی وجوبند رکھنے کا شوق تھا۔ پھر ان کی نہایت لطیف ظرافت نم
نگاری میں علم کا شعور ظرافت کی چاشنی تھی اور سیدھے سیدھے
گر پرکار انداز میں لکھنے اور بولنے کا فن ان کو ہزاروں میں ممتاز کر دیتا
تھا۔ ان کے تعلیمی زندگی کے دور میں خود یونیورسٹی میں اور اکثر باہر بھی
سیدین صاحب کو تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ صرف ایک بار کا ذکر کروں گی
تقریری مقابلہ ۱۹۲۲ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوا تھا
لی گڑھ سے سیدین صاحب اور ایک طالب علم شریک ہوئے تھے۔ اس
ے علاوہ ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کے طلبہ حصہ لینے کے لیے آئے تھے جس
بن حیدرآباد کے آصف علی بھی تھے۔ سیدین صاحب کو سب سے آخر میں
بلوایا گیا اور ان کی تقریر بہت توجہ اور دلچسپی سے سنی گئی۔ ٹرافی علی گڑھ
یونیورسٹی کو ملی۔ مقرر نمبر ایک آصف علی بیگ کو ججوں نے چنا اور نمبر ۲
سیدین صاحب کو مگر بنارس یونیورسٹی کے حضرات جن میں زیادہ تر اولڈ
بوائز تھے ان کا اصرار تھا کہ سیدین کا نمبر اول ہونا چاہیے۔ آخر انہوں
نے جلسے میں اعلان کیا کہ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے کی طرف سے خواجہ
غلام السیدین کو ایک خاص انعام دیا جائے گا اور بہت اچھی اچھی کتابوں
کا ایک سیٹ ان کو بھیجا جائے گا۔

ان کا نام یونیورسٹی یونین کے نائب صدر کے لیے پیش ہوا۔ دوسرا
طالب علم جس سے مقابلہ تھا اکبر عالم تھے۔ سیدین کا جیتنا یقینی سمجھا
جاتا تھا۔ مگر اندر اندر کچھ ایسی ترکیبیں کی گئیں کہ ان کے نمبر کم ہو گئے، یعنی
دونوں امیدواروں کے برابر برابر نمبر رہے اور وائس چانسلر صاحب نے
فیصلہ فرمایا کہ دونوں چھ چھ ماہ یونین کے نائب صدر رہیں۔ مگر سیدین صاحب
اس سے پہلے ہی یورپ کے تعلیمی سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ علی گڑھ میگزین
کے اردو سیکشن کے مدیر بھی رہے۔ اور علی گڑھ کی تعلیمی، علمی، ادبی زندگی
میں نمایاں حصہ لیا۔ اور استادوں میں بھی جن میں ایک سے بڑا ایک
عالم اس وقت موجود تھا نہایت ہر دل عزیز تھے۔

پروفیسر ہانیکر، پروفیسر حلیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور
کئی یورپین پروفیسر اس ہونہار طالب علم کو بے پناہ چاہتے تھے۔ اور
بعد میں بیشتر سے ان کے دوستانہ تعلقات ہو گئے جو عمر بھر رہے۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی، مولانا محمد علی اور دیگر لیڈروں نے
علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین اور بہت
سے لوگ یونیورسٹی چھوڑ کر جامعہ چلے گئے۔ مگر سیدین صاحب شامل
نہیں ہوئے، یہ اور بات ہے کہ بعد میں انہوں نے جامعہ کا بہت کام
کیا اور جامعہ کی ہر قسم کی مدد کی۔ بزرگوں اور دوستوں کی مختلف
رائے تھی۔ زیادہ تر لوگوں کا مشورہ تھا کہ سول سروس کا امتحان دو
کیونکہ سب کو یقین تھا کہ وہ اس میں نمایاں کامیابی اور اعلیٰ عہدہ
پائیں گے۔ مگر سیدین صاحب کے خاندان میں کسی نے انگریزوں کی
نوکری کرنا پسند نہیں کی۔ کچھ تو خاندانی روایات کی وجہ سے کچھ اس
لیے کہ ان کا رجحان تعلیم کی طرف تھا اور معلم بننے کی ان میں پیدائشی
صلاحیت تھی۔ سول سروس کے خیال کو پسند نہیں کیا وہ باہر جانا چاہتے
تھے مگر ابھی اس کا فیصلہ نہ ہوا تھا وقت گزاری کے لیے علی گڑھ میں
ایم۔ اے۔ ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ چند ہفتوں بعد یوپی کی طرف
سے باہر کے لیے چند وظیفوں کا اعلان ہوا اس میں ایک وظیفہ
تعلیم کے مضمون کے لیے وقف تھا۔ ان کو بھی انٹرویو کے لیے بلایا گیا
دھڑکتے دل کے ساتھ الٰہ آباد پہنچے کچھ ساتھیوں نے ڈرا دیا تھا کہ ٹیڑھے
سیدھے سوال ہوں گے مگر سیدین کسی سوال سے گھبرا جائیں تو ہم سمجھیں۔

انٹرویو تھا) مختلف سوال ہوئے جن کا شافی جواب دیا گیا آخر ایک ممبر نے (جس سے دوستوں نے ڈرایا تھا) یہ سوال کر ڈالا کہ "تمہیں نہ تعلیمی تجربہ ہے نہ تم عمر میں دوسروں کے برابر ہو۔ پھر تمہیں تجربہ کار ہیڈ ماسٹروں یا انسپکٹر آف اسکول پر کیوں ترجیح دی جائے۔" سیدین کی حاضر دماغی اور کسی سے مرعوب نہ ہونے کا یہ ذرا سا نمونہ دیکھیے۔ بولے دونوں اعتراض بجا ہیں اور آپ جو چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن میں اپنی تائید میں آپ کی اجازت سے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ عمر کی کمی ایک ایسا جرم ہے جو عمر کے بڑھنے سے خود ہی معاف ہو جاتا ہے — دوسرا اعتراض زیادہ وقیع ہے لیکن اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہ سوچتا کہ دوسرے امیدوار جو کئی سال کا تجربہ رکھتے ہیں، ان کے سوچنے اور پڑھانے کے طریقے ایک حد تک متعین ہو چکے ہیں اور دو سال کی قلیل مدت میں پرانی عادتوں کو کس حد تک چھوڑ سکیں گے اور نئے اصولوں کو کہاں تک اپنا سکیں گے؟۔

کمیشن کے صدر جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے اور اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہا کہ یہاں تو آپ بھی قائل ہو گئے ہوں گے۔

خدا کے فضل سے سب سامان جانے کا ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ جہاز کی سیٹ بھی ہو گئی۔ دلی اور بمبئی تک پہنچانے والوں نے رخت سفر باندھا۔ ماں بہنوں پر یہ بہت سخت وقت تھا۔ مگر ماں نے کلیجے سے لگا کر بس یہ کہ "میری جان جاؤ جس میں تمہاری بہتری اور خوشی ہو اس میں میری خوشی ہے۔ جاؤ باپ کا نام روشن کرو"۔ اور سیدین نے ماں کی یہ آرزو جس شان سے پوری کی وہ نصف صدی پر پھیلی کہانی ہے۔

سفر کی سخت منزلیں (اس زمانے میں انگلستان کا سفر آسان نہ تھا) طے کر کے لیڈز پہنچے ان کا مضمون ایجوکیشن تھا۔ یہ لیڈز یونیورسٹی تعلیم کے لیے مشہور تھی جسے سر مائیکل سے منظم کیا تھا۔ سیدین صاحب کا داخلہ ہو گیا۔ پہلے ہی سال ڈپلوما میں وہ "نظری اور عملی" دونوں ہی امتحانوں میں فرسٹ کلاس پایا۔ یہاں بھی وہ تمام پروفیسروں اور طالب علموں میں بہت جلد ہر دل عزیز ہو گئے۔ اور بقول خود ان کے ان میں جو ایک شرمیلا پن تھا اس پر بھی کسی حد تک قابو پا لیا۔ دوسرے سال "ماسٹر آف ایجوکیشن میں داخلہ لیا"۔ یورپ اور امریکہ میں جدید تعلیمی رجحان بہت مشکل تھا۔ مگر سیدین کے لیے کوئی چیز ناممکن نہ ہوتی تھی۔

انہوں نے اس کے لیے بے حد مطالعہ کیا۔ جس سے ان کو یوں بھی ہر طرح کا فائدہ ہوا اور ان کا خاص ذہن بن گیا۔ جس میں مطالعہ سے بڑھ کر کوئی دولت نہ تھی۔ انہوں نے دوسرے سال ایم ایڈ کی ڈگری بڑے امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ ان کے استادوں کا اصرار تھا کہ ایک سال ٹھہر جاؤ تو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل جائے گی۔ مگر ماں کی محبت اور خاندان کے مالی حالات دیکھتے ہوئے سیدین صاحب نے اپنی اس تمنا کو کچل ڈالا اور ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیدین صاحب نے چھٹیاں بھی اور امتحان کے بعد یورپ کے اکثر ملکوں کی سیر کی۔ اور جرمنی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر ذاکر حسین (ملاقات تو پہلے کی تھی) اور ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی جو زندگی بھر کی اٹوٹ دوستی میں بدل گئی۔ کئی ہندوستانی نوجوانوں سے گہری دوستی ہو گئی۔ سید نور اللہ، یوسف شاہ، بجے ناتھ کاک، کے۔ بی۔ ایس پروفیسر مجیب وغیرہ۔ لیڈز یونیورسٹی میں بحیثیت مقرر کے بھی سیدین صاحب نے بہت شہرت حاصل کی۔ اور انگریز مقرروں کے مقابلے میں بھی۔ ان کا انداز اور انگریزی کی قابلیت کے خود انگریز معترف تھے اور یہ بہت بڑی بات تھی کہ یہ مغرور قوم اپنے اور اپنی زبان کے آگے کسی افلاطون کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔

سیدین صاحب کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ خاندانی تھا علی گڑھ یونیورسٹی میں اس کی ننھی سی کونپل پھوٹی اور یورپ کی تعلیم میں آزادی کی جدوجہد اور وطن کی محبت کا درخت پھلنا پھولنا شروع ہوا۔ یہیں پہلی بار وہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے یہیں گاندھی جی کی شخصیت اور تعلیم سے اثر لینا شروع کیا۔ اور یہیں ڈاکٹر ذاکر حسین کی محبت میں جامعہ سے انہیں دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر سیدین کو اپنی مادر علمی علی گڑھ یونیورسٹی سے سب سے زیادہ پیار تھا اس کی عزت تھی۔ وہ اس کی کمزوریوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور اس کی خوبیوں سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمت کریں گے۔ ٹریننگ کالج علی گڑھ کی حالت اس زمانے میں ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا نتیجہ ہی نکلا تھا کہ علی گڑھ کے وائس چانسلر آفتاب احمد خاں کا تار ملا۔ جس میں علی گڑھ ٹریننگ کالج کی پرنسپل شپ کی گئی تھی (یہ بات قابل غور ہے کہ سیدین کو زندگی میں بڑی بڑی نوکریاں

اور عہدے ملے، مگر کسی کے لیے انہوں نے خود سے درخواست نہیں دی۔ ہمیشہ دوسروں کی طرف سے پیش کش ہوتی رہی)

لندن سے ہندوستان آئے علی گڑھ پہنچے۔ پرنسپل کا چارج لیا اور دل و جان سے ٹریننگ کالج کی خدمت میں لگ گئے۔ اور چند سال کے اندر اسے زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔ ایسے ایسے قابل طالب علم اس ادارے سے نکلے جنہوں نے نہ صرف اپنے استاد کا نام روشن کیا بلکہ تعلیم کی بہت خدمت بھی کی۔

سیدین کا زیادہ وقت تو ڈاکٹر ضیاء الدین کی وائس چانسلرشپ میں گذرا۔ اور بعد میں سر راس مسعود وائس چانسلر ہوئے تو ان کی بزرگی اور خوردگی کے باوجود بہت گہرے تعلقات ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی شخصیت سے بہت متاثر ایک دوسرے کے خاندان کے معتقد تھے۔ لیکن سیدین کی قابلیت اور ذہانت کے باوجود ان کی نوجوانی کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ ٹریننگ کالج کی پرنسپلی کے لیے کسی قابل انگریز کی ضرورت ہے یہ ذہنی غلامی اس وقت بڑے بڑے قابل لوگوں کے دماغ میں بسی تھی۔ راس مسعود نے لیڈز یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی سے فرمائش کی کہ کسی انگریز ماہر تعلیم کا نام پروفیسری کے لیے پیش کریں۔ (غالباً پروفیسر پرنسپل ہونے کے لیے ضروری تھا) وہاں لوگ سیدین صاحب کی علمی شخصیت سے آگاہ ہو چکے تھے وہاں سے جواب آیا کہ آپ کے یہاں خواجہ غلام السیدین جیسا شخص موجود ہے اس لیے ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ یہاں سے کسی کو بھیجا جائے۔ غرض ۱۹۳۱ء میں ان کا تعلیم کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا اور ٹریننگ کالج کی باگ ڈور پوری طرح ان کے ہاتھ میں آ گئی، ان کے تعلقات ایک طرف تمام استادوں اور پروفیسروں اور ماتحتوں سے نہایت خلوص و محبت کے تھے تو دوسری طرف شاگردوں سے جو اکثر عمر میں ان سے بڑے ہوتے تھے گہری دوستی اور اپنائیت کے تھے۔ مگر دونوں حلقوں میں بہت مقبول تھے

سیدین صاحب نے پرنسپل کے کاموں کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی جاری رکھا۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت کی اور یہاں رہ کر کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، اقبال کا فلسفہ، تعلیم اور تعلیم نو کا پیغام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان ساری مصروفیات کے باوجود ان کی قومی تحریک سے بھی دلچسپی بڑھتی گئی۔ مگر وہ تعلیمی دائرے میں رہ کر آزادئ ہند اور قومی خدمت کا فرض ادا کرنا پسند کرتے تھے۔ گاندھی جی سے انہیں بہت عقیدت اور ذاکر حسین صاحب سے بہت محبت تھی۔ جب گاندھی جی نے واردھا اسکیم پیش کی اور ذاکر صاحب کو اس کا صدر بنایا تو سیدین صاحب اور ان کے کالج کے طالب علموں نے بہت دلچسپی سے کام کیا اور جب اسکیم گاندھی جی کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے بے حد پسند کیا۔ اور اپنا نام سیدین صاحب نے کہیں آنے نہیں دیا بلکہ سارا سہرا ذاکر صاحب کے سر باندھا۔ جانے کتنے ایسے کام تھے جو انہوں نے جامعہ کے لیے اور دوسرے اداروں کے لیے کیے اور اس کا سہرا بزرگوں، دوستوں کے سر باندھا اور خود نام و نمود سے دور رہے وہ کام کے قائل تھے نام کے نہیں۔

تیرہ سال تک وہ اپنے فرائض، نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے اور ان کے ذہن میں دور دور علی گڑھ چھوڑنے کا خیال نہ تھا یہاں شادی کر لی تھی، گھر بنا لیا تھا اور خاندان کا مرکز بھی علی گڑھ اور ان کا گھر بن گیا تھا۔

اور جب ۱۹۳۸ء میں، ذاکر صاحب کی ایما اور وساطت سے انہیں ریاست جموں اور کشمیر میں ڈائرکٹر تعلیمات کی جگہ پیش کی گئی اور سات سال جموں اور کشمیر میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا تو دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ ان کی انتظامی صلاحیت بھی تعلیمی قابلیت سے کم نہ تھی۔ دوسرے جموں اور کشمیر کی تعلیمی دنیا میں اصلاحات کیں۔ اس فرسودہ قدامت پرست سخت تنگ نظر سانچے کو اس خوبی سے بدلا کہ سات سال میں کشمیر کے تعلیمی نظام ملک کے بہترین تعلیمی نظاموں میں شامل ہونے لگا۔ استادوں کی عزت بڑھی، تنخواہیں بڑھیں۔ درجہ بڑھا۔ اسکولوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اور ان کا معیار پہلے سے بہت اونچا ہو گیا۔ دوسری طرف وزیر اعلیٰ سے لے کر نیچے کے افسروں تک سب ان کی عزت کرتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں نواب صاحب رام پور نے اصرار کر کے مشیر تعلیم کا عہدہ رام پور کے لیے سیدین صاحب کو پیش کیا۔ کشمیر کی فضا بدل رہی تھی۔ پھر رام پور میں ان کے عزیز دوست بشیر حسین زیدی کی کوشش بھی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ مل کر وہ بہت کچھ رام پور کے لیے کر سکیں گے

چنانچہ دو سال سے کچھ زیادہ سیدین صاحب رام پور میں رہے اور بہت کچھ تعلیمی اصلاحات کیں۔ اسکول، کالجوں اور تعلیمی اداروں کی حالت بدلی۔ وہاں بھی نہایت ہر دل عزیز اور نیک نام رہے۔

۱۹۳۷ء میں مسٹر بی۔ جی کھیر نے جو اس وقت بمبئی کے وزیر اعلیٰ تھے سیدین صاحب کو بمبئی گورنمنٹ میں مشیر تعلیم کا عہدہ پیش کیا جسے انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ تین سال تک انہوں نے اس وسیع اور اہم ریاست کے تعلیمی کاموں کو سنبھالا۔ جب مولانا آزاد نے انہیں مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیم میں جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے بلایا تو کھیر صاحب کو بہت قلق تھا اور وہ ہر رعایت اور ترقی دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر مولانا آزاد کے ساتھ کام کرنے کی اہمیت، ہندوستان کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی لگن انہیں دلی لے آئی۔ محکمۂ تعلیم ہند میں وہ جوائنٹ سکریٹری بھی رہے اور مشیر تعلیم بھی۔ تقریباً بارہ سال سیدین صاحب نے پہلے مولانا کے ساتھ اور چند سال دوسروں کے ساتھ کام کیا اور ہندوستان کی تعلیمی زندگی اور فضا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مولانا آزاد ان کی بے حد عزت اور قدر کرتے تھے۔ اور سیدین صاحب تو ان سے محبت اور عقیدت رکھتے ہی تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنا جتنا خوشگوار تھا بعد کے آنے والوں کے ساتھ اتنا ہی دشوار تھا۔ مگر سیدین کا یہ ظرف اور صبر تھا کہ ہر مشکل کو وہ خاموشی اور ہر الزام کو حوصلے سے جھیل گئے۔ اور آخر حق ہی کی فتح ہوئی۔ اور ان کا کیرکٹر اور کردار آئینے کی طرح صاف و شفاف ثابت ہو گیا۔

انہوں نے ایجوکیشن منسٹری میں رہ کر علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور دیگر تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی بہت مدد اور خدمت کی۔ نئی پالیسیاں اور بہت سے کالج ملک کے طول و عرض میں کھولے گئے نئے نئے پروگرام ترتیب دیے۔

۱۹۶۱ء میں سیدین صاحب ایجوکیشن منسٹری سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ایک سال کشمیر حکومت کے اصرار پر وہاں ایجوکیشن ایڈوائزر رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے راک فیلر فاؤنڈیشن کی دعوت پر امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں توسیعی لیکچر دیے۔

وہ یونسکو سے ۴۸ء یا شاید اس سے پہلے سے وابستہ تھے۔ انہوں نے سالوں یونسکو کی خدمت انجام دی۔ ،،عالمی بینک مشن برائے عراق،، میں تعلیمی مشیر کی حیثیت سے کام کیا۔ آسٹریلیا کے پہلے نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے بین الاقوامی وفد میں ممبر کی حیثیت سے اہم کام کیے۔ لندن یونیورسٹی میں لیکچر دیے۔ خود ہندوستان میں انہوں نے مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں، دیگر تعلیمی اداروں میں توسیعی خطبات اور کانووکیشن ایڈریس دیے۔

انہیں کئی ایوارڈ بھی ملے، پدما بھوشن کا خطاب اور ان کی کتاب ،،آندھی میں چراغ،، پر ساہتیہ اکادمی کا انعام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۶۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اور کولمبیا یونیورسٹی نے جب اپنی جوبلی منائی تو دنیا کے سات ممتاز ماہرین تعلیم کو ایک تمغہ اور سند پیش کیے گئے تھے۔ سیدین صاحب ان میں سے ایک تھے۔

انگریزی میں ان کی کتابیں ،،اقبال ایجوکیشنل فلاسفی،، اور ،،اسلام مذہب امن،، کو کافی شہرت ملی۔ موخرالذکر کتاب کو انہوں نے انتقال سے صرف دو دن پہلے مکمل کیا۔ اور پھر اپنے خالق سے جا ملے۔

راجہ راؤ

پروفیسر محمد یسین

بانیٔ ادارہ سر سید احمد خاں نے جس خلوص اور قومی و ملی جذبہ سے سرشار ہو کر علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی اور اسے ایک عظیم دانشگاہ بنانے کا خواب دیکھتے رہے اس کی تکمیل میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور عیسائی انگریزوں کا بھی حصہ ہے۔ صدی کے اوائل میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ ادارہ محض درس گاہ ہی نہیں، تربیت گاہ بھی ہے۔ یہاں کے علمی ماحول، ڈسپلن اور طالب علموں کی ہمہ جہتی نشو و نما میں اساتذہ اور ارباب حل و عقد کی طرف سے پرخلوص کوششوں کے چرچے ہر طرف تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۵ء میں جنوبی ہند کے ایک برہمن خاندان کے چشم و چراغ راجہ راؤ بھی حیدر آباد سے تحصیل علم کے لیے علی گڑھ آئے۔ ان کا مقصد علی گڑھ سے باقاعدہ ڈگری حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی میں دو سالہ قیام کے ذریعہ فرانسیسی زبان سیکھنے کے علاوہ اپنے کو یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا تھا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ راجہ راؤ کے ساتھ ایک دوسرا نوجوان احمد علی بھی اسی زمانہ میں علی گڑھ وارد ہوا۔ دونوں یونیورسٹی کے شاعر اور مصور پروفیسر ارک ڈکنسن (ERIC DICKENSON) کی کشش سے یہاں آئے۔ موصوف انگریزی کے صدر شعبہ تھے اور یونیورسٹی میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔ دونوں نوجوان ڈکنسن سے بیحد متاثر رہے اور انھیں کے سایۂ عاطفت میں اپنی خوش آیند زندگی کے خواب دیکھتے رہے اور بالآخر دونوں ہندوستانی انگریزی ادب کے ممتاز ناول نگار ہو کر چمکے۔ احمد علی نے اپنے ناول "دلی کا دھندلکا" (TWILIGHT IN DELHI) میں دہلی کی حقیقی زندگی کی ترجمانی کی اور تقریباً چوتھائی صدی بعد سنہ ۱۹۶۴ء میں "اندھیارے کا سمندر" (OCEAN OF NIGHT) لکھ کر اپنے لیے ہندوستانی ادب میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ راجہ راؤ ابتدائی دور میں گاندھیائی فلسفہ کے ترجمان رہے لیکن بعد ازاں فلسفی ناول نگار بن گئے۔ بہرحال دونوں مادر درس گاہ کے ان لائق فرزندوں میں ہیں جنھوں نے ادبی میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

راجہ راؤ جنوبی ہندوستان میں "ہاسن" (میسور) کے مقام پر سنہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حیدر آباد یونیورسٹی میں کنڑی زبان کے پروفیسر تھے چنانچہ راجہ راؤ کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں وہ فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے علی گڑھ آئے اور بعد ازاں انہوں نے نظام کالج، حیدر آباد سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران راجہ راؤ نے فرانسیسی زبان میں اتنی قدرت حاصل کر لی کہ انھیں نظام وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے "سوربان" (SORBONNE) یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ وہ سنہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک فرانس میں قیام پذیر رہے اور پھر دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر انہوں نے سنہ ۱۹۴۶ء سے سنہ ۱۹۵۶ء تک دوبارہ وہاں سکونت اختیار کی۔

راجہ راؤ ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں میں اس

لحاظ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے مشرق و مغرب دونوں کے علمی خزانوں سے استفادہ کیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ، فلسفہ، مذہبیات (ویدپران) ان کے رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مغربی ادب اور تاریخ فلسفہ کا بھی غائر مطالعہ کیا ہے سنہ ۱۹۲۹ء میں فرانس سے واپسی کے بعد وہ گاندھیائی فلسفہ سے زیادہ متاثر رہے اور کچھ دنوں تک انہوں نے گاندھی آشرم میں بھی قیام کیا۔ آزادی ملنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ فرانس روانہ ہو گئے۔ اور وہاں سے انگلستان اور امریکہ کے علمی دورے کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ان ممالک میں ہندوستانی ادب اور فلسفہ پر کئی لکچر دیئے۔ راجہ راؤ کی پہلی بیوی فرانسیسی تھیں لیکن امریکہ میں قیام کے دوران انہوں نے ایک رقاصہ سے شادی کر لی۔ اس دوران میں ہندوستان سے ان کا تعلق برقرار رہا اور انہوں نے اپنے وطن سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا۔ راجہ راؤ نے ہندوستانی فکر کے سرچشموں سے فیضیاب ہو کر مغربی دنیا کو مشرقی ذہن، ادب، فلسفہ اور مذہب سے روشناس کیا ہے۔ رامائن مہابھارت، گیتا، ویدانت کے علاوہ انہوں نے سیاست میں گاندھی جی، روحانیات میں سری آتمانند اور ادبیات میں W.B.YEATS کے علاوہ VALERY اور ANDREGIDE سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان تمام اثرات کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں

راجہ راؤ کا نظریۂ ادب بنیادی طور پر ہندوستانی ہے اور اس پر قدیم تہذیبی و مذہبی نظریات کی واضح چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے۔ مصنف کے بقول ادبی تخلیق ایک طرح کی ریاضت (تساوعنا") یا روحانی تجربہ ہے جس کے لیے وہ اپنے مرشد یا گرو کا مرہون منت رہتا ہے جب مصنف کو عرفان حاصل ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر اظہار کی تڑپ محسوس کرتا ہے جس کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ راجہ راؤ کے بقول اچھا ادیب وہ ہے جو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کر اپنی ذات و کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تخلیقی عمل زمانہ قدیم کے عبادت گزاروں کی طرح ہر قسم کے موہ مایا سے یکسر بے نیازی کا دوسرا نام ہے۔ راجہ راؤ کی تخلیقات پر ہندوستان کا نقش اتنا گہرا ہے کہ ان کا ایک کردار لا محالہ اس حقیقت کا انکشاف کرتے کرتے رہ جاتا ہے

"میں جہاں کہیں جاتا ہوں ہندوستان کا سایہ میرے اوپر رہتا ہے"

عرصہ دراز تک تارک وطن رہنے کے باوجود ان کی تخلیق کائنات میں ہندوستانی دلوں کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے ناول و افسانے ہندوستانی عناصر بالخصوص قدیم فلسفہ، تاریخ، اساطیر و خرافیات سے مرکب ہیں۔ آخری دور کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ راجہ راؤ آفاقی قدروں میں کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ وہ زندگی کی عمرانی اور ماورائی حقیقتوں میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ، "ہندوستان دنیا کو حقیقت کے عرفان کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا اور وہ حقیقت اخلاقی نہیں بلکہ مابعد الطبیعاتی (META PHYSICAL) ہے۔

راجہ راؤ نے افسانہ نگاری کی ابتدا نو عمری میں ہی شروع کر دی تھی لیکن سنہ ۱۹۳۳ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک کہانیوں کا مجموعہ سنہ ۱۹۴۷ء میں "THE COWS OF THE BARRICADES" کے زیر عنوان شائع ہوا۔ ان میں سماجی شعور اور ہندوستانی زندگی و معاشرت کی حقیقت پسندانہ ترجمانی ہے۔ یہ کہانیاں موضوع اور اسلوب کی حد تک اس کے پہلے ناول "کنٹھا پورا" سے قریب ہیں۔ "JAVNI" اور "AKKYA" میں ہندوستانی عورتوں کی خاموش دلیری اور بے لوث قربانی کا تجربہ ملتا ہے۔ ان کہانیوں میں ذات پات کے شکنجوں اور کم عمری میں شادی کی کلفتوں، بیوہ پن کی پریشانیوں اور سماجی خرابیوں کا بیان ہے۔ مشہور کہانی "NARSIGA" ایک معصوم گڈریہ لڑکے کا خاکہ ہے۔ وہ کسی مقامی آشرم کے بابا کے ذریعہ گاندھی جی کو رامائن کا ہیرو رام اور غیر ملکی حاکم کو راون سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک گاندھی جی کی جیل سے رہائی رام کے بن باس سے اجودھیا لوٹنے کے مترادف ہے۔ ان تمام کہانیوں کا مرکزی خیال ان جذبات سے مملو ہے جو صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں ہندوستانی ادب میں عام تھے لیکن راجہ راؤ نے ان سے

کوئی مبسوط فلسفۂ حیات نہیں مرتب کیا۔

ابتدائی دور کے اہم کارناموں میں راجہ راؤ کا ناول "کنتھاپورا" (KANTHA PURA) مخصوص انفرادیت کا حامل ہے کیونکہ یہ گاندھیائی سیاست کے نیم شاعرانہ اور نیم اساطیری فضا کی باز آفرینی پر مشتمل ہے۔ جنوبی ہند کے ایک گمنام گاؤں میں گاندھی جی کی تحریک اور ان کی شخصیت کے اثرات کچھ اس طرح مرتب ہوتے ہیں کہ ہمیں بیک وقت سارے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہمعصر سیاسی دنیا کے ہیرو قدیم زمانے کے اساطیری ہیروؤں کے شانہ بشانہ نظر آتے ہیں۔ ناول کا ہیرو مورتی اپنی زندگی عدم تشدد اور حق کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس ناول کو "گاندھی پُران" بھی کہا گیا ہے۔ یہاں گاندھی "بھگوان" ہیں اور مورتی ایک اوتار کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزی حکومت دراصل "شیطان کا راج" ہے اور ستیہ گرہی وہ دیوتا ہیں جو اس راج کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ کنتھاپورا گاؤں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ۱۹۳۰ء میں سارے ہندوستان میں ہو رہا تھا لیکن کچھ معنوں میں اس گاؤں کی مخصوص انفرادیت ہے۔ یہاں تاریخ، سیاست، مذہب اور ضعیف الاعتقادی کے باعث کچھ ایسی فضا پیدا ہوتی ہے کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

گاؤں کا جغرافیائی نقشہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ ندی ہماوتی (HIMAVTHI) سارے گاؤں کے لوگوں کی نگاہوں اور دلوں سے قریب ہے، اسی طرح قریبی پہاڑیوں کی دیوی کنچماں "(KANCHAMMA)" اس گاؤں کے باشندوں کے لیے آشیرباد کا ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے۔ ان پہاڑیوں سے پرے بحرِ عرب ہے اور اس سے بھی آگے وہ سرزمین جہاں سے "لال آدمی" آکر ہمارے راجہ بنے بیٹھے ہیں۔ گاندھی جی کا ذکر نہ صرف جلسے جلوسوں میں ہوتا ہے بلکہ بھجن اور ہری کتھا میں بھی ان کا نام احتراماً دیوتاؤں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ چرخہ سوت کاتنا محض علامتی عمل نہیں ہے بلکہ ایک طرح کے پوجا کے مترادف ہے۔ ناول میں جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان جاتے ہیں تو اس کا اظہار کچھ اس طرح ہوتا ہے،

"لوگ کہتے ہیں کہ مہاتما جی لال آدمیوں کے دیس جائیں گے
اور وہاں سے ہمارے لیے سوراج لائیں گے اور پھر ہم
سُکھی ہوں گے۔ راون مارا جائے گا اور سیتا آزاد ہو کر
سیتا بھگوان رام کے پہلو میں رتھ پر بیٹھ کر اجودھیا
آئیں گی جب یہ لوگ وہاں پہنچیں گے تو آسمان سے
پھولوں کی بارش ہوگی"

"کنتھاپورا" کی کامیابی اس کی حقیقت پسندی اور سادہ مگر دلنشیں طرزِ بیان ہے۔ یہاں زندگی کی عکاسی نہایت موثر طریقے سے روایات و رسوم کے پس منظر میں کی گئی ہے۔ راجہ راؤ کو گاؤں کی حقیقت اور اس کے وجود کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے سب لوگ ایک نامعلوم رشتے میں بندھے نظر آتے ہیں۔

"کنتھاپورا" معاشرتی یا سیاسی ناول نہیں ہے بلکہ اس کے اندر انسانیت کی روح مچلتی نظر آتی ہے۔ یہاں ماضی و حال کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور وقت کا ابدی دھارا ہمارے سامنے موجزن نظر آتا ہے۔ یہ ناول راجہ راؤ کے گاندھیائی فلسفہ پر ایمان کی غمازی کرتا ہے اور اس میں افسانوی کردار بھی ہمیں اپنی سادگی، عقیدت مندی اور قربانی کے جذبے کا احساس دلاتے ہیں۔ اگرچہ اس ناول میں مصنف نے ذات پات کے بھید بھاؤ، غربت اور جہالت کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس میں کہیں بھی مصلحانہ جوش و خروش نہیں نظر آتا۔

راجہ راؤ اپنے پہلے کامیاب ناول کے بعد تقریباً بائیس سال تک خاموش رہے لیکن اس دوران میں انھیں جن ذہنی و روحانی تجربوں سے گزرنا پڑا اس کا عکس ان کے دوسرے ناول "سانپ اور رسّی" (THE SERPENT & THE ROPE) میں ملتا ہے جو ۱۹۶۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ دراصل ایک طرح کی رزمیہ داستان ہے جس کی سرحدیں ناول سے ملتی ہیں۔ نقادوں کا قول ہے کہ اگر ان کا پہلا ناول "کنتھاپورا" رامائن کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسرا ناول مہابھارت کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کو "مہا پوران" بھی کہا گیا ہے۔ پوران دراصل سنسکرت ادب میں قدیم صنف ہے جس میں مذہب، فلسفہ، شاعری

زندگی کے تمام تجربات، مشاہدات اور تاثرات ایک دوسرے سے
شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ فطرت کی نوع بنوع رنگینیوں کے علاوہ قدیم رسموں
دیوی دیوتاؤں اور اساطیری کرداروں کے معجزوں اور جوگیوں و سنتوں
کے روحانی تجربوں پر مشتمل حکایات اس کے جزو لاینفک ہوتے ہیں۔
راجہ راؤ کے ناول میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں لیکن ان پر جدیدیت
کی مہر لگی ہوئی ہے۔ بقول مصنف۔ "یہ ناول انگریزی زبان میں
پوران" کی کہانیوں کی تخلیق نو ہے اور اس میں مختلف کہانیاں، حکایات
فلسفیانہ نکتے، اساطیری واقعات اور معاشرتی مباحث مرکزی کہانی
میں مالا کی طرح پروئے گئے ہیں۔

"سانپ اور رسی" میں مرکزی کردار جنوبی ہند کا برہمن
راما سوامی ہے جو خود اپنی کہانی بیان کرتا ہے۔ فطرتاً وہ حساس، نازک
خیال اور عاشق مزاج واقع ہوا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں سرکاری وظیفہ پر
وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس جاتا ہے جہاں یونیورسٹی میں کیتھولک لڑکی
میڈلن سے اس کی ملاقات بالآخر شادی پر منتج ہوتی ہے۔ باپ کی
بیماری کی خبر سن کر راما سوامی ۱۹۵۰ء میں ہندوستان واپس آتا
ہے۔ باپ کی موت کے بعد راما سوامی کا روحانی سفر شروع ہوتا ہے
اور وہ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کے ساتھ شرادھ کے لیے
بنارس جاتا ہے جہاں سے اس کے بقول ابدی ہندوستان کے تمام
شاہراہ گزرتے ہیں۔ بنارس سے یہ قافلہ الہ آباد پہونچتا ہے اور
مذہبی رسومات کے بعد راما سوامی محسوس کرتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی
گوشے میں بھی رہے ہندوستان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ راما
سوامی کا ذہن دراصل تہذیبی دھاراؤں اور مخالف دھاراؤں
کا ابلتا ہوا گرداب ہے۔ اس کے کردار کے متضاد پہلو اسے اکثر اوقات
بے چین رکھتے ہیں۔ وہ کبھی روحانیت سے متاثر نظر آتا ہے تو کبھی
جسمانی لذتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کبھی زندگی کے حقائق
پر غور کرتا ہے تو کبھی خوابناک تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔
اس کے نزدیک اخلاقیات کا تصور سماجی اور مغربی ہے جب کہ
مابعد الطبیعات کا تعلق محض ہندوستان سے ہے اور یہ ابدی اقدار
کی حامل ہے۔ وہ اپنی تمام اخلاقی جنسی بے راہ رویوں، بے وفائیوں اور
سازشوں کو اصلی حقیقت کی تلاش کا نام دیتا ہے اور خود تمام اخلاقی
و مذہبی پابندیوں سے بلند تر محسوس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر
حسب ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"میرا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ کثرت ازدواج مردوں
کی فطرت میں داخل ہے۔ ہندو اور عیسائی جب ایک
ہی رفیقۂ حیات سے نباہ کی بات کرتے ہیں تو وہ سخت
غلطی پر نظر آتے ہیں..... (اس لحاظ سے) اسلام
زیادہ بہتر مذہب ہے کیونکہ وہ زندگی کو فطری انداز
میں دیکھتا ہے۔"

یہاں اس سے بحث نہیں کہ راما سوامی (راجہ راؤ) کس حد تک ہندو
عیسائی یا اسلام مذہب کو سمجھتا ہے لیکن اس کے انداز فکر اور اعمال
سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک مغرب زدہ ہندوستانی شہزادے
کی طرح ہے جو مشرق سے زندگی کی تمام تر برکتیں اور خوشیاں حاصل
کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے ضابطوں اور ذمہ داریوں سے دور
بھاگتا ہے۔

"سانپ اور رسی" میں کہانی کا خاص عمل دو سطحوں پر بنایا گیا ہے
خارجی عمل سطحی طور پر عالمی پس منظر رکھتا ہے کیونکہ ہیرو ہندوستان
فرانس، انگلستان، روس اور اسپین وغیرہ ممالک میں مختلف النوع
تجربوں سے گزرتا ہے اور طرح طرح کے لوگوں سے مل کر زندگی کے
متعلق اپنے تاثرات قائم کرتا ہے۔ اس کی زیادہ تر نفسیاتی الجھنیں
عورتوں کے ساتھ تعلقات کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ راما سوامی
کی تین عورتوں سے زندگی کی مختلف منزلوں پر ملاقات ہوتی ہے
میڈلن جو اس کی بیوی بنتی ہے، بالآخر اسے چھوڑ دیتی ہے۔ لکشمی
جس سے بمبئی میں قیام کے دوران اس سے تعلقات قائم ہو جاتے
ہیں۔ ہیرو کی بے وفائیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ کیمبرج کی آزاد خیال
طالبہ ساوتری کے ساتھ راما سوامی کی علامتی شادی محض
ڈھونگ ثابت ہوتا ہے اور وہ ہندوستان واپس آکر اپنے منگیتر
کے آغوش میں پہونچ جاتی ہے۔ راما سوامی ان عورتوں کی زندگی
میں داخل ہوتا ہے اور ایک حد تک ان کی رہنمائی بھی کرتا ہے

لیکن بالآخر یقینوں اپنی اپنی راہ لیتی ہیں اور راماسوامی اپنے کو بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس ذہنی خلفشار اور روحانی کرب سے نجات کے لیے اسے خدا کی نہیں بلکہ مرشد (گرو) کی تلاش ہے۔ شاید وہی اسے "انفرادی انا" کے التباس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔

ناول کا نفسیاتی عمل کئی اعتبار سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ عمل بہت حد تک راماسوامی کے دل و دماغ اور روح کی گہرائیوں کے اندر ہوتا رہتا ہے۔ ہم جغرافیائی مقامات، خارجی واقعات اور جال افسانہ کے حرکات و سکنات کو راماسوامی کی ہی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ خدا، کائنات، "کرم" موت، "ابد" دھرم"، شادی، عورت، تاریخ کلچر، "نروان" شہنشاہیت اور مارکسزم پر اس کے نظریات اس کے ذہنی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ کہانی میں نفسیاتی گہرائی جنوبی ہند کی معاشرتی زندگی کے پس منظر میں زیادہ دلچسپ ہیں۔

اس ناول میں راماسوامی ہی حقیقت ہے اور باقی سب التباس۔ پروفیسر آئنگر کا خیال ہے کہ راجہ راؤ خود حقیقت ہے اور باقی سب دھوکا ہے۔ مایا ہے۔ ناول کا خاص موضوع انسانی زندگی کی بے ثباتی اور انسانی خواہشات کی بے ثمری کا خاموش نوحہ ہے کیونکہ بیشتر کردار مایا جال میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں اور التباس کو حقیقت سمجھ کر خواہ مخواہ اپنے لیے دکھ درد مول لیتے ہیں۔ جب تک ہم سنسار کے چکر میں رہتے ہیں، اندھیرے میں بھٹکتے رہتے ہیں لیکن جب کسی گرو، کی ہدایت سے حقیقت کا صحیح عرفان ہوتا ہے تو نجات کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ جب تک گرو سے ملاقات نہیں ہوتی ہم "رسی" اور "سانپ" میں فرق نہیں کر پاتے۔ دراصل مرشد کی روحانی بصیرت اور ہدایت کے ذریعہ ہی ہمارے اندر رسی کو "حقیقت" اور سانپ کو "مایا" سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ عورت، محبت، جسمانی لذت، دولت جاہ و اقتدار، شعر و ادب اور فنون سب مایا کے مختلف روپ ہیں۔ اصل چیز "رسی" کی حقیقت کا وہ عرفان ہے جو ہمیں وشنو کے تالاب کی طرح شفاف و متبرک بنا دیتا ہے۔ یہ ناول افسانوی انداز میں قدیم ہندوستانی تہذیب و معاشرت، اساطیر و فلسفہ کو زندگی کے مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ انگریزی زبان میں کسی ہندوستانی نے اس سے بہتر اور پر تاثیر ناول نہیں لکھا ہے

"سانپ اور رسی" میں راجہ راؤ کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی فضا کی بازآفرینی کچھ اس طرح کی ہے کہ یہاں کے شہر دیہات، گاؤں، ندیاں، مندر گرجے اور جیلیں رجال و داستان اس کے ذہنی جغرافیہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس کا خاص مقصد انسانی تعلقات کی نازک شعریت کا اظہار ہے۔ چونکہ راجہ راؤ کے ناول کا مطمح نظر سیاسی یا سماجی نہیں بلکہ مابعد الطبیعاتی ہے لہٰذا اس مخصوص فضا میں تاریخی ربط و تسلسل کی تلاش بے سود ہے اور عصری مسائل کے حل کی کوشش بھی سعی لاحاصل ہے۔

راجہ راؤ کے ذہنی خلفشار اور نفسیاتی الجھنوں کا اظہار طربیہ انداز میں لکھے ہوئے ناول "بلی اور شیکسپیر" (THE CAT & SHAKESPEARE) میں بخوبی ہوا ہے۔ اسے ہم مصنف کا مابعد الطبیعاتی طربیہ کہہ سکتے ہیں اس ناول میں راماکرشن پائی (PAI) جو ترونندرم میں ایک معمولی کلرک ہے، کہانی کا خاص کردار ہے۔ وہ راماسوامی کی طرح روحانی بلندی یا کائناتی بصیرت کا مالک نہیں۔ گذشتہ دو سال سے وہ اپنے بیوی بچوں کو گاؤں چھوڑ کر ترونندرم میں شانتا پلے کی محبت میں گرفتار ہے۔ ان دونوں کے جنسی تعلقات بڑھتے ہیں تو راماکرشن کے نفسیاتی معاملات میں کئی گرہیں پڑنے لگتی ہیں۔ وہ عورت مرد کے تعلقات، شادی شدہ یا ناجائز محبت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ اسی مذبذب میں اس کی پہلی بیوی اپنے مائیکے چلی جاتی ہے اور اپنے بچوں کو راماکرشن کی جگہ سورج دیوتا کو باپ ماننے کی تلقین کرتی ہے۔ دوسری عورت سے تعلقات کا نتیجہ بھی ناکام شادی کی صورت میں ہوتا ہے۔

"بلی اور شیکسپیر" میں سب سے دلچسپ کردار گوندن نائر (GOVINDAN NAIR) ہے اس کا فلسفہ حیات سیدھا سادا لیکن معنی خیز ہے۔ وہ دنیا کو ہمیشہ اپنے زاویے سے دیکھتا ہے اور انسانوں کو بلی کے بچوں کی طرح سمجھتا ہے۔ دراصل بلی اور اس کے بچوں کی تمثیل کے ذریعہ راجہ راؤ نے پھر "حقیقت اور فریب" کا مسئلہ

اٹھایا ہے۔ اس کے نزدیک گنہگار انسان خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور جب وہ اپنے کو رضائے خداوندی پر چھوڑ دیتا ہے تو اس کی ساری مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔ اس ناول میں رحمت خداوندی کا تصور انسانوی انداز میں کچھ یوں ہے کہ بلّی (خدا) اپنے تمام بچوں (بندوں) پر نظر رکھتی ہے اور ہر خطرے کے وقت ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے موجود رہتی ہے۔ زندگی کا راز دنیا میں موجود چند افراد کو معلوم ہوتا ہے لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ باقی لوگ محض میاؤں میاؤں سنتے رہتے ہیں۔ راجہ راؤ کے ناول پر اس ویدانتی فلسفہ کا اثر بالکل واضح ہے جس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ حقیقت کا صحیح عرفان عشق سے ہوتا ہے۔ عشق حقیقی دراصل خود کو خالق باری (برہما) میں ضم کر دینے کا دوسرا نام ہے۔ انسان ہر لحاظ سے ایک عظیم قوت کے سامنے بے بس اور لاچار ہے اور اس کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو اس قوت کے سپرد کر دے۔

"بلی اور شیکسپیر" کا عنوان البتہ کافی عرصہ تک معرض بحث رہا ہے۔ ناول میں "بلی" کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن شیکسپیر کو خواہ مخواہ گھسیٹنے کا کوئی جواز نہیں نظر آتا۔ شیکسپیر کے طربیہ ڈراموں کا انداز راجہ راؤ کے طربیہ ناول سے یکسر مختلف ہے۔ محض ہملٹ کی خود کلامی سے مماثلت یا مرکزی کردار کے اندر کچھ تذبذب اور الجھن کی بنا پر شیکسپیر کو ناول کے عنوان کا جز بنانا کچھ زیادہ قابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔

"کامریڈ کیریلاف" (CMRADE KIRILLOV) ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک مختصر ناول ہے جس میں نہ کوئی خاص ترتیب ماجرا ہے اور نہ کوئی کشمکش۔ اسے ہم مصنف کی تھکی ہوئی تخلیقی قوتوں کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ کامریڈ ایک جنوب ہندی برہمن ہے جو تھیاسوفی سے تشنہ اور مایوس ہو کر کمیونزم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کامریڈ مہاتما گاندھی کا مارکسی جائزہ لینا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں مارکسزم اور ویدانت کا تقابلی مطالعہ کرتا ہے۔ بالآخر فتح ویدانت کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ کامریڈ (راجہ راؤ) اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ کمیونزم کا مقصد معاشی و سیاسی مسائل کا عارضی حل تلاش کرنا ہے لیکن حیات و کائنات کے سربستہ راز ویدانت کے ذریعہ ہی منکشف ہوتے ہیں

"ناول کے دوسرے حصہ میں کامریڈ کریلاف کسی چیکوسلوواک لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ ازدواجی زندگی کے دوران جس رفتار سے اس کی ہندوستانیت عود کرتی ہے اسی رفتار سے اس کے کمیونزم کا جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وہ بالآخر کمیونزم کے دائرہ سے نکل کر ویدانت کے فلسفہ پر عمل کرنے لگتا ہے۔ راجہ راؤ کی اس تخلیق میں بھی ہندوستانی کلچر، فلسفہ اور تاریخ کی گہری چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے۔ فنی اعتبار سے دستوفسکی کے اثرات کے باوجود یہ ناول کمزور اور پر تصنع ہے۔ راجہ راؤ نے روسی مصنف سے جو کچھ بھی استفادہ کیا ہو، وہ اس کی بلندیوں کو نہیں پہونچ سکتا۔

راجہ راؤ کے ناولوں کی سب سے مابہ الامتیاز خصوصیت مشرق و مغرب کے تعلقات کی بے مثل تجزیہ نگاری ہے۔ مغربی ممالک سے ہندوستان کے رابطہ کی بدولت ہندوستانی انگریزی ادب میں مشرق و مغرب کے سیاسی اور ثقافتی تعلق کے موضوع کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ملک راج آنند، آر۔ کے۔ نرائن، کملا مارکنڈے، انیتا دیسائی، نین تارا سہگل اور چمن نہال وغیرہ نے اس موضوع کو ہر ہر پہلو سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ راجہ راؤ کے ناولوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اس موضوع کو نفسیاتی، معاشرتی اور ثقافتی تضاد و کشمکش کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "سانپ اور رسی" میں مشرق و مغرب کا فرق کلی طور پر نمایاں ہے۔ ہیرو راما سوامی اور فرانسیسی عورت میڈلن کی محبت پروان چڑھتی ہے اور دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک دونوں خانگی خوشیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن انجام کار ہندوستانی اور فرانسیسی تہذیبی اختلاف کے باعث ایک دوسرے سے علیحدگی کے بعد طلاق حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ فرق جغرافیائی اعتبار سے بھی قابل توجہ ہے اور معاشرتی اعتبار سے بھی۔ مصنف کا خیال ہے کہ "ہندوستان، فرانس یا انگلستان کی طرح کوئی ملک نہیں بلکہ ایک تصور ہے۔" بنارس اور پیرس کا فرق بھی کچھ کم نمایاں نہیں۔ "بنارس میں زندگی تمام تر داخلی رنگ رکھتی ہے لیکن پیرس میں زندگی خارجی کیفیات سے مرکب ہے۔"

"کامریڈ کیرلاف" میں مشرق و مغرب کے فرق کو نہایت فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ کامریڈ اپنے ہندوستانی تہذیبی ورثہ کو اپنی شخصیت کا جزو بنائے ہوئے ہے لیکن وہ اکثر محسوس کرتا ہے کہ ہندو مذہب کسی کو روٹی، کپڑا اور دیگر ضروریات زندگی نہیں فراہم کر سکتا۔ دنیا کے مذاہب میں وہ اسلام کو زیادہ عملی اور ترقی پسند مذہب تصور کرتا ہے جس میں دنیا اور عاقبت دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس ناول میں کامریڈ کیرلاف ہمیں "مجموعہ اضداد" ہی نظر آتا ہے کیونکہ وہ مذہبی اعتبار سے کٹر ہندو اور سیاسی اعتبار سے خالص کمیونسٹ ہے اور دونوں کے حقیقی تضاد کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ایک سچے ہندوستانی کی طرح وہ اکثر و بیشتر مہاتما بدھ، سری شنکر اور گاندھی جی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اور ہندو مذہب میں بدھ دھرم اور گاندھی واد کے اصولوں کو ملا کر ایک نئے انسانی مذہب کی بشارت دیتا ہے۔

جدید ناول محض خارجی واقعات کا بیان یا معروضی انداز میں سیاسی و سماجی زندگی کی ترجمان نہیں۔ مغربی افسانہ نگاروں کی طرح ہندوستانی مصنفوں نے بھی اپنے انگریزی ناولوں میں فرد و ذات کے نفسیاتی مسائل پیش کیے ہیں اور اپنی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی افسانہ کے پردہ میں بیان کیا ہے۔ راجہ راؤ کے یہاں سوانحی عناصر ان کے چاروں ناولوں میں کسی نہ کسی انداز میں ملتے ہیں۔ ان سے نہ صرف مصنف کے ذہنی، جذباتی اور اخلاقی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس کے روحانی سفر کی روداد بھی مرتب ہوتی ہے۔ "کنتھاپورا" کا ہیرو مورتی بہت حد تک راجہ راؤ کے سیاسی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہندوستان سے اس کی والہانہ محبت اور انگریزوں سے نفرت، ہندوستانی مذہب اور کلچر سے روحانی لگاؤ اور انگریزی طرز معاشرت سے ناپسندیدگی کا اظہار ناول میں ہر جگہ ہوا ہے۔ گاندھی جی کا اندولن اس کے نزدیک انقلاب فرانس سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کے ذریعہ بھارت ماتا کو آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔ "سانپ اور رسی" ایک خاص اعتبار سے مصنف کی زندگی کا افسانوی خاکہ ہے۔ اس میں ہندوستان اور مغربی ممالک میں راجہ راؤ کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور تاثرات کا خوبصورت بیان ہے۔ راجہ راؤ کی طرح راما سوامی بھی جنوبی ہند کا برہمن ہے اور سرکاری وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے فرانس جاتا ہے مگر فرانسیسی حسینہ سے شادی کے باوجود وہ مغربی رنگ میں نہیں رنگا جا سکا۔ مغرب کی رنگین اور دلآویز دنیا میں رہ کر بھی اسے کسی نہ کسی چیز کی کسک رہتی ہے۔ ہندوستان واپسی پر وہ ایک گرو، کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جو اسے نفسیاتی اور روحانی الجھنوں سے نجات دلا سکے۔

"بلی اور شیکسپیر" میں دونوں اہم کردار رام کرشن پائی اور گووندن نائر مصنف کی زندگی کے دو پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افکار و اعمال بہت حد تک راجہ راؤ کے نظریہ حیات پر مبنی ہیں۔ "کامریڈ کیرلاف" میں بھی راجہ راؤ بہت حد تک اپنی کہانی دوسروں کی زبانی کہلواتے ہیں۔ دراصل اس ناول میں کہانی کا مقصد محض حالات و واقعات کی تفصیل نگاری نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش ہے۔ ہندوستانی ادب، فلسفہ، مذہب اور اساطیر سے اس کا شغف اسی تلاش کا سلسلہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ راجہ راؤ اپنی زندگی کے داخلی و خارجی حالات و کوائف کے علاوہ اپنی مذہبی، ذہنی اور نفسیاتی زندگی کی بھی عکاسی کرتا ہے اور اپنے تہذیبی ورثہ پر بجا طور پر نازاں ہے۔

راجہ راؤ کی ناول نگاری کا سب سے بڑا نقص ان کا فلسفہ ویدانت، اور مذہب (ہندو دھرم) سے انتہائی شغف اور ناولوں میں اخلاقیات پر غیر ضروری مباحث ہیں۔ اس سے نہ صرف کہانی کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے بلکہ کرداروں کی شخصیت بھی مجروح ہوتی ہے۔ واقعات کے بیان میں ابہام بھی ناگزیر ہو جاتا ہے اور سنجیدہ مباحث کے باعث طنز و مزاح کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راجہ راؤ دانستہ طور پر قاری کو عقلی روحانیت کے دلدل میں پھنسا دیتے ہیں مگر اس سے نکلنے پر اس فلسفہ کی سطحیت کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔ ہندوستانی نقادوں نے راجہ راؤ کو ان کے کردار کے بہروپیہ پن کا خاص مذاق اڑایا ہے۔ ان کے یہاں

جس چیز کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ ہے سماجی رشتوں سے نسبتاً ماورائی فرار۔ ان کے یہاں نفسیاتی محرکات کی وضاحت نہیں ملتی کیونکہ وہ بنیادی طور پر مجردات سے ہی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے حیات و کائنات کا نظریہ کچھ خاص قدروں پر مبنی ہے لیکن جدید ہندوستان میں ان کی کوئی خاص وقعت نہیں۔ راجہ راؤ کا نظریہ حیات بہت حد تک سماجی نا انصافی، معاشی نابرابری اور اعلیٰ طبقوں کی حکمرانی کے تصور پر مشتمل ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ کوئی فلسفہ حیات جو فرد کو سماج سے ماورا رکھتا ہے۔ بنی نوع انسان کی فلاح کا ضامن نہیں ہو سکتا اگر ہم دنیا کو "مایا" بھی سمجھ لیں تو نہ تو اس سے تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتے ہیں اور نہ خود اس سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عینیت اور ماورائیت کے امتزاج سے ایک خوابناک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے راجہ راؤ اپنے خوابوں کو عصریت کا رنگ نہیں دے سکتے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کا مطلب ویدک زمانہ کا بھارت ہے یعنی ویدوں پرانوں، اپنشدوں اور منتروں کا ہندوستان۔ وہ مایا جال کے اندر رہ کر مختلف النوع التباسات کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستان ان کے نزدیک ایک استعارہ ہے جو تاریخ، سائنس اور نیوٹن یا آئن سٹائن کے اصول سے بالاتر اور بے نیاز ہے۔

راجہ راؤ قدیم طرز کی کہانی لکھنے میں خاص قدرت رکھتے ہیں۔ وہ ڈرامائی یا رزمیہ بیان کے بجائے داخلی نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے قائل ہیں جس سے کہانی کی واقعیت اور تاثریت برقرار رہتی ہے۔ کہیں کہیں اس اسلوب بیان میں انہوں نے پرانے ویدوں کے بیانیہ طرز کی پیوندکاری بھی کی ہے جس سے ہندوستانی فضا پیدا ہوتی ہے اور مغربی قارئین کو خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ راجہ راؤ کا اسلوب بیان منفرد ہے۔ ان کے تشبیہات و استعارات جس قدر نادر ہوتے ہیں اسی قدر ان کے تلازمے اور تضادات دلچسپ ہیں۔ کبھی کبھی ان کی طرز نگارش "بوجھل" معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ راجہ راؤ تفریحی ناول نہیں لکھتے بلکہ ان کے موضوع کی سنجیدگی اسلوب نگارش میں بھی منعکس ہوتی ہے۔ یہ مشکل پسندی شعور کی رو کی وجہ سے نہیں بلکہ داخلی کیفیات اور روحانی کشمکش کی ترجمانی کے باعث ہے۔ اپنی فنی کمزوریوں کے باوجود انہوں نے انگریزی نثر کو ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا اکتساب قابل تعریف ہے۔

کتابیات

(1) BAKHTIYAR, IQBAL : ED. THE NOVEL IN MODERN INDIA (1964)

(2) IYENGAR, K.R. SRINIVAS : INDIAN WRITING IN ENGLISH

(3) NAIK, M.K., DESAI, S.K. : CRITICAL ESSAYS ON (1973) INDIAN WRITING IN ENGLISH (1977)

(4) SHARMA, K.K. : ED. PERSPECTIVES ON RAJA RAO

عظیم بیگ چغتائی

محمد علی جوہر

عظیم بیگ چغتائی کی تعلیم و تربیت زیادہ تر علی گڑھ میں ہوئی بی۔ اے اور ایل ایل۔ بی کی ڈگری اسی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا شمار یونیورسٹی کے ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا۔ اردو اور انگریزی پر ان کی قابلیت مسلم تھی۔ طالب علمی کے ہی زمانے سے اردو ادب سے خاصا لگاؤ ہو گیا تھا۔ مضامین لکھنے کا شوق شروع سے ہی بے حد تھا۔ علی گڑھ سے بی۔ اے ایل ایل۔ بی کی سند لینے کے بعد جودھپور میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ گوناں گوں مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ علم و آگہی کے اس شغف کا ثمرہ ہی یہی تھا کہ ان کا شمار ملک کے چند بڑے مزاحیہ نگاروں میں ہونے لگا۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانے کو دیکھنے کے بعد ان کی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ذہن کو پوری طرح متوجہ کرتی ہے وہ ان کے افسانوں میں مزاح کا عنصر ہے۔ ان کے طرز بیان میں ان کی فنکارانہ صلاحیت پوشیدہ ہے۔ ان کا لب و لہجہ ایک خاص کیفیت لے کر ہمیں چغتائی کی دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔ ان کا انداز تخاطب نہایت دلکش اور پر تاثیر ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے احساسات و خیالات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنے پر پوری طرح قدرت رکھتے ہیں۔

ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ دوسروں سے قدرے مختلف تھا۔ جب لکھنے پڑھنے کے لیے بیٹھتے تو پوری پوری رات گذار دیتے اور یہ بھول جاتے کہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ اور بھی کام ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا چسکا اس قدر لگ چکا تھا کہ ایک دفعہ ان کے دوست شاہد احمد بغرض ملاقات جودھپور آئے اور مضامین کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے چند ہی دنوں میں کئی عمدہ مضامین لکھ کر اپنے دوست کے حوالے کر دے۔ شاہد احمد "سوانہ کی روحیں" کے پیش لفظ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سوانہ کی روحیں" چغتائی صاحب کا بے مثل شہپارہ ہے ستمبر ۱۹۳۵ء میں میں ان سے ملنے جودھپور گیا تھا۔ مہمان کی تواضع انہوں نے اس طرح کی کہ پے در پے کئی مضمون ساقی کے لیے لکھ ڈالے۔ مجھے روکنے کی یہ انوکھی ترکیب سوجھی کہ رات کو کسی کہانی کا پلاٹ بناتے اور پھر کہتے کہ ایک دن اور رک جاؤ تو یہ کہانی لکھ دوں۔ غرض میرے ایک ہفتہ کے دوران قیام ہی میں انہوں نے دس بارہ نہایت عمدہ افسانے مجھے لکھ کر دے دئے۔ یہیں سے مجھے چغتائی نمبر کی اشاعت کا خیال آیا جو چند اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ یکم اکتوبر ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا۔ "سوانہ کی روحیں" چغتائی صاحب کے تخیلی مضامین کا سب سے اچھا نمونہ ہے دوسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ چغتائی صاحب مشہور ظرافت نگار تھے لیکن جب ٹریجڈی لکھتے تھے تو اتنی موثر کہ آنسو رک

نہیں سکتے تھے۔ سوانح کی روح میں، مرزا صاحب کی حزن نگاری کا شاہکار ہے۔ کہانی آتنی دلکش ہے کہ غالباً ان کی کوئی کہانی اتنی دلکش نہیں۔ مارواڑ کے رزم بزم کے واقعات اور ان کی حسین تصویر کشی کے لحاظ سے یہ چھوٹی سی کتاب اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً آخری بھی کہ اب سرزمین مارواڑ کو چغتائی جیسا سپوت میسر نہیں آسکتا،، ؎۳

اچھی کتابیں عظیم بیگ چغتائی کی تنہائی کی بہترین رفیق تھیں۔ جب کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے مطالعہ موقوف کر دیتے۔ اور ملاقاتی کے جاتے ہی پھر کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہو جاتے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا اور صرف رات کو سوتے وقت یا ختم کتاب پر منقطع ہو جاتا۔ ان کی دلچسپ گفتگو علم سے بھرپور اور ان کی وسعت مطالعہ کی آئینہ دار ہوتی تھی۔ آواز کا زیر و بم اور لہجہ کی فسوں کاری مخاطب کو مسحور کر دیتی،

چغتائی نے افسانے بھی لکھے ناول بھی اور مذہبی موضوعات پر کتابیں بھی۔ ان کے افسانے کا پلاٹ ان کی فنی چابکدستی کا مظہر ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار کے بجائے پلاٹ کی اہمیت نظر آتی ہے۔

چغتائی کے کردار اکثر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے نہیں ہوتا۔ یہ ان کے افسانوں کی بنیادی کمزوری ہے ایسا لگتا ہے کہ ہم چغتائی کی بنائی ہوئی دنیا میں گھوم رہے ہیں۔

چغتائی کی کتاب " خطوط کی ستم ظریفی " کا مزاحیہ کردار قابل توجہ ہے۔ ہم احساسات و جذبات سے بلند ہو کر اسے دیکھتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ مزاحیہ کردار کو اپنی حرکات و سکنات میں کوئی غیر معمولی مضحکہ خیز پہلو نظر نہیں آتا لیکن دراصل اس کی ناہمواریاں اتنی واضح ہوتی ہیں کہ جو شخص بھی اس سے متعارف ہوتا ہے وہ ایک قلیل مدت میں انہیں محسوس کر لیتا ہے

بقول ظفر قریشی بی۔ اے دہلوی،

وو خطوط کی ستم ظریفی،، میں ظرافت اور مزاح آمیز — الم جابجا نظر آتا ہے۔ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ آپ کے کرداروں کی ستم ظریفی لفظوں کی بندش کی محتاج نہیں ہے۔ جو کرداروں سے زیادہ مصنف کے بے تکے پن کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ افسانہ کا پلاٹ اور کردار کی حرکت ایسی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں کہ مصنف کو مصنوعی مزاح پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پلاٹ خود بخود چہکنے لگتا ہے۔ کرداروں کے چہرے پر سے ظرافت بار کرنیں ایوانِ ادب پر بکھر جاتی ہیں اور ایک ایسا عروج climax پیدا ہو جاتا ہے کہ قاری بے تاب ہو جاتا ہے اور مصنف " عفی عنہ " کو دعا خیر سے یاد کرنے لگتا ہے لیکن مصنف آخر صناع ہیں۔ جادو کی پتلیاں چھوڑ کر دور جا کھڑے ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کی بوکھلاہٹ کو دیکھ کر ہنستے رہتے ہیں۔ آپ کرداروں کے ساتھ ہنستے بولتے آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھتے ہوئے چلیں تو اس سفر کے دوران میں سڑک کے دو طرفہ اصلاح تنقید، الم سنجیدگی اور منشور حیات کے پتھر بھی جابجا نصب دیکھیں گے جس کی طرف مصنف بار بار اشارہ کرتا ہوا چلتا ہے مگر جہاں پر آپ کی سنجیدگی کا حملہ ہوا اور انہوں نے کوئی گدگدی کی مصنف ممدوح نے اس کتاب میں اپنی اس صنعت کو پورے اہتمام کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور اس قدر مشکل بلکہ سفاک پلاٹ پر افسانہ نگاری، قصہ گوئی اور ظرافت نگاری کا سکہ ادب میں جاری کر دیا ہے۔ اتنے کامیاب اسکیچ شاید غیر زبانوں میں بھی کم نظر آئیں گے،، ؎۴

چغتائی کی ادبی تحریروں کے برعکس مذہبی موضوع پر انہوں نے جو کچھ لکھا اسے بالعموم ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ " قرآن اور پردہ،، چغتائی کی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ اس میں موصوف نے

قرآن اور احادیث کی روشنی میں پردہ کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ کتاب کے شروع میں انہوں نے اپنی موقف کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان ایل. ایل. ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کے خیال کو پیش کیا ہے۔

"عورتوں کے متعلق قرآن مجید کا یہ حکم کہ" وہ اپنے زینت کا اظہار نہ کریں "، یہ ایسا حکم ہے جس کی مختلف طریقے سے تاویلیں کی گئی ہیں لیکن ان لوگوں کے نزدیک بھی جو" زینت" کے معنی صرف زیور ہی نہیں لیتے بلکہ جسم کے حسن کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں اس کی اجازت ہے کہ ہاتھ اور چہرہ عورت کھول سکتی ہے۔ میرا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مذہبی بحث و مباحثہ میں پڑوں میں ہدآیہ سے جو سنیّوں کی مشہور فقہ کی کتاب ہے صرف اتنا اقتباس نقل کرتا ہوں کہ" اس کی اجازت نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے چہرے اور ہاتھ کی ہتھیلیوں کے سوائے کچھ اور دیکھیں اور بس اسی قدر اجازت ہے۔ کیوں کہ عورتوں کا کام کاج سے تعلق رہتا ہے اور یہ تعلق مردوں سے لین دین کا ہوتا ہے۔ پس اگر بدن کے یہ حصے بھی پوشیدہ کیے جائیں تو بڑی دشواری ہوگی۔ پس ضرورت ہے کہ یہ حصے کھلے رہیں"

(کتاب چہارم باب ۴ فقرہ ۱)

اس اقتباس سے میرا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ اوائل زمانہ اسلام میں کیا تھا اور شمالی ہندوستان میں آج کیا ہو رہا ہے[۵] چغتائی کی خامی یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے جو اسلوب چنا وہ موضوع کے لحاظ سے مناسب نہیں تھا جس کا احساس آگے چل کر انہیں خود بھی ہوا۔ اپنے ایک قریبی دوست کے توجہ دلانے پر لکھتے ہیں ـــ

میں کوئی ادیب نہیں جو زبان بولتا ہوں وہ لکھتا ہوں۔ لیکن ایک دوست نے مجھ کو اس رسالہ کی زبان اور لہجہ کی طرف توجہ دلائی کہ ایک مذہبی کتاب کے لیے یہ بہت ناموزوں ہے اور لہجہ عامیانہ اور بازاری کی وجہ سے "اگر یکہ" والوں کی تہذیب کا منظر پیش کرتا ہے۔ چونکہ اپنی غلطی آدمی کی نظر نہیں پڑتی لہذا میری سمجھ بھی اس جگہ قاصر رہا لیکن مجھ کو پھر بھی افسوس رہ گیا کہ یہ غلطی اس وقت معلوم ہوئی جب تصحیح ناممکن ہوگئی لہذا اس کی معافی چاہتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس کے ذرا ناظرین غور کریں کہ مجھ کو لوگوں نے کس قدر خواہ مخواہ مطعون کیا ہے کہ کتاب شائع ہونے کی خبر سنتے ہی تمام اخباروں میں میرا فضیحتا ہو رہا ہے اور "الخلیل" ایسے معزز اخبار میں مطائبات کے عنوان سے ۸ ۲ر جولائی ۳۰ء کے پرچہ میں جو کچھ بھی مجھ کو لکھا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے اور جب ایک باوقار اور سنجیدہ پرچہ کا یہ حال ہے تو میں تو محض یہ کہہ کر کہ" طالب علم ہوں اور ابھی کالج کے جنجال سے ہی چھٹکارا نہیں ملا ہے"، اپنی بریت حاصل کرتا ہوں مگر پھر بھی مجھ کو افسوس ہے اور ناظرین اسی لہجہ کو معاف کریں[۶]

زبان اور لہجہ ہی نہیں بلکہ مذہبی معاملات میں ان کا نقطۂ نظر بھی جمہور علما سے مختلف رہا ہے چنانچہ "رقص و سرود" کو وہ جائز سمجھتے تھے۔ انہوں نے ناچ گانے کے متعلق ایک مضمون رسالہ "حریم" لکھنؤ میں شائع کر کے بدنامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ مضمون کے شائع ہونا تھا کہ ہندوستانی دنیائے اسلام میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک القاب سے نوازا گیا۔ ان کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ سب سے پہلے لاہور کے مشہور اخبار "انقلاب" کے اڈیٹر نے "افکار و حوادث" کے عنوان سے ۱۱ نومبر کے انقلاب میں چغتائی کے خلاف لکھا۔ پھر اخبار "الخلیل" اودھ پنچ، خادم کلکتہ وغیرہ وغیرہ نے عوام کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ جس کی بنا پر دھمکیوں کے خطوط بھی آنے شروع ہوگئے۔ اڈیٹر سچ مولانا مولوی عبدالماجد دریابادی نے بھی اس کے خلاف قلم اٹھایا بالآخر چغتائی کو معافی مانگنی پڑی۔ "سچ" مورخہ ۶ جنوری ۳۳ء میں انہوں نے لکھا۔

" گانے کے بارے میں میں نے کہا حضور نے گانا سنا اور گانا سننا سنت رسول اللہ ہے اور اگر کسی وجہ سے

باوجود اس واقعہ کے بنظر مصلحت یا ادب کی وجہ سے
اس کو سنت رسول اللہ کہنا غلطی ہے تو آئندہ میں
احتیاط کروں گا۔" [۸]

معافی مانگنے کے بعد چغتائی نے ایک خط دوبارہ مولانا کی خدمت میں لکھا جس کا جواب حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے گانا سننا سنت رسول اللہ ہونے کی دلیل ان الفاظ میں دی ہے۔

"گانے اور باجے کی ممانعت میں حضور کے متعدد
ارشادات وارد ہیں عملاً بھی حضور اس سے محترز رہے
۲۳ سال کی پیغمبرانہ اور ۶۳ کی کل زندگی میں شاید صرف
دو بار ایسے مواقع پیش آئے ہیں کہ جشن و مسرت عالم
کے دن پیشہ ور عورتیں نہیں۔ فن موسیقی کی جاننے والیاں
نہیں۔ بستی کی کمسن لڑکیاں مواجیہ میں عاشقانہ غزلیں
اور ٹھمریاں نہیں۔ مبارکباد اور نعتیہ اشعار گاتی بجاتی
آئیں .... حضور نے صرف یہ فرما کر اجازت
دے دی کہ آج تو عید کا دن ہے کہاں یہ صورت
واقعہ اور کہاں ایک ایسے مضمون میں جو رقص و
سرود کی ترغیب اور موسیقی نوازی ہی کے لیے لکھا
گیا ہو۔ بلا کسی شرط و قید کے مطلقاً یہ کہہ دینا کہ گانا تو
سننا سنت رسول اللہ ہے تلبیس کی اس سے
بڑھ کر روشن مثال اور کیا ہو گی معاذ اللہ آپ کی
(میری) اصطلاح میں سنت کا اطلاق ہر اس فعل
پر ہو جاتا ہے جو نبی سے اتفاقاً یا اضطراراً کبھی
بھی صادر ہوا ہو۔" [۹]

مرزا کافی عرصہ سے [۱۰] دق کے مریض تھے اور اپنے نحیف و لاغر جسم کو لیے ہوئے آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہے تھے لوگ انہیں دیکھ کر ان پر ترس کھاتے لیکن وہ ہمیشہ مسکراتے رہے ان کی بیماری کی حالت کا نقشہ عصمت چغتائی نے اس طرح کھینچا ہے:

وہ اندوہ ناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے
ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی
نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے
ہونٹ۔ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے
ناہموار دانت اور لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور
عورتوں جیسی نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی
انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم
آگیا تھا۔ پتلی پتلی کھینچی ٹانگیں جن کے سرے پر ورم
سے سوکھے بدمزہ پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی
وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا
کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے
پر دھونکنی کا شبہہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں۔
بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا
چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا
تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی
لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے...... کون سا
دنیا و دین کا رخ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا
مگر پھر بھی نہ رلا سکا اس رخ میں جلن، ہنستے نہیں
ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے۔
"زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار
بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک
لاش کیوں نہیں جاتی۔" [۱۱] (دوزخی)

آہستہ آہستہ مرض نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا اور آخر کار اگست ۱۹۴۱ء کو جبکہ وہ جودھپور میں چیف جسٹس [۱۲] تھے ان کا انتقال ہو گیا۔

انہوں نے جو کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ان میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں ـــــ "پھریری" چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز۔ خطوط کی ستم ظریفی۔ رقص و سرود۔ روح ظرافت۔ سوانہ کی روحیں۔ شریر بیوی قرآن اور پردہ، کالے گورے، بکروری، کبوا اور کیسے۔ تعشنٹ۔ مرزا جنگی۔ کولتار۔ خانم۔ ویغرہ ویغرہ۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر اعجاز حسین۔ مختصر تاریخ زبان اردو صفحہ ۳۶۶

(۲) مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ سوانح کی روحیں۔ صفحہ ۱

(۳) " " ۔ صفحہ ۳

(۴) مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ خطوط کی ستم ظریفی۔ صفحہ ۵۔۶

(۵) مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ قرآن اور پردہ۔ صفحہ الف، ب

(۶) مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ قرآن اور پردہ۔ صفحہ ۵

(۷) مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ رقص و سرود۔ صفحہ ۴

(۸) اخبار سچ لکھنؤ مورخہ ۶ جنوری ۳۳ء

(۹) ڈاکٹر اعجاز حسین۔ مختصر تاریخ زبان اردو صفحہ ۳۶۶

(۱۰) عصمت چغتائی۔ چوٹیں صفحہ ۱۶۵

(۱۱) ڈاکٹر اعجاز حسین۔ مختصر تاریخ زبان اردو صفحہ ۳۶۶

(۱۲) ڈاکٹر اعجاز حسین۔ مختصر تاریخ زبان اردو صفحہ ۳۶۶

"سرسید کے ادبی سرمائے کو جو چیزیں مستقل حیثیت سے امتیاز اور انفرادیت بخشتی ہیں ان کو مجموعی لحاظ سے تین چار جملوں میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں سرسید ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادیٔ رائے اور آزاد خیالی کی رسم جاری کی اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کہنے کو تو یہ چند معمولی الفاظ ہیں مگر انہی چند سادہ لفظوں میں اس زمانے کے مشرق و مغرب کی اکثر و بیشتر ذہنی آویزشوں اور کشمکشوں کی طویل سرگذشتیں پوشیدہ ہیں۔ انہی چند الفاظ میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ہندوستان کی سماجی اور ادبی تاریخ کے بڑے بڑے عقیدوں اور بڑے بڑے نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ

خواجہ منظور حسین

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

بہ ۱۹۴۰ء کے شروع کی بات ہے۔ میں نے دہلی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک تحریری مقابلے میں حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ منظور حسین صاحب جو اس وقت شعبۂ انگریزی میں ریڈر تھے۔ اس مقابلے کے سلسلے میں حکم مقرر کیے گئے تھے۔ اور ان کے فیصلے کے مطابق مجھے اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ عنوان انگریزی ناولوں کے مطالعے سے متعلق تھا خاندان کے ایک بزرگ نے جن کے غالباً خواجہ صاحب شاگرد رہ چکے تھے۔ اور جو اس وقت یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے تھے، میرے ادبی میلان اور دلچسپیوں کے پیش نظر ایک دن کہا، کہ میں خواجہ منظور حسین سے تمہارا ذکر کر دوں گا، تم کبھی کبھی ان کے پاس چلے جایا کرو تاکہ تمہارے ذوق کی ان کی نگرانی اور رہنمائی میں نشوونما ممکن ہو سکے۔ میں نے یہ ہدایت گرہ باندھ لی۔ چنانچہ ایک دن ہمت کر کے ان سے ملاقات کی نیت سے ہوسٹل سے نکلا۔ نہ جانے دل میں یہ بات کیسے سما گئی تھی کہ خواجہ منظور حسین کوئی بھاری بھرکم، قوی الجثہ، رعب اور دبدبے والے خوفناک قسم کے انسان ہوں گے۔ ان کے گھر پہنچ کر برآمدے میں لگی برقی گھنٹی بجائی۔ پلک جھپکتے میں ایک حسین وجمیل نوجوان نظروں کے سامنے تھا۔ کرتے اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس میانہ قد، گٹھا ہوا جسم، کشادہ پیشانی، سرخ وسپید رنگت، تابناک غلافی آنکھیں، جن سے ذہانت و شرافت ٹپکی پڑتی تھی۔ نظروں میں حیا اور پاکیزگی کی رمق، اور طور طریق نفاست، تہذیب اور شائستگی کے غماز۔ میں ششدر، مبہوت اور ہکا بکا ہو کر اس شاداب اور نودمیدہ گلاب کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے آفتاب کی ساری بنفشئی شعاعیں ایک دم برآمدے میں بکھر گئی ہوں۔ اس وقت ان کی عمر پینتیس چھتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے جی کڑا کر کے کہا، کہ میں خواجہ منظور حسین صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ انتہائی نرمی اور دلآسائی کے ساتھ جواب دیا کہ اسی خاکسار کو کہتے ہیں۔ فوراً اندر ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ غائبانہ تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔ اس لیے کہ خواجہ صاحب مرحوم بہت کم آمیز اور کم سخن قسم کے انسان تھے۔ اور راقم الحروف کا حال اول دن سے یہ رہا کہ کسی جلسے میں تقریر کرنا ہو فی البدیہہ بھی اور تیاری کے ساتھ بھی، تو بلا جھجک تیار اور آمادہ، لیکن ویسے نجی صحبتوں میں لب کشائی میں بغایت تامل اور تذبذب۔ تھوڑی دیر میں بہرکیف خدا خدا کر کے یہ مہر سکوت ٹوٹی اور انھوں نے میرے ادبی مشاغل اور ترجیحات کے بارے میں استفسار فرمایا اور اتنا عرصہ گذر جانے پر بھی اب تک یاد ہے کہ میری کم سنی کے باوصف لیکن میری ذہنی تربیت کے خیال سے، جس کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ اپنے قیمتی کتب خانے میں سے تین کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ ایک مشہور رومانی نثر نگار WILLIAM HAZLITT کے مضامین کا مجموعہ دوسرے انگریزی ناول نگار تھیکرے کا ناول HENRY ESMOND اور تیسرے پولش ناول نگار CONRAD کی کتاب بعنوان YOUTH AND TWO OTHER NARRATIVES۔ چلتے وقت

فرمایا کہ جب دوبارہ آؤں، تو یہ تینوں کتابیں پڑھ کر آؤں، تاکہ ان پر گفتگو ہوسکے۔ چنانچہ انٹرمیڈیٹ کے سال اول سے لے کر ایم اے فائنل تک تعلیم کے دوران برابر یہ وطیرہ رہا کہ میں ہمیشہ وقتاً فوقتاً منتخب اور بعض اوقات بڑی نادر کتابیں ان سے مستعار لے آتا اور جب انھیں واپس کرنے جاتا، تو سوچتا رہتا کہ دیکھیے آج آزمائش کے اس پل صراط سے گذرنے کا کیا انجام ہوگا۔ خواجہ صاحب باتیں بھلے دار نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ تاڑ جاتے تھے کہ ان کتابوں سے کسب فیض کس حد تک کیا ہے۔ اور اس لیے راقم الحروف کو خاصا چوکنّا اور محتاط رہنا پڑتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک طویل اور مبسوط مضمون بہ عنوان "اقبال کا ذہنی ارتقا" سپرد قلم کیا۔ جو کچھ ہی دن بعد رسالہ "جامعہ" میں، جس کے جناب نور الحسن ہاشمی اس وقت مدیر تھے، دو قسطوں میں اشاعت پذیر ہوا۔ خواجہ صاحب کی خدمت میں اس کی نقلیں پیش کیں۔ اقبال کی شاعری کی گہرائیوں اور باریکیوں میں رسائی کا حوصلہ تو اب بھی نہیں ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں کیا خاک سمجھا ہوں گا۔ خواجہ صاحب نے نفس مضمون کے بارے میں تو کچھ نہ فرمایا البتہ اتنا ضرور کہا کہ اگرچہ میں فارسی آمیز اردو کا زیادہ روادار نہیں ہوں، لیکن تمھارے انداز تحریر پر فارسی کچھ ایسی رچی بسی ہے کہ میں اسے پسند کرنے پر مجبور ہوا۔ شفقت اور ہمت افزائی کا یہ انداز بھی کیسا نرالا، دلکش اور البیلا تھا۔

خواجہ صاحب بڑے نستعلیق اور کڑھے ہوئے انسان تھے خوب رو، جامہ زیب، مروت و انکسار اور تہذیب و شائستگی یعنی URBANITY کا پیکر مجسم، خالص دلی والے، انگریزی اور اردو تحریر پر یکساں ید طولیٰ رکھنے والے، لیکن ہمیشہ اس امر کا التزام رکھتے تھے کہ اردو بولتے وقت انگریزی کا ایک لفظ بھی نیچے نہ آئیں۔ ان کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوتی تھی۔ محاورے کے دلدادہ اور رسیا لیکن اس معاملے میں بھی شدت اور مبالغے سے دور دور، اور اردو بھی ٹھیٹھ اور ٹکسالی ہندی الفاظ کا دخل فقط اتنا، جس کی سند چلن سے مل سکے اور جو مذاق سلیم پر بار نہ گزرے

سلامت روی اور نفاست، حزم و احتیاط، رکھ رکھاؤ اور ثقاہت یہ سب گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ انگریزی، اردو اور فارسی زبان و ادب میں جیسی حیرت انگیز مہارت اور ان پر جیسی قدرت انھیں حاصل تھی۔ اور جو بصیرت اور آگہی ان کے حصے میں آئی تھی، اس کی نظیر اب تو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان تینوں زبانوں کے بحر ذخار میں ایسی شناوری کرنے والا شاذ ہی کوئی ملے۔ ان کا تعلق اس روایت سے تھا جسے ARISTOCRACY OF INTELLECT کہا جاسکتا ہے۔ عرصہ دراز تک ان کی کوئی کتاب منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ البتہ یہ یاد پڑتا ہے کہ اب سے تقریباً نصف صدی پہلے انھوں نے چیخوف اور دوسرے روسی فن کاروں کی کہانیوں کے معرکۃ الآرا تراجم اردو میں کیے تھے اور جو اس وقت کے موقر رسائل خاص طور پر "جامعہ" (دہلی) اور "سہیل" (علی گڑھ) میں شائع ہوئے تھے۔ چیخوف کی مشہور کہانی THE STEPPE کا اردو ترجمہ "گھاٹی" میں، جو خواجہ صاحب نے کیا تھا، اب تک ذہن پر نقش ہے۔ البتہ ۱۹۶۶ء سے لے کر چند سال بعد تک تابڑ توڑ ان کی تین چار کتابیں سامنے آئیں۔ جن میں ان روسی کہانیوں کے تراجم کا مجموعہ بھی شامل ہے، جس پر فیض احمد فیض نے پیش لفظ لکھا تھا۔ اپنی تبحر علمی کے باوجود لکھنے لکھانے کے معاملے میں خواجہ صاحب خاصے جز رس تھے۔ اس کا بڑا سبب غالباً تکمیلیت کا وہ معیار تھا، جسے انھوں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ اور جس کے حصول کے وہ برابر متلاشی اور جویا رہے۔ اس نے ایک حد تک ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بخ بستہ بھی کر دیا تھا۔

خواجہ صاحب کی کتاب "اقبال اور دوسرے شاعر" جو سب سے پہلے منظر عام پر آئی، ان سب کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، جو اقبال پر اب تک لکھی گئی ہیں۔ مشترک شعری محرکات اور موضوعات کے حوالے سے انھوں نے اقبال کو اردو اور فارسی کے بعض عظیم شاعروں کے پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کا اندازِ قدر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض متنازع فیہ ادبی اور تنقیدی مسائل بھی اس ضمن میں معرض بحث میں آگئے ہیں۔ جن پر انھوں نے

بڑی جرأت و عرفان، دیدہ وری اور ژرف نگاہی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ محاکمے کا یہ بھی ایک زاویۂ نظر ہے۔ اور اس احتساب میں انھوں نے بالعموم معروضیت، منصف مزاجی اور بے لاگ پن کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں تقریباً تیس سال کے وقفے کے بعد راقم الحروف کو پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ جب حاضر ہوا تو ایسی محبت سے گلے لگایا گویا دیدہ و دل فرش راہ کر دیے ہوں۔ اپنی حقیر کاوش 'اقبال کی تیرہ نظمیں' کے پاکستانی ایڈیشن کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس موقع پر خواجہ صاحب مرحوم نے اپنی اس کتاب کا خاکہ دکھایا تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے اور جس میں انھوں نے بڑی دیدہ ریزی اور بلوغت نظر کے ساتھ اقبال کی شاعری کی مختلف پرتوں کو ٹٹول ٹٹول اور کرید کرید کر دیکھا اور دکھایا ہے، اور اقبال کی شاعری کے نسبتاً کمزور پہلوؤں کی بھی نشان دہی کی ہے، لیکن پدم شری کلیم الدین احمد کے بھونڈے اور بے مغز انداز میں نہیں۔ غزل کے موضوع پر وہ ایک عرصے تک کام کرتے رہے۔ کیوں کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں جب بی۔ اے میں پڑھتا تھا، تو وہ کبھی کبھی اپنی اس مہم جوئی اور کدو کاوش کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ عرصہ دراز تک اس کھوج میں لگے رہے۔ کہ غزل کی شاعری کے علائم کا رشتہ ہم عصری سیاسی اور ثقافتی تحریکوں سے محکم طور پر جوڑ کر یہ ثابت کر سکیں کہ یہ شاعری محض چونچلوں، اور چھیڑ چھاڑ کی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ناطہ گرد و پیش کی ہر آن متغیر زندگی سے بہت گہرا مضبوط اور ناقابل شکست ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کا ایک سیاسی اور معاشرتی سیاق و سباق اور منشا بھی ہے، جو براہ راست طور پر نہیں، بلکہ بالواسطہ طور پر منعکس ہوتا ہے۔ غزل پر اپنی دو تالیفات 'تحریک جدوجہاد بہ طور موضوعِ سخن' اور 'اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ' میں خواجہ صاحب نے غزل کی شاعری کی افہام و تفہیم کے باب میں ایک نئے طریق فکر کا آغاز کیا۔ اور اپنے قیاسیات کو اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی شہادتوں سے استناد کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے چوں کہ یہ انداز نظر نیا اور چونکا دینے والا تھا۔ اس لیے

ان کے نتائج فکر پر بھی انگشت نمائی کی گئی۔ اور بعض اہل نظر کو اس میں جہاں تہاں کھینچ تان بھی محسوس ہوئی۔ اور اپنے مفروضات کے دفاع میں دور کی کوڑی لانے کا الزام بھی ان پر تراشا گیا۔ لیکن اگر سنجیدگی کے ساتھ اور بہ امعان نظر ان مفروضے پر غور کیا جائے تو اس کی صحت اور صداقت سے انکار ممکن نہیں گو یہ ضرور ہے کہ ان دونوں تالیفات میں بقول خود ان کے متن زیادہ اور حاشیہ کم ہے۔ ایک بار دورانِ گفتگو کسی خاص سیاق و سباق میں انھوں نے راقم الحروف سے فرمایا تھا۔ کہ انھوں نے اشعار کا انتخاب اس طور پر کیا ہے کہ تصویر خود اپنے منہ سے بول اٹھے۔ یہ بڑی حد تک درست ہے، لیکن بعض اہم مشقول کے بارے میں مسلسل، مربوط، منضبط اور تفصیلی اظہار رائے کی گنجائش پھر بھی باقی رہتی ہے۔ اور اس کے بغیر تشنگی کا احساس ناگزیر ہے۔ ہر قسم کی ادبی تنقید کو کسی نہ کسی طرح کے نظریاتی چوکھٹے یعنی CONLEPTUAL FRAMEWORK کے اندر رکھنے سے اسے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مشہور امریکی نقاد JOHN CROWE RANSOM نے بہت صحیح بات کہی ہے کہ نقاد کا سروکار شاعری کے ساتھ شعریات سے بھی ہونا چاہیے۔ اس بڑے اور اہم کام کی اشاعت کی نوبت چند سال پیشتر ہی آئی۔ شاید کسی نفسیاتی پیچیدگی کے سبب خواجہ صاحب کی علمی اور ادبی کاوشیں جلد منظر عام پر نہ آسکیں، اور انھیں قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن خواص ہمیشہ ان کے مداح، معترف اور گرویدہ رہے۔ رشید احمد صدیقی فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض پطرس بخاری احمد ندیم قاسمی انتظار حسین اور وقار عظیم جیسے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے ان کے علم و فضل کی گیرائی اور گہرائی ان کی دیدہ وری اور رمز شناسی اور ان کے محاکموں کی جامعیت اور دور رسی کا ہمیشہ کھلے دل سے اقرار و احترام کیا۔

خواجہ صاحب دلی کے ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور وہیں ۱۱ر مئی ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ء میں انگریزی

انھوں نے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں ۲۹ء میں آکسفورڈ سے بی۔ آنرز کیا۔ ۳۰ء اور ۳۱ء میں ایک سال اپنے پرانے استاد پروفیسر ڈکنز اور دوست پطرس بخاری کی دعوت پر ایک سال گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی پڑھائی۔ وہیں فیض احمد فیض ایم۔ اے انگریزی کلاس میں ان کے شاگرد رہے۔ ۳۱ء سے ۴۷ء تک علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی میں ریڈر اور پروفیسر رہے۔ آخر آخر میں ۵۹ء سے ۶۹ء تک دس سال انٹر یونیورسٹی بورڈ پاکستان کے سکریٹری رہے۔ خواجہ صاحب نے تقسیم ہند کے فوراً بعد علی گڑھ کی سرزمین کو خیرباد کہا اور وہیں اپنی بیوی اور ان کے میکے والوں کے اصرار پر مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے۔ جب تک وہ اس یونیورسٹی میں رہے یہاں کے ادیب اور شاعر ان سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ اور ان کا فیضان جاری رہا۔ ترقی پسند تحریک کے مقامی اور باہر کے معماروں اور کارکنوں کو بھی ان کا تعاون اور ان کی ہمدردی اور سرپرستی حاصل رہی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ سر شام ٹہلنے کے لیے نکل جاتے تھے۔ اس دوران مجھ جیسا کم سواد کوئی طالب علم آ نکلتا، تو اسے بھی اپنی معیت کا شرف بخشتے۔ گفتگو کا مرکز و محور ہمیشہ کوئی نہ کوئی علمی اور ادبی موضوع ہی ہوتا۔ کسی کی بھلائی برائی سے انھیں سروکار نہ تھا۔ کسی کی تضحیک، تحقیر، بدسگالی اور عیب جوئی کا ان کے ضابطۂ اخلاق میں کوئی خانہ تھا ہی نہیں۔ اپنی نام و نمود تشہیر و اشاعت اور ستائش و صلے سے وہ کلیتہً مستغنی رہے۔ ان کی شخصیت ایک محوی یعنی SELF-EFFACING شخصیت تھی۔ ان جیسا نیک نفس آدمی میرے تجربے میں سوائے سید حامد صاحب کے کوئی دوسرا نہیں آیا۔ ان پر اگر کوئی ناخلف اور بداندیش نازیبا تنقید و تعریض بھی کرتا، تو بجائے جواباً کچھ کہنے کے ان کی گردن ہمیشہ خمیدہ ہو جاتی۔ ایسی خود ضبطی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ یونیورسٹی کی سیاست اور ارباب حل و عقد سے وہ ہمیشہ گریزاں اور دامن کشاں رہے۔ ان کا سارا وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا۔ قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید شاید ہی کوئی قابل ذکر چیز ان کے مطالعے سے چھوٹتی ہو۔ اور اس

پر مستزاد حافظہ ایسا قوی اور مستحضر کہ ایک دفعہ جو چیز نظر سے گزر گئی اس کا نقش گویا ہمیشہ کے لیے ذہن پر مرتسم ہو گیا۔ عام طور پر وہ جدید یعنی بیسویں صدی کا انگریزی ادب پڑھاتے تھے۔ لیکن ہر دور کے ادب اور تحریکات سے ان کی واقفیت ایسی گہری اور راز آشنا تھی، کہ لگتا تھا جیسے شاید اسی کے بالاستیعاب مطالعے پر ساری توجہ مرکوز رہی ہو۔ ان کا انہماک اور ان کے مطالعہ کی وسعت اور گوناگونی حیرت انگیز تھی۔ اس کا اندازہ پاکستان جا کر ان سے ملنے پر ہی ہوا اور خطوط سے بھی برابر ہوتا رہتا تھا۔ ان کی تلاش و جستجو کی جبلت، غور و تامل کی عادت اور علمی و ادبی معاملات اور مسائل میں ان کے استغراق کا وہی عالم برابر رہا، جو راقم الحروف نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا، جسے ختم ہوئے اب چالیس برس سے زیادہ گذر چکے ہیں۔ جس چیز کا پتہ آپ کو کہیں نہ ملے اگر آپ اس کے بارے میں خواجہ صاحب سے رجوع کریں تو وہ فوراً آپ کو ایسی مکمل، حتمی اور تشفی بخش اطلاع فراہم کر دیتے تھے جس کا سان گمان نہ ہو۔ تقریباً چار یا پانچ سال پہلے کی بات ہے، ایک صاحب کو۔ جو اقبال اور ورڈز ورتھ کے موضوع پر انگریزی میں تحقیقی کام کر رہے تھے۔ اقبال پر مشہور انگریزی نقاد ہربرٹ ریڈ کے مضمون کی ضرورت تھی... میں نے یونیورسٹی لائبریری اور شعبۂ انگریزی کے سمینار میں ہربرٹ ریڈ کے سارے مجموعے کنگھال ڈالے لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم میں برابر اسے حاصل کرنے کی ٹوہ میں لگا رہا۔ ایک رفیق کار کو۔ جو انگلستان جا رہے تھے، اس کام پر مامور کیا، کہ وہ مذکورہ مضمون کی نقل وہاں سے لے کر آئیں۔ لیکن انھیں کامیابی اس لیے نہیں ہوئی کہ انھوں نے اقبال کی کتابیات میں اسے تلاش کیا، اور وہاں اس کا اندراج نہیں تھا۔ یہ مضمون جس کے حوالے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ لیکن خود مضمون عام دسترس سے باہر ہے سنہ ۱۷ء میں انگلستان کے کسی رسالے میں اس وقت چھپا تھا۔ جب نکلسن نے اقبال کی دو مثنویوں "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کا انگریزی ترجمہ مع اپنے مقدمے کے شایع کیا تھا۔ اور اس طرح اقبال کو پہلی بار یورپ کے دانشوروں

ے روشناس کرایا تھا۔ بہر حال جب وہ مقصود کسی طرح ہاتھ نہ لگا تو راقم الحروف نے خواجہ صاحب مرحوم کو اپنی بے تابی اور ناکامی دونوں کا حال لکھا۔ انھوں نے خط ملتے ہی فوراً اس مضمون کی نقل کرا کر بھیج دی۔ یہ مضمون نصف امریکی شاعر وہٹمین کے بارے میں ہے اور نصف اقبال کے بارے میں اور ہربرٹ ریڈ جیسے قدآور نقاد نے اقبال کی عظمت کا جس کشادہ جبینی اور عالمانہ وسعت نظر کے ساتھ اعتراف کیا، کاش پدم شری کلیم الدین احمد کو اس کا علم ہوتا تو ان کے چاروں طبق روشن ہو جاتے۔ اور انھیں اپنی بے بضاعتی کا بھی احساس ہوتا اور شاید وہ اپنی کوتاہ اندیشی اور کج فہمی پر بھی پشیمان اور متاسف ہوتے۔ راقم الحروف نے اس مضمون کا اردو ترجمہ نقد و نظر کی ایک اشاعت (جلد ۲، شمارہ ۱) میں خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شایع کیا۔

خواجہ صاحب ادبی اور تنقیدی رسائل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ایسے نپے تلے مہذب اور مسکت انداز میں کرتے تھے، کہ اس سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان کے ہاں جارحیت نام کو نہیں تھی۔ ان کی وسعت مطالعے کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ اب تک حافظے میں پیوست ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب راقم الحروف ایم۔ اے (انگریزی) کے آخری سال میں تھا مشہور ناول نگار، ای ایم فاسٹر علی گڑھ تشریف لائے اور انھوں نے یونین ہال میں چارلس ڈکنز کے فن پر ایک مقالہ پیش کیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں فاسٹر کی بعض ایسی تحریروں کا حوالہ دیا، جن کا کسی کو علم نہیں تھا۔ بخوبی یاد ہے کہ فاسٹر فرط حیرت میں بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے، اور برجستہ بول پڑے YOU ARE SLANDERING ME۔ خواجہ صاحب میں رشید صاحب کی طرح، دوسرے کے کمال کے اعتراف کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ دو واقعات اس وقت حافظے میں گردش کر رہے ہیں۔ عصمت چغتائی پر پطرس کے بے مثل اور اچھوتے تنقیدی مضمون کا بڑے ذوق وشوق سے ذکر کرتے ہوئے میں نے خواجہ صاحب کو سنا تھا۔ اسی طرح آزادی پر فیض کی معروف اور منفرد نظم جو تقسیم ملک کے فوراً بعد لکھی گئی تھی: 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' اس کا مسودہ جو فیض نے انھیں دیا تھا۔ انتہائی جوش مسرت اور جذبۂ تحسین کے ساتھ انھوں نے بعض احباب کو علی گڑھ میں اس وقت سنایا اور دکھایا، جب وہ نظم غالباً منظر عام پر نہیں آئی تھی۔

انتقادی بالغ نظری کے ساتھ ہی اردو نثر لکھنے پر بھی خواجہ صاحب کو بہ حد کمال قدرت حاصل تھی۔ ثقیل الفاظ کے ساتھ دروبست کی پختگی صلابت واستحکام اور معنی ومفہوم اور پیرایۂ بیان میں سخت گیر مطابقت اور ارتباط جو اچھی نثر کی خوبیاں ہیں۔ وہ سب ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ حشو و زائد، فقرہ طرازی، عبارت آرائی پر تصنع رنگینی اشعار کے ذریعے تزئین و آرائش کا اہتمام غلو اور شدت ان کے ہاں نام کو نہیں۔ عبارت سہل المفہوم میں قطعیت، الفاظ ایک دوسرے سے مربوط اور نگینوں کی طرح جڑے ہوئے، باوجود تلاش بسیار ان کے ہاں ایک پیراگراف بھی ایسا نہیں مل سکتا جس سے ذہن یا مفہوم غبار آلود ہو جائیں اور الفاظ کا رنگین دھندلکا ترسیل کے عمل میں رکاوٹ ڈال دے۔ ہمارے ہاں اردو کے ادیب اور نقاد ابھی تک شاعرانہ نثر کے چکر سے نہیں نکلے ہیں۔ اور تحریر میں عبارت آرائی اور طلاقت لسانی کی نمائش اور مظاہرے کو کمال فن جانتے ہیں۔ اور الفاظ کے طوطا مینا بنانے پر تکیہ کرتے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ تحریر میں قوت اور صلابت جملوں کی تراش خراش سے نہیں پیدا ہوتی، اس کا سرچشمہ دراصل نظر کی وہ دراکی یعنی ACUTENESS OF PERCEPTION ہے، جو الفاظ کو بھی شفافیت بخشتی ہے اور ذہن کے دریچے بھی کھولتی ہے۔ اردو میں اس روایت کی داغ بیل دراصل حالی نے ڈالی تھی۔ لیکن ہم مڑ مڑ کر للچائی ہوئی نظروں سے شبلی اور محمد حسین آزاد کی طرف دیکھنے سے باز نہیں آتے۔ اس میں کچھ دخل اس امر کو بھی ہے کہ اردو نثر کے اسالیب پر فارسی طرز نگارش کا ابھی تک غلبہ ہے۔ ہم بالعموم فرانسیسی اور انگریزی کی نثر کی خوبیوں کے ادا شناس اور محرم راز نہیں ہیں۔ اور ان سے ہم نے اتنا اثر قبول نہیں کیا جتنا کہ کرنا چاہیے تھا۔

کچھ اس میں نثر سہل پسندی اور ذہنی کاہلی اور انجماد کا بھی ہے۔ اچھی نثر لکھنا اتنا ہی صبر آزما اور شکیب طلب کام ہے، جتنا کہ اچھا شعر کہنا۔ اس کے لیے جو ریاضت اور محنت پتہ پانی درکار ہے اس سے ہمارے ادیب اکثر جان چراتے ہیں۔ اچھا نثر نگار ایک تہذیبی عمل یعنی CIVILIZING PROCESS سے گزرے بغیر اپنے مافیہ کو خاطر خواہ طور پر الفاظ میں منتقل نہیں کر سکتا۔ سجی سجائی اور ظاہری چمک دمک رکھنے والی نثر خیال اور مفہوم کے افلاس کی چغلی کھاتی ہے۔ اور ان پر غیر محکم گرفت کا راز فاش کرتی ہے۔ الفاظ کی توانائیوں یعنی POTENCIES کو ذہنی اور جذباتی مرکب سے جدا نہیں کر سکتے۔ خواجہ صاحب نے جن استقاکر نثری اسلوب کا ڈول ڈالا ہے اس کی موزونیت، شائستگی اور ستھرے پن میں ان کے ہم پلہ صرف فیض احمد فیض ہی شمار کئے جا سکتے ہیں جو کے ہاں غیر شعوری طور پر خواجہ صاحب کے متین متوازن اور گوارا لب و لہجے کا رنگ جھلکتا ہے۔ انھیں بھی راقم الحروف ہی کی طرح خواجہ صاحب مرحوم سے شرف تلمذ حاصل رہا تھا۔

مولانا عبدالعزیز میمن

شیخ نذیر حسین

مولانا عبدالعزیز میمن نے نوے برس کی عمر میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ وہ عہد حاضر میں عربی زبان کے مشہور ادیب، محقق عالم اور انشا پرداز تھے اور اپنی عربی تصانیف کی بدولت ہندو پاکستان سے زیادہ عرب ممالک کے علمی حلقوں میں معروف اور روشناس تھے۔ مولانا صاحب کا وطن مالوف راج کوٹ، کاٹھیاوار تھا جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، آبائی پیشہ زمینداری تھا، بچپن ہی میں وہ حصول علم کے لیے دہلی چلے آئے، ان دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، شہر میں باکمال علماء کے درس و تدریس کے حلقے جگہ جگہ قائم تھے۔ میمن صاحب نے مولانا محمد بشیر سہسوانی سے جو نواب صدیق حسن کے زمانۂ عروج میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے، درسیات کی تحصیل کی، ادب کی تعلیم کے لیے وہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے، انہوں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھیں، میمن صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی، امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خاں سے ملنے گئے اتفاق سے عید کا دن تھا، ڈپٹی صاحب نے متنبی کی عید اور وجہ حبیب والا شعر پڑھا۔ عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے عجیب لطف پیدا کر دیا اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اس زمانے میں معقولات کا بڑا شہرہ تھا، قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا، ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا۔ علامہ محمد طیب مکی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب تھے ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبہ رام پور کھنچے چلے آتے تھے۔ میمن صاحب نے رام پور جا کر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات، منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے اور یونیورسٹی میں اول آئے۔

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا، بڑے بڑے علماء، ادباء اور صلحاء وہاں موجود تھے، لیکن میمن صاحب افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے، کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علماء کے فقہی اختلاف کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقاتلے بن جایا کرتے تھے، وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گذر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ ظفر کی یاد تازہ تھی اس کی یہ غزل :-

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ ؛ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا خونی دروازہ، جہاں شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام و خواص تھا، ارزانی کا یہ عالم تھا کہ معرکی چھپی ہوئی صحیح بخاری ڈھائی تین روپے میں مل جاتی تھی۔

اس اثنا میں ان کو مشن کالج پشاور میں عربی، فارسی کے

لکچرر کی جگہ مل گئی اور پشاور چلے آئے اس زمانے میں انہوں نے لاہور کے مشہور رسالہ مخزن میں عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر کئی مضامین لکھے جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندیٰ اور شرح شذور الذہب اور الفیہ کی شرح کو اختیار کرنے اور منطق و فلسفہ میں زیادہ انہماک کے بجائے علم حدیث کے اشتغال اور مزاولت پر زور دیا گیا تھا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدر دانی سے اورینٹل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے، یہ زمانہ اورینٹل کالج کے شباب کا تھا۔ شعبہ عربی میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبہ فارسی میں ڈاکٹر محمد اقبال (ڈاکٹر داؤد رہبر کے والد) اور سید وجاہت حسین بلگرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے ان اساتذہ کے علم و فضل اور تدریسی مہارت کی شہرت سن کر یو پی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدر آباد (دکن) تک سے طلبا لاہور کھنچے چلے آتے تھے، مولانا میمن کالج میں تدریس کے علاوہ اورینٹل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگراں تھے، اس دور کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی اسامی خالی ہوئی تو وہ غالباً علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی سعی و سفارش سے علی گڑھ چلے گئے۔ میمن صاحب کے تقرر پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے معارف کے شذرات میں اظہار مسرت کیا تھا۔ میمن صاحب ۱۹۵۰ء میں صدر شعبہ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے، ان کی آمد سے قبل عربی شعبہ کا صدر جرمن مستشرق ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکا تھا۔

معیار تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم۔ اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا، میمن صاحب نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی امہات کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العمدہ (ابن رشیق) نصاب میں داخل کیں، شعبہ عربی کا وقار ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں قائم کیا اور طلباء میں صحیح علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق پیدا کیا ان کے درس و تدریس سے بہت سے مستعد طلبا نے فائدہ اٹھایا۔

ان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدر آباد سندھ اب اسلام آباد) ڈاکٹر محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی) ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (مسلم یونیورسٹی) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (دہلی یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں، افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف جن کو میمن صاحب بھی بہت مانتے تھے ٹریفک کے حادثے میں گذشتہ ستمبر میں لندن میں انتقال کر گئے۔

علی گڑھ قیام کے دوران میں ان کا قابل ذکر کارنامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے، اس کی شرح ایک اندلسی عالم ابوعبید البکری آرائی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی میمن صاحب نے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شارح کی غلطیوں اور فرو گذاشتوں کی نشاندہی کی۔ اور ۱۹۳۵ء میں خود قاہرہ جا کر اس کو سمط اللآلی کے نام سے شائع کرایا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ جو آئندہ چل کر عالم عرب میں بھی ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔

امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابو تمام، بحتری اور متنبی کے دواوین کا انتخاب الطرائف الادبیہ کے نام سے کیا تھا، یہ بھی اسی زمانے میں میمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا۔ الفتح کے فاضل مدیر محب الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ لیا، اس کی صرف چار جلدیں شائع ہو سکیں یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے، لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے۔ جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہو سکتا اب اس کو مصر کے مشہور محقق عالم استاد عبدالسلام محمد ہارون جدید تحقیق تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اور اس کی چھ سات جلدیں چھپ چکی ہیں۔

میمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف دو جلدیں شائع ہو سکیں، افسوس ہے کہ خطیب صاحب کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ عظیم الشان کارنامہ ادھورا رہ گیا،

۱۹۵۰ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے گئے،

اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الہلالی اور الفاضل (البردہ) کی اشاعت ہے۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں راقم کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا۔ اسلامی کلوکیم (مذاکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب ممالک کے متعدد فضلا مدعو تھے، جن میں نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار کی تھی، اس سے قبل ان کے علمی مقالات اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے مجمع العلمی العربی (دمشق) سہ ماہی مجلہ میں پڑھ چکا تھا اور ان سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ میں استاد محترم شیخ محمد العربی المراکشی کی معیت میں فلیٹی ہوٹل پہنچا، جہاں عرب مندوبین مقیم تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ محمد بہجت بیطار مولانا محمد ادریس کاندھلوی (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ) کے یہاں چلے گئے ہیں، ان کی تلاش میں ایک اور صاحب سرگرداں تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، خشخشی داڑھی اور اچکن اور پاجامے میں ملبوس، مراکشی صاحب نے بتلایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز میمن ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے نعمیلت کدے پہنچے جہاں بیطار صاحب بلبل ہزار داستان بنے شیعوں کے متعلق لطائف و ظرائف بیان کر رہے تھے، اور انہوں نے ساری محفل کو کشت زعفران بنا رکھا تھا ان کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے، میمن صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے جس میں میرے اندازے میں میمن صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ وہاں سے یونیورسٹی آتے ہوئے راستے میں پنجاب یونیورسٹی کی چھوٹی سی مسجد پڑی، جس کی پیشانی پر یہ شعر کندہ تھا

چراغ و مسجد و محراب و منبر ... ؛ ... ابوبکر و عمر عثمان، حیدر

شیخ بہجت بیطار نے اس شعر کا مفہوم دریافت کیا۔ راقم نے اس کا مطلب اردو میں جناب محمد العربی المراکشی سے بیان کیا اور انہوں نے اس کا مفہوم عربی میں شیخ صاحب کو سمجھایا۔ بتیس اکتیس برس گزر جانے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکا کے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے، ۱۹۶۰ء میں سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ (ادارہ تحقیقات اسلامی) قائم ہوا۔ تو میمن صاحب اس سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے عراق، شام، مصر، ترکی اور تونس وغیرہ کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید لائے۔ اب ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کا کتب خانہ مطبوعات کے لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے کتب خانہ سے کم نہیں۔ ۱۹۶۴ء میں وہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی قدر دانی اور معارف پروری کی بدولت عربی زبان کے صدر شعبہ بن کر اورینٹل کالج میں تشریف لے آئے اور لاہور میں دو سال مقیم رہے، افسوس ہے کہ اس دفعہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ ہو سکا۔ اب وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں میں رہنمائی کے لیے زیادہ سود مند ہو سکتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبدالحق ندوی کے مکتبۃ العلمیہ میں آ جاتے تھے۔ عربی زبان و ادب سے شغف رکھنے والے حضرات بھی ان سے وہیں ملنے چلے آتے تھے۔ راقم السطور بھی بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا، یہ پرلطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی تھی اور علماء سلف ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خاں کی علمی خدمات اور ہندوستانی محدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی تھی۔ ان کی گفتگو کا موضوع نادر علمی کتابیں تھیں جن کی تلاش و جستجو میں انہوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے تھے۔ قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلاطین آل عثمان تک کے تاریخی آثار، وہ دل کش موضوع تھے جس پر وہ حاضرین مجلس کو گھنٹوں اپنی پرلطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے سلطان ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں مدد و اعانت کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ اور اس کے ارکان قسطنطنیہ ہی میں مر کھپ گئے۔ میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔

اس مجلس میں وہ کبھی دل لگی اور تفنن و مزاح کی باتیں بھی کرتے تھے۔ عالم عرب کے بیشتر فضلاء سے ان کے گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ عربوں میں وہ شامیوں کی مہمان نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہل تونس کی تہذیب و شائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسی ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو خیرباد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہ جامعہ زیتونیہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور کی بھی تعریف کیا کرتے تھے۔ جو بڑھاپے میں بھی نواب

یتی حسن کی طرح خوبصورت اور دیدہ زیب دکھائی دیتے تھے۔ شیخ
ہر بن عاشور نے قرآن مجید کی تفسیر التحریر والتنویر فی التفسیر کے نام
ی ہے اور اس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتنا کیا ہے، وہ مغربی
یوان پرستی سے سخت متنفر تھے۔ عرب قوم پرستی جس کا مقصد عربوں کو
رعرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے، خود عربوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے،
خلاف اس کے وہ ترکوں کی علمی سرپرستی کے بے حد مداح تھے جن کی
ی سرپرستی کی بدولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔
ملامی ممالک کی دینی اور اصلاحی تحریکوں پر بھی ان کی نظر اچھی تھی۔

لاہور سے سبکدوش ہوکر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی
ذارنے لگے۔ اس زمانے میں انہوں نے ابوتمام کا دیوان الحماسۃ الصغریٰ
رد علی بن حمزہ بصری کی التنبیہات علی اغالیط الرواۃ شائع کیں۔ مجلہ مجمع اللغۃ
لعربی (سابق مجلہ مجمع العلمی العربی) دمشق میں انہوں نے معجم الادباء
یاقوت) پر نقد و تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ وہ امام
رضی الدین غانی کی العباب الزاخر کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے، چنانچہ
سی رسالہ میں انہوں نے اس کا مقدمہ بھی شائع کیا تھا۔

کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابق معتمد مالیات حکومت
پاکستان) اور پیر حسام الدین راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدتمند
تھے۔ علمی حلقوں میں ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور باہمی طنز و تضحیک
مشہور تھی، ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انہوں نے اردو بورڈ کے
زیر اہتمام عربی لغت اور اس کی خصوصیات پر کئی خطبات دیے تھے جو اردو
بورڈ کے سہ ماہی مجلے میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ اب ضرورت
ہے کہ پیر حسام الدین ان خطبوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔

میمن صاحب چند برس سے تنہائی اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر
رہے تھے، تین چار برس ہوئے ان کی اہلیہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ اور
لڑکے ملازمت کے سلسلہ میں کہیں باہر مقیم تھے۔ صرف ایک پوتا ان کی
خبرگیری کیا کرتا تھا اور آخر میں نہایت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے۔

آخر تک حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس و ہمدم
بنی رہیں۔ انہوں نے نوے برس کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات
سے معمور تھی، ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال کیا ـــــ "مولانا عبدالعزیز میمن"

یادداشت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے، سیکڑوں عربی قصائد اور ہزاروں
اشعار نوک زبان تھے۔ کتب درسیہ میں دیوان المتنبی اور دیوان الحماسہ
تقریباً مکمل حفظ تھے۔ مفضلیات، الکامل (المبرد) اور کتاب البیان
التبیین (جاحظ) کے بیشتر حصے ازبر تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلاء
المعری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔ نادر علمی کتابوں کی اشاعت
اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔ وہ مجمع اللغۃ دمشق اور قاہرہ
کے بھی رکن تھے۔ میمن صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن ذہنی جمود
نام کو بھی نہ تھا۔ سیر و سیاحت اور مختلف الخیال اصحاب فکر و نظر کے
میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ امام شافعی کے بے حد
مداح اور عقیدت مند تھے اور اصول فقہ میں ان کے الرسالہ کی عربیت
بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ فقہا میں ابن حزم اور ابن عبدالبر کی جامعیت
اور بغدادی کی عربیت کے بڑے قائل تھے، کہا کرتے تھے کہ جتنے علمی
و ادبی ماخذ و مصادر عبدالقادر بغدادی (مصنف خزانۃ الادب)
کی دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہوسکے
مستشرقین میں وہ مسٹر سالم کرینکو کے جو ان کے ساتھ علی گڑھ میں کام
کر چکے تھے، تبحر علمی، وسعت معلومات کے قائل تھے۔

اصلاحی خیالات:۔ مولانا میمن درس نظامی کے نصاب
تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے،
نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض
شروح اور ابن ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے
لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی سفارش کرتے تھے، جس میں نور
نبوت کے علاوہ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ
سنن ابی داؤد کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد والرقائق
کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ تفسیر میں جلالین کے بجائے
جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ ابن خلدون نے جن کتابوں
کو اصول فن ادب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انہوں نے الندوہ (دور
جدید) میں میری محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ
لکھا تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل (المبرد) ایک مبتدی کے لیے زیادہ
مفید ہے۔ ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو

ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے۔ کتاب البیان والتبیین (جاحظ) میں فصیح نظم ونثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوادر لغت وشعر لالی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک حماسات میں ابوتمام کا دیوان الحماسہ سب سے عمدہ اور بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔

اس علم وفضل کے باوجود تمکنت نام کو نہ تھی، طرز معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی، وہ سودا سلف بازار سے خود لایا کرتے تھے۔ شاگرد تمباکو اور چلمیں دور دور سے لاکر دیتے تھے۔ حقہ کے شوقین تھے۔ طالب علموں کے استفسار کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے، لیکن زیادہ سوالوں سے گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنک مزاجی اور بخل کے افسانے سناتے ہیں لیکن ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں۔ انہوں نے عربی خواں طلبار کے وظائف کے لیے لاکھوں روپے کے عطیات کراچی اور پنجاب یونیورسٹیوں کو دیے۔ شاید دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی ان کی فیاضی سے محروم نہ رہا۔

انہوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا جب حدیث کی مشہور کتاب مصنف عبد الرزاق شائع ہوئی تو پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اس کے بہت سے نسخے خریدے اور طلبا مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیے۔ راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے۔ کہ انہوں نے ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے مجھے عربی کا ایک شعر لکھ کر دیا تھا اور میں اسی شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

مازال تکتب فی الحدیث مجتہدا ٭ حتیٰ وجدناک فی الحدیث مکتوبا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کی زبان کی خدمت کے صدقے میں ان کے درجات بلند کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

"فکر و نظر" کی پرانی جلدوں کے مندرجہ ذیل شمارے دستیاب ہیں۔

آپ اپنی ضرورت اور پسند کے شمارے
دفتر فکر و نظر سے
حاصل کرسکتے ہیں۔

سنہ:	شمارہ:	جلد:	سنہ:	شمارہ:	جلد:
۱۹۶۰ء	۳	۱	۱۹۷۳ء	۳، ۴	۱۳
۱۹۶۴ء	۴	۵	۱۹۷۵ء	۱، ۲	۱۴
۱۹۶۵ء	۳	۶	۱۹۷۹ء	۱، ۴	۱۶
۱۹۶۶ء	۱	۷	۱۹۸۰ء	۱، ۲، ۳، ۴	۱۷
۱۹۶۷ء	۲	۸	۱۹۸۱ء	۱، ۲، ۳، ۴	۱۸
۱۹۶۹ء	۴	۹	۱۹۸۲ء	۳، ۴	۱۹
۱۹۷۰ء	۱، ۲	۱۰	۱۹۸۳ء	۱، ۲، ۳، ۴	۲۰
۱۹۷۱ء	۲، ۳	۱۱	۱۹۸۴ء	۳، ۴	۲۱
۱۹۷۲ء	۱، ۲، ۳	۱۲			

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن

مسلم یونیورسٹی اکڈمک کونسل نے طبیہ کالج کے قیام کے لیے اسکیم
ب کرنے کی غرض سے ۸ ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک سب کمیٹی قائم کی جس
ینیورسٹی کے تحت طبیہ کالج قائم کرنے کی سفارش پیش کی، جو منظور کی
۔اور ۱۹۲۷ء میں طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا۔ نواب سر مزمل اللہ خاں
ں چانسلر تھے۔ اساتذہ کے تقرر کے لیے انتخابی کمیٹی مسیح الملک حکیم
ں خاں، حکیم غلام کبریا خاں، شفاء الملک حکیم عبدالحمید اور شفاء الملک
م عبدالحبیب دریابادی پر مشتمل تھی۔ مسیح الملک کی جوہر شناس نظروں نے
ان عزیز لکھنؤ کے نوجوان طبیب حکیم عبداللطیف (پیدائش ۲۹ اپریل
ار) کا انتخاب کیا۔ ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو حکیم عبداللطیف بحیثیت
د طبیہ کالج سے وابستہ ہوئے۔ کچھ عرصے بعد وائس پرنسپل اور ۱۹۴۹ء میں
بل مقرر کیے گئے۔ ۳ ستمبر ۱۹۶۱ء کو ۳۴ سال وابستگی کے بعد سبکدوش
ے۔ پرنسپل کے علاوہ پروفیسر معالجات، ڈین فیکلٹی آف میڈیسین اور ڈائرکٹر
ر ریسرچ ان یونانی میڈیسین بھی رہے۔ علی گڑھ کی علمی تہذیبی اور سیاسی
ٰی میں انھیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ یونیورسٹی کے بہت ذمہ دار
ہم فرد سمجھے جاتے تھے۔ تمام اہم کمیٹیوں میں شریک رہتے تھے۔ اکڈمک
ل، اکزیکیٹو کونسل اور کورٹ کی میٹنگوں میں ان کی تقریریں بہت زوردار
ا تھیں۔ اور یونیورسٹی کے مسائل و معاملات میں ان کی رایوں اور مشوروں
قرام کیا جاتا تھا۔

علی گڑھ کے پہلے دور کے نورتن اور سرسید کے رفقا محسن الملک، وقار الملک
۔ نا حالی، مولانا شبلی، مولوی سلیم پانی پتی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ
ی چراغ علی اور نواب عماد الملک کا زمانہ گو انھیں نہیں مل سکا لیکن

عہد ثانی کے نورتنوں نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، صاحبزادہ آفتاب
احمد خاں، مولوی عبدالحق، مولانا طفیل احمد، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر
یلدرم، مولوی عزیز مرزا اور مولوی عنایت اللہ کا دور اُن کے سامنے گزرا اور
ان کی صحبتیں انھیں میسر آئیں۔ تیسرے دور کے نورتن ان کے بے تکلف احباب
تھے جس کے وہ خود بھی ایک رتن تھے۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر
رشید احمد صدیقی، پروفیسر محمد حبیب، کرنل حیدر خاں، مولانا سلیمان اشرف،
عبدالمجید قریشی، میاں محمد شریف اور بابر مرزا جیسی نامور شخصیتیں شامل ہیں۔

علی گڑھ آنے سے پہلے حکیم صاحب کو رام پور اور لکھنؤ کے اہل علم
کی مجالس سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا۔ فلسفہ میں مولانا فضل حق رامپوری
سے اور نقلیات میں شمس العلماء مولانا عبدالمجید فرنگی محلی، مولانا عبدالکریم
فقیہ اول ندوۃ العلماء اور مولانا عبدالشکور جیسے علماء سے تلمذ تھا۔ طب کی تعلیم شفاء الملک
حکیم عبدالمجید شفاء الملک حکیم عبدالمعید اور حکیم حافظ عبدالمجید سے تکمیل الطب میں حاصل
کی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں طبی تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۲۶ء تک تکمیل الطب کالج میں
درس دے چکے تھے۔ علی گڑھ کے نئے قائم شدہ طبیہ کالج نے ان کی سرپرستی
اور رہنمائی میں ملک کے طبی اداروں کی صف میں جلد امتیاز و اعتبار حاصل
کیا اور دہلی و لکھنؤ کی طرح علی گڑھ طب کا مرکز قرار پایا۔

حکیم صاحب اطبائے قدیم کی روایات اور فنی عظمت کا بے مثل نمونہ
تھے۔ ان کی ماہرانہ دسترس، حکیمانہ بصیرت اور فنی عرفان سے طبی مسائل کے
حل میں رہنمائی ملتی تھی۔ ان کی نظر قدیم طبی کتابوں ہی پر بہت گہری
نہیں تھی، طب کے بنیادی علوم منطق، فلسفہ، ہیئت، موسیقی اور قدیم
سائنسی موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اسی لیے جہاں حسن معالجہ

حذاقت فن اور دست شفا کی وجہ سے انھیں شہرت و امتیاز حاصل تھا، وہاں نظریات و فلسفۂ طب کا ان سے زیادہ رمز آشنا اور صاحب معرفت کوئی دوسرا نہیں تھا۔ کلیات طب کے دقیق و مشکل مقامات اور فلسفیانہ مباحث پر جس وقت وہ اظہار خیال کرتے تھے تو ان کا انداز اس قدر دلنشین اور قابل فہم ہوتا تھا کہ بعد میں اس مسئلہ کی دقت اور دشواری پر شبہ ہونے لگتا تھا۔

انھیں اپنے فن پر بے حد اعتماد تھا اور یہ اعتماد محض خوش عقیدگی کی بنیاد پر نہیں تھا۔ اس کے پیچھے طب کے ذخیرہ پر ان کی گہری نظر، دوسری طبوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد اپنے فن کو کھنگالنے کی کوشش، اور فنی حذاقت تھی۔ وہ ہندوستان کے صحتی مسائل کو دیسی طبوں کے ذریعہ حل ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے زندگی بھر جد و جہد کی اور اپنے کو پورے طور پر وقف کر دیا۔ ان کا کوئی وقت ذاتی یا گھر کے لیے نہیں تھا، ہر وقت علمی مباحث تعلیمی معاملات اور فنی مسائل کے سلسلہ میں وہ منہمک و مصروف رہتے تھے۔ ہندوستان میں طب کے ہر اہم مسئلہ کے حل کے لیے ان پر نگاہ اٹھتی تھی اور ہر محاذ پر وہ کمان کرتے نظر آتے تھے۔ انھوں نے طب کے ایک پورے کارواں کی سالاری کی ہے۔

طبی ماہر تعلیم کی حیثیت سے طبیہ کالجوں میں وہ یونانی اور ایلوپیتھی کی مخلوط تعلیم سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ اور اسے طب یونانی کے لیے بہت ضرر رساں سمجھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ جب تک یہ مخلوط نصاب رائج رہے گا اس وقت تک طب یونانی کو ترقی سے ہم کنار ہونے اور اپنی حقیقی شکل میں ابھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ طبیہ کالجوں کے فارغین کی یونانی سے بے رغبتی اور ایلوپیتھی رجحان کا اصل سبب یہ نصاب تعلیم ہے جس میں طلبا کو ان مضامین پر پورا وقت صرف کرنے کا موقع نہیں ملتا وہ مسلسل اس کے خلاف جد و جہد کرتے رہے اور ایلوپیتھی سے مرعوبیت کی اس فضا میں ان کی آواز برابر گونجتی رہی۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی وائس چانسلری کے زمانہ میں علی گڑھ کے نصاب میں تبدیلی کی اور ایک انقلابی قدم اٹھایا۔ ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی طرف سے قائم کردہ نصاب کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے انھوں نے ایک جامع نصاب مرتب کر کے پیش کیا۔ وہ مرکزی وزارت صحت کی طرف سے نصاب کے سلسلہ میں کی جانے والی کوششوں میں شریک رہے۔ دیسی طبوں کے متعلق ملیار کمیٹی کی رپورٹ ان کی مساعی کا مظہر تھی اور یونانی حلقوں میں ان سے زیادہ کوئی اس کا خیر مقدم کرنے والا نہیں تھا۔

علمی حیثیت سے ان کے مضامین اور تصانیف بے حد قابل قدر ہیں۔ ۱۰ برس کی عمر سے انھوں نے لکھنا شروع کیا اور آخری لمحات تک وہ برابر لکھتے رہے ان کی طبی نگارشات تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پہلا مضمون ماہنامہ "خادم الاطباء" لکھنؤ میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے وہ نظریاتی مضامین خاص طور پر اہم ہیں جن میں طبی قدروں اور اصولوں پر زور دیا گیا ہے اور جن میں فلسفۂ طب سے بحث کی گئی ہے۔ مقالات، مقدمات اور خطبات پر مشتمل ایک مجموعہ راقم کے زیر ترتیب ہے۔ "مضامین شفاء الملک" کے نام سے یہ مجموعہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر محیط ہوگا۔ ان کے علاوہ نظریات و فلسفۂ طب، عناصر، مزاج، اخلاط پر ان کے مضامین کو راقم نے علاحدہ کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ تجدید طب کے نام سے یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں طبع ہو چکی ہے۔

علی گڑھ میں طبیہ کالج کے قیام کے پانچویں سال ڈاکٹر سر راس مسعود کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اپریل ۱۹۳۲ء سے سہ ماہی مجلہ "طبیہ کالج میگزین" نکلنا شروع ہوا۔ شفاء الملک اس کی مجلس ادارت میں شریک تھے۔ ان کی یہ شرکت برائے نام نہ تھی۔ رسالہ کے اجرا اور اس کو اعلیٰ معیار عطا کرنے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اس رسالہ کے ذریعہ انھوں نے طلبا میں علمی ذوق ابھارا اور انھیں مطالعہ و تحقیق میں مصروف کیا۔ ان کی یہ کوشش کامیاب رہی اور طلبا نے محنت اور دیدہ ریزی سے قابل قدر مضامین پیش کیے۔ جب تک یہ رسالہ جاری رہا طلبا میں مطالعہ اور مضمون نویسی کا شوق نشو و نما پاتا رہا۔ حکیم صاحب نے اس زمانہ میں طلبا پر بڑی محنت کی وہ انھیں مختلف موضوعات دیتے، حوالہ کے لیے کتابوں کی نشاندہی کرتے اور مواد کی فراہمی میں ان کی ضروری رہنمائی فرماتے۔ ان کی مسلسل ہمت افزائی نے طلبا میں بالغ نظری پیدا کی۔ طلبا کی فنی تربیت کے ساتھ ہی اس رسالہ میں خود حکیم صاحب کے فاضلانہ مضامین شائع ہوئے۔ مطب کی بے حد مصروفیتوں کے باوجود وہ تصنیفی کام کے لیے وقت نکالتے رہے۔ ورنہ مطب کی مصروفیات بالکل متقاضی نہیں تھیں کہ اس قسم کے خالص علمی و فنی مضامین کے لیے گنجائش نکالتے۔ اس زمانہ میں مطب کا یہ عالم تھا کہ یونی ورسٹی کے طالب علم اور اساتذہ سے لے کر ادنیٰ درجہ کے ملازمین اور شہر کے عوام و خواص سب ان کے زیر علاج رہتے تھے۔ مطب میں ہر لحظہ

یوم ہوتا تھا۔ گھر پر بھی سکون کا وقت نہیں تھا۔ کئی سو مریض مسلسل دیکھنے کے
ںعیں تھک جانا چاہیے تھا۔ مگر ان کی قابلِ رشک صحت انھیں ہر وقت
دم رکھتی تھی اور وہ بے تکان علمی و تدریسی کاموں میں معروف رہتے تھے۔
حکیم صاحب اور علی گڑھ کے تعلق سے یہاں مجلس مصنفین کا ذکر ضروری
۔ جس طرح ابتدائی عمر میں لکھنؤ کی مسلم اکاڈمی سے جسے ۱۹۲۳ء میں
نا عبدالحلیم شرر نے قائم کیا تھا، ان کا تعلق رہا۔ نہ صرف اس کے علمی مذاکروں
وہ شریک رہے بلکہ بعض قیمتی مقالات اس اکاڈمی میں پیش کیے۔ اسی
ۂ مجلس مصنفین علی گڑھ جو ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو قائم کی گئی تھی ان کے
ی اور دلچسپی کا خاص مرکز رہی۔ مجلس کے کامیاب اور پر رونق جلسے
ہفتہ منعقد ہوتے تھے۔ ان میں مقتدر صاحبانِ علم و فن مختلف موضوعات
یہ پر مقالے پڑھتے تھے۔ مجلس کی طرف سے سہ ماہی آرگن "مصنف" فروری
۱۹ء سے جاری ہوا۔ مجلس کے روحِ رواں سید الطاف علی بریلوی اڈیٹر
ا حیدالدین (ایف آر ایس اے لندن)، پرنٹر اور سکریٹری مجلس مولانا محمد
بن کیفی چریاکوٹی ٹلہ پبلشر تھے۔

مجلس کے جلسے مختلف اراکین کی قیام گاہوں پر منعقد ہوتے تھے ان
ں مثلاً الطاف علی بریلوی، سید بشیر علی (کیمسٹری)، مولوی محمد عزیر (اردو)
بدالعزیز میمن (عربی)، ڈاکٹر محمود احمد (شعبۂ فلاسفی)، شمس العلماء مولانا محمد امین
سی، پروفیسر عبدالمجید قریشی، مولانا ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر آل احمد سرورؔ،
لانا سید طفیل احمد شرکا مقالہ نگار اور فرائض صدارت انجام دینے والوں
ں نواب صدر یار جنگ، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، مولوی یعقوب
ش راغب، خان بہادر سید آل علی نقوی، ابواللیث صدیقی، ظہیرالدین
دی، مولوی ابوالحسن (انسپکٹر مدارس یوپی)، پروفیسر عبدالغفور، علامہ سید
لیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، نیاز احمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، پروفیسر شیخ
بدالرشید، پروفیسر اے بی اے حلیم، پروفیسر محمد شفیع، میاں محمد شریف، خواجہ
غلام حسین، احسن مارہروی قابلِ ذکر ہیں۔

دسویں مجلس مولانا عبدالعزیز میمن کے تفویض کردہ پر ۲۴ نومبر ۱۹۴۱ء کو
ئی شفاء الملک حکیم عبداللطیف (اس وقت وائس پرنسپل تھے) صدرِ جلسہ
وئے۔ ۱۹ ارکان شریک تھے۔ ظہیرالدین علوی نے اپنا مقالہ "شعراءِ اردو اور
ہندی شاعری" سنایا۔ نئے سال کا پہلا جلسہ جو مجلس کا چودھواں جلسہ تھا۔

۲۷ جنوری ۱۹۴۲ء کو شفاء الملک کی دعوت پر آفتاب لائبریری کانفرنس کمپاؤنڈ
میں زیرِ صدارت مولوی نظام الدین حسین ہوا۔ آل احمد سرور نے مقالہ "اکبر اور
سرسید" پڑھا۔ بیسواں جلسہ محمد حاذق صاحب (شعبۂ فارسی) کی دعوت پر ۵ ار
اپریل ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض شفاء الملک نے انجام دیے
مظہر علی علوی وکیل ہائی کورٹ کلکتہ نے مقالہ بعنوان "اقتصادیات کے بنیادی اصول
اسلامی تعلیم میں" پیش کیا۔

مجلس کے ان جلسوں سے اس زمانہ کی علی گڑھ کی علمی و تہذیبی زندگی
کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے مباحث علمیہ اور نقد و تبصرہ کا معیار بلند معیار تھا۔
مقالوں کے بعد جو علمی گفتگو ہوتی تھی اس کی دلچسپی اور افادیت خاص چیز
تھی۔ اس مجلس نے یونی ورسٹی کے علمی حلقوں میں اس قدر مقبولیت حاصل کی
تھی کہ مجلس جو ہر مرتبہ کسی ایک رکن کی جانب سے کی دعوت پر ہوتی تھی اس
کا سلسلہ ۵۴ مجلسوں تک چلتا رہا اور کسی صاحب کو دوبارہ دعوت دینے کی
نوبت نہیں آئی۔ ۴۴ ویں مجلس یکم جون ۱۹۴۴ء سے دوسرا دور شروع ہوا۔
آخری ساٹھواں جلسہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہوا۔

مجلس مصنفین اور اس کے سہ ماہی رسالہ مصنف کے دفتر "بیت المصنف"
کا قیام بھی اعلیٰ علمی مقاصد کے تحت عمل میں لایا گیا تھا۔ ۷ نومبر ۱۹۴۴ء کو اس
کی رسمِ افتتاح ہوئی۔ مجلس کے علمی و تحقیقی مقالات کے ساتھ ہی جو مصنف
میں شائع ہوتے تھے۔ بیت المصنف میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور تراجم
کا سلسلہ بھی منصوبہ جاتی پر جاری کیا گیا۔ علمی کام کے لیے ایک چھوٹا سا مرکز قائم
ہونے کی وجہ سے علی گڑھ تشریف لانے والے اہلِ علم بیت المصنف میں بھی قدم
رنجہ فرماتے تھے۔ افضل العلماء مولوی عبدالحق مدراس، پروفیسر نجیب اشرف
ندوی، پروفیسر اسماعیل (اندھیری کالج بمبئی)، محمود احمد عباسی (امروہہ)، مولانا
نظام الدین حسین (بدایوں)، راجہ میر احمد علی خاں آف محمود آباد، مولانا ابن حسن
جارچوی، مولانا ظفر الملک علوی، قاضی عبدالغفار، پروفیسر طاہر فاروقی اس
میں آنے والوں میں ہیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس نے نہ صرف علی گڑھ بلکہ مسلمانان
ہند میں تعلیمی تحریک کو ابھارا دینے میں زبردست حصہ لیا ہے، اس کے دوسرے
عہدوں کی طرح آنریری جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر مقتدر شخصیتیں فائز رہی ہیں
۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۷ء بارہ سال صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جوائنٹ سکریٹری رہے

۱۹۱۷ء میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا سید طفیل احمد (وفات ۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء) جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کے سبکدوش ہونے پر خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی کا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں شفاء الملک اس عہدہ کے لیے منتخب کیے گئے۔ عبد المجید قریشی ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کراچی روانہ ہو گئے۔ سید الطاف علی بریلوی کے نام اپنے پہلے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"آپ سب بہت یاد آتے ہیں۔ کانفرنس کے کارکنان حکیم صاحب، شیخ عطاء اللہ صاحب، رشید صدیقی صاحب، شہزاد صاحب، سراج الحق قریشی صاحب، مولانا اکرام اللہ صاحب غرضیکہ جو طے اس سے کہہ دینا کہ مجھے سب یاد آتے ہیں۔"

کانفرنس نے ۱۴ مئی ۱۹۴۵ء کو "انڈین اکاڈمی آف اسلامک ریسرچ" کے نام سے ایک اسکیم منظور کی تھی اور ۱۹۴۶ء کے شروع میں اس کا باضابطہ قیام عمل میں آیا تھا۔ اس اسکیم کے عملی پروگرام کو تیار کرنے کے لیے جو سب کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں پروفیسر عبد المجید قریشی، خان بہادر میاں افضل حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر ابو بکر احمد حلیم، پروفیسر ارسلان خاں شروانی، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اور سید الطاف علی بریلوی شریک تھے۔ اس کی بعض کمیٹیوں میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین، ڈاکٹر سر محمد عزیز الحق، بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق اور خواجہ غلام السیدین بھی شامل تھے۔ چونکہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انڈین اکاڈمی آف اسلامک ریسرچ کے کارکن مشترک تھے اس لیے مجلس مصنفین کو زیادہ وسعت دینے کا پروگرام ختم کر دیا گیا۔ صرف اس کا علمی مجلہ مصنف بدستور جاری رکھنا طے پایا۔ علی گڑھ کے نئے حالات کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں یہ بند ہوا۔ پہلا شمارہ فروری ۱۹۴۲ء میں نکلا تھا۔

حکیم صاحب نے کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی سے حصہ لیا۔ انڈین اکاڈمی آف اسلامک ریسرچ کے نام سے کانفرنس کے زیر اہتمام قائم کردہ اکاڈمی نے جو کام شروع کیے ان میں ایک تہافۃ الفلاسفہ بھی تھی۔ یہ امام غزالی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں انھوں نے فلاسفۂ قدیم کے ان نظریات کی جو اسلام کے اصول و عقائد کے خلاف ہیں تردید کی ہے۔ قدامت عالم پر فلاسفہ و متکلمین میں خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں بڑی بحثیں رہی ہیں۔ اس کتاب میں فلاسفہ کے نظریات کی تردید کی گئی ہے۔ انگریزی یا اردو میں اس کا ترجمہ نہیں تھا۔ شعبۂ فلسفہ

کے ایک ریسرچ اسکالر ابو القاسم محمد میاں فرنگی محلی نے پروفیسر میاں محمد شریف اور شفاء الملک حکیم عبد اللطیف کی نگرانی میں اس کا ترجمہ شروع کیا۔ کانفرنس کے دوسرے ریسرچ اسکالر صبیح احمد کمالی اس کے انگریزی ترجمہ پر مامور ہوئے۔ اور مصنف کی اطلاع کے مطابق ہر دو تراجم کافی مقدار میں ہو چکے تھے۔ اسی زمانہ میں امام غزالی کی دوسری کتاب مقاصد الفلاسفہ کا حیدر آباد میں ترجمہ ہوا تھا۔ علامہ شبلی نے بھی اس کا ترجمہ شروع کیا تھا مگر نہ معلوم کیوں چھوڑ دیا۔

تہافۃ الفلاسفہ کی طرح الجواہر الغالیہ کا بھی اکاڈمی نے ترجمہ کرانا شروع کیا۔ یہ کتاب مولانا عبد الحق خیر آبادی کا وہ کارنامہ ہے جس کی حلقۂ فلاسفین میں بڑی پذیرائی کی گئی ہے۔ اس میں مابعد الطبیعیات کے تمام اہم مسائل کے متعلق قابل ذکر فلاسفہ کے خیالات کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ کوئی مسئلہ تشنہ نہ رہنے پائے۔ اس میں عربی فلسفہ کے تمام اہم نکات اور مابعد الطبیعیاتی مسائل میں مسلمانوں کی ساری غور و فکر شامل ہے۔ اس کا بھی اردو یا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ کانفرنس اکاڈمی کے تیسرے ریسرچ اسکالر حیات خاں اس کے ترجمہ پر مامور ہوئے اور شفاء الملک حکیم عبد اللطیف اور پروفیسر میاں محمد شریف اس کے نگراں قرار پائے۔

"مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تنظیم جدید" کے عنوان سے سید الطاف علی بریلوی نے جو تجاویز پیش کیں ان میں حسب ایما حکیم صاحب ایک تجویز دوا خانہ کے قیام سے متعلق تھی۔ "مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کو ہندوستانی دوا خانہ دہلی کے طرز پر ایک مکمل تجارتی دوا خانہ قائم کرنا ہے۔ جس میں ہر قسم کے مفردات و مرکبات کا اسٹاک ہونے کے علاوہ خود اپنی ایجاد کردہ پیٹنٹ دواؤں کا بھی بڑا ذخیرہ ہونا چاہیے۔ اگر ہمارے طبیہ کالج نے مندرجہ بالا قسم کا اعلیٰ درجہ کا دوا خانہ قائم کر لیا تو کالج مذکور کے جملہ مصارف اس کی آمدنی سے پورے ہو جائیں گے۔ یہ کام اس لیے بھی اشد ضروری ہے کہ گورنمنٹ گرانٹ گھٹ جانے کی وجہ سے اس وقت طبیہ کالج بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔"

چنانچہ حکیم صاحب کی مساعی اور اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی توجہ سے یہ دوا خانہ قائم ہوا اور آج اس کا شمار ملک کے اہم و معتبر دواساز اداروں میں ہے۔ اس کے مرکبات کے نسخے جو حکیم صاحب کے تجویز کردہ ہیں اپنی افادیت اور زود اثری کی وجہ سے امتیاز رکھتے ہیں۔ حکیم حافظ محمد اسلم صدیقی نے اپنی تالیف "شفاء الملک نقوش و تاثرات" میں

کے قیام سے متعلق تفصیلات پیش کی ہیں[۴]

شفاء الملک کی مستقل تصانیف میں التحقیق المطلوب فی الماء المشروب مطبوعہ ۱۹۲۳ء (یہ رسالہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے رسالہ القول فی الماء المشروب کے جواب میں لکھا گیا ہے) تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال مطبوعہ ۱۹۲۵ء تاریخ طب مطبوعہ ۱۹۲۵ء ہماری سائنٹفک طب ں، مختصر تاریخ تشریح ومنافع وجراحت، ہماری طب میں ہندؤں ا کتاب النبض، کتاب الادویۃ القلبیۃ (ابن سینا کی کتاب کا اردو ترجمہ ‌نیمت مقدمہ) فلسفہ نبوت مطبوعہ ۱۹۲۵ء، مذہب اور لامذہبیت' رضیتہ، اور مولانا فضل حق خیرآبادی (جن سے مولانا فضل حق رامپوری ا ہدایت علی بریلوی دو واسطوں سے سلسلہ تلمذ قائم ہے) کی کتاب الجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود کا اردو ترجمہ الفوز المجود (غیر مطبوعہ) ہیں) طب میں ہندؤں کا ساجھا" پر سید الطاف علی بریلوی نے معنف کے ، میں لکھا تھا" آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نیے آنریری ، سکریٹری شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی ایک ذہین طباع دیب ہیں۔ آپ کی قریب ایک درجن چھوٹی بڑی تصانیف ہیں۔ ہندی بان ورسم الخط کا آج کل جو افسوس ناک و جارحانہ قضیہ درپیش ہے بے نتیجہ شور و غوغا کرنے کے بجائے آپ نے پنڈت سندر لال اور ڈاکٹر بھگوان ں ہندوستانی کلچر سوسائٹی کی تقلید میں اپنی تازہ تصنیف ہماری طب ندؤں کا ساجھا ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں متوازن کالموں ‌عل میں چھپوائی ہے۔ اس طریقہ طباعت کا یہ فائدہ ہوگا کہ ہندی یا رسم الخطوں سے قطعاً ناواقف لوگ ان کو بآسانی اور بہت جلد جائیں گے۔ نیز کسی بھی رسم الخط کے ساتھ ناانصافی کا محل باقی نہ ا۔ شفاء الملک صاحب کی رہنمائی سے علی گڑھ کی نیشنل پرنٹرس لی گڑھ نے بھی استفادہ کیا ہے، اور اس کا بچوں کا ماہوار رسالہ لک "دھنش" بھی اسی ماہ اپریل میں نہایت دیدہ زیب اور ، اردو متوازی رسم الخطوں میں شائع کیا جا رہا ہے، اس رسالے کی زبان م اور روزمرہ کی بول چال ہوگی۔ اس کی اڈیٹری کے لیے مشہور اہل قلم مربیگ سابق اسسٹنٹ اڈیٹر و اڈیٹر مدینہ بجنور، زمزم لاہور، منشور فتنہ اور صبح وطن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ حکیم صاحب کی کتاب اور رسالہ دھنک کا حسب دل خواہ خیر مقدم ہوا تو ارادہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر اس کام کو وسعت دی جائے"[۱۸]

حکیم صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مختلف طبی موضوعات پر کام کرنے کے لیے انھوں نے اپنے تلامذہ کو متوجہ کیا۔ ان سے کتابیں لکھوائیں اور خود ان پر مقدمے تحریر کیے۔ اس طرح ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے بعض اہم کتابیں شائع ہوئیں۔

اسلامیات ان کا بہت خاص موضوع تھا۔ قرآن وحدیث پر وہ عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر ماجدی پر ان کا تبصرہ فہم قرآنی کا آئینہ دار ہے[۴۹]۔ تبصرہ میں انھوں نے بعض باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور مولانا نے پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ حاشیہ میں ان کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔ "قرآن کریم کے محاورات" پر بھی ان کا ایک مضمون ندائے ملت میں شائع ہوا ہے[۵۰]۔ قرآن پر مولانا دریابادی کی اس سند کی طرح حدیث کے تعلق سے مولانا منظور نعمانی نے اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے۔ راقم سطور کی تالیف معارف الحدیث کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور میں اس کا نسخہ ہدیۃً ان کو بھیجتا تو عموماً ہفتہ عشرہ کے اندر اس کا مطالعہ فرما لیتے اور اس طرح غور سے مطالعہ فرماتے کہ کتابت وطباعت کی بعض اغلاط کی بھی نشاندہی فرما دیتے اور مجھے اپنے تاثرات لکھتے جو میرے لیے بڑے خوش کن ہوتے۔ ان کا اصرار کے ساتھ یہ بھی مشورہ تھا کہ جن صحابہ کرام کی روایات معارف الحدیث میں لی گئی ہیں ان سب کا مختصر تعارفی تذکرہ بہتر تو یہ تھا کہ ساتھ ہی ساتھ حاشیہ میں درج کر دیا جاتا لیکن اب جب کئی جلدیں بغیر اس کے شائع ہو چکی ہیں تو آخری جلد میں ایک ضمیمہ شامل کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔ میں نے حکیم صاحب کا یہ مشورہ قبول کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو عمل میں لانے کی توفیق عطا فرمائے"[۵۱]

عورتوں اور بچوں سے متعلق احادیث انھوں نے کتابی شکل میں مرتب کی ہیں اور اسے اپنی بیگم راضیہ کے نام پر "راضیہ مرضیہ" سے موسوم کیا ہے۔ بزرگان دین میں حضرت مجدد الف ثانی سے خاص طور پر متاثر تھے۔ سرہند

تا عمر یہ کا سلسلہ رہتا تھا۔ میاں اصغر حسین دیوبند سے بیعت تھے۔ مولانا مظفر الرحمن عثمانی اور مولانا شاہ وصی اللہ سے تجدید بیعت کی تھی۔ پنج وقتہ نماز باجماعت، روزہ، تراویح اور اوراد و وظائف کا اہتمام رہتا تھا۔

ملک کے تقریباً تمام طبی اداروں سے کسی نہ کسی درجہ میں ان کا تعلق تھا۔ وہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی منیجنگ کمیٹی کے ممبر بعد میں سکریٹری اور آخر میں صدر، آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج قرول باغ کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر پٹنہ طبیہ کالج کی ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر، جامعہ طبیہ دیوبند کی مجلس طبی کے صدر، نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے سلسلہ میں حکومت کی قائم کردہ ملکی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اور سری نگر طبیہ کالج کا قیام انہی کی کوششوں کا رہین منت تھا۔ علی گڑھ سے سبکدوشی کے بعد اگست ۱۹۶۳ء سے دسمبر ۱۹۶۴ء تک تقریباً سوا سال جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل اور اس کی گورننگ باڈی کے سکریٹری رہے۔

مرکزی وزارت صحت کی تمام اہم کمیٹیوں سے متعلق تھے۔ یونانی ایڈوائزری کمیٹی، پلاننگ کمیٹی، یونانی ایجوکیشن کمیٹی، فارماکوپیا کمیٹی، سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسین، اور دوسری سرکاری کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ سنٹرل کونسل آف ریسرچ ان انڈین میڈیسین اینڈ ہومیوپیتھی کی گورننگ باڈی، اکزیکیٹو کمیٹی اور جنرل کونسل کے ممبر اور اس کے یونانی ایڈوائزری کمیٹی کے چیرمین تھے۔ مرکزی حکومت کے علاوہ صوبائی حکومتوں نے بھی ہمیشہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بورڈ آف انڈین میڈیسین یوپی اور اس کی فیکلٹی کے ممبر، آیورویدک اینڈ طبی اکاڈمی یوپی کے ممبر، یوپی، کشمیر اور دوسرے صوبائی اور یونین پبلک سروس کمیشن کی تقرراتی کمیٹی کے ممبر، اسی طرح دوسرے اداروں کی انتخابی کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ سرکاری سطح پر ہمیشہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں حکومت برطانیہ نے انھیں شفاء الملک کا خطاب عطا کیا۔

ملک کی آزادی کے بعد دو صدور مملکت کے وہ اعزازی طبیب مقرر ہوئے۔ پہلی مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے صدر جمہوریہ بننے کے بعد اعزازی طبیب نامزد کیے گئے پھر وی وی گری کے عہد میں دوبارہ اس منصب پر فائز ہوئے اور آخر تک رہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے سینیر نائب صدر اور اس کے روح رواں تھے۔ پنجاب طبی کانفرنس، آندھرا پردیش طبی کانفرنس اور کشمیر طبی کانفرنس کے سالانہ جلسوں کی صدارت کی تھی، علم و ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے دلچسپیاں قائم تھیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری کے علاوہ جامعہ اردو علی گڑھ کے ٹرسٹ اور علی گڑھ نمائش کمیٹی کے برسوں ممبر رہے۔

اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہنے اور اپنی بات تسلیم کرانے کی ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ جس چیز کو وہ پیش کرتے تھے اس کے حق میں ایسے دلائل دیتے تھے کہ اس کی اہمیت سے انکار مشکل ہوتا تھا۔ طبیعت میں جرأت اور عالی حوصلگی بہت تھی۔ بڑی بڑی میٹنگوں میں کسی جھجک اور لحاظ سے بے پروا ہو کر بے دھڑک بولتے تھے۔ بارہا ایسے مواقع پر جہاں دوسروں کے لیے لب کشائی مشکل ہوتی تھی وہ پورے زور اور قوت سے بولتے تھے اور بالکل مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد طب یونانی کے نائب اور وکیل کی حیثیت سے انھیں ابھرنے کا موقع ملا اور انھوں نے سرکاری اور غیر سرکاری ہر جگہ اس کی وکالت اور اس کی طرف سے بولنے کا حق ادا کیا۔ پارلیمنٹ کی مشترکہ سلیکشن کمیٹی (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) کے سامنے ان کا بیان اور جوابات ان کی طبی فضیلت اور شان کے علاوہ ان کے بے باک مقرر ہونے کی بہترین مثال ہے، اس موقع پر یہ ناچیز بھی موجود تھا۔ مختلف ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے طب یونانی کے تعلق سے جو سوال کیے جا رہے تھے اس کے نہایت معقول و مسکت جوابات اس طرح دے رہے تھے کہ پوری میٹنگ میں ان کی شخصیت چھائی ہوئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے فن کا واقعی کوئی ایسا شخص بول رہا ہے جسے سند و اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔ اس موقع پر ایک لطیفہ یہ رہا کہ جنوبی ہند کے ایک ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ آپ کی زبان میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ حکیم صاحب نے برجستہ جواب دیا آپ ہی کی پشتو کونسی میری سمجھ میں آرہی ہے۔ اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ وہ ایک بہترین مقرر تھے اور اکثر کسی تیاری کے بغیر بولتے تھے بارہا ایسا ہوا کہ عین وقت پر کسی مخصوص موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی اور تقریر میں کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوا کہ چند منٹ قبل وہ اس سلسلہ میں بالکل خالی الذہن تھے۔ ایک ہی موضوع کی موافقت یا مخالفت میں ان کے پاس دلائل کی کمی نہیں ہوتی تھی۔

طبیعت کی جودت اور اپج تجویز نسخہ اور ترکیب دوا میں بھی نمایاں رہتی تھی۔ انھوں نے جہاں بعض مسائل مثلاً مزاج کافور، حرکت نبض، اختناق الرحم، وجع مفاصل، سدہ قلبیہ، نبات الاسنان وغیرہ میں مجتہدانہ نظر کی

متقدمین اطباء سے اختلاف کیا ہے وہاں علاج میں بھی الگ راہیں بنائی ہیں۔ ان کا نسخہ کتابی یا روایتی طرز کا نہیں ہوتا تھا، انتخاب اور حسن ترکیب کی عجیب شان پائی جاتی تھی۔ مزاج کی یہ خصوصیت تھی کہ کسی مسئلہ پر غور کے لیے بہت وقت صرف نہیں کرتے تھے۔ ایک برجستہ اور فکر آفریں ذہانت کے مالک۔ ان کا ذہن مسائل کی طرف ایک دم منتقل ہوتا تھا، بالکل چھلانگ لگانے والے انداز میں، اور ذہانت و روشنی طبع کے ساتھ یہ علم و تجربہ کا اثر تھا کہ ان کی یہ بے ساختگی اور ذہنی چھلانگ برسوں کے غور و فکر کا حاصل معلوم ہوتی تھی، اور اکثر حالات میں ان کا نشانہ صحیح ہوتا تھا۔ لوگوں سے تعلقات اور عام مسائل سے لیکر مرض کی تشخیص اور تجویز نسخہ تک میں یہ بات دیکھی جاتی تھی۔ اگر پہلی مرتبہ میں وہ مرض کی تشخیص نہیں کرسکے ہیں یا ان کا نسخہ کارگر نہیں ہوا ہے تو پھر کوشش کے باوجود مرض ان کے قابو میں نہیں آتا تھا، ذہانت کی جو مختلف قسمیں ہیں ان میں ایک قسم ذہن کی تیز منتقلی ہے۔ اس قسم کی ذہانت کے جہاں کچھ فائدے ہیں وہاں بعض نقصانات بھی ہیں اس کا مظاہرہ ان کی شخصیت میں دیکھنے میں آتا تھا۔ وہ بڑی امنگوں اور حوصلوں کے انسان تھے۔ ان کے ہاں پر جوش آرزومندی پائی جاتی تھی۔ جذبۂ شوق کی بے پناہ لگن جس میں سکون و قرار کی گنجائش نہ تھی۔

فلسفیانہ رنگ غالب تھا۔ تحریر و تقریر دونوں میں اس کی آمیزش رہتی تھی۔ اسی کے ساتھ بہت باغ و بہار اور شگفتہ مزاج تھے۔ بعض اوقات یہ فیصلہ دشوار ہوتا تھا کہ طبیعت میں مزاح و ظرافت کا عنصر زیادہ ہے یا علمی و فلسفیانہ رنگ غالب ہے۔ دراصل ہر موقع و محل کا انھیں لحاظ رہتا تھا۔ سنجیدہ علمی مباحث ہوں یا خالص فنی مسائل، علماء کی مجلس ہو یا بے تکلف احباب کی محفل۔ اس کے مطابق ان کی گفتگو ڈھلی ہوتی تھی اور جس موضوع پر اظہار کرتے تھے وہ دوسرے درجہ کی چیز نہیں معلوم ہوتی تھی۔

اودھ کے شرفاء کی روایات کے حامل تھے۔ جود و سخا، تواضع و مدارات، حق گوئی و بے باکی، علم کی عزت اور اہل کمال کی قدر دانی ان کے اوصاف گراں مایہ تھے۔ اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہ صرف علی گڑھ میں ان کا حلقہ احباب وسیع تھا بلکہ برصغیر ہند و پاک کے بیشتر اہل علم و اصحاب دانش سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ۱۹۶۴ء میں دہلی میں جب پہلا قلبی دورہ پڑا تو تیرتھ رام شاہ نرسنگ ہوم میں جہاں داخل تھے عیادت کرنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین (اس زمانہ میں نائب صدر تھے اور دو بار بغرض عیادت گئے تھے) حافظ محمد ابراہیم (پنجاب میں گورنر تھے اور خاص طور پر عیادت کے لیے دہلی آئے تھے)، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، کرنل بشیر حسین زیدی، مولانا ابواللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا محمد یوسف مرحوم امیر جماعت تبلیغی، محمد مسلم مدیر روزنامہ دعوت مولانا مفتی عتیق الرحمن، مولانا اسعد مدنی، مولانا قاضی سجاد حسین، مولانا عبدالدائم جلالی اور دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے بزرگ اساتذہ تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی سے بڑا تعلق تھا، ذاکر صاحب علی گڑھ کی وائس چانسلری سے قبل جب جامعہ سے علی گڑھ آتے تو حکیم صاحب سے ملنے ضرور جاتے۔ وائس چانسلری کے زمانہ میں بھی انھوں نے اس وضع کو نبھایا۔ اکثر مغرب بعد حکیم صاحب کی قیام گاہ عزیز جہاں منزل تشریف لے جاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل حکیم صاحب کے ہاں ہر ہفتہ مائدہ ہوتا تھا جس میں مخصوص احباب شریک ہوتے تھے۔ ذاکر صاحب بھی چند مرتبہ شرکت کر چکے تھے۔ جب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آئے تو مائدہ بند ہو چکا تھا۔ دریافت کیا اب مائدہ نہیں ہوتا، وہ تو اچھی چیز تھی، میں بھی شرکت کرتا۔ حکیم صاحب نے جواب دیا اب وہ احباب منتشر ہو گئے اس لیے مائدہ بھی بند ہو گیا۔ ذاکر صاحب جب بہار کے گورنر تھے تو ان کے اصرار پر ایک ہفتہ حکیم صاحب ان کے مہمان رہے تھے اور ذاکر صاحب نے بڑے تعلق سے فرائض میزبانی ادا کیے تھے۔ حکیم صاحب کے نام ذاکر صاحب کے تقریباً دو درجن خطوط راقم کے پاس محفوظ ہیں۔ جن سے بے تکلفانہ تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔ رشید صاحب کے مضامین اور خطوط میں انھی تعلق کے ساتھ تذکرہ ہے۔ علی گڑھ کے دوسرے دوستوں میں عبدالمجید قریشی، اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا سلیمان اشرف، مفتی شفیع فرنگی محلی، حمیدالدین خاں، محمد حاذق، پروفیسر عمرالدین، پروفیسر حفیظ الرحمن خاص تھے۔ مولانا حفظ الرحمن مرحوم سے تعلق کا یہ عالم تھا کہ حکیم صاحب خواہ علی گڑھ موجود ہوں یا نہ ہوں مگر مولانا ہمیشہ انہی کے دولت کدہ پر قیام فرماتے تھے۔ اور قدر و محبت کا عجیب معاملہ تھا۔

حکیم صاحب بہت لطیف اور نفیس ذوق جمال رکھتے تھے۔ گفتگو میں لطافت اور ادبیت کی چاشنی ہوتی تھی اسی لیے محفل میں مرکز نظر رہتے تھے۔ فلسفہ، طب اور اسلامیات کے علاوہ ان کا ایک پسندیدہ موضوع جنسیات تھا، جس پر وہ بلا تکلف بولتے تھے، مختلف پہلوؤں سے جنسی مسائل

اور جنسی الجھنوں کا جائزہ لیتے، اس کی نفسیاتی نزاکتوں، سماجی دشواریوں مذہبی ضابطوں اور علاجی نکتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے نازک مقامات سے اس طرح گزرتے کہ شائستگی کا کوئی پہلو ہاتھ سے نہ جاتا۔ حاضرین میں سے اگر کوئی صاحب نشانہ پر ہوتے یا کوئی زاہد خشک موجود ہوتا تو گل افشانی گفتار اور بڑھ جاتی۔ بعض وقت اس موضوع کو چھیڑ کر مقصد شیخ حرم کو تنگ کرنا بھی ہوتا تھا۔ ان کے ہاں عمر اور جنس کی تخصیص نہ تھی۔ آگے شبیر احمد صدیقی گھر کے دوست تھے نعمان کے بیٹے احسان صاحب سے بھی بے تکلفی کا وہی انداز تھا اور وہ ان کی مخصوص مجلسوں کے شریک تھے۔

بدنظمی برداشت نہیں تھی۔ کسی شخص کی الجھی ہوئی گفتگو یا بے اصولی حرکت پر بہت مکدر ہوتا تھا اور دیر تک طبیعت بدخط رہتی تھی۔ کھانے کا مذاق نہایت اعلیٰ تھا، اکثر مہمان نوازی رہتی۔ دوسروں کو مدعو کرکے خوش ہوتے اور اچھے کھانے کی داد دیتے۔ پان کے شوقین تھے۔ تیاری میں خاص اہتمام کرتے اس کے اجزاء کا تناسب اتنا نپا تلا ہوتا تھا کہ دوسرے کے ہاتھ کا پان پسند نہیں آتا تھا۔ ایک خاص لطف ولذت کے ساتھ پان نوش کرتے تھے۔ کسی مسئلہ پر غور وفکر کے وقت پان نوشی کی رفتار بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت خاص انداز میں خاموشی کے ساتھ پان چباتے اور گفتگو ناپسند ہوتی۔

علی گڑھ کے روایتی ماحول میں نشست وبرخاست کے آداب اور لباس کا جو اہتمام کیا جاتا ہے ان کی شخصیت اس کا آئینہ تھی۔ کپڑا ان پر سجتا تھا۔ بہت عمدہ شیروانی پہنتے تھے۔ اچھے سے اچھا درزی شیروانی سیتے ہوئے گھبراتا تھا۔ معمولی سا نقص فوراً پکڑ لیتے اور ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے کہ درزیوں کو حیرانی ہوتی۔ خوبصورت کسرتی بدن تھا۔ ورزش آخر تک ترک نہیں کی تھی، ورزش اور بنوٹ کا سلسلہ بچپن سے قائم رہا۔ رامپور میں استاد سہراب خاں کی شاگردی اختیار کی۔ علی گڑھ میں کلو پہلوان، تولا پہلوان اور حفیظ پہلوان سے اس فن کی باریکیوں پر عبور حاصل کیا۔ بنوٹ کی تکمیل استاد مصباح الدین رامپوری اور شاہ زور دار میاں کے ایک شاگرد سے کی تھی۔ ان کی قیام گاہ عزیز جہاں منزل میں ایک کمرہ میں باقاعدہ اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ جہاں مگدر اور دوسرا سامان پہلوانی رہتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ میں جرمنی کے مشہور پہلوان زبسکو اور رستم زماں گاماں پہلوان کی نمائش گراؤنڈ میں جو تاریخی کشتی ہوئی تھی اس میں وہ جج تھے۔ اس کشتی میں تقریباً ایک گھنٹہ کی پینترا بازی کے بعد گاماں جیتا تھا، علی گڑھ کا مشہور مالشیا نصیبا ان کی مالش کرتا تھا۔ نصیبا اس مسعود کا بھی مالشیا رہا ہے۔

فنون لطیفہ میں خطاطی موسیقی اور مصوری سے دلچسپی تھی۔ خوشنویسی میں خط نسخ کی اصلاح منشی حامد علی مرصع رقم اور نستعلیق کی اصلاح منشی محمود علی سے لی تھی، طب کی کتابوں میں بعض موسیقاری پر جب پہنچے تو تشفی نہیں ہوئی۔ پھر قانون کے علاوہ شرح آملی کا مطالعہ کیا تو اس میں بہت سی مصطلحات موسیقی پائیں۔ خیال ہوا کہ یہ فن سیکھے بغیر مسئلہ واضح نہیں ہو سکتا چنانچہ علی گڑھ میں استاد مولا بخش شاگرد رشید ظہور حسین نائک خورجہ سے دو سال تک اس فن کو حاصل کیا۔ پھر چند ماہ خواجہ محمد اشعیار سے تحصیل کی۔ ایک زمانہ میں مصوری کا بہت شوق رہا، سجاد صاحب آرٹسٹ مسلم یونیورسٹی سے مشورہ اور اصلاح لی۔ چند تصویریں بطور یادگار محفوظ ہیں۔ جن میں خود ان کی اپنی تیار کردہ تصویر بھی ہے جسے فوٹو سامنے رکھ کر بنایا تھا۔ شعر وشاعری سے اگرچہ ذوق نہ تھا مگر طبیعت موزوں پائی تھی۔ بعض موقعوں پر اردو کے علاوہ عربی میں بھی شعر کہے ہیں۔

۳ اور ۴ نومبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب ۲ بجے لکھنؤ میں بعارضہ قلب وفات پائی، مولانا منظور نعمانی نے غسل دیا۔ حاجی بلال میاں دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور جھوائی ٹولہ کے خاندانی قبرستان میں سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں دفن ہوئے، متعدد شعراء نے مرثیے اور قطعات وفات کہے۔ حکیم سید نور العین راغب کا ایک قطعہ ہے ؎

حکمت پناہ وقت صداقت مآب عصر
روپوش گشت حیف چو امروز زیر خاک

تاریخ انتقال بگو راغب حزیں
عبداللطیف خفتہ بجوار خدائے پاک
۱۳۹۰ھ

حواشی

لہ تذکرہ خاندان عزیزی مطبوعہ ۱۹۰۸ء لہ ان کے والد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی مولانا شبلی کے استاد تھے۔ اور ان کے چچا مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مصنف بشری سر سید کے استاد تھے۔ لہ مصنف قاموس المشاہیر، ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین، بدایوں لہ مصنف ستمبر ۱۹۴۳ء لہ مصنف اپریل ۱۹۴۰ء لہ مصنف اپریل ۱۹۲۸ء لہ کانفرنس گزٹ ۲۱ اپریل ۱۹۴۹ء لہ شفاء الملک نقوش وتاثرات مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۸۵ء لہ مصنف اپریل ۱۹۴۸ء لہ صدق جدید ۴ دسمبر ۱۹۷۰ء لہ ندائے ملت لکھنؤ ۱۸ ستمبر و ۲۲ ستمبر ۱۹۴۴ء لہ الفرقان فروری ۱۹۷۱ء

مولانا ضیاء احمد بدایونی

مالک رام

یوپی کا تاریخی شہر بدایوں کسی تفصیلی تعارف کا
اج نہیں ہے۔ یہ صدیوں تک علم وفضل اور رشد و
رایت کا مرکز رہا ہے اور اسے اسلامی عہد کی بے حد
رگزیدہ شخصیتوں کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔
ٹھارہویں صدی کے آغاز میں حضرت محمد بن ابوبکر
ـدیق کی نسل سے ایک صاحبِ علم بزرگ مولانا
جیہہ الدین اپنے خاندان سمیت سنبھل سے بدایوں
ئے، اور یہاں مولوی ٹولہ میں بس گئے۔ انہیں اسلاف
ں کمال احمد صاحب ہوئے ہیں، جن کی فارسی ادبیا
ور خطاطی میں مہارت بدایوں کے اہلِ علم حلقوں میں
ج بھی یاد کی جاتی ہے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے۔ بڑے
شفیع احمد محو شاگرد امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰ء)،
منجھلے، رفیع احمد عالی شاگرد تسلیم لکھنوی (ف. مئی
۱۹۱۱ء) اور مطیع احمد رخشاں شاگرد راشد علی ضیا
و منیر۔ رفیع احمد عالی وکیل عدالت تھے۔، اس حیثیت
سے مدتوں ضلع بدایوں کی تحصیل گنور میں مقیم رہے۔

وہ اپنے والد کی طرح فارسی کے، فاضل، اور
اردو و فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا ۱۹۳۴ء میں
انتقال ہوا۔

رفیع احمد عالی کی اولاد میں تین بیٹیوں کے علاوہ
تین بیٹے ہوئے، رضی احمد رضی اور ضیا احمد ضیا اور آفتاب
احمد جوہر۔ رضی پولس کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔ ان کے
کلام کا ایک مختصر انتخاب "لمعات" کے عنوان سے
شائع ہو چکا ہے۔ (علی گڑھ) انہوں نے ۱۹۳۹ء میں
رحلت کی۔ چھوٹے بھائی آفتاب احمد ڈسٹرکٹ جج
کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ بفضلہ
خوش و خرم بدایوں میں قیام ہے۔

ضیا احمد بروز جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (۱۸
ستمبر ۱۸۹۴ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پہلے دن سے
قوا کے کمزور منحنی تھے، اسی باعث اکثر بیمار رہتے تھے۔
ایک مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔
نانی نے منت مانی کہ بچہ ٹھیک ہو گیا، تو میں اسے
عربی پڑھا کر عالم و خادمِ دین بناؤں گی۔ خدا کی
قدرت کا کرشمہ کہ وہ بچہ جو ہر طرح کے علاج معالجے
سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، اس فعل کے بعد ایک معمولی
عطار کے ٹوٹکے سے تندرست ہو گیا۔

جب سنِ شعور کو پہنچے، تو نانی اماں کی منت کے
احترام میں بدایوں کے مشہور مدرسے شمس العلوم
میں بھیج دیے گئے، جہاں کا نصاب درسِ نظامی پر
مشتمل تھا۔ انہوں نے یہاں مولانا محب احمد قادری،

مولانا محمد ابراہیم قادری اور مولانا شاہ عبدالمقتدر (سجادہ نشین درگاہِ قادریہ) سے عربی پڑھی۔ عربی کے علاوہ اس مدرسے میں فارسی اور قرآن کی تعلیم پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہوکر انہوں نے حدیث کی سند اور اجازت مولانا سید یونس علی محدث بدایونی سے لی۔

شمس العلوم میں درسِ نظامی کی تکمیل تو ہوگئی؛ لیکن چونکہ وہ انگریزی سے بالکل نابلد تھے، اس لیے ان کے والد نے اب انہیں گورنمنٹ ہائی اسکول، بدایوں میں بھیج دیا۔ یہاں دسویں درجے تک تعلیم پانے کے بعد انہوں نے بریلی کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند حاصل کی، اور طلائی تمغہ انعام میں پایا۔ اس کے بعد چندے ملازمت کی اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا۔ اب انہوں نے ڈاکٹر زبید احمد صدر شعبۂ فارسی کی نگرانی میں "فارسی ادب در عہدِ اکبر" کے موضوع پر مقالہ مرتب کرنے کی تیاری شروع کی۔ لیکن ہنوز کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جگہ مل گئی اور یہ مقالے سے دست بردار ہوکر علی گڑھ چلے گئے۔ دو برس بعد ۱۹۲۹ء میں وہ دلی کالج، دلی میں بھی کوئی سال بھر تک ملازم رہے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مدرس (لیکچرر) بن کر علی گڑھ واپس چلے گئے۔ اصحابِ حل و عقد نے محسوس کیا کہ اپنی تعلیم کے پیشِ نظر یہ اردو کے بجائے فارسی کے شعبے کے لیے زیادہ موزوں رہیں گے، چنانچہ ان کا تبادلہ شعبۂ فارسی میں ہوگیا۔ وہ یہاں ۱۹۵۹ء تک بیشتر پہلے مدتوں ریڈر کی حیثیت سے کام کیا؛ ۱۹۵۹ء میں سبکدوشی سے کچھ پہلے پروفیسر اور صدرِ شعبہ بنا دیے گئے تھے۔

ملازمت سے الگ ہونے پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انہیں امیر خسرو پر تحقیقی کام کے لیے وظیفہ دیا۔ ۱۹۶۳ء میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) میں اردو لغت کی ترتیب و تدوین کے کام پر مقرر ہوگئے۔ سال بھر بعد یعنی ۱۹۶۴ء میں دلی یونیورسٹی نے انہیں اسی کام پر اپنے ہاں بلالیا۔ یہاں وہ ۱۹۷۱ء تک رہے۔ چونکہ اب بیمار بہت رہنے لگے تھے، خاص طور پر فشارِ دم کا پرانا عارضہ عود کر آیا تھا، اس لیے وہ معیاد ختم ہونے پر الگ ہوگئے۔ اس کے بعد بھی ان کا زیادہ قیام دلی میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے ساتھ رہا، اگرچہ علی گڑھ جاتے آتے رہتے تھے۔ علی گڑھ ہی میں تھے کہ ۴ر جولائی ۱۹۷۳ء کو انہیں فشارِ دم کے شدید حملے سے چکر آیا۔ ڈاکٹر نے پورے آرام کا مشورہ دیا۔ جب حالت اور خراب ہوگئی، تو اگلے دن (۵ جولائی) غفلت اور نیم بیہوشی کی حالت میں انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ تین دن تک یہی صورتِ حال رہی۔ ۸ر جولائی ۱۹۷۳ء علی الصباح تین بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اسی دن دوپہر کے وقت تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور انہیں یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ گویا علم و فضل کا وقار، شرافت و وضعداری، انکساری و خورد نوازی دفن ہوگئیں۔ جناب اظہر احمد کمالی کے قطعۂ تاریخ وفات کا مقطع ہے:

از سرِ اندوہ تربت پر لکھوں سالِ وفات
تاجدارِ علم و حکمت، بادشاہِ فکر و فن ۱۹۷۳ء

ان کا نکاح غالباً ۱۹۰۹ء میں بدایوں کے قدیم قاضیوں کے خاندان میں ______ قاضی منصور حسین وکیل کی چھوٹی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوا تھا۔ ان سے ایک بیٹی (بلقیس خاتون) اور پانچ بیٹے (حبیب احمد، رفیق احمد میکش، ظہیر احمد صدیقی، نصیر احمد صدیقی، معین احمد صدیقی) اپنی یادگار چھوڑے۔ سب بیٹے برسرِ روزگار اور خوش و خرم ہیں۔

ٹر ظہیر احمد صدیقی ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی دلی یونیورسٹی میں
پیر اور صدر شعبۂ اردو ہیں۔

ضیا صاحب نے شعر گوئی اپنے اسکول کے زمانے میں شروع
. شروع میں غزل کی طرف زیادہ میلان رہا لیکن اکبر الٰہ آبادی
ے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے مشورہ دیا کہ غزل گوئی بیکاری
مشغلہ ہے، اس سے بہتر ہے کہ مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۴)
طرح تاریخ اسلام کے مشہور اور سبق آموز واقعات کو نظم کیا
ئے۔ چنانچہ ان کا اس کے بعد کا کلام بیشتر اسی رنگ کی منظومات پر مشتمل
باقاعدہ تلمّذ کا تعلق کسی سے نہیں رہا۔ کبھی ضرورت پڑی
اپنے بڑے بھائی رضی بدایونی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔

سب ذیل تصنیفات ان سے یادگار ہیں ـــــ

(۱) قصائد مومن مع شرح (لکھنؤ ۱۹۲۵ء)؛ (۲) دیوانِ مومن
مع شرح (الٰہ آباد ۱۹۳۴ء) بعد کو اس کے دو اور اڈیشن شائع ہوئے
۱۹۴۴ء، ۱۹۵۰ء)؛ (۳) تذکارِ سلف (تاریخی منظومات کا انتخاب)؛
۱) کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ (علی گڑھ ۱۹۴۸ء)؛
) تجلیات (مجموعۂ نظم) (دلی ۱۹۵۳ء)؛ (۶) یادگارِ عالی (بدایونی
جس میں اپنے والد مرحوم کا کلام مع مقدمہ شائع کیا ہے؛ (،)
معات (علی گڑھ) اس میں اپنے برادرِ اکبر رضی بدایونی کا کلام
مع کیا ہے؛ (۸) قولِ سدید (علی گڑھ ۱۹۶۰ء) یہ محمود احمد
عباسی امروہوی کی کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" کا جواب
ہے؛ (۹) مکتوبات (دلی، ۱۹۶۰ء) ان خطوط کا انتخاب جو دوسرے
حضرات نے ان کے نام لکھے تھے؛ (۱۰) سخن زار (ساہتیہ اکاڈمی، نئی
دہلی ۱۹۶۸ء) فارسی شاعری کا انتخاب مع اردو ترجمہ؛ (۱۱) مباحث
رسائل (دلی، ۱۹۷۱ء) علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ؛ اس پر یوپی
اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپے کا انعام دیا تھا؛ (۱۲) جلوۂ حقیقت
دلی ۱۹۷۲ء)؛ مذہبی مضامین کا مجموعہ؛ (۱۳) مسالک و منازل
دلی ۱۹۷۵ء)؛ فارسی مقالاتِ ادبی و انتقادی۔ کچھ چیزیں،
خاص کر دیوان کا بیشتر حصہ، غیر مطبوعہ رہ گیا۔
پورے کلام کا مجموعہ نہیں چھپا۔ ضخیم کلیات یادگار چھوڑا ہے۔

زمانے کی روش بدل گئی، اب اس کے چھپنے کی کیا توقع ہے! اسی
سے مختلف اصنافِ سخن کا انتخاب پیش کر رہا ہوں۔

اسلام اور غلامی

اس عہدِ معدلت کا یہ قصہ ہے جب کہ تھا
کوفہ علیؓ کے ظلِ ہمایوں سے فیضیاب
وہ بادشاہ، نانِ جویں جس کا ناشتا
وہ شہریار، فرشِ زمیں جس کا رختِ خواب
جس کی زبان محفلِ حکمت میں دُر فشاں
جس کی حسام شورشِ ہیجا میں فتحیاب
حاصل تھا یہ اسی کو تقرب کہ پیار سے
کہتے تھے بوتراب، رسولِ فلک جناب
بازار ایک روز گئے، عید کے قریب
قنبر غلامِ خاص تھے حیدر کے ہم رکاب
دونوں کے پیرہن تھے زبس کہنہ و ردی
دو کپڑے اس جگہ لیے مولا نے انتخاب
ایک ان میں نسبتاً تھا نفیس اور قیمتی
اور دوسرا تھا نرخ میں کم اور خراب
اچھا جو تھا، وہ اُن کو دیا؛ خود بُرا لیا
ہر دم تھا بس کہ پیشِ نظر جادۂ صواب
قنبر نے عرض کی کہ جو بہتر لباس ہے
بہرِ نمازِ عید کریں زیبِ تن جناب
اصرار انتہا سے بڑھا جب رفیق کا
بولے کمالِ لطف و کرم سے یہ بوتراب
تم ہو ابھی جواں، ہے تجمّل روا تمہیں
میں پیر ہوں، بجا ہے تجمّل سے اجتناب
چھیڑا نہ خواجگی و غلامی کا تذکرہ
مطلب یہ تھا کہ آئے نہ اسے نہیں حجاب

محسن اسلام
(گاندھی جی)

اے وہ کہ تو نے جاں سی متاعِ عزیز کو
آزادیِ ضمیر پہ قربان کر دیا
اے وہ کہ تیرے خون کی ہر ایک بوند نے
ہندوستان میں امن کا ساماں کر دیا
اے وہ کہ تو نے معشرِ اسلام کے لیے
دشواریِ حیات کو آسان کر دیا
تیرے ہر ایک قطرۂ خون نے جہان میں
برپا سرشک و درد کا طوفان کر دیا
تھی تیرے دم سے پیکرِ مہر و وفا میں جان
قاتل نے کیا کیا، تجھے بیجان کر دیا
جشنِ وداد ہندو مسلم تھی تیری ذات
ہیہات، ظلم نے اسے ویران کر دیا
کیا نشۂ شرابِ تعصب تھا جس نے، آہ
انسان کو اس دیار میں حیوان کر دیا
"ہے چست حُریت کی قبا تن پہ ہند کے"
اس ستم شعار نے بُطلان کر دیا
بھارت کو تھی دلوں سے بلیدان کی طلب
جاں دے کے تو نے پیش بلیدان کر دیا
"مسلم کو بھی ہے جینے کا حق خاک ہند میں"
تو نے زبانِ زخم سے اعلان کر دیا
پھونکوں سے شمعِ دیں کو بجھانے چلے تھے جو
اس سعیِ بد پہ ان کو پشیمان کر دیا
چھایا تھا مسجدوں کی فضا پر جو ابرِ جور
وہ تو نے ایک دم میں پریشان کر دیا
بھولینگے اب نہ اہلِ وفا جس کو حشر تک
وہ امتِ رسول ؐ پہ احسان کر دیا
زیبا ہے تجھکو "محسن اسلام" کا لقب
حق نے یہ مرتبہ تجھے پہچان کر دیا

مرحوم کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بے محل نہیں ہوگا، اگر ان میں سے چند محفوظ کر دی جائیں۔ ؎

تاریخِ وفات سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی:

گئے خزانۂ ہستی سے حضرتِ دلگیر	نصیب گلشنِ فردوس میں قیام ہوا
جو گوش زد ہوا یہ حالِ غم سالِ ضیا!	تو فکرِ سال کا منظور اہتمام ہوا
کہا زُورے جمل یوں خرد نے سالِ وفات	کہ ملکِ علم و ادب، حیف بے نظام ہوا

(۱۳۵۲ = ۱۳۵۰ + ―――― ۲)

بوفاتِ فاضلِ بہروز شاعرِ مشہور حضرت احسن مارہروی مغفور:

۱۳۵۹ھ ――――

وہ جنابِ احسنِ مارہروی	خدمتِ شعر و ادب تھا جن کا کام
یاد آئینگی جب ان کی صحبتیں	تڑپیگا سینے میں قلبِ مستہام
عرض ہے حق سے کہ ان کی قبر پر	بارشِ بارانِ رحمت ہو مدام
ہے ضیا! گر فکرِ تاریخِ وفات	لکھ: "وصالِ شاعرِ شیریں کلام"

―――― (۱۳۵۹)

تاریخِ رحلت حضرت اخی و استاذی مولوی حاجی رضی احمد حسن رضی:

ہے حادثہ سخت بڑے بھائی کی رحلت	تفصیل کا یارا ہے زباں میں، نہ قلم میں
یاد آتے ہیں جب ان کے وہ الطاف فراواں	بندھ جاتی ہے اشکوں کی جھڑی جوشِ الم میں
مجھ کو بھی فنِ شعر میں حالی کا ہے رونا	حالی کی طرح حضرتِ استاد کے غم میں
تاریخ بھی رحلت کی، ضیا! ہے یہ دعا بھی	"مہمان ہوں" وہ دارِ جنستانِ ارم میں"

―――― (۱۳۵۸)

حبّی و مجبتی فاضلِ نبیل مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی:

وہ راغب، وہ عزیزِ مصرِ معنی	نہیں جن کا بدل ہندوستاں میں
ضیا! کہہ مصرعِ تاریخِ رحلت	یہ فرمائش تھی بزمِ دوستاں میں
جو نکلا مادہ میں نے سنایا	"گئے راغب گلستانِ جناں میں"

۵۰ ―――― (۱۹۹۸ - ۵۰ = ۱۹۴۸ء)

✻ ✻ ✻ ✻ ✻

؎ ہر ایک تاریخ کے ساتھ خاصا طویل قطعہ ہے، میں نے چند اشعار انتخاب کر لیے ہیں۔

مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی:

حضرت عبدالقدیر	ذی الفضائل، ذی کرم، ذی مرتبت
ت ہوگئے شوال میں	اس جہاں سے سوئے دارِ آخرت
یارب! ہو ان کے زیبِ فرق	تاجِ گلہائے ریاضِ مغفرت
تاریخ اس غم کی ضیا!	"انتقالِ عالمِ نیکو صفت"

(۱۳۶۹)

وفات ڈاکٹر ہادی حسن:

شیریں بیاں ہادی حسن	ناگہاں دو شش از قضا خاموش شد
شمعِ ایوانِ کمال	حیف، از بادِ فنا خاموش شد
سال از سرِ حسن و الم	طوطیِ گویائے ما خاموش شد

(۱۳۸۲ = ۱۳۷۳ + ۸)

تاریخیں نقل کروں۔ ان کی بیاض میں بے مبالغہ سیکڑوں ہیں۔ دوستوں کے ہاں ولادت، شادی، غمی کی، کسی کے رسید، کسی کی کتاب کی طباعت کی، ہر طرح کی تاریخیں ہیں۔ مرحوم ہت کرم فرماتے تھے۔ ان میں دو تاریخیں میرے متعلق بھی ہیں؛ شامل انتخاب کر رہا ہوں، تاکہ یادگار رہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہماری ٹی بشریٰ کی شادی ہوئی، تو انھوں نے تاریخ کہی:

عقدِ بشریٰ دخترِ مالک رام صاحب:

طوی ہمایونے نگراں	ہر غم است اندر ہجومِ عیش گم
بنشس خرد نوشاہ را	گفت: واللہ! بارک بشریٰ لکم

(۱۳۸۵)

۱۹۶ء میں میرے احباب نے تین جلد (اردو اور انگریزی) میں عزازی کتاب مرتب کی، جسے راشٹرپتی شری وی۔ وی گیری نے ایک خاص تقریب میں جو راشٹرپتی بھون میں منعقد ہوئی مجھے پیش کیا۔ اس موقع پر مرحوم نے تاریخ کہی:

تاریخ فنگاہ دادی "جشنِ مالک رام" بخدمت فاضل موصوف:

سپہرِ علم مالک	نگہ دار و حق از بیمِ زوالش
ارمغانِ۔۔۔ کہ اینک آمد	دلیلِ تازہ بر اوجِ کمالش

---

* اشارہ بہ کتاب "ارمغانِ مالک" (ضیا)

ہوا خواہاں زلبس و لشاد گشتند	بہ تشریفے کہ دادہ ذو الجلالش
بمن گفتہ سروش از روئے الہام	"ہمایوں بخت روشن فکر" سالش

(۱۹۷۱ = ۱۹۷۰ + ۱)

اب آخر میں چند شعر غزل کے بھی ملاحظہ ہوں:

صدقے اے عشق تصور! تری رنگینی کے	غلد زنگار رہے گوشہ مری تنہائی کا
حسنِ فطرت کا بہر رنگ نمایاں ہونا	کبھی سبزہ، تو کبھی گل خنداں ہونا
حسن پھر حسن ہی ہے، لاکھ خطا وار سہی	مجھ سے دیکھا نہ گیا ان کا پشیماں ہونا
میں ہوں، اندوہ ہے اور گوشۂ تنہائی ہے	وہ ہیں، اغیار ہیں، اور انجمن آرائی ہے

تمنا کا فنا ہونا ہے بر آنا تمنا کا	مجھے یہ سکون سستی ہے اثر معلوم ہوتی ہے
کہاں تھی دلکشی یہ جلوۂ حسن خود آرا میں	مری رنگینیِ ذوقِ نظر معلوم ہوتی ہے
نہیں کم مرگ سے حسرت بھی حیا تلخ کامی سے	وہ مشکل و شوار ہے دشوار تر معلوم ہوتی ہے
جنونِ سجدۂ پیہم کا اعجاز اے ضیا دیکھو	جبینِ شوق جزو سنگِ در معلوم ہوتی ہے

انوارِ تجلی کی، اللہ رے، نظر سوزی	بے پردہ ہیں اور پردہ ہے چشم تماشا ہے
یہ کشمکشِ ہستی سرمایۂ ہستی ہے	موجوں سے کہا بڑھ کر یوں ساحل دریا نے
وہ سامنے ہیں پھر بھی محرومِ تجلی ہوں	تصویرِ تحیر ہوں، نیرنگِ تماشا ہے

ہے وہی طور، وہی برقِ تجلی، لیکن	وشتِ ایمن میں نہیں موسیٰ عمراں کوئی
اب نہ وہ رنگ ہے غنچوں میں، نہ بو پھولوں میں	لے گیا ساتھ بہارِ چمنستاں کوئی

کھل ہی گیا سب رازِ دل ان کا
چشمِ سخن آرا کی زبانی
جان کی قیمت، عشق کی عظمت
میں نے نہ سمجھی، تم نے نہ جانی

مسز ممتاز جہاں حیدر

پروفیسر ثریا حسین

بیگم ممتاز جہاں حیدر کو علی گڑھ برادری میں "ممتاز آپا" کے نام
سے جانا جاتا رہا ہے۔ انھوں نے جس سکوت اور گوشہ گیری
ے ساتھ اپنی زندگی کے آخری ایام گذارے۔ اسی میں وہ ۵ جنوری
۱۹۸ء کی سہ پہر ہم سے رخصت ہو گئیں۔ علی گڑھ ہی ان کی جنم
ھومی تھی جہاں وہ محلّہ رسل گنج کے ایک مکان میں پیدا
ہوئی تھیں۔ یہی وہ سال تھا جب ان کے والدین کا خواب
شرمندہ تعبیر ہوا وہ بانیٔ تعلیم نسواں ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ
ی تیسری صاحبزادی تھیں اور گھر میں سنجھلی کہلاتی تھیں۔
ن کی تعلیم کی ابتدا، ان کے والدین کے قائم کردہ اُس مدرسہ
سے ہوئی جو مسلمان لڑکیوں کے لیے کھولا گیا تھا۔ ازابیلا تھوبرن
ا لج لکھنؤ سے انھوں نے بی اے اور ایم اے کیا۔ فارغ
لتحصیل ہونے کے بعد ۱۹۲۹ء وہ اپنے والدین کے قائم کردہ
مدرسہ تعلیم نسواں کے اسٹاف میں شامل ہو گئیں۔ ۱۹۳۴ء میں
ن کی شادی مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ کیمسٹری کے استاد جناب
رنل ایم حیدر خاں سے ہو گئی۔ جو بعد کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے قائم مقام وائس چانسلر بھی تھے۔

اپنی والدہ کی طرح ممتاز آپا نے بھی شادی اور مدرسہ
ی ذمہ داریوں کو یکساں نبھایا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ گرلز کالج کی پرنسپل
مقرر ہوئیں اس وقت بی اے میں صرف پانچ لڑکیاں داخل
ہوئی تھیں۔ اُن کی انتھک اور بے لوث کاوشوں کے نتیجہ میں
لڑکیوں کا یہ کالج ترقی کی منازل پر پہنچ سکا۔ بی اے
میں سائنس کورسز انھیں کی قیادت میں شروع ہوئے ساتھ
ہی ساتھ طالبات ایم۔ اے نیز ایم ایس۔ سی کے لیے یونیورسٹی
میں شریک ہونے لگیں۔

میں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی ایام سے دور ملازمت
تک انھیں مختلف اوقات میں دیکھا ہے جہاں وہ نئے
انداز اور نئے روپ میں نظر آتی تھیں۔ طالبات اور
کالج سے متعلق ہزاروں ایسے واقعات آج بھی کارزار
حیات میں طمانیت عطا کرنے کو کافی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنس کالج عورتوں کا ایک
ایسا کالج تھا جس کی اہمیت و قیمت کا اعتراف غیروں نے
بھی کیا ہے۔ لیکن اس چمن زار کی سینچائی میں جس ہستی نے
دامے درمے سخنے اپنا سب کچھ لگا دیا ان میں ممتاز آپا کا
نام لیا جاتا ہے۔

ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے جب ملک کی تقسیم کے وقت
کالج اندیشوں کی بدلی میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے پُرآشوب
اور اندوہناک دور کا مقابلہ انہوں نے جس ہمت اور بہادری
کے ساتھ کیا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے یہ وہ وقت تھا جب
بڑے بڑوں کے پتے پانی ہو رہے تھے۔ مگر یہ نازک اندام

لیکن بہادر عورت جس نے اولوالعزمی اور حوصلہ کا عطیۂ والدین سے حاصل کیا تھا نہایت اعتماد اور مضبوطی کے ساتھ اس ہمت شکن زمانہ میں گرلز کالج کی حفاظت اور بقار کی سعی میں مصروف رہیں۔ لڑکیاں اور اساتذہ جوق در جوق پاکستان جا رہی تھیں نئے داخلے بہت کم ہو رہے تھے۔ ان حالات میں ممتاز آپا کالج کی ترقی کے منصوبے برابر بنا رہی تھیں۔ ان جیسے امید پرست اور متوازن لوگ دنیا میں کم ہی ملتے ہیں۔

ممتاز آپا سے متعلق یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ طالبات کی تربیت میں درجہ بدرجہ مختلف سلوک روا رکھتی تھیں۔ کہیں وہ پیار و محبت اور نرمی کا رویہ اختیار کرتیں کہیں ڈانٹ پھٹکار اور سخت گیری۔ مگر تمام رویوں میں شفقت اور محبت کا دریا موجزن رہتا۔ ہم لوگ ان کے رعب کے باعث ڈرتے بھی تھے۔

۱۹۴۹ء میں جب ستمبر میں یونیورسٹی کھلی اور میں اپنے وطن سے علی گڑھ آئی اور حسب معمول کالج بھی گئی۔ پرنسپل آفس کے سامنے لان میں اپنی سہیلیوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھی (پرنسپل آفس اس وقت وہاں تھا جہاں آج عبداللہ ہال کا پرووسٹ آفس ہے) کہ دفعتاً چپراسی نے آکر کہا کہ ممتاز آپا آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ میں ڈرتے ڈرتے چک اٹھا کر ان کے آفس میں پہنچی۔ ممتاز آپا مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئیں گلے سے لگایا اور کرسی گھسیٹ کر پاس بٹھایا گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔ اور میں حیرت میں ڈوبی انھیں دیکھتی رہ گئی کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کل تک تو وہ میری شرارتوں کے باعث مجھے ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی تھیں اور کہاں آج؟ ــــ انھوں نے میری حیرانی کو بھانپ لیا۔ زیر لب تبسم کے ساتھ بولیں کہ تم سے میں بہت خوش ہوں۔ بابا کے خواب کی تعبیر کے لیے تم نے جو کچھ کیا اس کے چرچے میرے لیے باعث مسرت ہیں۔ تم نے ایم اے میں فرسٹ آکر اس کالج کا نام روشن کیا ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ رشید صاحب نے بھی ان سے میری خاص تعریفیں کی تھیں کہ سید سلیمان ندوی جیسے عالم نے نوے فیصد نمبر دیے اور دیگر ممتحن بھی معترف تھے ــــ ممتاز آپا کی اس گفتگو سے مجھے یہ لگا کہ انھوں نے ایک پرنسپل کی جگہ سمجھدار ماں کا روپ اختیار کر لیا ہے جو انفرادی طور پر بچے بچے سے متعلق معلومات رکھتی تھیں۔ اور دیگر لوگوں سے بھی دریافت کرتی تھیں۔ پھر وہ اردو کے متعلق گفتگو کرتی رہیں اور یہ بتایا کہ سلیمہ سلطانی پاکستان روانہ ہوگئیں۔ سلمیٰ شان الحق اور بسم اللہ نیاز احمد نے بھی ترک وطن کر لیا ہے جب پڑھانے والے ہی ہجرت پہ آمادہ ہوں تو یہاں اردو کس طرح زندہ رہ سکتی ہے؟ ــــ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے تمہیں آگے بڑھنا ہوگا۔ طالبات میں اس کے ادب اور سرمایہ سے دلچسپی کے لیے تم جیسی استانیوں کی ضرورت ہے تم آج ہی گرلز کالج کا شعبۂ اردو جوائن کرلو۔

۱۹۴۹ء سے ستمبر ۱۹۷۰ء تک ممتاز آپا کا میرا ساتھ رہا۔ اور میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی طالبات کے علاوہ نوجوان اساتذہ سے بھی خاصی قریب تھیں۔ ہر موضوع پر آزادانہ گفتگو کرتیں۔ شادی بیاہ، گھریلو مسائل اور بچوں میں دلچسپی لیتیں۔ ان کے ذاتی مسائل کے حل کرنے میں کوشاں رہتیں۔

تعلیم کے میدان میں عورتوں کی پیش رفت حوصلہ ــــ اور جرأت کی بات ہے کیونکہ وہ صرف بیرونی حالات کے مسائل سے دوچار نہیں ہوتیں۔ گھریلو اور اندرونی الجھنیں، مخفی ان کی ترقی کی راہ میں کبھی کبھی مزاحم بن جاتے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ عورتوں کے ان مسائل پر بھی دلچسپی کا اظہار کیا جائے۔ اس بات کا ممتاز آپا کو بخوبی اندازہ تھا۔ مجھے اپنی شادی کا واقعہ یاد آرہا ہے جب انھیں یہ خوش خبری ملی تو انھوں نے دریافت کیا کہ شادی نشور میں ہوگی اور علی گڑھ عصرانہ کہاں ہوگا۔ میں نے بتایا یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں؟ سن کر چیں بہ جبیں ہوگئیں۔ کہ بھلا ہماری لڑکی ہوکر ایسی بیگانگی کا رویہ؟ پھر عصرانہ عبداللہ لاج ہی میں ہوا۔ بابا میاں جناب ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ کے اصرار پر یہ تقریب عبداللہ لاج کے سبزہ پر منعقد ہوئی۔ جس میں ممتاز آپا نے بڑی بہن کی طرح جس

جوشی اور خلوص کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس
سرت آج بھی میرے دل میں محفوظ ہے
وہ زندگی کے ہر شعبے میں عورتوں کی ترقی کی خواہاں تھیں۔
ی اس بات کا احساس تھا کہ عورت اگر چاہے تو دنیا کے ہر میدان
آگے بڑھ سکتی ہے۔ چنانچہ صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ اور دیگر مشاغل
ں کو د EXTRA CARRICULAR ACTIVITIES میں وہ چاہتی
ں کہ طالبات بھرپور حصہ لیں۔ چنانچہ جب میں نے یونیورسٹی اسٹاف
ب میں بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا تو وہ خاص مسرور ہوئیں۔
ے فرنچ میں ڈپلوما حاصل کرنے پر انھوں نے عام سہیلیوں کے
نے میری تعریفیں کیں اور محنت و لگن کے ساتھ سب کو آگے
ھنے کے لیے کہا۔

ممتاز آپا کی ذات ہمارے لیے مشعل راہ تھی ان کی سرگرمیاں
صلاحیتیں ہمیں آگے بڑھنے کے لیے اکساتی تھیں ــــ وہ اکیڈمک
ل کی ممبر، ایگزیکٹو کونسل کی اور کورٹ کی ممبر ہوئیں۔ یورپ
ریکہ کی سیاحت کی جس کے تاثرات کے بیکراں سرمایہ سے ہم
نے استفادہ کیا تھا۔ ان کی گفتگو اور عمل سے ہم طالبات
رہتے اور زندگی میں آگے بڑھنے نیز کچھ کرنے کا جذبہ ہمیں
اتا اور ہم میں سے کسی کو اگر اپنی کوشش میں ذرا سی بھی کامیابی
ی تو ممتاز آپا ہمت افزائی میں کمی نہ کرتیں ــــــــ
۱۹ ء فرنچ گورنمنٹ کا اسکالرشپ ملا تو وہ بہت خوش ہوئیں
فرانز ایک اردو کے استاد نیز ایک عورت کو ملا یہ بات ممتاز آپا
سرور کرنے کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے اس کے لیے میری بہت
ہمت افزائی کی اور انھیں کی جگائی ہوئی جوت تھی جس نے مجھے
دن ملکِ تعلیم کی راہ میں آنے والی ہر دشواری کے اندھیروں
محفوظ رکھا۔

ممتاز آپا ایک ترقی پسند اور روشن خیال خاتون تھیں۔ تعلیم
میدان میں انھوں نے جو نمایاں کوشش کیں اور درس و تدریس
مسائل کو حل کیا اس کے لیے زمانہ ان کا معترف تھا ــــ اسی لیے
ا میں جب اکسفورڈ میں کامن ویلتھ یونیورسٹیوں کی کانفرنس ہوئی
تو ممتاز آپا وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی
نمائندگی کی۔ ۱۹۵۰ء میں خیرسگالی مشن کے ایک معزز رکن کی حیثیت سے
انھوں نے چین کا دورہ بھی کیا۔ امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں فورڈ
فاؤنڈیشن کے ذریعہ پیش کردہ جنرل ایجوکیشن ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے
بھی گئی تھیں۔

ویمینس کالج کی طالبات یا اساتذہ اگر کوئی امتیاز حاصل کرتیں تو ممتاز
آپا بڑی خوش ہوتیں۔ ۱۹۶۰ء میں پیرس سے واپس کے بعد
مجھے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پوسٹ گریجویٹ کلاس لینے کے
لیے بلایا گیا۔ اس زمانہ میں جذبی صاحب چھٹی پر گئے تھے۔ اسی
پر انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ بڑی خوشخبری ہے کہ میری ساتھی اساتذہ
میں تم پہلی خاتون ہو جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ
کلاس پڑھانے جا رہی ہو۔ لیکن یاد رکھو تم پہل کر رہی ہو اور اس میں
اس مادرِ درسگاہ کے مشاغل اور تعلیمی سرگرمیاں پس پشت نہ پڑ جائیں
دیر تک مجھے نصیحت کرتی رہیں۔ پھر جب میں نے پوسٹ گریجویٹ
کلاس لینی شروع کی جس میں شہریار بھی شامل تھے مجھے اس ماہرِ تعلیم
خاتون کے مشورے قدم قدم پر رہنمائی کرتے۔

ممتاز آپا اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد سے آخر تک شیخ عبداللہ مرحوم
کی قائم کردہ "فیمل ایجوکیشن" کے معاملات کی نگرانی کرتی رہیں۔
جس کا دفتر عبداللہ ہال میں ہے۔ انھوں نے اپنی تینتیس سالہ (۱۹۳۷ء
تا ۱۹۷۰ء) کی پرنسپل کے دوران شدید قسم کی مصروفیات اور فرائض
منصبی ادا کیے۔ ان فرائض سے سبکدوشی نے ان کو ایسے گہرے احساس
میں مبتلا کر دیا کہ شاید دنیا کو اب ان کی ضرورت نہیں۔ میں جب
اکتوبر ۱۹۷۲ء میں ایران سے لوٹی تو ان کو ایک مختلف ہستی پایا۔
وہ دفعتاً اپنی عمر سے زیادہ ضعیف لگنے لگتی تھیں اور خاموشی
کر لی تھی۔ میرے لیے صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی کیونکہ
میں نے ان کو ہمیشہ شگفتہ، عمل پسند فعال اور مختلف سرگرمیوں
میں مصروف اور منہمک دیکھا تھا۔ اب وہ ریٹائرمنٹ کے
بعد گوشہ نشین، اپنی بدلتی ہوئی حیثیت پر افسردہ! مجھے یقین
ہے کہ انھیں اعزازی طور پر کسی نہ کسی اہم تعلیمی و سماجی خدمت میں

مصروف رکھا جاتا تو زندگی کا دورِ آخر ان کے لیے خوشگوار ہوتا۔ اگر ان کے وسیع تجربہ اور علم سے استفادہ حاصل کیا جاتا تو انھیں یہ ہرگز محسوس نہ ہوتا کہ خود علی گڑھ کو اب ان کی ضرورت نہیں۔

کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم رسمی تعزیت کے جلسے اور ریزو لیوشن پیش کرنے کے بجائے ملک کی بچیوں کو ممتاز جہاں جیسی بزرگ ہستیوں کی درخشاں زندگی کی مثال پیش کریں جنھوں نے اپنی عمریں طبقۂ نسواں کی بے لوث خدمت میں صرف کر دیں؟ ممتاز جہاں کبھی لیڈر نہیں بنی مگر ان کی شاگردوں میں عابدہ احمد اور محسنہ قدوائی شامل ہیں۔ ان کی تربیت کی ہوئی اولڈ گرلز آج بھی برصغیر ہند و پاک اور بیرونی ممالک میں مختلف حیثیتوں سے مادر علمی کا نام روشن کر رہی ہیں۔

مگر مجھے پچھلے چند برس یاد آتے ہیں جب میں شام کو کبھی عبداللہ لاج جاتی تو وہ خود پچھلے برآمدہ میں خاموش اور تنہا بیٹھی ملتی تھیں تب مجھے خیال آتا کہ عبداللہ لاج نے ممتاز جہاں حیدر کے پرمسرت اور ولولہ خیز دور دیکھے ہیں۔ اور اب یونیورسٹی قبرستان میں اپنے شوہر پروفیسر ایم حیدر خاں کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا!

(اقبال)

شیخ عبداللہ

پروفیسر آل احمد سرور

اکتوبر ۱۹۵۲ء کی ایک شام ہے۔ ایس۔ پی کالج سرینگر کے ہال کے باہر کوئی پچیس تیس آدمیوں کا مجمع ہے جس میں اسد اللہ کاظمی، خواجہ غلام السیدین، جیالال کول محمد یونس اور اُن کی بیوی راج، شہر کے کچھ ادیب اور کالج کے کچھ طلباء، لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک اُستاد اور اردو کے ایک ادیب کا توسیعی لکچر سننے کے لیے جمع ہیں اس مجمع میں ایک وزیر اعظم بھی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اب مجمع خاصا ہو گیا اور لکچر کا وقت بھی ہو چلا ہے تو وہ سب سے کہتا ہے۔ چلو بھئی اندر چلیں۔ اب دیر نہ کرنا چاہیے۔ یہ وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ ہیں (اُس وقت ریاست کے وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کہا جاتا تھا) اور لکچر میرا ہونے والا ہے۔

تین توسیعی لکچر تھے تینوں میں شیخ صاحب موجود رہے آخری لکچر کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ کل آپ اقبال پر ایک لکچر اور دے دیجئے۔ میں نے عذر کیا کہ لکچر لکھنے کا وقت نہیں ہے۔ ہاں آپ فرمائیں تو زبانی جو باتیں ذہن میں ہیں عرض کر سکتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا میں یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے اقبال کے فکر و فن پر تقریباً ایک گھنٹے تقریر کی اور اقبال کے اشعار سے اپنی بات کو واضح کیا۔ شیخ صاحب ایک وجد و کیف کے عالم میں تقریر سُنتے رہے۔ اُس کے بعد اُنہیں کسی سرکاری تقریب میں جانا تھا۔ مگر مجھے بھی ساتھ لیتے گئے اور دیر تک باتیں کیں۔

شیخ صاحب کی شہرت تو ۱۹۳۲ء سے میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق اور غلام محمد چکن علی گڑھ میں میرے معاصر تھے اور ان سے خاصا ربط و ضبط تھا۔ وہ بڑی محبت اور عقیدت سے شیخ صاحب کے قصے سنایا کرتے تھے۔ شیخ صاحب ۱۹۲۹ء میں ہی علی گڑھ سے ایم۔ ایس۔ سی کر کے سرینگر واپس ہوئے تھے۔ جب ۱۹۳۲ء میں کشمیر کی سیر کا اتفاق ہوا تو سرینگر اور وادی میں شیر کشمیر کے نعرے سنے۔ ایک رات کو ہماری دعوت ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کے یہاں تھی۔ یہ امیرا کدل میں رہتے تھے۔ وہاں پہنچے تو عورتیں کوئی گیت گا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کچھ دیر کے بعد شیخ صاحب آنے والے ہیں۔ اُن کے خیر مقدم کے لیے یہ گیت گائے جا رہے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں پھر کشمیر آیا۔ اب کے قیام خواجہ غلام السیدین صاحب کے یہاں تھا۔ اُن سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا ہے۔ جواہر لال نہرو شیخ صاحب سے بڑی محبت کرتے ہیں شیخ صاحب کو کشمیر کی تعلیم سے بہت دلچسپی ہے اور حکومت سے اختلاف کے باوجود وہ سیدین صاحب کی تعلیمی میدان میں کوششوں کو سراہتے ہیں اور کشمیری پنڈتوں کے ایک حلقہ سے سیدین صاحب کی مخالفت پر اُن کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہیں۔

میں نے شیخ صاحب کو ۱۹۴۵ء میں دیکھا جب وہ جواہر لال نہرو کے ساتھ پی۔ ای۔ این (P.E.N) کانفرنس میں جے پور تشریف لائے۔ اُس کے بعد ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر، جب مسز نائیڈو نے جو چانسلر

تھیں، جواہر لال نہرو، ذاکر حسین، ہومی بھابھا اور شیخ صاحب
کو یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری دی۔ مگر پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء
میں ہوئی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر
تھے۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کا ریڈر تھا۔ ذاکر صاحب
سے گہرے مراسم تھے۔ اُن کا تار آیا کہ جلد علی گڑھ پہنچو۔
میں گیا تو بتایا کہ شیخ صاحب کشمیر میں نئے ڈائرکٹر تعلیم کے
نام پر غور کر رہے ہیں۔ مجھ سے کہا ہے کہ کوئی اچھا آدمی بتاؤ۔
میں نے تمہارا نام تجویز کیا ہے۔ تم دہلی جاکر اُن سے ملو۔ یہ
خیال رکھنا کہ ڈائرکٹر کے تقرر میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ فی الحال
ایک نیا کالج کھلنے والا ہے جس کا نام ہے امر سنگھ کالج ——
اُس کی پرنسپلی کا سوال ہے۔ غالباً فوری بات اسی جگہ کے
لیے ہوگی۔ بہرحال میں دہلی پہنچا۔ اطلاع کرائی۔ شیخ صاحب
کے پاس اس وقت شاہ میری صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔
کوئی گھنٹہ بھر بات ہوئی۔ شیخ صاحب نے صاف کہا کہ فی الحال
آپ پرنسپل کے عہدے پر آجائیے۔ ڈائرکٹر کا مسئلہ ابھی
زیر غور ہے۔ اِس ملاقات میں اندازہ ہوا کہ شیخ صاحب تعلیمی
مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کو خاص اہمیت دیتے ہیں
ریاست میں سارے ملک سے اچھے آدمی جمع کرنا چاہتے ہیں
آسماں سے بات نہیں کرتے۔ دوسرے کی بات غور سے سنتے
ہیں۔ رائے دو ٹوک دیتے ہیں۔ شخصیت میں ایک دل نوازی
ہے۔ میں جلد فیصلہ کرنے کا وعدہ کر کے علی گڑھ واپس
آگیا اور ذاکر صاحب کو روداد سنائی۔ چند روز کے بعد
تقرر کا پروانہ بھی آگیا مگر میں نے بالآخر یونیورسٹی کو چھوڑ کر
ایک کالج کی پرنسپلی پر جانا مناسب خیال نہ کیا اور ——
معذرت کر دی۔

اس واقعہ کے دو سال بعد اکتوبر ۱۹۵۲ء میں میرے
توسیعی لکچر سرینگر میں ہوئے۔ ان کی طرف شروع میں اشارہ
کیا جا چکا ہے۔ جب ریڈیو کشمیر قائم ہوا تو شیخ صاحب نے
اس موقع کے لیے مجھ سے ایک پیام مانگا۔ میں نے "نگار
جنتِ کشمیر" کے نام سے ایک نظم لکھی اور اُن کی خدمت
میں بھیج دی۔ نظم کی رسید تو آئی مگر خلافِ توقع اِس میں
نظم پر کوئی تبصرہ نہ تھا۔ صرف یہ اطلاع تھی کہ یہ خدمت اخبار
کو دے دی گئی ہے۔ شاید اس نظم کا یہاں نقل کرنا نامناسب
نہ ہو —

نگارِ جنتِ کشمیر مجھ سے قولِ عرفی سن
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
ہر اک تاریک گھر کو تیری کرنوں کی ضرورت ہے
ابھی ہندوستاں میں عام ہے خوئے گراں خوابی
معاذ اللہ مرے رندوں کے سینوں کی یہ بے نوری
تعالی اللہ تیرے شیخ و برہمن کی جگر تابی
شمیم روح پرور تیری بادِ صبح گاہی میں
نظر افروز تیرے لالۂ صحرا کی شادابی
نہ جانے کتنے صحراؤں کی قسمت جاگ اٹھے اس سے
سنبھال اس کو بڑی دولت ہے تیرا اشکِ عنابی
خلل آیا ہے بزمِ خواجگی کے خواب نوشیں میں
تری جوئے کہستاں میں ہے وہ طغیانِ بے تابی
جھلکتی ہیں کہیں پل بھر کو مہر و ماہ کی آنکھیں
ازل سے دیدۂ بینا کی قسمت میں ہے بے خوابی
اٹھا تیشہ کہ ہر سنگِ گراں ہو جوئے شیر آمدے
ہے مردوں کے لیے اک تازیانہ یہ کم آبی
عروسِ وادیِ گنگ و جمن ہے محوِ آرائش
اسی پر زیب دیتی ہے ترے گوہر کی خوش آبی

(جون ۱۹۵۲ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ صاحب کے مرکز سے
اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ اگست ۱۹۵۳ء
میں اُن کی اسیری کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اقبالؔ سے شیخ صاحب کی عقیدت تو مشہور ہے

جب وہ اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے تو علامہ سے اُن کی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ تحریک حریت کشمیر میں اُن کی ولولہ انگیز تقریریں اکثر اقبال کے اشعار سے شروع ہوتی تھیں — انہوں نے اقبال کے حسب ذیل اشعار اکثر پڑھے ہیں اور اُن کی بدولت ہزاروں کے مجمع کو گرمایا ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

فرمانِ خدا فرشتوں کے نام، وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں کلچرل اکیڈمی کی ایک تقریب میں حاضرین کے اصرار پر انہوں نے یہ نظم پھر سُنائی تھی۔ آواز میں قدرتی لحن تھا، اور یہ دلوں میں اتر کر جذبات میں طوفان برپا کر دیتی تھی۔ اقبال کے علاوہ جوش، حفیظ اور فیض سے شیخ صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ جوش نے ایک نظم بھی شیخ صاحب کے متعلق لکھی ہے جس میں دُنیا جہان کے شیوخ سے بیزاری کا اعلان کرنے کے بعد کہتے ہیں ؎

لیکن اِک شیخ سے محبت ہے
شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ

فیض کا تو نکاح انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔ چند سال ہوئے فیض ہندوستان آئے تھے تو شیخ صاحب انہیں کشمیر بُلانا چاہتے تھے مگر کچھ مجبوریوں کی بنا پر وہ نہ آسکے۔ فیض کو اس کا اب تک افسوس ہے۔

شیخ صاحب کے نام اقبال کا ایک خط بھی کلچرل اکیڈمی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انتقال سے کچھ پہلے شیخ صاحب کی دعوت پر اقبال نے کشمیر آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر علالت کی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ شیخ صاحب کہتے تھے کہ اقبال نے ہی انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ مسلم کانفرنس کے دائرۂ کار کو وسیع کر کے اس میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا جائے۔ گویا نیشنل کانفرنس کے خیال کی تحریک انہیں اقبال سے ملی تھی۔ شیخ صاحب اپنی اکثر تقریروں میں اقبال کے فلسفۂ خودی کا ذکر کرتے تھے اور انہوں نے کشمیریوں کو خود شناسی اور خود اعتمادی کا جو درس دیا وہ اقبال کی فکر کا ہی عطیہ ہے۔ اقبال سے شیخ صاحب کی عقیدت و محبت کا ایک بہت اہم مظاہرہ کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر کی شکل میں ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ یہ برصغیر میں پہلی اقبال چیئر تھی، پاکستان میں بھی یہ چیئر اس کے بعد قائم ہوئی۔ اقبال چیئر کے قیام کے ڈیڑھ سال بعد جب میں نے شیخ صاحب کے سامنے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی تجویز پیش کی تو کچھ سرکاری حلقوں کی مخالفت کے باوجود شیخ صاحب نے اِس تجویز کی حمایت کی اور مارچ ۱۹۷۹ء میں یونیورسٹی کونسل نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ چار سال سے اقبال پر تحقیق و تنقید، اقبال شناسی کو عام کرنے، مذاکروں اور لکچروں کے ذریعے اقبال کے فکر و فن کی ترجمانی کرنے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اقبالیات پر ریسرچ کرانے میں مصروف ہے۔ اس کے بیشتر سیمناروں کا شیخ صاحب نے افتتاح کیا۔ اُن کی خواہش کے مطابق مشہور مصوّر ایم۔ ایف۔ حسین اور غلام رسول سنتوش نے اقبال کی تصویریں بنائیں، یونیورسٹی لائبریری کا نام اقبال لائبریری رکھا گیا اور اس وادیٔ گل میں اقبال کے شعلے سے نئی نسل کو گرمی اور روشنی عطا کرنے کا حیات بخش اور روح پرور پروگرام شروع ہوا۔ اُمید ہے کہ اقبال کو مجدد بنا کر کشمیر میں دانش وری کی

مستقبل سے احساس میں معاون ثابت ہوگی۔

ادھر چھ سال میں شیخ صاحب سے ملنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا مجھے خاصا موقع ملا اور مجھے اندازہ ہوا کہ ایک قومی نظر رکھتے ہوئے شیخ صاحب کو اسلام اور اُردو زبان سے کتنا گہرا شغف تھا۔ جب پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہوا تو میری تحریک پر شیخ صاحب نے ریاستی سطح پر پندرہویں صدی تقریبات کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے ذریعہ سے کلچرل اکیڈمی کی طرف سے اسلامی آثار پر ایک شاندار نمائش کی گئی۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے موجودہ دور میں اسلام، مسائل اور امکانات کے عنوان پر ایک جامع سیمینار ہوا جس میں چالیس کے قریب مقالات پڑھے گئے۔ یہ مقالات عنقریب دو جلدوں میں شائع ہوں گے۔ جب میری تحریک پر کشمیر یونیورسٹی نے طے کیا کہ مشہور عالم اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن ندوی کو اعزازی ڈگری دی جائے تو شیخ صاحب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مولانا نے کانووکیشن میں جو بصیرت افروز خطبہ دیا اُس سے شیخ صاحب بہت متاثر تھے۔ اُس کے دو دن بعد انہوں نے پاچور کے زعفران زار میں مولانا کی دعوت کی۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی۔ شیخ صاحب کشمیری ہونے کے ناطے قدرتی طور پر کشمیری اور ریاست کی دوسری زبانوں کا فروغ چاہتے تھے اور اُن کی سرپرستی میں کلچرل اکیڈمی کے کاموں میں بڑی توسیع اور ترقی ہوئی۔ کشمیری زبان کے فروغ کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ شیخ صاحب ریاست کی رابطے کی زبان اور سرکاری زبان اُردو کا فروغ بھی چاہتے تھے انتقال سے سال بھر پہلے جموں میں کلچرل اکیڈمی کی ایک اردو کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ریاست میں اُردو کی حیثیت پر نہایت واضح اور جامع انداز میں روشنی ڈالی تھی اُردو کے ادیبوں کی ہمت افزائی وہ آخر تک کرتے رہے۔

ہے وہ اکثر کہتے تھے کہ کشمیر یونیورسٹی ایک عام یونیورسٹی نہیں ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سارے ملک سے یہاں اچھے سے اچھے اُستاد جمع کیے جائیں تاکہ یہاں کے نوجوانوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی تعلیم ملے۔ اُن کی نظر خاص طور سے سماج کے اُس طبقہ پر تھی جو تعلیم کی سہولتوں سے محروم رہنے کی وجہ سے اپنی صلاحیت کو اب تک اُجاگر نہ کر سکا۔ وہ جہاں انسانی علوم اور سماجی علوم کی بہترین تدریس چاہتے تھے وہاں سائنس پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ اُن کا تخیل بلند تھا، اُن کی نظر ہمہ گیر تھی وہ ریاست میں اعلیٰ درجہ کے سائنسداں، چوٹی کے ڈاکٹر اور انجنیر اور صاحب نظر صنعت کار مہیا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ماہرین کی رائے بہت غور سے سنتے تھے۔ مگر اُن کا فیصلہ اُن کا اپنا ہوتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ جو فیصلہ کرتے تھے اس پر جمے رہتے تھے جس کے متعلق جو رائے قائم کر لیتے تھے اُس میں تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ جس کو بھی شیخ صاحب کا اعتماد حاصل ہو جاتا تھا پھر کوئی سازش یا غیبت اُس کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھی۔ شیخ صاحب صرف کشمیر کے معمار اعظم ہی نہیں، برصغیر کے ایک بڑے مدبر اور راہ نما تھے۔ اُس کے ساتھ ہی وہ ایک اعلیٰ درجہ کے منتظم بھی تھے اور ضبط و نظم کے سختی سے قائل۔ وہ بڑے بے خوف، نڈر اور جی دار آدمی تھے کوئی طاقت انہیں اس بات کو کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی جسے وہ سچ سمجھتے تھے۔ تنگ نظر حلقوں میں اُن کے رول کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں ان پر کیا کیا تہمتیں نہ تراشی گئیں۔ انہوں نے قید و بند کی کیا کیا صعوبتیں نہ جھیلیں۔ مگر وہ اپنے موقف پر برابر قائم رہے۔ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کا سہرا دراصل ان ہی کے سر ہے۔ جمہوریت، سیکولرزم اور

ے مضبوط رشتے کے ساتھ کشمیر کی انفرادیت، اس کے
شخص، اُس کے مخصوص مزاج کے استحکام کے علمبردار
تھے۔ دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہندوستان
ں وحدت میں کثرت کی جلوہ گری ہی ہندوستان کی
دولت ہے۔ ہمیں اس وحدت پر اصرار کے ساتھ اس کے
جلوہ صد رنگ کی کثرت پر بھی اصرار کرنا چاہیے شیخ صاحب
ا سیکولرزم لادینی سیکولرزم نہیں تھا۔ وہ پکے مسلمان تھے
ور مولانا آزاد کی طرح اسلام کے شاندار ورثے کا چھوٹے
سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونا گوارا نہ کر سکتے تھے اپنے مذہب
ور تہذیب سے اُن کا رشتہ مضبوط تھا اور اس کے ساتھ وہ
نئے دور کے تمام تقاضوں کو سمجھتے تھے اور "نئے جنوں"
کے لیے "نیا ویرانہ" ضروری سمجھتے تھے۔

شیخ صاحب کی شخصیت عہد ساز اور تاریخ ساز ہے۔
کمزوریاں اُن میں بھی تھیں ان سے کون بشر خالی ہے۔ مگر
دیکھنا یہ چاہیے کہ انہوں نے کشمیر کو کیسا پایا اور کیسا چھوڑا۔
انہوں نے کشمیر کو پامال اور خوار و زبوں پایا اور اُسے سربلند،
سرفراز اور خوش حالی کی طرف گامزن چھوڑا۔ انہوں نے
کشمیریوں میں عزتِ نفس، خودآگہی، خودشناسی اور خود
اعتمادی پیدا کی۔ وہ صحیح معنوں میں اقبال کے اس شعر
کی تفسیر تھے ۔

"ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن"

سالم کرنیکو

ڈاکٹر عبد الباری
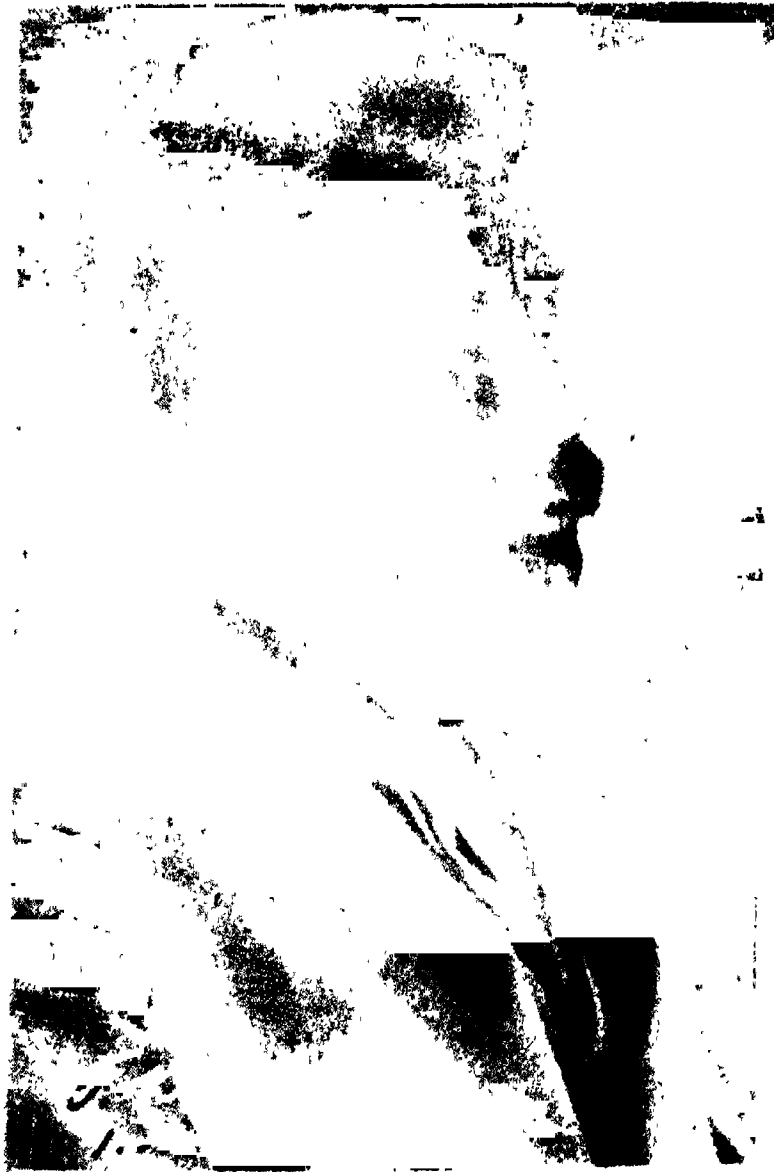
استشراق کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو خصوصیت سے
یں صدی کے مستشرقین، الا ماشاء اللہ، اسلام اور اسلامی
وثقافت کے تئیں اپنی افہام وتفہیم میں بڑی حد تک
وہی اور کج فہمیوں کے شکار نظر آتے ہیں اسلام بیزاری اور
م دشمنی کے الزامات سے وہ اپنا دامن پاک نہیں رکھ پا ئے۔
سر سالم کرنکو ان چند گنے چنے فضلاء اور محققین میں شمار
جا سکتے ہیں جنھیں مستشرقین کے اس زمرے میں استثنائی
ت حاصل رہی ہے۔ اسلامیات اور عربی زبان وادب
ان کی دلچسپیوں کا جائزہ لیجئے اور اس ضمن میں ان کی
وتحقیق کاوشوں کا بغور مطالعہ کیجئے تو یہ کہے بغیر چارہ
یں کہ ہمیں ان کی تحریروں میں اسلام بیزاری کی شکلیں
نظر نہیں آتیں۔

پروفیسر کرنکو کے مطالعہ میں دوسرا خوش آئند پہلو ہمارے
یہ ہے کہ اسلامیات اور عربی زبان وادب سے تعلق رکھنے
، عالمی شہرت کے مالک اس محقق کی علمی زندگی کے شب
۔ تقریباً دو سال (یعنی ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء) بحیثیت
ٹینگ پروفیسر اسی دانش گاہ اسلامی علی گڑھ میں، اپنے
عربی سے وابستگی کے ساتھ گذرے۔ اسی شعبہ عربی
ے سابق استاذ علامہ عبدالعزیز میمنی کی یگانۂ روزگار
ی کاوش شرح سمط اللآلی فی شرح أمالی القالی" جب

اور شاکر فہام جیسے چوٹی کے عرب ادبار و ناقدین فن نے اس
کتاب کو تحقیق نصوص کے فن میں منارۂ ہدایت، فن کی ندرت
کا حرف آخر اور "تاج اعمال التحقیق"، کہہ کر حقیقت وعقیدت
کا اظہار کیا۔ حسن اتفاق کہئے کہ اس کتاب کی تیاری میں
علامہ موصوف کو پروفیسر کرنکو کے نہ صرف دوستانہ اور مفید مشورے
ملے ہیں بلکہ اس کے مخطوطے کے حصول اور اس کی طباعت میں
بھی ان کی معاونت شامل رہی ہے۔ یہ وہی پروفیسر کرنکو ہیں
جنھیں ۱۹۲۲ء سے لے کر تادم حیات، ہندوستان کے جلیل القدر
علمی ادارے۔ دائرۃ المعارف، حیدرآباد کی ممبری حاصل رہی
اور وہ وہاں کے مصححین کی قیادت کرتے رہے۔ خود دائرۃ
المعارف کے مصححین نے عربی زبان وادب میں ان کی دستگاہ،
علوم اسلامیہ میں گہری نظر، عربی مخطوطات سے عالمی سطح کی
واقفیت اور نصوص کی تحقیق میں اعلیٰ ژرف نگاہی کی بنا پر
"من اشہر علماء الغرب" کہا تھا۔ شاید فن کی اسی مناسبت کا
لحاظ رکھتے ہوئے علامہ میمنی نے اپنی مذکورہ کتاب "شرح سمط اللآلی
کے مقدمے میں جس حامد ہستی کا احترام علم و فضل کے ساتھ
بطور خاص شکریہ ادا کیا ہے وہ کرنکو کی ہی ذات والاصفات
ہے۔ مقدمے کے یہ الفاظ کرنکو کی علم دوستی، علمی بصیرت
اور فنی مہارت کا پتہ دیتے ہیں ـــــ

[illegible]

جامعۃ توبنگان بالألمانیۃ فطلبت بمؤنۃ صدیقی الأستاذ سالم الکرنکوی. وفی الختام اری من الواجب المروۃ شکر السادۃ الأفاضل الذین لھم ید او اصبع فی نشر ھذا المؤلف کالأستاذ الفاضل سالم الذی ألقی إلیّ مقالید ما کان یملکہ من نفائس الأسفار وھو شئ کثیر من دواوین العلم وضروب المؤلفات.

بحیثیت مستشرق ومستعرب

اگر عالمی سطح پر صف اول کے مستشرقین کا جائزہ اُن کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کی مجموعی تعداد اور قدروقیمت کی روشنی میں لیا جائے تو پروفیسر کرنکو کے علاوہ فرانسیسی مستشرق سلوادی ساسی (SYLVESTRE DESACY)، جرمن مستشرق وستنفلد (F. WUSTENFELD ۱۸۹۹ء) اور برطانوی مستشرق مارگولیتھ (MARGOLIOTH ۱۸۵۸ء-۱۹۴۰ء) کے نام سرفہرست نظر آئیں گے. اب اس بارے میں تو دو رائیں ہوسکتی ہیں کہ مستشرقین میں کرنکو کو سب سے بڑا مقام حاصل تھا یا نہیں. لیکن مستعربین میں یعنی عربی زبان کے دامن ادب سے ناطہ جوڑ کر کام کرنے والوں میں خصوصیت سے تحقیق نصوص کے میدان میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کرنکو شیخ المستعربین تھا. مستعربین کے درمیان، تحقیق نصوص کے فن میں وستنفلد، تعداد کی زیادتی اور کام کے دقیق ہونے کے اعتبار سے، سب سے زیادہ کام کرنے والا شمار کیا جاتا ہے. لیکن اوٹو اسپیش (OTTO SPIES) جیسے مشہور اسکالر اور مستشرق کا یہ اعتراف ہے کہ کرنکو کا کام، تحقیق نصوص کے میدان میں ہر اعتبار سے وستنفلد سے کہیں آگے ہے. یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ کرنکو کا وطنی تعلق اس خطارض یعنی جرمنی سے رہا ہے جسے شرقیات کے عالمی مراکز میں، کاموں کے تنوع، وقت اور تعداد

پروفیسر سالم کرنکو نے استشراق کی دنیا میں پہلا ت
برطانوی مستشرق چارلس لائل (۱۸۴۴-۱۹۲۰ء) اور ۱۸۷۷ء
کی ایما پر رکھا. چارلس نے عربی شعر و شاعری کی طرف سب
توجہ دلائی. یہی وجہ ہے کہ کرنکو کی ابتدائی کاوشوں میں عر
شعراء اور ان کے کلام کا تعارف و ترجمہ شامل ہے. استشرا
تقاضوں کا کچھ لحاظ خصوصیت سے کرنکو کی ابتدائی کاوش
پایا جانا ایک فطری عمل ہے. لیکن خود ان کی افتادطبع اور ق
سلیم کا معاملہ کچھ ایسا رہا کہ عربی زبان وادب کے واسطے سے
براہ راست مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت سے انہیں
زیادہ قربت ہوتی گئی اتنی ہی زیادہ ان کی اسلام اور مسلم
محبت اور تعلق قلبی میں اضافہ ہوتا چلا گیا. اس صورت حال
انہیں عام مستشرقین کی اس ڈگر سے دور کردیا جس پر چل کر
استشراق عمومی طور پر علمی وتحقیقی کاوشوں میں قومی اور
عصبیت کی آلودگیوں سے اپنا دامن پاک نہیں رکھ سکے ہیں.
وقت وہ بھی آیا جب فرتس کرنکو (FRITZ KRENCOW) ا
قبول کرکے محمد سالم کرنکو بن گئے. اسی صورتحال کو مدنظر رکھتے
کرد علی نے دمشق کے "المجمع العلمی" میں لکھا تھا — "پرو
عربوں سے اور اسلام سے ایسی محبت کرتے ہیں جس کی توقع
ایک مخصوص قلبی تعلق والے کے دوسرے سے نہیں کی جا

احوال زندگی

پروفیسر کرنکو کی پیدائش ۲۱ر اگست ۱۸۷۲ء
شمالی جرمن کے ایک شہر شون برگ (۱۸۷۲ء)
میں ہوئی. اسی شہر سے اسکول کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا. ا
کا باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی بنا پر تعلیم منقطع کرکے
تجارت کی طرف آنا پڑا. یتیمی کی زندگی اور گھر کی ذمہ د
نے انہیں حساس اور رقیق القلب بنا دیا تھا. انہیں
تعلیم کا بڑا شوق تھا چنانچہ تجارت میں لگ جانے
اس شوق کو اپنے دل سے نکال پھینکنے میں انہیں کا
نصیب نہ ہوئی. برلن میں ایک برطانوی خاتون سے

انھیں خاتون کی بنا پر انھیں انگلینڈ جانے کی ضرورت
وس ہوئی ۔

چنانچہ ۱۸۹۴ء میں وہ انگلینڈ چلے آئے اور رشتہ
دواج میں منسلک ہوگئے ۔ سترہ سال وہاں کی رہائش کے
، ۱۹۱۱ء میں انھیں برطانیہ کی شہریت حاصل ہوگئی ۔ انگلینڈ
بھی تجارت سے تعلق رہا اور وہ BUCKINGHAM میں ایک
ڑی چلاتے رہے لیکن ایک خاص بات یہ تھی کہ انگلینڈ آتے ہی
ان کا معمول ہوگیا تھا کہ فارغ اوقات کو وہ مطالعۂ کتب میں صرف
تے ۔ خصوصیت سے عربی اور فارسی زبانوں کے مطالعہ کا بھی
ق تھا جس کی بنا پر وہ انگریزی ، فرانسیسی ، عربی ، فارسی ، ترکی ،
یانی ، عبرانی اور لاتینی زبانیں اچھی طرح سیکھ پائے ۔ مشہور برطانوی
مستشرق چارلس لائل نے انھیں اس طرح کے مطالعہ کی مزید رغبت
ئی اور آہستہ آہستہ انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ پہلے وہ عربی
اعری کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد فن لغت ، تاریخ ، سیرت
، طب سے متعلق عربی نگارشات زیر مطالعہ رکھیں ۔ علوم عربیہ
ے دلچسپی اور مطالعہ کا سلسلہ چلتا رہا ۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ
یلم کے بعد ہی وہ ان علوم میں دست گاہ رکھنے والوں کی صف میں
امل ہوگئے جنھیں شہرت بھی نصیب ہوئی ۔ دنیا ان کے
نام و مرتبہ سے آشنا ہوئی ۔

علمی اداروں کی رکنیت اور اعزازات

۱۹۲۲ء میں وہ دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ممبر بنائے
ئے اور وہاں کے اعلیٰ مصححین میں شمار ہوئے ۔ تحقیق و تصحیح فنون
اکام وہ دائرۃ المعارف کے ایک معزز اور مستقل ملازم کی
یثیت سے کرتے رہے ۔ دائرۃ المعارف سے ان کا یہ تعلق زندگی
ے آخری لمحات تک جاری رہا ۔ پروفیسر کرنکو کے تحقیق نصوص
، ۱۵ سے زائد کتب بیشتر کاوشوں کے ثمرات کتابی شکل
یں دائرۃ المعارف سے ہی شائع ہوئے ۔ اور شاید دائرۃ المعارف
ے بیشتر اہم ترین عربی مخطوطات کی تصحیح و تحقیق کے
[illegible]

اس ادارے سے منسلک ہونے اور اپنا علمی تعاون پیش کرنے کے بعد
ہی کی ۔ دائرۃ المعارف کی علمی شہرت اور اہلیت میں ان کی
ذات سے چار چاند لگ گئے ۔

۱۹۲۷ء میں جرمنی کے ERLANGAN کے ایک
طبی اور سائنسی ادارے PHYSICAL MEDICINE SOCIETY
نے انھیں اپنا CORRESPONDING MEMBER
بنالیا ۔ ۱۹۲۸ء میں وہ دمشق کے "المجمع العلمی" کے ایک رکن
منتخب ہوئے ۔

۱۹۲۹ء میں لیپزک یونیورسٹی ، جرمنی نے انھیں فلسفہ میں
ڈی فل کی اعزازی ڈگری سے نوازا ۔ یہ اعزاز انھیں ، ان کی علمی
خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خصوصیت سے قدیم عربی زبان
کا غیر معمولی علم رکھنے ، شاعری ، لغت ، تاریخ اور طبیات سے
متعلق عربی نصوص کی تحقیق و ترجمہ کرنے ، سائنٹفک آئیڈیالوجی
رکھنے اور دوسروں کی علمی کاموں کی ترغیب و استعانت میں لگے
رہنے کی بنیاد پر عطا کیا گیا ۔

صاحبزادہ آفتاب احمد کی وائس چانسلرشپ کا زمانہ تھا جب
پروفیسر کرنکو کو شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے قیام کے سلسلے میں نصاب
تیار کرنے والی کمیٹی میں شامل کیا گیا اور ان کی تحریری رائیں حاصل
کی گئیں یہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے لیکن ۱۹۲۶ تک اسلامک اسٹڈیز
کے لیے وہ پروفیسر کرنکو کو علی گڑھ لانا بھی چاہتے تھے ان کے
اس خواہش کی تکمیل سر راس مسعود کی وائس چانسلرشپ میں پوری
ہوئی ۔ ۱۹۲۹ء میں وہ VISITING PROFESSOR کی
حیثیت سے علی گڑھ بلائے گئے ۔ یہاں اصلاً تعلق شعبۂ عربی سے
ہی رہا ۔ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی ان کے علمی مرتبے کے
معترف تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ علی گڑھ آنے والے مستشرقین
میں پروفیسر کرنکو مقام و مرتبے کے اعتبار سے سب سے بڑے
تھے ۔ قیام علی گڑھ کے ناطے پروفیسر کرنکو سے جن لوگوں نے
[illegible]

خط و کتابت کے ذریعے اس مبارک رشتہ کو باقی رکھے رہے ان
میں عبدالعزیز میمن اور مولانا بدرالدین کے علاوہ مولانا حبیب الرحمن
خاں شروانی بھی تھے۔ علی گڑھ کے ہی قیام کے دوران پروفیسر کرنکو
کو البیرونی کی کتاب "کتاب الجماہر" ایڈٹ کرنے کا خیال پیدا
ہوا۔ اس بات کا تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب کے مقدمے میں خود کیا
ہے۔ قیام علی گڑھ کے ہی دوران علامہ عبدالعزیز میمن سے ان کے
علمی ارتباط اور دوستی کی وہ راہ ہموار ہوئی جس کا تعلق خاطر
زندگی کے آخری ایام تک باقی رہا۔ علی گڑھ برادری بھی ان کی
علم دوستی اور انسان دوستی کے جذبے کی دل سے قدرداں تھی۔
بلاشبہ پروفیسر کرنکو بھی علی گڑھ سے تعلق خاص رکھتے تھے چنانچہ
اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب انھوں نے تمام علمی کاموں سے منہ
موڑ لیا تھا اور داخل اسپتال تھے تو یہ صرف علی گڑھ کی یاد اور
میمن صاحب کی دوستی تھی جس نے انھیں اس حال میں بھی علی گڑھ
کے ایک پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے کا ممتحن بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ
پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ " حماسۃ البصریۃ " کا وہ تحقیقی ایڈیشن
تھا جو پروفیسر مختارالدین احمد صاحب نے بحیثیت ریسرچ اسکالر میمن
صاحب کے زیر نگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

علی گڑھ میں پروفیسر کرنکو اور بیگم کرنکو اپنی صحت کی خرابی کی
بنا پر دو سال سے زیادہ قیام نہ کرسکے ۱۹۳۰ء میں وہ اپنے عہدے سے
سبکدوش ہو کر انگلینڈ واپس چلے گئے۔ وہاں سے کچھ عرصہ بعد
اپنے رشتہ مندوں کے پاس Bonn جا پہنچے۔
۱۹۳۱ء میں بون یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر
کیے گئے مختلف سمسٹروں میں انھوں نے وہاں کامیاب تعلیم دی۔ ان کی
توجہ سے بون یونیورسٹی میں ریسرچ کے کاموں کا سلسلہ فروغ پایا۔
دو سال کے بعد ان کی برطانوی نژاد بیوی اپنے وطن انگلینڈ
چلی گئیں۔ انگلینڈ پہنچ کر بیوی کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا اس
مرتبہ چھٹی لے کر یہ خود بھی بیوی کی علالت کی بنا پر جرمنی سے انگلینڈ
آئے۔ پریشانیاں بڑھتی چلی گئیں چنانچہ ۱۹۲۹ء میں بون یونیورسٹی

کی ملازمت سے بھی سبکدوش ہو کر انگلینڈ چلے گئے اور کیمبرج
خاموش اور تقریباً گوشہ نشینی کی سی زندگی
گذارنے لگے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد کا زمانہ تھا جب
کرنکو کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی، علمی کاموں کا سلسلہ
کمزور پڑ گیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اولوا سپیس (Oluf Spies) کو
کو انھوں نے ایک ذاتی خط لکھا اس میں انھوں نے لکھا تھا
ان کا ۷۵ واں برتھ ڈے آ پہنچا ہے مگر یہ حال ہے کہ دمہ
قلب کے امراض نے انھیں گھیر رکھا ہے۔
۱۹۴۹ء میں ان کے بائیں بازو پر لقوے کا اثر ہوا۔
میں ان کے ہاتھوں میں اس قدر سوجن ہو چکی تھی کہ لکھنا ممکن نہ
تھا۔ وہ تقریباً تین سال لگاتار بیمار رہے اس حال میں بھی ان
کی محبت اور علم دوستی انھیں ۱۹۵۲ء میں جرمنی کھینچ لے گئی
اور وہ "بون" کے ۱۲ ویں اورینٹل کانفرنس میں شریک ہوئے
اس کے بعد وہ انگلینڈ واپس ہوئے اور اسی سال کیمبرج میں
ان کی وفات ہو گئی۔

شرقیات، اسلامیات اور خصوصیت سے عربی زبان
ادب میں پروفیسر کرنکو کے گراں قدر کارناموں سے آگہی اور ان
علمی کاوشوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے میں جہاں
کی نگارشات کا تفصیلی تعارف ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے
ان کے تحریری نمونوں سے بھی حقیقت حال تک پہنچنے میں بڑی
بڑی مدد ملتی ہے۔
یہاں ان تحریروں میں سے صرف دو اقتباسات پیش
کرنے پر اکتفا کروں گا۔
ایک البیرونی کی کتاب الجماہر کا عربی مقدمہ ہے جو ان
میں لکھا گیا جب کرنکو کی تحریروں میں پختہ نظری اور فکر و فن کی
پختگی آ چکی تھی۔ دوسرا انگریزی کا ایک خط ہے جو ان

خری آیام کی تحریر ہے۔ اتفاق سے دونوں تحریریں نہ صرف مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ بلکہ خود شعبہ عربی سے پروفیسر کرنکو کے گہرے
ربط کے عکاس بھی ہیں۔

پروفیسر کرنکو کتاب الجماہر کی ایڈیٹنگ کے بعد اپنے
تاثرات خاتمہ کتاب کے طور پر یوں تحریر فرماتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
وبہ ثقتی

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وسلم
اکثر الناس عبید الدنیا والدرهم
إذ فیها منافع کثیرة للناس وهما
الضیامن أهم اسباب للآفات التی
نصیب الدنیا حتی الحسد والحروب
وللناس دائماً فی الطلب عن معاون
جدیدة للذهب والفضة والجواهر
إذ لاغایة فی حرصهم الی جمع الأموال
ولهذا السبب صنفت العلماء قدیماً
وحدیثاً الکتب فی اوصاف الجواهر و
الفلزات ومعاونه باللغات المختلفة
وقد کتب إلیّ قبل سنین عدیدة المرحوم
الأستاذ (ویدمن) لما وجد فی اخر
نسخة من الجزء الثامن من کتاب الإکلیل
للهمدانی ذکر معاون الیمن فقال لو
نشرنا هذه الرسالة لعلها تکشف
عن خزائن منسیة منذ دهور لیکون
لنا الجزار من الذین یعملون الحفر
فیها بغیة الثروة۔ ثم توفی صدیقی
الی رحمة اللہ وبقیت النسخة عندی
لأن جمع الاموال لم یکن فی سجیتی
ثم لما کنت فی جامعة دهلی کنه قال
لی ذات یوم صدیقی الاستاذ (هادی
حسن) إنی قد نظرت فی نسخ خطیة
فارسیة لتالیفات مسماة (جوهرنامه)
أی کتاب الجواهر ولم أجد فیها ما
یشفی الغلیل ولو عثرنا علی کتاب
تذکر فیها المعادن القدیمة فی
بلاد الهند۔ ارجو أنه یکون نافعاً لنا و
لغیرنا فی تجدید الحفر فیها۔ فقلت
جواباً له: لا أعرف إلاّ کتاباً واحداً
ولکن لا توجد۔ لهذا الکتاب إلاّ نسخة
فریدة وهی فی خزانة اسکوریال فی
بلاد الاندلس۔

(شروع کرتا ہوں اس اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے)
اور جس پر بیا ایمان رکھیے
ساتھ ہی درود و سلام بھیجتا ہوں محمدؐ پر جو ہم سب کے آقا
و مولیٰ ہیں۔

لوگوں کی بڑی تعداد مال و دنیا کی غلامی میں پھنسی ہے وجہ
صرف یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں انھیں بڑے بڑے فائدے
نظر آتے ہیں حالانکہ یہی چیزیں وہ ہیں جو آفات دنیاوی کے
اہم اسباب بن جاتے ہیں اور بات آپسی حسد و جنگ تک جا پہنچتی
ہے۔ انسانوں کو تو ہمیشہ سے ہی سونے چاندی اور جواہرات کے لیے
نئے نئے معاون کی تلاش رہی ہے کیونکہ اموال اکٹھا کرنے کی ہوس
انھیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اسی سبب سے اہل علم نے
ہیرے جواہرات اور ان سے متعلق کتابیں مختلف زبانوں میں دور
قدیم و جدید دونوں میں ہی تصنیف کی ہیں۔ چند سال پیشتر مرحوم
استاد ویڈمن ( ) نے مجھے اس وقت خط لکھا تھا
جب انھیں ہمدانی کی کتاب الاکلیل میں یمن کے معادن کا تذکرہ
ملا۔ انھوں نے لکھا تھا " اگر ہم اس رسالہ کو شائع کر دیں تو
امید ہے کہ اس سے مخفی خزانوں کا پتہ چلے اور ہم ان کی

سے منافع ہاتھ آئیں جو دولت کی تلاش میں کاوش کریں گے۔ میرے دوست کا کچھ عرصہ بعد انتقال ہو گیا اور وہ قلمی نسخہ کتب میرے پاس رکھا رہا کیونکہ مال کا جمع کرنا میری فطرت میں کبھی نہیں رہا۔ لیکن ان دنوں جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں گیا، ایک دن میرے دوست استاذ ہادی حسن نے مجھ سے کہا "میری نظر فارسی کے ایک قلمی نسخہ موسوم بہ جوہر نامہ پر پڑی ہے مگر اس میں جو کچھ میں دیکھ پایا اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ اگر ہم کسی ایسی کتاب کا پتہ پاتے جس میں ہند کے قدیم معادن کا تذکرہ ہوتا تو ہمیں امید ہے کہ وہ ہمارے لیے بھی فائدہ کا سبب بنتی اور ان کے لیے بھی جو کان کنی کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تب میں نے انھیں جواب دیتے ہوئے کہا" مجھے صرف ایک کتاب کا پتہ ہے۔ اور وہ بھی دنیا کا واحد نسخہ ہے جو اسپین کے کتب خانہ اسکوریال میں محفوظ ہے۔)

زندگی کے آخر ایام میں وہ علامہ عبدالعزیز میمن صاحب کے ذریعہ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی کے ایک پی۔ ایچ ڈی مقالے کے ممتحن بنائے گئے۔ یہ دراصل "حماسۃ البصریۃ" کے تحقیقی ایڈیشن کی شکل میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا وہ کام تھا جس پر انھیں D. Phil کی ڈگری دی گئی جب یہ تحقیقی کام پروفیسر کرنکو کے پاس پہنچا تو انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ صاحبِ مقالہ کو انگریزی میں خط لکھا —

67-DE FERVILLE AVENUE

CAMBRIDGE

14. JUNE. 1952.

DEAR MUKHTARUDDIN,

THOUGH IT IS UNUSUAL FOR A EXAMINAR TO COMMUNICATE WITH THE CANDIDATE I BELIEVE, CONSIDERING THE IMPOSSIBILITY OF MEETING YOU PERSONALLY,

— — [illegible]

AM VERY PLEASED WITH YOUR WORK AND ONLY REGRET THAT YOU DID NOT HAVE PHOTOGRAPH OF THE ORIGINAL MANUSCRIPTS FROM ISTAMBUL AS IT WOULD HAVE UNDOUBTEDLY SAVED YOU FROM MUCH TROUBLE IN ESTABLISHING CORRECT READINGS WHICH HAVE BEEN SPOILED BY IGNORANT COPYISTS. I HAVE READ EVERY WORD OF YOUR THESIS AND MADE SOME PENCIL NOTING WHERE I BELIEVE I CAN SUGGEST BETTER READINGS. UNFORTUNATELY, I PRESENTED MOST OF MY ARABIC AND PERSIAN BOOKS TO THE HAMBURG UNIVERSITY WHO LOST EVERY BOOK THROUGH AIR-RAID IN 1941 AND HAD TO RELY UPON MY MEMORY ENTIRELY. SEVERAL OF THE FRAGMENTS YOU HAVE BEEN UNABLE TO IDENTIFY I CERTAINLY KNEW, BUT MY BOOKS, TOGATHER WITH VALUABLE NOTES BEING GONE I WAS UNABLE TO GIVE YOU MY HOLD IN THAT WAY. AGAINST THIS YOU WERE FORTUNATE THAT MY VALUED FRIEND, ABDUL AZIZ GRANTED YOU ACCESS TO HIS TREASURES COLLECTED ON HIS JOURNEY TO ISTAMBUL AND EGYPT AND I WANT YOU TO GIVE HIM MY ASSURANCE OF UNDYING FRIENDSHIP.

تحریر میں تحقیق سے متعلق پروفیسر موصوف کے خیالات ، یقیناً ان کے ذوق ادب اور علمی تحقیق بصیرت کے غماز ہیں

تحقیق نصوص کا فن :-

پروفیسر کرنکو کو عربی زبان وادب میں پائے جانے والے تمام علوم وفنون میں سب سے زیادہ شغف لغت سے رہا۔ اسی طرح ان کے علمی کاموں کا خاص میدان تحقیق نصوص (PREPARING OF CRITICAL EDITION OF OLD ARABIC TEXT) کا فن تھا۔ اس میں کرنکو کے مقام ومرتبہ کا آسانی سے اندازہ ایک تو ان کی علمی کاوشوں کی تفصیلی فہرست کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جس میں ایک بڑی تعداد علوم کے تنوع کے ساتھ ساتھ ایسی کتابوں کی پائی جاتی ہے جسے علمی دنیا فن میں نگانۂ روزگار سمجھتی رہی ہے۔ ایک دوسرا واقعہ بھی تحقیق نصوص کے فن میں پروفیسر کرنکو کی نابغہ نظری کی نشاندہی کرتا ہے۔ علامہ عبدالعزیز میمن کی مشہور زمانہ کتاب سمط اللآلی جب منظر عام پر آئی تو دنیائے عرب نے اس کتاب کو تحقیق نصوص کے فن میں شاہکار تصور کیا۔ خود پروفیسر کرنکو نے اسے "من أصح مطبوعات ادبیۃ" کہا لیکن ساتھ ہی میمن صاحب کو لکھے گئے اپنے دو علیحدہ علیحدہ خطوط میں اپنی کتاب مذکور سے متعلق متعدد تصحیحات بھی لکھ بھیجیں۔ ان تصحیحات کے ضمن میں یہ بھی لکھا کہ وہ ادھر سات ماہ سے علیل چلے آرہے ہیں۔ اس لئے کتاب کا مزید مطالعہ ممکن نہیں۔ موقع ہوتا تو کتاب کا ورق ورق دیکھتے اور مشورہ دیتے البتہ یہ ضرور مشورہ دیا کہ فہرست میں قوافی اور اسماء شعراء کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا اضافہ کر لیا جائے۔ چنانچہ ایک سال بعد یہ کتاب قاہرہ سے ۱۹۳۶ء میں ان اضافوں کے ساتھ چھپی۔ یہ ساری باتیں پروفیسر کرنکو کی تحقیق نصوص کے فن میں نابغہ نظری کی نشاندہی کرتی ہیں۔

علمی کاوشیں :

اپنی معلومات کی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً ۱۲ علیحدہ علیحدہ علوم سے متعلق تقریباً ۳۲ اہم ترین مخطوطات کو تصحیح وتحقیق سے مزین کرنے کا شرف انہیں حاصل رہا ہے۔ ان میں بیشتر زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ طباعت کے بعد کتابوں کی مختلف جلدوں کا اگر لحاظ کیا جائے تو ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۵۰ تک جا پہنچتی ہے۔ چند وہ کتابیں بھی ہیں جن کی تصحیح وتحقیق دوسرے علماء نے کی تھی لیکن مزید تصحیحات کے ساتھ ان کی تکمیل پروفیسر کرنکو کے ہاتھوں ہوئی۔ موضوع کے اسی تنوع کے ساتھ ان کے علمی وتحقیقی مقالات، ادبی نوٹس اور تقریظات کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی ان کتابوں کے علاوہ دیکھی جا سکتی ہے۔

موصوف کی ان تمام علمی کاوشوں کا جدول جو میرے احاطۂ علم میں آسکی ہیں درج ذیل عنوانات کے تحت پیش خدمت ہے۔

مخطوطات کی تصحیح وتحقیق سے متعلق

علوم	اسماء الکتب	مصنف	مطبع
طب میں	(۱) کتاب المناظر	ابن الہیثم	دائرۃ المعارف حیدرآباد
ہیئت	(۲) تنقیح المناظر	شیرازی	
	(۳) کتاب الجماہر فی الجواہر	البیرونی	۱۳۵۵ھ حیدرآباد
لغت	(۴) جمہرۃ اللغۃ	ابن درید الازدی (۴ جلدیں)	حیدرآباد (۱۳۴۴ھ، ۱۳۲۵، ۱۳۵۱ھ)
نحو	(۵) کتاب الافعال (مع فہرست)	ابن قطاع الصقلی	۴ جلدیں، حیدرآباد (۱۳۶۰ھ)
	(۶) کتاب الجیم	ابو عمرو الشیبانی	چند جلدیں طبع ہو چکی تھیں۔ لیڈن ۱۹۲۰ء میں
شاعری	(۷) دیوان مزاحم العقیلی		
	(۸) " قحیف العقیلی		
	(۹) " ابو حنبل الطبی		

(۱۱) دیوان طفیل الغنوی لندن (۱۹۲۰ء)
(۱۲) " عمرو بن کلثوم
(۱۳) " الطرماح بن الحکیم (لندن (۱۹۲۷ء میں)
(۱۴) " نعمان بن بشیر
(۱۵) " ابن ابی دُلف
(۱۶) " معاویہ رض
(۱۷) شرح قصیدۃ البردۃ لکعب بن زہیر التبریزی ۱۳۵۴ھ
(۱۸) معجم الشعرا المرزبانی (۳۸۴ھ) قاہرہ
(۱۹) المؤتلف والمختلف الآمدی (۳۷۰ھ) قاہرہ
(۲۰) حماسہ ابن الشجری حیدرآباد
ادب (۲۱) کتاب المجتنیٰ ابن درید ۳۲۱ھ حیدرآباد ۱۳۴۲ھ
(۲۲) کتاب الامالی (فہرس) ابوعلی القالی البغدادی حیدرآباد ۱۳۶۱ھ
(۲۳) کتاب المعانی الکبیر ابن قتیبہ (۳ جلدیں) حیدرآباد ۱۳۶۸ھ
(۲۴) کتاب المأثور ابوالعمیثل الاعرابی لندن
تذکرہ (۲۵) الدرر الکامنۃ لابن حجر العسقلانی (۸۵۲ھ) ۶ جلدیں
حیدرآباد (۹۲-۹۷ ۱۳ھ)
طبقات (۲۶) طبقات النحاۃ البصریین ابوسعید السیرافی الجیریا
(۲۷) مختصر طبقات النحویین واللغویین ابوبکر الزبیدی روم
تاریخ (۲۸) التیجان فی ملوک حمیر وہب بن منبہ حیدرآباد
(۲۹) کتاب التیجان ابن ہشام (۲۱۸ھ) حیدرآباد ۱۳۴۷ھ
(۳۰) المنتظم (مع فہارس) ابن الجوزی (۵۹۷ھ) ۶ جلدیں حیدرآباد
(۵۸-۱۳۵۷ھ)
تفسیر (۳۱) تفسیر ثلاثین سورۃ ابن خالویہ حیدرآباد
حدیث (۳۲) الجرح والتعدیل (مع مقدمہ) ابن ابی حاتم (۳۲۷ھ) ۷ جلدیں
حیدرآباد ۱۳۷۰ھ

(۳) دیوان عبید بن الابرص تحقیق چارلس لائل
(۴) دیوان کعب ابن زہیر تحقیق ٹی ۔ کوواِلسکی T. KOWALSKY
بروایت السکری (انگریزی مقدمے کے اضافے کے ساتھ)
(۵) لسان العرب جدید اڈیشن سلفیہ پریس قاہرہ

غیر مطبوعہ تصحیحات

(۱) ارشاد الاریب (تقریباً ۲۰ تصحیحات) یاقوت الحموی جلد ہفتم
(۲) سمط اللآلی (چند تصحیحات) عبدالعزیز المیمنی قاہرہ

جمع وترتیب اشعار

(۱) اشعار الانصار
(۲) اشعار ابراہیم بن عباس الصولی
(۳) اشعار الأفوہ الاودی
(۴) اشعار النمر بن تولب رض
(۵) اشعار طفیل بن عوف الغنوی والطرماح بن الحکیم
(۶) اشعار رعدی بن الرقاع ماخوذ کتاب الخیل لابی عبیدۃ
(ان جمع شدہ اشعار کا بہت بڑا حصہ ہنوز منظر عام پر نہیں آیا ہے)

تقریظات

(۱) سمط اللآلی عبدالعزیز المیمنی
(۲) الطرائف الادبیۃ " " "
صرف نمونے کے طور پر ان دو تقریظوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی تقریظیں لکھی گئی ہیں

غیر مطبوعہ اہم نوٹس

پروفیسر کرنکو نے اپنے خط میں بہت سارے اہم نوٹس کا ذکر کیا ہے، جو ان کی چند اہم کتابوں کے ساتھ ساتھ ہمبرگ یونیورسٹی کو دے دیئے گئے ۔

دیگر محققین کی تحقیقی کاوشوں کی تکمیل اور مزید تصحیح

(۱) مرأۃ الزمان سبط ابن الجوزی جلد ہشتم حیدرآباد
(۲) تاریخ قطب الدین الیونینی اول، دوم اور سوم حیدرآباد

تراجم

۱۔ اشعار طفیل بن عوف الغنوی والطرماح بن الحکیم
(متن عربی کے ساتھ مکمل انگریزی ترجمہ)

۲۔ دیوان مزاحم العقیلی (متن عربی کے ساتھ مکمل انگریزی ترجمہ) جب میموریل لندن سیریز XXV

ادبی و تحقیقی مختصر مقالات اور نوٹس

انگریزی زبان میں
قصیدۃ۔ خفاجہ۔ خفاجی۔ غنسار حیرہ۔ طرفہ۔ زہیر۔ خط رح۔ خزاعۃ۔ کنانۃ۔ نعمان بن المنذر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم

جرمنی زبان میں۔
تقریباً ۲۳ شخصیات پر مختصر مگر جامع مقالات۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد چہارم

مخطوطات کی فہرست سازی

۱۔ برٹش میوزیم لائبریری کے مخطوطات فہارس اور ضروری نوٹس
۲۔ الامالی القالی فہارس طبع قدیم قاہرہ
۳۔ کتاب الافعال فہارس ج ۱ حیدرآباد

مکاتیب

پروفیسر کرنکو کے مکاتیب انگریزی، جرمن اور عربی زبانوں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جو دنیا کے اہم علماء اور محققین نام لکھے گئے۔ ان مکاتیب میں بھی اچھا خاصا حصہ ایسے مکاتیب کا ہے جو کہ شرقیات، اسلامیات اور عربی ادب کے ناطے اہمیت رکھتا ہے۔ علامہ عبدالعزیز میمن اور پروفیسر مختارالدین احمد کے نام لکھے گئے مطبوعہ عربی و انگریزی کے چند مکاتیب مجلۃ المجمع العلمی الہندی، علی گڑھ کے میمن نمبر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آپ بیتی

عربی میں ایک مختصر سوانحی خاکہ بقلم احد المستشرقین"
مجلہ لغۃ العرب ۱۹۲۸ء

علمی و تحقیقی مقالات

بقول اوٹو اسپیس (Otto Spics) ۵۰ سے زائد اہم مقالات عربی، انگریزی اور جرمن زبانوں میں دنیا کے مشہور مجلات میں چھپ کر منظر علم پر آ چکے ہیں۔
(دیکھئے اور ینس، جرمنی، اسلامک کلچر حیدرآباد اور جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن)
ان میں سے چند بطور نمونے کے درج ذیل ہیں۔

1. The Use of writing for preservation of ancient Arabic poetry (Prof Brown Commemoration Volume Cambridge 1922)
2. An Article Al-Biruni Commemoration Volume Calcutta 1951)
3. Accounts of some scientific manuscripts in libraries in Persia
4. Salahuddin al Safadi
5. Kitabal jim of Abu Amr al Shaibani, RAAD 1925
6. Articles on ابن البختری ابوحاتم السجستانی الطوسی
7. Two oldest books on Arabic folklores
8. Arabic dictionary of the 4th century A.D Fellicitation Vol-1925

مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

کے موقع پر

"فکر و نظر" کا خصوصی شمارہ

زیر ترتیب ہے

تقریباً دو سو صفحات کے اس شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی اور مذہبی کارناموں کا مفصل جائزہ پیش کیا جائے گا ہند و پاک کے ممتاز اور مستند ادیبوں اور محققین کے مضامین کے علاوہ مولانا آزاد کی تحریروں کا جامع انتخاب اور ان کی نادر تصاویر بھی شامل ہوں گی۔

ایل۔ کے۔ حیدر

مختار مسعود

طویل اور کشادہ برآمدہ میں ایک بلند رومی پیل پایہ سے ٹیک لگائے فرش پر اکڑوں بیٹھے سامان کی فہرست بناتے ہوئے تھکے ماندے سکریٹری ڈسٹرکٹ بورڈ نے حیرت اور حسرت سے مغلوب ہو کر کہا، زندگی ہو تو ایسی ہو۔ ہمارا جینا بھی کوئی جینا ہے پیدا نہ ہوتے تو کسی کو خبر تک نہ ہوتی، پیدا ہوئے تو کون سا فرق پڑ گیا۔ دیوار کے ساتھ دور تک اوپر تلے سامان چنا ہوا تھا۔ کیبن ٹرنک، ساگوانی صندوق، کشمیری میخ دان، چمڑے کے بیگ اور لکڑی کے کھوکھے۔ بارِ سفر میں بوریا بھی تھا مگر اس میں نرم ترکستانی غالیچے نیم کے پتوں سمیت لپٹے ہوئے تھے۔ سامان کیا ہے گویا، بھان متی کا پٹارا یا عمرو کی زنبیل، اسے کھولا تو سوغات اور مصنوعات کی نمائش لگ گئی۔ ترشا ہوا شیشہ، ڈھلی ہوئی چاندی، زیبائشی مرقعے، آرائشی مجسمے، سٹیل پالش پر بنی ہوئی جاپانی سینریاں، یورپی روغنی نقاشی، آبدار تلواریں، بدرنگ ڈھالیں، توڑے دار بندوقیں، مغرب کی پوستینیں اور مشرق کے قالین۔ چینی مٹی کے برتنوں میں ایک نیلگوں اور ٹھوس روسی ڈنر سیٹ کی کشتیاں اور ڈونگے اس جہازی قالب کے تھے کہ ان پر بادبان لگا دیں تو بحری بیڑا تیار ہو جائے۔ یہ سامان نہ جہیز ہے اور نہ خراج۔ یہ تو ملک الموت کا مالِ غنیمت ہے۔

رحیم بخش بوچہ کی نگرانی میں دو تین پیشکار کئی دن تک سامان کی فہرست بنانے میں لگے رہے۔ ایک وقت میں ایک نگ کو لیتے اور اس میں سلیقہ سے تہ بہ تہ اشیا کو ایک ایک کر کے نکالتے، جوہری کی طرح پرکھتے اور تفصیل فہرست میں اور تحقیق قوسین میں درج کر لیتے۔ دستاویزات تعلیمی (اسناد و سرٹیفکیٹ ہائے کیمبرج)، دستاویزات سرکاری (مشمولہ فرمان شاہی دستخطی جارج پنجم، تمغہ جات اعزازی (نقرئی) کتابچہ (درباره آداب زیب تنی تمغہ جات)۔ سامان میں ایک ریشمی خریطہ بھی تھا۔ اس نکاح نامہ پر خطبہ مسنونہ عربی میں چھپا ہوا، کوائف فارسی میں درج شدہ اور دستخط انگریزی میں ثبت تھے۔ نکاح کے گواہ اور وکیل بیشتر وائسرائے کی مجلس عاملہ کے رکن تھے یا اسی مرتبہ کے مشہور شہری۔ سامان میں ایک مٹیا رنگ کی تصویر بھی تھی۔ نو تعمیر نئی دلی کے ایک جدید بنگلہ کے بیل منڈھے پورچ کے سامنے دور پھیلے مسطح سبزہ زار میں کرسی پر ڈاکٹر ایل کے حیدر بیٹھے ہیں۔ پاس ہی مسز سٹیفنی حیدر کھڑی ہیں۔ دونوں کے درمیان پانچ چھ برس کی ایک بچی ہے جس کا نام ربن کی ننھیال اور کہوٹہ کی ددھیال کی دوغلی روایات کے مطابق ڈورتھی ایگنس فاطمہ حیدر ہے۔

سامان کی فہرست اور فہرست کی نقلیں بنانے میں کوئی چار ہفتے لگے اور کئی دستہ کاغذ صرف ہوا۔ کہاں وہ دن کہ یہ سامان نئی دلی کے بنگلہ میں عہدہ اور خوشحالی اور مل گرلہ کی پھوس والی کوٹھی میں درویشی اور بے رغبتی کا عینی گواہ

تھا۔ کہاں یہ دن کہ ڈاکٹر حیدر کے انتقال کے برسوں بعد یہ سامان میری سرکاری رہائش گاہ کے برآمدہ میں لاتعلق اجنبی عملہ کے ہاتھوں میں فہرست مال منقولہ متروکہ مستعلہ ہو کر رہ گیا۔ سامان کا مالک پُر نظر تھا اور سامان کی وارث بیوہ ہے اور بے نیاز رہی ان دونوں کی بیٹی تو اس نے بچپن کے چند سالوں کے بعد نہ یہ سامان دیکھا تھا اور نہ یہ برمنظم۔ لہٰذا یہ مال متاع سالہا سال تک لاہور میں کوپر روڈ پر اب جہاں ماسٹرز گلڈ کا دفتر ہے اس سے ملحق رہائشی عمارت کے ایک کمرے میں بند پڑا رہا۔

مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کے صدر ڈاکٹر ایل کے۔ حیدر کو جب میں نے پہلی بار غور سے دیکھا تو وہ بڑے بارعب نظر آئے۔ یہ شروع کے دنوں کی بات ہے اور اب اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ میں لڑکپن کی سرحد کے پار زمین بے یاری کا مسافر تھا۔ جسم دبلا، نرخرہ بے قابو، آواز بے سری اور قدلانبا، لمبے ہونے کی رفتار یہ تھی کہ ہر تین چار ماہ کے بعد ٹخنے پائنچوں سے جھانکنے لگتے۔ ادھر ایک عمر رسیدہ، سنجیدہ اور جہاں دیدہ آدمی۔ ایک فربہ کم گو اور بھاری بھر کم شخصیت۔ یورپ میں پڑھا ہوا اور انگریز حکومت کا مانا ہوا ماہر معاشیات، ہیرس ٹوئیڈ کا چارخانہ کوٹ اور برجس نما پلس فور پہننے والا شخص جو عید کے روز شلوار قمیص اور مشہدی کلاہ و دستار میں نظر آتا۔ ایک سہ پہر گالف سٹک لے کر بال اٹھانے والے پیش خدمتی کے ساتھ پیدل چلنے والا اور دوسری سہ پہر جرمن میم کے ہمراہ گھڑ سواری کرنے والا صاحب۔ بہت سے لوگ جنھیں ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ انھیں نرا صاحب سمجھتے تھے۔

انگریز کے زوال کے دنوں میں صاحب کا لفظ اپنی سابقہ عزت کھو کر صرف ایک پھبتی بن گیا تھا۔ وہ لوگ جن کو صاحب کی شکل نظر آتے ہی سانپ سونگھ جاتا تھا ان کی اولاد صاحبوں کو دیکھ کر زیر لب تبسم فرمانے لگی۔ رائج الوقت اصطلاح کے مطابق جو دیسی انگریز پرست تھا وہ ٹوڈی، جو انگریز دوست تھا وہ صاحب جو پانی کی جگہ کا غذ استعمال کرے وہ نرا صاحب۔ صاحب لوگ کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ وہ کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک اور عمارت کے درمیان پان کی شکل کا ہرا بھرا سبزہ زار ہوتا تھا جس کے ایک طرف سے ادھ کٹی بجری کی سڑک بور بچ میں داخل ہوتی اور دوسری طرف سے بے نیل مرام واپس چلی جاتی۔ کوٹھی عام طور پر گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی عمارت یوں لگتی جیسے مہر سکوت جو کسی نے اس قطعہ زمین پر ثبت کر دی ہو۔ اس خاموشی کو مقررہ اوقات پر انگریزی اردو کے مخلوط جملے اور مشرق کی اینٹ اور مغرب کے گارے سے بنے ہوئے بچے توڑا کرتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کی کوٹھی میں خاموشی قدرے زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور سٹیفنی دونوں خاموش طبع اور کم آمیز ۔ جملہ اولاد ایک بچی پر مشتمل تھی جسے پانچ سال کی عمر میں انھوں نے شملہ بھیج دیا اور دس سال کی عمر میں انگلستان شملہ کانونٹ میں داخل ہونے کے بعد اس بچی کا تعلق ہر اس چیز سے ٹوٹ گیا جو اسے باپ کی میراث میں مل سکتی۔ زبان، ملک روایات اور مذہب۔ البتہ شہسواری میں اس نے جلد ہی اتنا نام پیدا کیا کہ ایک ہاتھ میں کپ لیے اور دوسرے سے لگام تھامے اس کی تصویر ایک انگریزی روزنامہ میں چھپی۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سرپٹ لندن پہنچ گیا۔ ادھر ڈاکٹر حیدر کی کوٹھی میں خاموشی اور گہری ہو گئی۔ یہاں تک کہ نئے طلبا انھیں بے اولاد شمار کرتے اور ان کی الگ تھلگ اور بے تعلق زندگی کا سرا اس محرومی سے جوڑ دیتے۔ ایگنس کو انگلستان بھیجتے وقت والدین کا خیال تھا کہ وہ اسے ہر سال بلایا کریں گے یا اس کے پاس جایا کریں گے۔ حالات پر کب کسی نے اپنی مرضی کے مطابق قابو پایا ہے۔ ولایت بھیجنے کے بعد وہ کوسوں دور بچی سے سالوں دور ہوتے چلے گئے۔ دوسری عالمی جنگ ان کے درمیان حائل ہو گئی۔

برطانوی ہند کی حکومت نے شاہی زرعی کمیشن کے لیے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی خدمات علی گڑھ سے مستعار لیں۔

، غالباً ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ خیال تھا کہ وہ سال دو سال میں واپس جائیں گے حالات کروٹ لیتے رہے، واقعات رونما ہوتے رہے واپسی کا خیال سال بہ سال باطل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ انہیں گیارہ رس تک واپس لوٹنے کی فرصت نہ مل سکی۔ ایک کمیشن کے بعد وسرا اور اس کے بعد تیسرا اور ما بعد فیڈرل پبلک سروس لیشن کی رکنیت یوں ملی جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ان دنوں برطانوی ہند میں سرکاری عہدہ کے ساتھ انعام و اکرام بہت ہوا کرتا تھا۔ عہدہ دار کا نصف رعب بلحاظ اختیار ہوتا اور نصف بلحاظ مواجب۔ زمانہ سستا، تنخواہ وافر۔ خاندان مختصر اخراجات محدود، بیگم رئیس مگر سادہ —— ان حالات میں بچت لازم تھی جسے معاشیات کے استاد نے بیج سمجھ کر زمین میں بو دیا۔ فصل بہت اچھی ہوئی مگر برداشت کے وقت جاپانی فوجیں آگئیں اور بٹائی میں انہیں بھی حصہ دار بنانا پڑا۔

شاہی زرعی کمیشن کے انداز بڑے شاہانہ تھے۔ تھوڑا سا کتابی کام کرنے کے بعد اس کے اراکین ایک لمبے سفر پر روانہ ہوگئے۔ وہ موقع پر زراعت کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ قطعہ زمین بر سر زمین۔ ان کے سفر کے لیے ایک اسپیشل ٹرین چلائی گئی جس کے سفید رنگ کے ڈبے ایک کالے بھجنگ شور مچاتے پتھر کا کوئلہ پھانکتے دھواں چھوڑتے انجن سے اسی رشتہ میں منسلک تھے جو سفید فام برطانیہ اور سیاہ فام برطانوی ہند کے درمیان قائم تھا۔ حاکم و محکوم میں یہ سفیدی و سیاہی کا فرق پوست کے رنگ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ سورج کی گردش کی بنا پر تھا ان دنوں ایمپریل برطانیہ پر نہ سورج غروب ہوتا تھا اور نہ کولونیل ہند پر طلوع ہوتا۔ وہاں خوشحالی کا دن چڑھا ہوا تھا اور یہاں قحط کی رات تھی۔ شاہی زرعی کمیشن کے ذمہ یہ کام لگا کہ وہ قحط کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کرے۔ ان تجاویز کی تلاش میں کمیشن کا ہر ممبر اپنے آٹھ پہیوں اور چار کمروں والے سیلون میں بیٹھا برعظیم کی وسعتوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جہاں جگہ جگہ ٹھہرتی اور ممبر بیچ بیچ سے وہاں کی زراعت کے مسائل اور وسائل کا جائزہ لیتے۔ ریل آخری اسٹیشن پر جا کر رکی تو راہ آہن کے خانہ بدوشوں کو سفر میں ایک سال بیت چکا تھا۔ اس مرحلہ پر کمیشن کے ممبر دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک بلادِ مغرب میں زرعی ترقی کے مشاہدہ کے لیے بھیجا گیا اور دوسرے کو ارضِ مشرق میں زرعی پسماندگی کے مطالعہ کا کام تفویض ہوا۔ اس سفر میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کا منظرف قبلہ شریف کے تھا۔

عارضی کمیشن ختم ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مستقل کمیشن کی میعادی رکنیت پر فیض ہوئے اور اسپیشل ریل گاڑی کا سفید ڈبہ چھوڑ کر ایک خوش نما بنگلہ میں منتقل ہوگئے۔ یہ عالمی کساد بازاری اور بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ اس دورِ بے اماں کا دل خراش ذکر تاریخ اور معاشیات کی کتابوں کے علاوہ اخباروں اور شعروں میں بھی محفوظ ہے۔ اخبارات میں گاہے بی۔ اے۔ پاس بے روزگار کی خودکشی یا بوٹ پالش کرنے کی خبر شائع ہوتی۔ مشاعروں میں محروم نوجوانوں کی ترجمانی ٹیپ کے اس مصرعہ سے ہوتی ؎ اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں۔ بے روزگاری کے ان دنوں میں ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر برطانوی ہند کی مرکزی پبلک سروس کمیشن کے واحد مسلمان ممبر تھے۔ دوسری اعلیٰ ملازمتوں کے علاوہ وہ نوآبادیاتی دور میں خدمت گذاری کی معراج یعنی آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امیدواروں کے انٹرویو لیا کرتے تھے۔ چونکہ رو رعایت کے قائل نہ تھے اور سفارش سے نفرت کرتے لہٰذا اس عہدہ کے لیے نہایت موزوں تھے تاہم عہدہ ان کے لیے موزوں ثابت نہ ہوا۔ بہت سے بے ہنر سفارشی اور بارسوخ سازشی ناامید ہو کر ناراض ہوگئے لوگوں نے طرح طرح کی باتیں ان سے منسوب کر دیں۔ ایک افواہ کے مطابق کمیشن نے مسلمان ممبر کی موجودگی میں امیدواروں کو عید کے دن انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق خواجہ حسن نظامی نے منادی کے روزنامچہ میں ان کے پرخچے اڑا دیے۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ تعلیم کے لیے جس طالب علم کو انگلستان بھیجا وہ پوٹھوار کا کریم حیدر لودھی

تھا۔ مگر وہاں سے جو صاحب بہادر واپس آئے وہ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر (نودھی کریم حیدر) کہلواتے ہیں۔

نئی دلی سے جو خبریں وقتاً فوقتاً علی گڑھ پہنچتیں انھیں قیاس آرائیوں کی بنیاد بنا کر لوگوں نے اندازہ لگایا کہ رکنیت کی میعاد ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ یعنی سر کا خطاب ملے گا اور وہ مرکزی پبلک کمیشن کے چیرمین یا وائسرائے کی ایکزیکیٹو کونسل کے رکن بن جائیں گے۔ دس سال پہلے قائم ہونے والے شاہی زرعی سروس کمیشن کے اسکاچ صدر کا تقرر برطانوی ہند کے وائسرائے کی حیثیت سے ہو چکا تھا، یا اس کی نامزدگی کی خبر آچکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے لارڈ لنلتھگو سے ذاتی تعلقات اس ریل گاڑی میں استوار ہو چکے تھے جس میں وہ سال بھر تک باہم شریک سفر رہے تھے تاہم ایک دن ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر خاموشی اور خوشی سے رئیس شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے علی گڑھ واپس آگئے۔ ظرف اتنا بڑا کہ نئی دلی اس میں سماگئی تو چھلکا نہیں اور علی گڑھ کی مدرسی ملی تو بھی فکر سے لبریز رہا۔ واپسی کے بعد ایک سوال فطری طور پر پیدا ہوا۔ کیا ایک شخص ایسے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد جو ذمہ داریوں کے حساب سے گرانبار، مشاہرہ کے اعتبار سے گراں قدر اور دائرہ کار کے لحاظ سے برعظیم کی وسعتوں پر پھیلے ہوئے تھے چندہ سے چلنے والی جامعہ کے ایک شعبۂ تدریس کی مختصر کائنات پر قانع رہ سکتا ہے یا وہ احساس برتری اور یاد ماضی میں ایسا الجھ جائے گا کہ اس کی الجھن دوسروں کے لیے تفریح اور عبرت کا سامان پیدا کرے گی۔ یہ سوال ایک خدشہ تھا جسے ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کے رویے نے پنپنے کا موقع ہی نہ دیا۔

مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو رہائش کے لیے ایک پھوس والا بنگلہ ملا۔ سامنے لان تھا، شمال میں شاگرد پیشہ اور باقی دو طرف جھاڑ جھنکار۔ بنگلہ اور شاگرد پیشہ (جو ان دنوں اچھی خاصی کالونی ہوا کرتا تھا) کے درمیان گھنے درختوں کے سایہ میں گھوڑوں کے لیے چوبی کٹہرے بنے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے فاصلہ پر ایک پکا اصطبل تھا۔ ایک مدت تک وہاں سواری کے دو تین جانور بندھے رہتے۔ گرمیوں میں جب بہت سے ساتھی پہاڑوں کا رخ کرتے ڈاکٹر ایل، کے، حیدر ہاتھ کا پنکھا جھلا کرتے اور کھدر کا موٹا کرتا پہن لیتے کہ وہ پسینہ چوس لیتا ہے۔ جو لوگ پہاڑ پر نہ جاتے وہ گھر کو خس خانہ بنا لیتے۔ یہ اہتمام بھی ڈاکٹر صاحب کو پسند نہ تھا۔ البتہ اصطبل میں برف کی سلیں باقاعدگی سے لگائی جاتیں تاکہ بے زبان جانور کو تکلیف نہ ہو۔ سردیوں میں لوگوں نے دیکھا کہ اصطبل سے ذرا فاصلہ پر برگد تلے لکڑی کے دو چار گٹھے پڑے ہوتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر صبح سویرے کلہاڑی لے کر لکڑی پھاڑنے کی ورزش کیا کرتے۔ چھپٹیاں ملازموں کے حصہ میں آتیں تاکہ وہ آگ تاپ سکیں اور چولہا گرم کر سکیں۔ صاحب بہادر کے حصہ میں صرف وہ صحت مند خوشی آتی جو مسامات سے پسینہ کی صورت پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ایک نیک دل اور سادہ لکڑہارے تھے۔

حیدر صاحب کے یہاں جو کھانا دونوں میاں بیوی کے لیے پکایا جاتا وہی ان تمام ملازمین میں تقسیم ہوتا جو تنخواہ مع خوراک پر ملازم تھے۔ ان کا سفید ریش باتمیز خانساماں ہمیشہ دھوبی کے دھلے کلف لگے اجلے کپڑے پہنا کرتا۔ باورچی خانہ کا بیشتر کام اس کے نائب کے سپرد تھا۔ وہ ہنڈیا کو دم دیتا اور فارغ ہو کر بٹلر بن جاتا۔ گھر کی چابیاں بھی اسی کے پاس رہتیں۔ حساب بھی وہی رکھتا۔ دوسرے ملازمین پر بھی اسے اختیار حاصل تھا۔ عہد مغلیہ کے خان ساماں کی ایک گھریلو صورت حیدر صاحب نوکر کو آواز دینے کے خلاف تھے۔ وہ خود وقت پر حاضر ہوتا یا اس وقت تک صاحب صبر سے کام لیتے اور انتظار کھینچتے۔ مسز سٹیفنی حیدر البتہ ملازم کو بلانے کے لیے آہستہ آہستہ دو بار پکارا کرتیں۔ خدمت گار، خدمت گار، مسز حیدر جرمنی کے ایک رئیس گھرانہ کی بڑی شائستہ خاتون تھیں۔ حیا ان کے چہرے پر یوں چھائی رہتی جیسے وہ کوئی بات چھپا رہی ہوں اور وہ چھپتی نہ ہو۔ انہی دنوں علی گڑھ میں ایک نوجوان انگریز میم کا اضافہ ہوا۔

اس کے آتے ہی سرگوشیوں اور افواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا وہ خوش شکل اور خوبصورت ضرور تھی مگر اسے خوش اطوار اور خوب سیرت کہنا مبالغہ ہوگا۔ مرتمہ نے اپنا گھر برباد کیا اور دوسروں کا بھی۔ میاں نے عین جوانی میں ان کی حرکتوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی اور یہ آجکل بیچ بڑھاپے کے قبہ جوں پیر شود پر عمل کر رہی ہیں۔ مسز حیدر علی گڑھ میں ہمیشہ کھلے اور لمبے کپڑے پہنتی تھیں اور سر کبھی ہیٹ سے ڈھکا رہتا اور کبھی سکارف سے بندھا ہوتا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں کبھی بھڑکیلے رنگ چست لباس یا لپ اسٹک استعمال کرتے دیکھا ہو۔ ایک بار میں نے ان کی تصویر لینی چاہی وہ ان دنوں انگلستان کی سفوک کاؤنٹی میں ایک ستر سالہ بوڑھی بیوہ کی حیثیت سے زندگی گذار رہی تھیں۔ کہنے لگیں مجھے تیار ہو لینے دو، یوں کھلے بالوں تصویر اتر جاتے مجھے شرم آتی ہے۔ پھر وہ اندر گئیں اور ایک ہیٹ پہن کر کاٹیج کے پچھلے صحن میں امرود کے درخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

مہینہ میں تین چار بار نمبر چار ذکا اللہ روڈ کے پردے والے صحن کے دروازے پر گالف اسٹک سے کھٹکھٹانے کے بعد مسز حیدر دروازے میں کھڑی ہو کر باریک آواز اور بدیسی لہجہ میں کہتیں ''بیگم شیخ عطا اللہ کیا میں اندر آ جاؤں''۔ ان کے لیے حسب خواہش ڈیک کرسی بچھائی جاتی، عام طور پر صحن میں اور گاہے باورچی خانہ میں۔ آنسو پیڑھ پر بیٹھ کر جب وہ توے سے روٹی اتارنے کی مشق کرتیں تو بے حد سنجیدہ ہوتیں۔ تجربہ ناکام ہو جاتا تو وہ اپنے اناڑی پن پر دیر تک کھلکھلا کر بچوں کی طرح ہنستی رہتیں۔ باورچی خانہ میں گفتگو کا موضوع دیسی کھانے پکانے کی ترکیب ہوا کرتی، جسے وہ اکثر لکھ لیتی تھیں۔ صحن میں جب فراغت سے نشست ہوتی تو وہ سادہ گھریلو باتیں کرتیں جن میں محور تھی ایگنس فاطمہ حیدر کا ذکر بار بار ہوتا جسے وہ پیار سے اگی کہتی تھیں۔ ایگنس میری ہم عمر تھی اور مجھے سال بہ سال بڑا ہوتے دیکھ کر وہ اندازہ لگایا کرتی تھیں کہ اب انگلستان میں ایگنس کتنی بڑی ہو چکی ہو گی۔ وہی کلکتہ کے کابلی والا کی شیکوہ زنی۔

ایک دن مسز حیدر نے دوپہر دو دار سہیلیوں کو دعوت پر بلایا اور دوسرے دن ان کے چھوٹے بچوں کی علیحدہ دعوت کی۔ پہلے روز کھانے میں اٹلی سے آئی ہوئی میکرونی بھی تھی جسے مسز حیدر نے بڑے شوق سے خود پکایا اور اصرار کے ساتھ کھلایا۔ کھانے والوں نے ان کا دل رکھنے کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن گھر پہنچ کر صاف اقرار کیا کہ اگر کچھ مقدار پلیٹ میں اور ڈال دی جاتی تو عین ممکن ہے کہ جی خراب ہوتا اور متلی آ جاتی۔ دوسرے دن کی دعوت میں ایک بچے نے معصومیت کے ساتھ پوچھا آنٹی آپ نے کل میری امی کو کیا کھلایا تھا کہ وہ کہتی تھیں۔۔۔ اور بچے نے اسی طرح بے دھڑک سچ بول دیا جیسے تمام بچے ہمیشہ بولتے آئے ہیں۔ جب بچے سچ بولنا چھوڑ دیں گے تو قیامت آ جائے گی۔ لوگ ناحق آثار قیامت کے لیے ضعیف روایتوں کا سہارا لیا کرتے تھے۔

احباب کے مختصر حلقہ میں سال بہ سال ایگنس کے ایک اور جماعت پاس کر لینے کی خوش خبری سنائی جاتی۔ یہاں تک کہ اس نے ادبیات باستانی یونان و روم میں ڈگری حاصل کر لی اب وہ چھ سات زبانوں کی ماہر تھی۔ ایک زمانہ میں ڈاکٹر حیدر کی خواہش تھی کہ فاطمہ زبان شناس کی حیثیت حاصل کر لے اور لیگ آف نیشنز جیسے ادارہ میں مترجم بن جائے۔ لیکن جب اس خواہش کے پورا کرنے کا وقت آیا تو لیگ آف نیشنز ختم ہو گئی اور دوسری جنگ عظیم کسی طور ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اگی نے دوبارہ ثانوی جماعتوں میں داخلہ لیا اور سائنس کا کورس پورا کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہو گئی۔ چند سال اور گذرے اور وہ لیڈی ڈاکٹر بن گئی۔ تعلیم کا یہ ولایتی دور کم و بیش ایک دہائی پر مشتمل تھا۔ یہ والدین اور اکلوتی پردیسی بیٹی کی جدائی کے دس سال تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے ان دنوں جب لڑنے کے لیے اتحادیوں میں سے صرف ایک اتحادی تنہا باقی رہ گیا اور لفٹ وانے نے مشق ستم کے لیے لندن کا انتخاب کیا ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کے ذکا اللہ روڈ کے پھیرے بڑھ گئے۔ یوں وہ ہفتہ میں دو تین بار آنکلتے تھے مگر ان دنوں یہ معمول روزانہ میں تبدیل ہو گیا۔ سوکھی گھاس کے اس گنجے قطعہ میں جو ہمارے اور پروفیسر غلام مرد

کے گھر کے درمیان واقع تھا وہ مونڈھے یا ڈیک چیر پر بیٹھ
جاتے اور دیر تک دوستوں سے گفتگو کرتے رہتے۔ شام پڑتی تو
بی بی سی کے پاس ان ایام میں ریڈیو نہیں تھا۔ وہ اپنا قیمتی
مگر از کار رفتہ ریڈیو تحفہ میں دے چکے تھے اور بنا خریدنے
کے روادار نہ تھے۔ جنگ کا زور کم ہوا تو مسز حیدر نے یہ راز
افشا کیا کہ ان دنوں حیدر صاحب گھر پر ریڈیو رکھنے کی تاب
نہ رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا، آخر کس دل سے میں اپنے گھر کے
محفوظ مگر اداس ماحول میں اُس وحشت کی تازہ ریڈیائی تفصیل
سن سکتا ہوں جو ایک ایسے شہر پر برس رہی ہے جہاں میری
اکلوتی کمسن بچی تنہا رہتی ہے۔ لوگ تھے کہ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر
کو پتھر دل کا آدمی سمجھتے کیونکہ وہ عام زندگی میں جذبات کی
نمائش سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ ضبط اور ضابطہ کے آدمی تھے
اور قول و فعل کے مرد با اصول ایسے کہ اپنی نظروں میں کمسار
ہونے کو سب سے بڑی سبکی سمجھتے تھے۔ وہ منافقت کو شرک
کے بعد سب سے بڑا گناہ جانتے تھے اور جب اسے عام
ہوتے دیکھا تو اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئے۔ مسلم یونیورسٹی
کے ایک وائس چانسلر کی دنیاداری کو دیکھا تو اپنے شعبۂ
تدریس کے کالبد میں سکڑ کر رہ گئے۔ کچھ پروفیسر جبری فارغ
کیے گئے۔ دوسرے ان کے سائے سے ڈرتے تھے۔ ڈاکٹر حیدر
نے اٹھ کر الوداعی تقریر کر ڈالی۔

جنگ ختم ہوئی تو ایک روز اپنے احباب کی مختصر محفل
میں اس کے دوررس اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے۔ یوں
لگتا ہے جیسے دوسری عالمی جنگ فرد کی دولت کے خلاف جنگ
تھی۔ پھر مسکرائے اور کہا، ثبوت کے طور پر میری مثال لیجیے
ہانگ کانگ پر قبضہ کرنے سے پہلے جاپانیوں نے شہر کے سلسلۂ
آب رسانی کو بمباری سے تباہ کر دیا کیونکہ اس نظام کی سرمایہ
کاری میں کچھ حصہ میرا بھی تھا۔ سنگاپور فتح ہوا تو شہر کا بجلی
گھر تباہ ہو گیا، کیونکہ اس کے کچھ حصص میں نے خرید رکھے تھے۔
رنگون انگریزوں کے ہاتھ سے گیا تو میرے ہاتھ سے وہ رقم بھی گئی
جو میں نے وہاں کی چند کمپنیوں میں لگا رکھی تھی۔ پھر سنجیدہ ہو گئے
اور بولے جس تجربہ سے میں دوچار ہوا ہوں اس نے سود و زیاں کا
معیار بدل دیا ہے۔ دولت کا نقصان صبر کا نفع ہوتا ہے۔ بلندی
کی طرف ہلکے پھلکے ہو کر پرواز کرنے کا نام صبر ہے۔ دولت ایک بوجھ
ہے۔ ہر روز کتنے ہی لوگ قارون کی طرح اس بوجھ کے نیچے دبے ہوئے
زمین میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بات بدلی اور کہا، کچھ
دعائیں ساری عمر مانگنی چاہئیں اور کچھ عمر کے مختلف حصوں میں۔
میں تو اب یہی دعا کرتا ہوں کہ خدایا اگر عمر لمبی دے تو بڑھاپا خوشگوار
دینا۔ اس کے بعد وہ مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ ہمیشہ شیرخوار
بچے کی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ معصوم، بے اختیار اور لمحاتی۔

۴۷-۱۹۴۶ء کا تعلیمی سال پروفیسر ایل۔ کے۔ حیدر کی مشغولی
عمر کا آخری سال اور ایم۔ اے معاشیات میں میرا پہلا سال تھا وہ
کلاس میں اپنے نوٹس کی کاپی لاتے اور بیشتر وقت اس میں سے
پڑھتے رہتے۔ آہستہ اور پختہ لہجہ میں۔ گاہے سر اٹھاتے اور ذرا سی
دیر تشریح کرنے کے بعد سر جھکا لیتے۔ رعب اتنا کہ نچلا نہ بیٹھنے والے
شوخ لڑکے بھی ان کے پیریڈ میں پہلو بدلنے سے احتراز کرتے۔ ایک
آدھ بار وہ ناراض ہوئے ناخوشی چہرے پر اس شدت سے نمایاں
تھی کہ اسے کسی فقرے یا لفظ کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ ساری
جماعت دم بخود رہ گئی۔ بلڈ پریشر بڑا موذی ہوتا ہے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ فراغتی دور کی رہائش کے لیے
ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر علی گڑھ، نئی دلی یا لندن کا انتخاب کریں
گے۔ بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ علی گڑھ میں رہیں گے
جہاں اُن کی عمر کا بڑا حصہ گذرا ہے۔ مدت ہوئی کریم حیدر
نامی ایک لڑکا پوٹھوہار کے قصباتی اسکول میں پڑھتا تھا۔
ایک روز اسکول جاتے ہوئے وہ کچے دیہی راستہ میں آنے
والے مٹی کے ڈلوں کو قدم قدم پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ گھوڑے
پر سوار ایک انگریز ادھر سے گزرا۔ اس نے گھوڑا روک کر
اس لڑکے کو ایک نصیحت کی۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ جذبہ
کو اظہار کے لیے بہترین موقع فراہم کرے۔ ٹھوکر مارنے کو بھی

چاہتا ہے۔ تو جاؤ فٹ بال کھیلو۔ وہ لڑکا پڑھنے اور کھیلنے کے لیے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوا۔ کالج میں فٹ بال کا کپتان بنا۔ طلبا کی یونین کا صدر منتخب ہوا۔ امتحان میں اول آیا۔ آغا خاں اسکالرشپ ملا۔ کیمبرج سے ڈاکٹریٹ لی۔ اب وہ ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہو رہا تھا اور ایک بار پھر لوگوں کے اندازے اس کے بارے میں غلط ثابت ہوئے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نوجوانی میں جہاں سے چالیس برس پہلے چلا تھا بڑھاپے میں واپس اسی جگہ جا کر رہنا چاہیے۔ پوٹھوار کی مٹی کے ڈلوں کی کشش نہ گئی کہوٹہ کے چھوٹے سے قصبہ میں جہاں ان دنوں بجلی تک نہ تھی اور مکان بھی کچے پکے تھے انھوں نے رہائش کے لیے جگہ حاصل کر لی۔ ایک خوبصورت ویلا مری میں خرید لیا۔ لودھی کریم حیدر اور سٹفنی حیدر نے یہ طے کیا کہ وہ گرمیاں مری اور سردیاں کہوٹہ میں گزارا کریں گے۔

عام طور پر خدا حافظی کا منظر بڑا ہنگامی، جذباتی اور مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ الوداع پرتکلف، الفراق پرتصنع۔ ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر تکلفات سے اتنا دور تھے کہ جب برعظیم کے ماہرین معاشیات کی انجمن کے سالانہ اجلاس کے صدر مقرر ہوئے اور خطبہ استقبالیہ سننے کے بعد خطبۂ صدارت کے لیے کھڑے ہوئے تو تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔ حضرات، صدارت کے اعزاز کا شکریہ، آیئے اب کام کی باتیں کریں۔ اس خطبہ کے آغاز کی طرح ان کی ملازمت کا انجام بھی بے تکلف اور سادہ تھا۔ آخری دن بھی وہ ہمیں پڑھانے آئے اور معمول کے مطابق لگے بندھے انداز میں اپنے نوٹس پڑھے اور گھنٹہ بجنے پر رخصت ہو گئے۔ البتہ سہ پہر کے وقت طلبا اور اساتذہ جمع ہوئے اور گروپ فوٹو لیے گئے۔ اکتیس برس پرانی کاپی میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ اس میں مہمان خصوصی شعبۂ معاشیات کے چپراسی اسماعیل کے ساتھ کھڑے ہیں۔ تعویذ کشی کے بعد ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر نے دامن جھاڑا اور گھر کی راہ لی۔ وہ سارا ساز و سامان جو سالہا سال کے بعد رحیم بخش بلوچ سکریٹری ڈسٹرکٹ بورڈ کے سامنے ڈی۔ سی ہاؤس ملتان کے [illegible]

نکلا تھا۔ لیکن یہ ملتان کیسے پہنچا اور کیوں پہنچا؟

ایک روز ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر ریلوے مال گودام پہنچے اور اپنا سامان بک کرایا۔ مال گاڑی کے دو ڈبوں میں سامان چڑھا، تالے لگے، اور مہر بند ویگنوں پر از علی گڑھ تا راولپنڈی کا شناختی پرچہ لگایا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف کھولا۔ فال نکالی" اور ہم تم کو کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میوؤں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ تو صبر کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی کی بشارت سنا دو" ابا جان سے کہنے لگے میں اس آزمائش کے لیے بالکل تیار ہوں۔ میں نے اثاثے سے کہیں زیادہ بڑا ذخیرۂ صبر کا جمع کر رکھا ہے۔ سامان بک کیے ہوئے زیادہ دن نہ گزرے ہوں گے کہ آزمائش شروع ہو گئی۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے اور اس سال جس پیمانہ پر خوف، بھوک، جان مال اور میووں کے نقصان سے آزمائش ہوئی اس کا حال لکھتے لکھتے فرشتوں کی انگلیاں تھک گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کوئٹہ پہنچ گئے۔ اور سامان راستے میں گم ہو گیا۔ جہاں سے سامان بھیجا تھا وہ جگہ ہندوستان میں رہ گئی اور جہاں بھیجا تھا وہ پاکستان میں شامل ہو گئی۔ دریافت کریں تو کس سے اور یادداشت بھیجیں تو کس مملکت کو۔ انقلابات میں معمولات کو کون پوچھتا ہے۔ مہینے گزر گئے پھر ایک دن پاکستان کے کسی چھوٹے سے بے نام اسٹیشن کے یارڈ میں مال گاڑی کے دو لاوارث ڈبے کھڑے ہوئے ملے۔ مہریں سلامت، سامان جوں کا توں۔ جسے اللہ رکھے۔ حق بحقدار

کہوٹہ اور مری کے گھروں کو آباد کیے ابھی چند ماہ گزرے ہوں گے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا پیرس اجلاس شروع ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پہلا اجلاس تھا اور اس ادارہ کی رکنیت کی پاکستانی درخواست اس میں پیش ہونی تھی۔ اقوام متحدہ کے اس اجلاس کے لیے جو پاکستانی وفد بھیجا گیا اس میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر شامل تھے۔ قائد اعظم قائد ملت ان سے واقف تھے۔ آزادی سے

کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر صاحب کو مسلم لیگ کی معاشی منصوبہ بندی کی کمیٹی کا رکن بھی مقرر کیا گیا تھا۔ مگر ان حشر کے دنوں میں سیاسی محاذ پر وہ گھمسان کا رن پڑا کہ معاشی غور و فکر کی طرف توجہ کرنی ممکن ہی نہ تھی۔ یوں بھی ڈاکٹر حیدر جی چھوڑ چکے تھے اور ان میں جوش اور لگن کی کمی تھی۔ عملی زندگی کا بہترین حصہ وہ انگریز انتظامیہ کی خدمت میں صرف کر چکے تھے۔ اعلانیہ تو شاید وہ مسلم لیگ کے ممبر بھی نہ تھے۔ ہنگامی سیاست ان کے معتدل مزاج کے خلاف تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ سنہ ۱۹۴۶ء کی سردیوں میں جس دن دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے اچھو میاں مسلم لیگ کے لیے مہاجرت پر لیے ہوئے سالم تانگہ پر رائے دہندگان کی تلاش کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کی ایک سڑک پر ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کو پیدل جاتے دیکھا تو تانگہ روکا اور پولنگ اسٹیشن تک لے جانے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے تانگہ میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے رائے دہندگی کا حق اپنی خوشی سے استعمال کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں مسلم لیگ سے کسی قسم کی آسائش حاصل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے ووٹ کی ادائیگی کا معاوضہ وصول کیا اور اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔ جملہ ختم کیا اور پولنگ اسٹیشن کی طرف قدم مارنے شروع کر دیے۔ اس روز یوں قدمے اور سخنے خدمت کے علاوہ انہوں نے مسلم لیگ کا کوئی اور کام شاید ہی کیا ہو۔ تاہم مسلم لیگ نے یاد رکھا کہ وہ جرمن فرانسیسی اور انگریزی جاننے، سفارتی رکھ رکھاؤ سے واقفیت اور اعلیٰ سطح پر کام کرنے کے تجربے کی بنا پر اقوام متحدہ کے ایک اہم اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کے لائق ہیں۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ اشراف سزاواری کے لیے کھوٹے کی گدڑی بھی چھان پھٹک لیتے تھے۔

پیرس میں اقوام متحدہ کا اجلاس ختم ہوا۔ پاکستان کو ادارہ کی رکنیت مل گئی اور وفد کا ایک رکن بچھڑی بیٹی سے ملنے کے لیے انگلستان چلا گیا جہاں اسے فالج ہو گیا۔ بشفیع حیدر کو خبر ملی تو وہ بھی بیٹی سے ملنے اور شوہر کی تیمارداری کے لیے انگلستان جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ قیمتی سامان بند کر کے ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کے بھائی بیرسٹر حیدر کے یہاں کوپر روڈ لاہور پہنچا دیا اور باقی سامان اسی طرح مری کی کوٹھی میں لگا لگایا چھوڑ کر اس کی چابی بیرسٹر صاحب کے حوالہ کر دی۔ ماں بیٹی نے شوہر اور باپ کی دو تین سال بڑی خدمت کی۔ بالآخر ڈاکٹر حیدر انگلستان میں انتقال کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد بیرسٹر حیدر کا پاکستان میں انتقال ہو گیا۔

مری کے وائیلٹ ویلا کو خالی پڑے پڑے آٹھ دس سال گزر گئے چھت کا روغن پھیکا پڑتے پڑتے بالکل اتر گیا۔ دیواروں کی سفیدی اڑ گئی۔ شیشے چٹخ گئے، لکڑی تڑخ گئی۔ نالی وارنش میں سوراخ ہو گئے۔ لوہے کی ہر شے زنگ آلود ہو گئی اور باقی سب چیزیں گرد آلود۔ ادھر لاہور میں بیرسٹر مرحوم کے پسماندگان کی حالت بگڑ گئی۔ ایک جوان لڑکے کی بینائی جاتی رہی۔ ایک جوان لڑکی کے شوہر نے علیحدگی اختیار کر لی۔ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ گذر اوقات مشکل ہو گئی۔ وہ لوگ چاہتے تو ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کا سامان فروخت کر کے اس مشکل کو آسان کر لیتے مگر بیرسٹر حیدر کی بیوہ پرانے خیال کی تھیں۔ ایسے لوگ زندگی کو ناپائدار اور نیکی کو پائیدار سمجھتے ہیں۔ اس اثنا میں انگلستان سے ابا جان کے نام ڈاکٹر حیدر کی بیوہ کے خطوط اور نیک خواہشات والے تہواری کارڈ باقاعدگی سے آتے رہے۔ خاوند کی یاد، بیٹی کا حال، زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشگوار باتوں کا ذکر۔ میں دیسی کھانوں کی مشق کرتی رہتی ہوں، قاضی یونس ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں گلہریوں سے امرودوں پر میری جنگ جاری ہے، میں نے اطالوی زبان سیکھنے کے لیے ہفتہ واری کلاس میں داخلہ لے لیا ہے، دوسرے ہم جماعتوں کی اوسط عمر میری عمر سے کوئی چالیس پینتالیس سال کم ہوگی، میں کلاس میں درمیانہ درجہ کی طالب علم شمار ہوتی ہوں۔ اپنی سکنی جائداد اور منقولہ سامان کا ذکر تو علیحدہ رہا کبھی بھولے سے اس طرف اشارہ بھی نہ کیا کوئی دس سال کے بعد ایک خط اس مضمون کا آیا کہ جو سامان کوپر روڈ پر پڑا ہے اگر آپ اسے لندن بھجوا سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ یہ چیزیں فاطمہ کو ہماری یاد دلاتی رہیں گی۔

سامان بھیجنے میں کئی دشواریاں تھیں۔ مالک کا انتقال

ردن ملک ہو چکا تھا، جرمن بیوہ پاکستانی شہریت چھوڑ چکی تھی،
بی نے پاکستان دیکھا بھی نہ تھا۔ چاندی کے سامان کی اجازت
سٹیٹ بینک سے لینی تھی اور جملہ سامان کے لیے ضمانت نامہ
اخل کرانے کے بعد چیف کنٹرولر امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ
اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کئی دیگر دفاتر کو وانعہ کی
ملیت، مال کی ملکیت اور بھیجنے والے کے اختیارات کے بارے میں
شفی کرانی ہوگی۔ لیکن ان تمام مراحل سے پہلے ایک کٹھن مرحلہ اس
امان کا حصول تھا کیا مسز حیدر کا ایک ہوائی ڈاک سے آیا ہوا انجی خط
کھا کر ایک دوست اور ان کا لڑکا یہ تمام سامان ڈاکٹر حیدر کے مرحوم
جائی کے پسماندگان سے حاصل کر سکتے ہیں۔ بیرسٹر صاحب کی بیوہ
سے ڈرتے ڈرتے رابطہ قائم کیا گیا۔ انھوں نے بات سنی اور کہا، سو بسم اللہ
رم شاہ سے ٹرک لیے اور سامان لاہور سے ملتان پہنچا دیا۔ خط و کتابت
کے ذریعہ ضمانت دی اور اجازت نامے بنوائے۔ رحیم بخش بوچڑنے
ہرست بنوائی اور دوبارہ حفاظت سے باندھا۔ ٹرک آئے اور کراچی لے
گئے۔ عملہ کے دو آدمی ہمراہ گئے۔ سامان ٹامس کک اینڈ سنز کے حوالے
یا۔ کل خرچ موازی ایک ہزار دو سو سینتیس روپیہ سات آنے۔ چند
ہفتوں میں سامان لندن پہنچ گیا۔ بارہ نومبر ۱۹۵۹ء کا لکھا ہوا
شکریہ کا خط ۴۳ ویسٹ واک، ایسٹ بارنٹ، ہرٹ فورڈشائر
سے میرے نام آیا جس کے اختتام پر درج تھا۔ تمہاری آنٹ
ایس۔ ایچ۔ سامان ٹھکانے لگا تو بیرسٹر صاحب کے خاندان کی
آزمائش بھی ختم ہوگئی۔ لڑکی کے ناراض اور غائب شوہر کے ترکہ
سے کئی مربعے زرخیز زرعی زمین کی یافت ہوئی۔ نابینا بھائی
نے زمینوں کا انتظام سنبھال لیا۔ مسز حیدر نے مری کی کوٹھی بھی
بیرسٹر صاحب کے بچوں کے نام لکھ دی۔ یہ لوگ کرائے کی بوسیدہ
کوٹھی چھوڑ کر بہتر جگہ منتقل ہوگئے۔ سنا ہے لڑکی نے حسب منشا
سی شادی بھی کر لی۔

ایک بار میں مسز حیدر کے گھر گیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق
لندن سے پہلے چار نمبر کی بس پکڑی پھر چھ نمبر کی اور آخر میں
دو نمبر کی بس اسٹاپ کے چوراہے سے جنوبی سڑک پر تھوڑی
دور چلنے کے بعد ایک وسیع مضافاتی سبزہ زار کے چاروں طرف
بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سے چونتیس نمبر کے
دروازے پر دستک دی۔ اس گھروندے کا کل رقبہ اس
اصطبل سے کم تھا جس میں کبھی برف کی سلیں لگائی جاتی
تھیں۔ مسز حیدر ڈائری کھولے عینک چڑھائے باورچی
خانہ میں پلاؤ دم کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ان کا
دم پھولا ہوا تھا۔ پلاؤ پکانے کے آخری مرحلہ کی ہدایات ان
کے لیے آخری معرکہ کے مانند تھیں جسے سر کرنے کے لیے وہ خاصی
بے حال ہو رہی تھیں۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور اگی آ پہنچی۔ ماں
کا چہرہ کھل گیا اور آنکھیں روشن ہوگئیں۔ فرط محبت سے
ماں کے منہ سے کوئی لفظ بھی نہیں نکلا۔ بس یونہی دیکھے اور
نہال ہوئے جا رہی تھیں۔ یہ عمل اتنی دیر جاری رہا کہ پلاؤ کے
آخری معرکہ میں انھیں شکست ہوگئی۔ اگینس باپ کی طرح
بھاری ماں کی طرح لمبی اور مزاج میں دونوں سے مختلف نکلی۔
آواز اونچی اور باتیں مسلسل۔ خوشی کے اظہار کے لیے کبھی قہقہہ
لگاتی کبھی چیخ مارتی نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا جب
سے وہ آئی تھی یوں لگتا تھا جیسے کاٹج میں بھونچال آگیا ہو وہ
چلتے پھرتے کوئی واقعہ سنا رہی تھی۔ کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے
میں۔ کبھی سیڑھیوں پر تو کبھی بالائی بیڈروم میں۔ میاں جانکا تھا
اور ماں کو وہ کہانی باورچی خانہ میں تسلسل سے سنائی دیتی رہی۔
دو ایک بار وقفہ آیا۔ میں سمجھا کہانی ختم ہوگئی یا گلا خشک ہوگیا۔ مگر
ایسی کوئی بات نہ تھی، وہ اس وقت سگریٹ سلگانے یا کش لگانے
میں مصروف تھی۔ کھانے کی میز پر جب اس سے گفتگو ہوئی تو سمجھ
میں آیا کہ وہ شور مچا کر اپنے آپ کو بہلانے اور مصروف رکھنے کی
کوشش کر رہی ہے۔ اگر وہ خاموش ہو تو کوئی اس کے کانوں
میں زور زور سے پکارتا ہے۔ تم ڈوروتھی اگینس فاطمہ حیدر ہو
مباحث کا ایک نشان۔ ایک ایسا حدہ جہاں دو واضح راہیں
مل کر ایک تیسری مگر غیر واضح سمت میں نکل جاتی ہے۔

لندن سے بروک واڈ کا فاصلہ ریل گاڑی نے کوئی ایک

گھنٹہ میں طے کیا۔ جب بروک ووڈ کے اسٹیشن پر اترا تو ایک مضافاتی
شہر کا خیال ساتھ لے کر اترا چھوٹا اور صاف ستھرا شہر جس کے اکلوتے
بازار میں ساری رونق سمٹی ہوگی۔ بازار کے اردگرد رہائشی بستی ہوگی۔
دو منزلہ گھر یا گھر صف بہ صف ڈھلواں کھپریل چھتوں کا سرخ رنگ
ہر گھر کے مرلہ بھر کے سبزہ زار سے مل کر منظر کو خوشنما بنا رہا ہوگا۔ بستی
کے گرد میلوں تک ہرے بھرے کھیت ہی کھیت ہوں گے۔ گاہے
جرسی گایوں کا گلہ نظر آئے گا۔ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا تو اس
شہر کا نام و نشان بھی نہ پایا جو میرے اندازے نے وہاں بسایا تھا۔ ایک
اور ہی شہر آباد تھا۔ بہت بڑا اور بے جان جسے شہر خموشاں کہتے ہیں۔
میلوں میں پھیلا ہوا وسیع قبرستان جس کی چمن بندی کی ہوئی ہے۔ سرخ
سبزہ و قطعے، روشیں۔ روش روش اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے
پیرہن والے پھولوں کے بجائے سنگ مرمر کی صلیبیں قطار اندر قطار
قبروں کے سرہانے سوگوار کھڑی ہیں۔ میل ڈیڑھ میل چلنے کے بعد مڑ کر
دیکھا۔ تا حدِ نگاہ قبریں ہی قبریں ہیں، تا حدِ خیال موت ہی موت۔
حشر کا پھیلا ہوا میدان ہے۔ مردوں کی حاضری لگ رہی ہے۔ ہر ایک
نے سنگ مرمر کا سرد اور بے جان ہاتھ اٹھایا ہوا ہے۔ حاضر جناب۔
ذرا دیر پہلے میں لندن میں تھا۔ اِس اور اُس میں کتنا فرق ہے۔ شاید
کوئی ایسا بڑا فرق بھی نہیں۔ لندن اگر زندوں کا بروک ووڈ ہے تو
بروک ووڈ مردوں کا لندن ہے۔ دونوں گنجان اور آباد ہر طرح، ہر مرتبہ
اور اقسام کے لوگوں سے بھرے ہوئے۔ ہر انسانی خوبی اور خامی کو
اپنے پہلو میں لیے ہوئے۔ ایک خواہشوں کا مسکن، دوسرا حسرتوں کا مدفن۔
دونوں جگہ مختلف محلے آباد ہیں اور سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس
قبرستان میں بھی سڑک کے دوسری جانب مسلمانوں کا محلہ واقع ہے۔
غریب اور ویران۔ نہ قطعہ بندی نہ چمن آرائی۔ سبزہ خشک اور زرد
جھاڑیاں خودرو اور بے تراش۔ اس حصہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک
قطار میں ترک فضائیہ کے چند افسروں کی قبریں ہیں۔ ان کے برابر پہاڑی
پر اُگے ہوئے تنہا درخت کے نیچے حسب وصیت ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر
دفن ہیں۔ میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس شخص کو یاد کیا
جس نے ایک بار خود الزامی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنی بظاہر کامیاب
دنیاوی زندگی کی بے ثمری اور پس انداز کی بے مائیگی کا یوں اعتراف
کیا تھا۔ میں نے ساری زندگی تعلیم سے فراغت تک فاصلہ طے کرنے
میں گنوا دی۔ برِعظیم کے مسلمانوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا حالانکہ میں اس کی اہلیت
اور استطاعت رکھتا تھا۔ اولاد ایک اور وہ بھی غیر ملکی۔ میں نے قوم کو کچھ بھی
نہیں دیا ایسی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے۔

زندگی ایک موج ہے۔ دریا سے اٹھنے کے بعد اگر وہ ساحل سے ٹکرائے
تو بھنور کی آنکھ اور مرنے والے کی آنکھیں دونوں اس کے ماتم میں
روتی رہتی ہیں۔ میں قبرستان سے سر جھکائے خاموش یہ سوچتا ہوا
واپس چلا۔ کیا اس کا بھی کوئی مداوا ہے۔ آواز آئی ضمیر کا لو
میں روشن چراغ آرزو کر دے۔ میں نے آرزو کا ایک چھوٹا سا چراغ روشن
کیا اور مڑ کر دیکھا۔ تا حدِ نگاہ چراغ ہی چراغ۔ تا حدِ خیال روشنی ہی روشنی

مولانا عبدالماجد دریابادی

ظفر حسین خاں

جس طرح عالم صوری میں نغمۂ فطرت اپنی جلوہ نمائیوں کے لیے کہیں
ری اور کہیں بلبل کی نغمہ سرائیوں کا آئینہ اختیار کر لیتی ہے اسی طرح عالم معنوی
ل مشیت طبعی اپنے ظہور کے مختلف اسلوب چن لیتی ہے۔ پیغامبر کا پیغام،
اعر کا شعر، حکیم کی حکمت یہ سب مظاہر مشیت ہی ہیں۔ اور قبول عام ان کا
ند۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ان مخصوص شخصیتوں میں سے تھے جن کا
نش جریدہ عالم پر ایک مرتبہ ثبت ہو جانے کے بعد پھر کبھی کے مٹائے
ٹ نہیں سکتا۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں ۱۹۰۹ء سے نیاز حاصل رہا ہے
۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہو چکے تھے اور میں ۱۹۰۹ء میں
۔ کیننگ کالج میں ہم مذاق طلباء کی ایک مختصر سی جماعت تھی جس میں
کٹر حفیظ سید مرحوم، مشیر الدین ایڈووکیٹ لکھنؤ بھی تھے اسی زمانہ میں
دہ بھی ایک ہی مذاق کے طلباء کا گروہ پیدا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر سید سلیمان
رغ التحصیل ہو چکے تھے۔ مولوی عبدالسلام بھی فضیلت کے قریب تھے
لوی عبدالباری صاحب معقولات سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ
ان لوگوں نے جو انجمن قائم کی تھی اس کے صدر مولانا عبدالماجد دریابادی
ب تھے اور میں سکریٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔

مولوی عبدالماجد صاحب بھی اس کے سرگرم ممبر تھے علامہ شبلی
ام کی ادبی شخصیت سے ہم سب متاثر تھے اور ان کی تحریروں کو سنجیدہ
ب کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے۔ شاید کہ وقت [illegible] آباد [illegible] کے
ہ جہاں علامہ شبلی نے سیرت نبوی کا دفتر قائم کیا تھا [illegible]

ہوتے تھے اور ان کے فیضان صحبت سے مستفیض۔ علامہ شبلی کی نظر انتخاب
مولانا عبدالماجد پر اس وقت پڑی جب مولانا نے علامہ کی الکلام پر الناظر
لکھنؤ میں ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ اور حقیقت یہی مولانا عبدالماجد دریا
بادی کا یہ مضمون ان کے ایوان شہرت کی پہلی اینٹ تھی۔ لطف یہ کہ سارا
مضمون علامہ شبلی کے اسٹائل کا نہایت کامیاب چربہ تھا۔

مولانا عبدالماجد کی سوانح عمری دراصل ایک تاریخی فلسفہ ہے۔
اس لیے کہ ان کی ایک مختصر سی حیات میں وہ سب دور گذر چکے ہیں جو
ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی تاریخ فلسفہ کا موضوع ہوتے ہیں
مذہب پرستی، مذہب سے بیزاری، تشکیک الحاد اور ایمان و ایقان کی جانب
بازگشت، مولانا کی تنہا ذات ان تمام مد و جزر افکار کا مرکز رہی ہے۔

مولانا کی حیات کے خاص خاص واقعات یہاں سپرد قلم کیے جاتے ہیں
خانگی حالات اور ابتدائی تعلیم: مولانا عبدالماجد ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے
تین بھائی بہن میں سب سے چھوٹے تھے۔

بسم اللہ کی رسم پانچویں سال کی عمر سے کرادی گئی تھی۔ گھر دنیوی
خوشحالی کے ساتھ ساتھ اچھا خاصا مذہبی بھی تھا۔ مولانا کے والد ماجد
نہایت دین دار بزرگ تھے۔ عین دوران حج میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا
ابتدائی تعلیم اسی انداز پر ہوئی جو عام مسلمان شرفاء کے ہاں رائج ہے یعنی
پہلے قرآن مجید اس کے بعد مولوی اسمعیل کی اردو ریڈریں، فارسی میں
گلستاں بوستاں یوسف زلیخا سکندر نامہ کریما [illegible] سعادت وغیرہ [illegible]
سال [illegible] اسکول میں داخلہ ہوا [illegible] اسکولوں میں [illegible]

سولہویں سال سیتاپور سائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور سب مضمونوں میں برتی لیکن حساب میں کسی قدر کچے تھے۔ اس لیے سکنڈ ڈویژن سے پاس ہوئے۔

عربی کی ابتدائی تحصیل حکیم مرزا محمود کی صاحب اور اس کے بعد مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محل سے کی۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں خوب جی لگا کر پڑھیں۔ مولانا پڑھنے کے شروع سے بڑے شوقین تھے اُس زمانہ میں اخبار، اشتہار، رسالہ، کتاب، جو چیز ہاتھ آگئی اسے بے پڑھے نہ چھوڑتے تھے۔ اسکول سے جاتے آتے خوب بھوکے ہوتے، ناشتہ پر گرتے لیکن اس وقت بھی کوئی کتاب، اخبار، رسالہ سامنے رہتا۔

الحاد کا آغاز۔ مضمون نگاری کا سلسلہ بارہویں سال ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا نے اپنے مضامین میں کسی سے بھی اصلاح نہیں لی۔ مضامین فرضی ناموں سے لکھے گئے۔ مضامین زیادہ تر مذہبی ہوتے تھے۔ ایک پورا رسالہ اسی سن میں عیسائیوں کے جواب میں لکھ ڈالا۔

۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج میں داخل ہوئے اب کالج کی لائبریری اور غالباً کلب کی لائبریری تھی اور مولانا بے تحاشہ انگریزی کتابوں پر گرے رفتہ رفتہ عقائد میں تزلزل پیدا ہو گیا اور سال چھ ماہ کے اندر ساری دینداری کی عمارت زمین کے برابر ہو گئی۔ ریشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن کے سستے ایڈیشن اس وقت بازار میں کثرت سے تھے ان کتابوں نے آگ پر تیل کا کام کر دیا۔ اب مولانا بجائے مسلمان کے اپنے ریشنلسٹ، ایگناسٹک اور لاادری کہلانے پر فخر کرنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں جب ایف اے کے امتحان کا فارم بھرنے کا وقت آیا تو مجھ سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیئے بالآخر طے پایا کہ دیانتداری اس کی مقتضی ہے کہ فارم میں مذہب کا خانہ چھوڑ دیا جائے۔

اعلیٰ تعلیم۔ عربی بطور سکنڈ لنگوئج کورس میں برابر رہی۔ ۱۹۱۲ء میں بی اے کیا۔ منطق اور سائیکالوجی سے خاص ذوق تھا چنانچہ جب دیگر طلباء کے ہاتھ میں جیمس کی ٹکسٹ بک آف سائیکالوجی کی مختصر جلد تھی جو بی اے کورس میں مقرر تھی، مولانا کے پاس جیمس کی پرنسپلز آف سائیکالوجی کی دو جلدیں تھیں۔ جو اس وقت ایم۔ اے۔ کورس میں داخل تھیں۔ اسی کو پڑھ کر امتحان دیا تھا۔ پہلی کتاب جو مولانا نے خریدی نہ تھی۔ اسی زمانے میں انگریزی میں مضمون نگاری شروع ہو چکی تھی۔ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ بمبئی میں اور ولایتی پرچوں مثلاً نیچر سیٹرڈے ریویو وغیرہ میں مضمون لکھے تھے۔ اردو رسالوں میں الناظر ادیب، الندوہ وغیرہ مولانا کے رشحات قلم سے سیراب ہوتے رہتے تھے کالج میں پروفیسر اور پھر پرنسپل کمونا کی بھی ان پر خاص توجہ رہی۔ فلسفہ میں ایم اے کرنے علی گڑھ گئے۔ لیکن کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ تکمیل نہ کر سکے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ۔ ۱۰-۱۹۰۹ء میں وکیل ایجنسی امرت سر متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً، "غذائے انسانی"، "محمود غزنوی" وغیرہ شائع کر چکی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلی مستقل کتاب "فلسفۂ جذبات" انجمن ترقی اردو کی طرف سے نکلی، اس کے سال دو سال بعد انجمن مذکور ہی نے فلسفۂ اجتماع شائع کی نومبر یا دسمبر ۱۹۱۵ء میں انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈر شپ" لندن کے نامور فشر انیٹ ڈون ایجنسی نے شائع کی اور اس پر ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ سے لے کر چھوٹے بڑے متعدد ولایتی جریدوں نے تبصرے کیے۔

اس کے بعد اردو تصنیف و تالیف کا کام مسلسل اور باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا اور ۲۲، ۲۳ سال کی عمر میں مولانا مستقل اور نامور مصنفوں کی صف میں آگئے۔

روحانی دور۔ اگر سیرت انسانی کو دل و دماغ کی دو مستقل جزئیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو بعض شخصیتیں ایسی نکلیں گی جن پر "دماغ" کا غلبہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پہلو میں دل ہے ہی نہیں، اس کی مثال جرمنی کا مشہور عالم کانٹ ہے جو ایک کافر ادا کے خنجر ابرو سے بری طرح گھائل ہو کر بچ گیا اور ساری عمر تجرد ہی میں کاٹ دی برخلاف اس کے بعض ایسے دل چلے ہوتے ہیں کہ گویا دماغ رکھتے ہی نہیں، مولانا کی سیرت میں فطرت نے دل و دماغ کا ایک لطیف توازن ودیعت کیا تھا اور کیرکٹر کے ان دو اسپرنگوں میں تعاون ہونے سے فکر و عمل اور کردار کے ہر شعبہ میں ایک ایسا دل آویز توازن پیدا کیا گیا تھا جو بلند مرتبہ شخصیتوں کا مخصوص جوہر ہوتا ہے۔ جب مولانا پر روحانی دور گزر رہا تھا میں لکھنؤ ہی میں تھا اور ان کے ساتھ شب و

روزی نشست و برخاست تھی، رازدانی اپنے ساتھ رازداری کے فرائض بھی عائد کرتی ہے. بہرطور ایک ناول نگار کی زبان سے نہ سہی ایک مورخ کی کی سیدھی سادھی بے کیف اور معاملہ فہم زبان اختیار کرتے ہوئے اس قدر لکھنے پر کفایت کرونگا کہ ۱۹۱۷ء میں مولانا کی وہیں شادی ہوگئی جہاں وہ چاہتے تھے اور بحمد اللہ محبت وشیفتگی کا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ آخر عمر تک برقرار رہا، بلکہ ایک ازمائش میں پڑجانے کے باوجود اس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا.

ادبی نقطۂ خیال سے ہماری دلچسپی کی چیز اس رومانی دور کا وہ سایہ ہے جو مولانا کے قلم پر پڑا. یوں تو غزل ونظم سننے اور پڑھنے کا شوق شروع سے تھا. لیکن اس زمانہ میں باقاعدہ غزل گوئی بھی شروع ہوگئی تھی. غزلیں بالعموم حسرت موہانی، شیفتہ، جوہر، مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی زمینوں میں ہوتی تھیں. اور کلام بھی کبھی کبھی حضرت اکبرالہ آبادی کے پاس اصلاح کے لیے بھیجتے رہتے تھے. ایک ڈرامہ "زود پشیمان" کے نام سے گمنام اور اسی دور کی یادگار ہے جو غالباً غالب کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیدرآباد کی ملازمت :- اس ساری مدت میں خیالات ملحدانہ اور مادہ پرستانہ رہے. اور فخر مل اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ کی ترجمانی پر رہا، ۱۹۱۷ء میں مسٹر راس مسعود (جو حیدرآباد میں اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات تھے) اور مولوی عبدالحق صاحب کے اصرار سے حیدرآباد گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتۂ ترجمہ وتالیف میں چار سو کے مشاہرہ پر ملازمت منظور کرلی. اس سے قبل کا واقعہ یعنی ۱۹۱۶ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کے ملازمت کرنے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی دلداہی اور عنائیتوں کے باوجود چند ہفتوں کے بعد چھوڑ دینے کا ہم سب کے علم میں تھا چنانچہ جب مولانا حیدرآباد جانے کے لیے پابہ رکاب تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ "استعفا بھی جیب میں ہے یا نہیں"،

الحاصل لشتم پشتم ایک سال حیدرآباد میں کاٹا اور اگست ۱۹۱۸ء میں رخصت لے کر لکھنؤ واپس آئے تو پھر حیدرآباد استعفا ہی گیا.

مولانا کی تصانیف میں "فلسفۂ اجتماع" واقعی مذہبی نقطۂ نظر کہیں کہیں فی الجملہ قابل اعتراض ہے حیدرآباد میں "غیر ملکیوں" کے خلاف ہمیشہ ایک محاذ قائم رہتا تھا چنانچہ اس کتاب کو آڑ بناکر بڑی سختی سے لے دے مچائی گئی.

بیسیوں فتوے کفر کے شائع کیے گئے اور جوش وغیظ کا طوفان مہینوں برپا رہا.

زمانہ قیام حیدرآباد میں بعض بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا ہوگئے تھے جن میں خاص طور پر قابل ذکر عماد الملک سید حسین بلگرامی، نواب سالار جنگ، سرکشن پرشاد، نواب سراج جنگ، ہوش بلگرامی کے نام ہیں.

عبوری دور :- حیدرآباد سے لکھنؤ آکر ہندو فلسفہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا. انگریزی میں جو ملا بغیر پڑھے نہ چھوڑا. مسز بسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، اربندو گھوش، اور ٹیگور کی تصنیفات میں سے کوئی کتاب مطالعہ سے نہ بچی، سب سے زیادہ موثر مسز بسنٹ اور بھگوان داس کی تحریریں ثابت ہوئیں. اس مطالعہ نے بالکل نیا منظر آنکھوں کے سامنے پیش کردیا اور یہ بات پہلی بار ذہن میں آئی کہ فرنگیت اور مادیت ہی دنیا میں فلسفہ کے آخری لفظ نہیں. بلکہ روحانیت، خدا پرستی اور الہیاتی مباحث بھی کچھ معنی رکھتے ہیں یہ دور ۱۹۱۸ء کے سہ ماہی سے لیکر دو برس تک رہا اور کہنا چاہیئے کہ مولانا کے الحاد اور اسلام کے درمیان کا عبوری دور تھا. رفتہ رفتہ طبیعت مذہب کی طرف کھنچنے لگی اور پیمبرؐ اور بزرگان دین سے بیزاری باقی نہ رہی.

ہندو تصوف سے اسلامی تصوف کی جانب منتقل ہوجانے میں کچھ دیر نہ لگی اور گیتا کے پرشوق مطالعہ نے گویا مثنوی مولانا روم کے لیے دروازہ کھول دیا. مثنوی کا ہاتھ لگنا تھا کہ مولانا اس کے عاشق ہوگئے اور اس کی چھ ضخیم جلدیں مع شرح وحاشیہ، ۲۶ ہزار اشعار لفظ بلفظ پڑھے اور ایک ایک شعر پر وجد کی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی علامہ شبلی کی سیرۃ النبی اور محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن بھی اسی درمیان میں اپنا کام کرتے رہے اور نفس مذہب کے فلسفیانہ مطالعہ میں

خصوصی جذبات اسلام کے بجائے پیدا ہو گئے تھے جو مذہب کی تحقیق میں شغف
کا یہ عالم تھا کہ یورپ کے ماہر علماء کی کتابوں کے مطالعے پر قناعت نہ کی۔
بلکہ احباب کے پاس اس موضوع پر جو کتابیں پڑھنے کے قابل تھیں وہ بھی
مانگ مانگ کر پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مجھ سے بھی مولانا نے فلسفۂ مذہب پر
کتابیں منگائی تھیں۔ اور میں نے ڈاکٹر مسنز بیس کی ہسٹری آف ریلیجن، ٹوس
کی سائیکالوجی آف ریلیجن اور والاڈ کی انٹروڈکشن ٹو دی فلاسفی آف
ریلیجن مولانا کو بھیجی تھیں۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی کی زندہ شخصیت بھی اس
مجوزہ منزل کو طے کرنے میں یگانہ مدد دیتی رہی۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی جب لکھنؤ تشریف لاتے تھے امین آباد میں
ایک فلیٹ میں قیام کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد ان سے ضرور ملنے جاتے تھے
کمال کہ حضرت اکبر مرحوم نے ایک بار بھی تبلیغ نہیں فرمائی۔ لیکن نہایت
لطیف اشاروں سے اسلام کی جانب مولانا کی طبیعت کو مائل کرتے
رہے۔ مولانا محمد علی کی صحبت و رفاقت بھی منزل اسلامیت کی جانب
لانے میں معین رہی۔ آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے روحانی
عقیدت سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔

اس زمانہ میں انگریزی مضامین ماڈرن ریویو کلکتہ میں زیادہ تر
نکلتے رہے۔ کبھی نام سے کبھی گمنام۔ کبھی اے، ایم کے نام سے معارف کی
ایڈیٹری بھی مدت تک کی۔ لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار حقیقت نکلوایا۔
مدتوں اس میں لکھتے رہے۔ لیکن زیادہ تر گمنام طور پر۔

نظام کی قدردانی ______ ۱۹۱۹ء میں سر امین
جنگ سکریٹری اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کا تار مولانا کی طلبی میں آیا۔
تار پاکر حیدرآباد گئے۔ چار دن مہمان رہے۔ باریابی ہوئی اور ۱۵۰ کا
وظیفہ مقرر ہو گیا کہ خواہ کہیں رہیں، ہر سال جس موضوع پر چاہیں
کوئی کتاب کسی ضخامت کی ہو تیار کریں۔ ۱۹۴۶ء میں وظیفہ کی تعداد
دو سو ماہوار ہو گئی۔

تجدید اسلام:- ۱۹۲۱ء سے کہنا چاہیے کہ مولانا از سر نو مسلمان
ہوئے۔ اور اسی وقت سے لکھنؤ کی مستقل سکونت ترک کرکے دریاباد
چلے گئے۔ لکھنؤ میں عزیزوں دوستوں کی کثرت تھی۔ لکھنے پڑھنے کا وقت
کم ملتا تھا۔ دریاباد میں مجھے مولانا کا مہمان ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں
وہ اپنی زندگی نہایت منضبط پروگرام کے تحت بسر کر رہے تھے آبائی
گھر کو ضروری ترمیم کرکے اپنے حسب ضرورت بنایا تھا۔ لائبریری کے لیے
ایک لمبی گیلری نکالی تھی جو میرے پہنچنے کے بعد ہی انہوں نے مجھے
بڑے شوق و مہربانی کے ساتھ دکھائی۔ گھر پر پڑھی ہوئی فارسی اور
کالج میں پڑھی ہوئی عربی اب کام آئی۔ تصوف کا بڑا لٹریچر اب فارسی
میں ہے۔ پہلے اسے پڑھا پھر رفتہ رفتہ کلام، حدیث، تفسیر کا مطالعہ کیا
اور ۱۹۲۹ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔

صحافت:- ۱۹۲۳ء میں محبت و عقیدت کے تعلقات مولانا محمد علی
کے ساتھ اور گہرے ہو گئے۔ جو ان کے ساتھ سنہ وفات ۱۹۳۱ء تک بڑھتے
ہی گئے۔ دہلی ان کے پاس برابر جانا ہوتا رہتا تھا اور ان کا روزنامہ ہمدرد
عملاً شروع نومبر ۱۹۲۴ء ہی سے مولانا کے اختیار میں تھا۔ باقی ۱۹۲۸ء میں
تقریباً آٹھ ماہ تک باضابطہ مولانا ہی کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا محمد علی
بغرض علاج یورپ گئے ہوئے تھے اور پرچہ مولانا کے ہاتھ میں چھوڑ گئے تھے
پرچہ پر مولانا کا نام بطور نگران نکلتا تھا۔

آخری ایام:- ۱۹۳۳ء میں تحریک قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ
و تفسیر پیدا ہوئی۔ یہ کام بیک وقت کئی گھنٹے کی مشغولی کا تھا پرچہ مجبوراً بند کرنا
پڑا۔ مئی ۱۹۳۵ء سے مہیا انتظام کے ساتھ یہ پرچہ "صدق" کے نام سے
پھر نکلنا شروع ہوا۔ کبھی سہ روزہ مگر عموماً ہفتہ وار۔ جو لوگ مولانا
کی طرز تحریر اور بلندی خیال کے شیدائی تھے اخبار کو ہاتھوں ہاتھ
خریدتے اور نمبر کا انتظار کرتے۔

سیاسیات:- عملی سیاسیات سے کبھی مولانا کو دلچسپی نہیں رہی
البتہ اسلام اور مذہب کے ماتحت اس سے برابر تعلق قائم رہا۔ چنانچہ
۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت میں عملی حصہ لینا شروع کیا ۱۹۲۵ء میں
اودھ کی صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے اور تین سال متفقہ
طور پر اس عہدہ پر انتخاب ہوتا رہا آخر جب کمیٹی کے اندر اختلافات
کے آثار دیکھے تو استعفا دیدیا۔ آل انڈیا مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی
کے بھی کئی سال ممبر رہے اور اس کی مختصر مجلس ورکنگ کمیٹی کی ممبری
پر دو سال تک انتخاب ہوتا رہا۔ فروری ۱۹۲۷ء میں سالانہ جلسہ
خلافت لکھنؤ میں صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے خطبہ پڑھا۔

ادبی اور تعلیمی اداروں سے تعلق۔ مذہب کے بعد مولانا کے ذوق کی چیز اردو ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی انجمن اردو کے غالباً ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۱ تک صدر رہے۔ ہندوستانی اکیڈمی یوپی کونسل اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں کئی سال تک ایم۔اے اردو کے ممتحن رہے لکھنؤ اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں بھی ممتحن ہوتے رہے۔

تصنیفات۔ مولانا نے سنجیدہ ادب کا معتدبہ اضافہ کیا پھر انداز تحریر اس قدر دل آویز و شگفتہ کہ جن کو موضوع بحث سے دلچسپی نہیں ہے وہ لطف ادب ہی حاصل کرنے کے لیے مولانا کی تصنیفات پڑھتے ہیں۔ ان کی خاص خاص تصنیفات کی فہرست یہ ہے۔

(۱)۔۔۔ تفسیر قرآن مجید انگریزی میں دو پاروں کی تفسیر شائع ہو چکی ہے (تاج کمپنی لاہور و کراچی) یہ تقسیم ہند سے بہت پہلے مولانا تاج کمپنی کو اشاعت کے لیے دے چکے ہیں۔ ۲۸ پارے پبلشر کے پاس ہیں۔

(۲)۔۔۔ سائیکالوجی آف لیڈرشپ (فشر انون لندن)

(۳)۔۔۔ اردو ترجمہ تفسیر القرآن (تاج کمپنی)

(۴)۔۔۔ مقالات ماجد، ادبی مضامین کا مجموعہ (تاج آفس بمبئی)

(۵)۔۔۔ مقالات حصہ دوم انشاء ماجد کے نام شائع ہوا۔

(۶)۔۔۔ مادی فلسفہ حصہ اول دوم (دارالمصنفین اعظم گڈھ)

(۷)۔۔۔ سفر حجاز (دارالمصنفین)

(۸)۔۔۔ فیہ ما فیہ، ملفوظات مولانا روم (دارالمصنفین)

(۹)۔۔۔ تصوف اسلام (دارالمصنفین) اس کتاب کے ۵ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۱۰)۔۔۔ فلسفۂ جذبات (انجمن ترقی اردو)

(۱۱)۔۔۔ فلسفۂ اجتماع۔ (انجمن ترقی اردو)

(۱۲)۔۔۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ ۲ جلد لیکی کا ترجمہ (انجمن ترقی اردو)

(۱۳)۔۔۔ تاریخ تمدن۔ بکل کا ترجمہ دو جلد جس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے (انجمن ترقی اردو)

(۱۴)۔۔۔ مکالمات برکلے (دارالمصنفین)

(۱۵)۔۔۔ ہم آپ یا پاپولر سائیکالوجی (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد)

(۱۶)۔۔۔ منطق قیاسی و استقرائی (سررشتہ تالیف ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

(۱۷)۔۔۔ قصص و مسائل (رضا اکیڈمی رام پور)

(۱۸)۔۔۔ اسلامیہ کالج کے سامنے دو لکچروں کا مجموعہ

(۱۹)۔۔۔ محمد علی مرحوم ذاتی ڈائری کے ورق پہلا ایڈیشن

(۲۰)۔۔۔ حکیم الامت نقوش و تاثرات دوسرا مکمل ایڈیشن تیار)

(۲۱)۔۔۔ تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام

(۲۲)۔۔۔ تمدن اسلام کی کہانی، اس کی زبانی، مجلس اسلامیات یونیورسٹی علی گڑھ

اور بہت سی چھوٹی کتابیں اور رسائل اس کے علاوہ ہیں جو طوالت کے خیال سے قلم انداز کیے جاتے ہیں۔ معارف، الناظر، اردو، ہندوستانی وغیرہ رسائل میں اردو مضامین اور ستیا سوفٹ ماڈرن، ریویو اسلامک ریویو، دکن میں انگریزی مضامین صدہا صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں

افسوس کہ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ان کی تجہیز و تکفین ان کے آبائی قبرستان دریاباد میں ہوئی۔

پروفیسر ہادی حسن

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

غیر منقسم ہندوستان اور بعد میں آزاد ہندوستان میں
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی علمی شہرت جن اساتذہ کی وجہ
ن ان میں پروفیسر ہادی حسن مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ درج
طور میں ان کی حیات اور کارناموں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی
ہے تاکہ آج کی نسل ایک ایسے استاد کے کارناموں سے واقف
جس نے عمر بھر علم و دانش کا چراغ فروزاں رکھا اور اسی چراغ
باریوں سے علی گڑھ کی علمی فضا منور رہی۔

پروفیسر ہادی حسن صاحب ۳ ستمبر ۱۸۹۶ء کو حیدرآباد
میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم امیر حسن صاحب ریاست۔
آباد کی انتظامیہ کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور مزید
کے کمشنر کی حیثیت سے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔
ن صاحب کی والدہ محترمہ ایک ایرانی النسل خاتون تھیں جنکی
تربیت نے ہادی صاحب کو فارسی زبان و ادب کا جید
بنایا۔

ہادی حسن صاحب نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیمات کے
حیدرآباد دکن میں طے کیے۔ پھر سائنس کے ایک طالب علم
بت سے فرگوسن کالج پونہ میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں
B.Sc. کی ڈگری لی۔ اس کامیابی کے بعد ریاست حیدرآباد
لینے پر وہ مزید تعلیم کے لیے لندن گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں
جہاں ان کے خاص مضامین ارضیات (GEOLOGY)
نباتیات (BOTANY) اور کیمیا (CHEMISTRY) تھے۔

جب ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فیصلہ کن
مراحل میں داخل ہو گئی تو ہادی حسن صاحب اس جدوجہد میں حصہ
لینے کے لیے اپنے وطن واپس آ گئے اور انہوں نے یہاں واپس آکر
سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ بقول ڈاکٹر ظفر(؟) احمد صدیقی
گاندھی جی ان کے کاموں سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے
اپنی ایک تحریر میں ہادی حسن صاحب کے کاموں کو بہت سراہا بھی تھا۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ان کا تعلق نباتیات کے
ریڈر کی حیثیت سے شروع ہوا۔ اس زمانے تک یونیورسٹی میں
ارضیات کا درس نہیں دیا جاتا تھا۔ علی گڑھ میں کچھ مدت گزارنے
کے بعد ہادی حسن صاحب دوبارہ لندن گئے اور لندن یونیورسٹی
سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آ گئے۔
اس ڈگری کے حصول کے بعد ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
کے شعبۂ فارسی کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا گیا جہاں ۲ ستمبر ۱۹۶۱ء(؟)
تک وہ نئی نسل کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ ہادی حسن صاحب
نے اپنی عمر کے ساٹھ سال ۱۹۵۶ء میں پورے کر لیے تھے۔ اس
زمانے کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ہادی حسن صاحب کی
مدت ملازمت میں یک وقت چار سال کی توسیع دی اس طرح
وہ ۱۹۶۰ء تک کام کرتے رہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں ہادی حسن

صاحب کے علاوہ صرف پروفیسر محمد حبیب صاحب کو اسی طرح کی چہار سالہ توسیع دی گئی تھی۔ ان توسیعات سے جہاں ان اساتذہ کے غیر معمولی علم و فضل پر روشنی پڑتی ہے وہیں ذاکر صاحب کی علم نوازی اور اہل علم کی قدر افزائی کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

درس و تدریس کی مشغولیتوں کے باوجود انہوں نے جو علمی کارنامے انجام دیئے ان کی فہرست درج ذیل ہے تاکہ نئی نسل کو اس بات کا علم ہوسکے کہ اس کے بزرگ کس انتھک محنت، لگن اور دیدہ ریزی سے کام کر کے اس کے لیے کتنا اہم اور وسیع سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔

۱۔ اسٹڈیز ان پرشین لٹریچر ۱۹۲۳ء
۲۔ لے ہسٹری آف پرشین نیوی گیشن ۱۹۲۸ء
۳۔ فلکی، ہز لائف ٹائم اینڈ ورکس ۱۹۲۹ء
۴۔ دیوانِ فلکی شیروانی ۱۹۳۰ء
۵۔ رضی الدین نیشاپوری، ہز لائف اینڈ ورکس ۱۹۳۴ء
۶۔ دی یونیک مدراس مینو اسکرپٹ آف دیوان فلکی ۱۹۵۱ء
۷۔ مغل پوئٹری، اِٹس ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ویلیو ؟
۸۔ دی یونیک دیوان آف امپرر ہمایوں ۱۹۵۲ء
۹۔ قاسم کاہی، ہز لائف ٹائم اینڈ ورکس ۱۹۵۴ء
۱۰۔ دیوان قاسم کاہی ۱۹۵۵ء
۱۱۔ مجموعۂ مقالات (فارسی) ۱۹۵۶ء
۱۲۔ شکنتلا (فارسی ترجمہ) ۱۹۵۶ء
۱۳۔ ریسرچز ان پرشین لٹریچر ۱۹۵۸ء

ہادی حسن صاحب نے علم و ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں اس کا اعتراف ہندوستان اور ایران دونوں کی حکومتوں نے کیا ۱۹۵۹ء میں حکومت ہند نے اُن کو اپنے اعزاز سے نوازتے ہوئے سرٹیفکٹ آف آنر دیا جس کے ساتھ ایک اعزازیہ بھی ان کو تاحیات ملتا رہا۔

۱۹۶۰ء میں ایران کی حکومت نے اپنے انعام "نشانِ دانش درجۂ اول" سے نواز کر ہادی حسن صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ اس کے ایک سال کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان کو فارسی ادبیات پر کام کرنے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا لیکن افسوس ہے کہ علمی دنیا بہت دنوں تک ان کے کاموں سے مستفید نہ ہوسکی۔ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے تقریباً چھ سال بعد ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء کو شام کے ساڑھے چھ بجے انہوں نے اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کی اور دوسرے دن یونیورسٹی کے اُس قبرستان میں ابدی نیند سونے کے لیے سپرد خاک کر دیئے گئے جہاں غیر منقسم ہندوستان کے سیکڑوں آفتاب و ماہتاب دفن ہیں [۲]۔

ہادی حسن صاحب کو قدرت نے ذہن رسا کے ساتھ ساتھ بلا کی قوت حافظہ بھی دی تھی۔ وہ ایک بالغ نظر دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے زبردست خطیب بھی تھے۔ جن لوگوں کو ان کی تقریریں سے بہرہ مند ہونے کے مواقع ملے ہیں وہ یہی محسوس کرتے ہیں کہ الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے مناسب و برمحل الفاظ کا استعمال کر کے اپنی تقریروں سے جادو جگایا کرتے ہیں۔ اگر اثنائے تقریر میں ان کی زبان سے لفظ "عزت" نکل جاتا تو منٹوں شہرت، دولت، صداقت، شجاعت، مروت، عشرت جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنی طلاقت لسانی کا ثبوت دیتے۔ ان کی یہ خطابت صرف فارسی زبان ہی تک محدود نہ تھی بلکہ انگریزی زبان میں بھی ان کی تقریریں اسی پائے کی ہوتیں غالباً وہ اردو میں تقریر کرنے کے عادی نہ تھے یہی وجہ ہے کہ جب علی گڑھ کے اردو مقررین کا ذکر ہوتا ہے تو ہم کو ان کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بہت کم افراد کو تقریر و تحریر دونوں میں مہارت ہوتی ہے۔ قدرت نے ان کو دونوں اوصاف سے نوازا تھا اور انہوں نے بھی تحریر و تقریر دونوں ہی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

نئی نسل کو شاید ہی اس بات کا علم ہو کہ اس فارسی کے جیّد عالم کا جواہر لال نہرو میڈیکل کالج علی گڑھ کی تاسیس میں کتنا بڑا حصہ ہے۔ اس کالج کی تاسیس کے لیے جب چندے کی مہم

ی گئی تو ہادی حسن صاحب مرحوم نے تن تنہا شب و روز کی انتھک
کے بعد تیس لاکھ روپیہ بطور چندہ جمع کیا۔ خدا نے ان کی
نت کی لاج رکھ لی اور جب وہ ایک کامیاب و کامران استاد
دگی گذار کر اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو اس سے ایک
بل ان کے خوابوں کی تعبیر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا میڈیکل
معرض وجود میں آچکا تھا اور وہاں طالب علموں نے باقاعدہ
ا شروع کر دیا تھا۔

ہادی حسن صاحب کی تصانیف میں "ایرانی بحریہ کی تاریخ" کو
زیادہ شہرت ملی۔ ان کی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے
میں انہوں نے اس بات سے بحث کی ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ
یرانی بحریہ کا نظم کیا تھا؟ دوسرے باب میں انہوں نے اس
ی تحقیق کی ہے کہ ہخامنشیوں (ACHAEMENIONS) کے
میں ایرانی بحریہ میں کیا کیا تغیر و تبدل ہوا؟ تیسرا باب اس
لینے کے لیے وقف ہے کہ ساسانی حکومت کے قیام سے پہلے مشرقی
ب میں تجارت کی صورتِ حال کیا تھی؟ اس موضوع سے عالمانہ
سے عہدہ برآ ہونے کے بعد انہوں نے چوتھے باب میں ساسانیوں
زمانے کے ایرانی بحریہ کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ پانچویں باب میں
ا کے ابتدائی دور کے ایران میں بحریہ کی جو کیفیت تھی اور
ہوں نے دوسری قوموں سے جو اثرات قبول کیے تھے، ان کا
، شواہد کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ پھر چھٹے باب میں
ل نے اس بات سے بحث کی ہے کہ دسویں صدی عیسوی
لے کر سولہویں صدی تک ایرانی بحریہ میں کیا کیا تبدیلیاں
ں، کون کون سی چیزیں ایجاد کی گئیں اور کن کن چیزوں کو
ا رفتہ قرار دیتے ہوئے ترک کیا گیا۔ ساتویں باب میں
سی ادبیات میں ایرانی بحریہ کے متعلق جو معلومات محفوظ ہیں
کو بنیاد بنا کر ایران کی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت
ڑی دل کش اور جاذب نظر کوشش کی گئی ہے [1]

ہادی حسن صاحب کی یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں لندن سے
ع ہوئی تھی۔ تقریباً ساٹھ برسوں کا زمانہ گذر جانے کی وجہ سے

اس موضوع پر نئی نئی معلومات فراہم ہو گئی ہیں بہت سے بظاہر
معدوم کتبوں کا پتہ چلا لیا گیا ہے اور ان کے معانی و مفاہیم متعین
کر لیے گئے ہیں۔ ان تمام نئی معلومات کی روشنی میں اگر اس کتاب کو
نئے سرے سے مرتب کر دیا جائے۔ تو یہ ہادی حسن صاحب کی خدمت
ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی بھی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

اسی طرح ان کی دوسری کتاب "مغل پوئٹری، اِٹس
کلچرل اینڈ ہسٹاریکل ویلو" بھی اہل علم کے حلقے میں خاصی
مشہور و مقبول ہے۔ یہ کتاب ان کے ان خطبات پر مشتمل ہے
جو انہوں نے مدراس یونیورسٹی میں ۱۹۵۱ء میں دیئے تھے۔ کتاب
پر کہیں بھی سنہ طباعت درج نہیں ہے مگر ان کے دیباچے کی
تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۵۲ء ہے، اس لیے یقین ہے کہ یہ کتاب اس کے
بعد ہی شایع ہوئی ہوگی۔ ہادی حسن صاحب نے اپنے مختصر سے
دیباچے میں اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ انہوں نے ان
خطبات میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کی
کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اس نکتہ کو
خاص طور سے ذہن میں رکھنا چاہیے ورنہ پڑھنے والے کو قدم
قدم پر بے جا تشنگی کا احساس ہوگا۔

اس کتاب کا پہلا خطبہ اس جائزے کے لیے وقف ہے کہ
مغلیہ عہد کے ہندوستان کی فارسی شاعری کی عمومی خصوصیات
کیا کیا ہیں اور یہ کس لحاظ سے ایران کی فارسی شاعری سے
مختلف ہے حالانکہ اس عہد کے بیشتر شعرا نہ صرف ایرانی النسل
تھے بلکہ تازہ واردانِ ہند بھی تھے۔ ہادی حسن صاحب کے نزدیک
اس عہد کی شاعری کے یورپی ناقدین اس کی حقیقی روح تک
پہونچنے میں ناکام رہے ہیں اس لیے وہ اس کی تخفیف کرتے ہیں
ایرانی ناقدین اس کی روح کے ادراک سے اس لیے قاصر
رہے کہ وہ اپنے آپ کو ان الفاظ اور مفاہیم سے ہم آہنگ
نہ کر پائے جن کو تازہ واردانِ ہند نے اپنایا تھا اور جو عہد
مغلیہ کے فارسی شعرا کا طرۂ امتیاز ہیں۔

دوسرے خطبے میں انہوں نے اس بات کے مطالعے کی کوشش

کی ہے کہ عہد مغلیہ کی ہندوستانی فارسی شاعری کی وہ کونسی خصوصیات ہیں جو اس کو اسی دور کی ایرانی فارسی شاعری سے نہ صرف الگ کرتی ہیں بلکہ ممتاز و نمایاں بھی کرتی ہیں ؟ ان خصوصیات کی طرف ہادی حسن صاحب نے مختصر مگر بلیغ اشارے کرنے کے بعد اپنی بات کو بہت سی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

اس کے بعد کا خطبہ "عظیم مغلوں کے درباری شعرا" کے عنوان سے ہے۔ اس خطبہ کے شروع میں انہوں نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ مغلوں کے ملک الشعرا صرف چار تھے، اکبر کے دور میں یعنی غزالی مشہدی اور فیضی، جہانگیر کے دور میں طالب آملی اور شاہجہاں کے دور میں ابو طالب کلیم۔ ہادی حسن صاحب کے نزدیک درباری شعرا کے فرائض یہ تھے: ۱۔ تاریخی فتوحات کو نظم کرنا ۲۔ غیر معمولی واقعات کے حوادث کی توجیہ اس انداز سے کریں کہ ان میں کوئی نیا اور حسین پہلو نکل آئے ۳۔ فی البدیہہ کسی بات کی ایسی تاویل کرنا کہ بادشاہ کا وقار کچھ اور بڑھ جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سے اشعار اپنی بات کی تائید میں نقل کیے ہیں۔

چوتھا خطبہ اس موضوع کے لیے وقف ہے کہ کن نظم پاروں کے صلے میں شعرا کو سونے یا چاندی میں تولا گیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سعیدائے گیلانی، ابو طالب کلیم قدسی۔ قاسم کاہی، خواجہ حسین مروی وغیرہ کے نظم پاروں کا تعارف کرایا ہے۔ جن کے صلے میں ان کو سونے یا چاندی میں تولا گیا۔ ان واقعات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں کہ ان اشعار کو نظم کرنے میں شعرا نے کن کن باتوں کا التزام کیا ہے اور کس حسن شاعرانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے اشعار کو نظم کیا ہے۔ یہ تمام التزامات عہد مغلیہ کی ہندوستانی فارسی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جن سے غیر ہندوستانی فارسی داں زیادہ واقف نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اس نوع کی شاعری کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے حالانکہ حقیقت امر اس کے برخلاف ہے اس نوع کی شاعری ایک طرف تو سماجی اور تاریخی فتوحات کی نشاندہی کرتی ہے اور دوسری طرف فن شاعری کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے۔

آخری خطبے میں ہادی حسن صاحب نے مغل بادشاہوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کی شاعری کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بابر، ہمایوں، کامران، اکبر، جہانگیر، دارا شکوہ، نورجہاں، ممتاز محل اور زیب النساء کے اشعار بڑی کد و کاوش سے جمع کر کے ان کا تعارف کرایا ہے۔ ہمایوں کا غیر مطبوعہ کلام ہادی حسن صاحب کی نظر سے پٹنہ میں گذرا، انہوں نے اس کو مرتب کر کے شائع کیا جس میں سولہ غزلیں، سات رباعیاں ایک مثنوی اور کچھ ابیات ہیں۔ جہاں تک زیب النساء کے ان اشعار کا سوال ہے جو دیوان مخفی کے نام کے مجموعہ اشعار میں محفوظ ہیں، ہادی حسن صاحب نے اس بات پر زور نہیں دیا ہے کہ یہ اشعار زیب النساء ہی کی طراوش قلم کا نتیجہ ہیں ان کا سارا زور اس بات پر ہے کہ یہ اشعار خوب صورت شاعری کا نمونہ ہیں۔

۱۰۰ صفحات کی مختصر سی کتاب میں ہادی حسن صاحب نے عہد مغلیہ کی ہندوستانی فارسی شاعری کا جس اجمال سے جائزہ لیا ہے اور اس کی خصوصیات نمایاں کی ہیں اس کا ایک خاکہ درج بالا سطور میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں مجھ کو دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے اول تو یہ کہ صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپنی کتاب "بزم تیموریہ" کی نظر ثانی شدہ اشاعت میں مغل بادشاہوں، شاہزادیوں کے اشعار جمع کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کو ہادی حسن صاحب کی روایت کی توسیع کہنا چاہیے اور امید کرنا چاہیے کہ اس ضمن میں مزید کام کیا جائے گا۔ ابھی بہت سے ایسے مغل شاہزادوں اور شاہزادیوں کے کلام ہمارے تعارف کے محتاج ہیں جو شاعر تھے اور ان کے اشعار ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ اس ضمن میں محمد شاہ کے چھوٹے بھائی شاہزادہ مبارک اختر کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا جس کا لقب اچھے میاں اور تخلص اختر تھا۔ اس شاہزادے نے تمام اصناف سخن میں

الی کی ہے مگر اس کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ خوش قسمتی
لو اس کی دو مثنویوں کو دیکھنے کا موقع ملا جن میں سے
ثنوی نا ہید و اختر پر میں نے ایک مفصل مقالہ تحریر
اپنی کتاب انعکاس میں شائع کر دیا ہے[۸]۔ اس شاعر
ار نہ تو ہادی حسن صاحب کو مل سکے اور نہ ہی سید
دبن عبدالرحمٰن صاحب کو۔ اسی طرح ابھی نہ جانے کتنے
رہوں گے جن کے کلام کہیں دبے پڑے ہوں گے ایسے
ر شاعرات کے کلام کی بازیافت ہمارے تہذیبی سرمائے
ـ اضافے کی حیثیت رکھے گی۔

دی حسن صاحب کی متذکرہ بالا کتاب: وضوع کا احاطہ
، اس پر بہت کم مواد ہماری دسترس میں ہے۔ علامہ شبلی
وم نے شعر العجم میں فیضی، نظیری، عرفی، صائب، طالب آملی
الب کلیم کی شاعری پر محاکمہ کر کے اس موضوع پر کام
کرنے کی راہ دکھلائی۔ غزالی مشہدی، قدسی اور اسی قبیل کے
دوسرے شعرا ان کے نزدیک اس قابل نہ تھے کہ شعر العجم میں جگہ
پاتے۔ علامہ شبلی کے بعد ہادی حسن صاحب نے عہد مغلیہ کی فارسی شاعری
کی بازیافت کی کوشش کی ان کی اس کوشش کا ماحصل اگرچہ
کم سے کم الفاظ میں بیان ہوا ہے اور اکثر جگہوں پر تو انہوں نے
اشاروں ہی سے کام لیا ہے مگر اس کے باوجود ان کی یہ علمی کوشش
اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ ان کے پیش کردہ اشاروں کی
روشنی میں عہد مغلیہ کی فارسی شاعری کا مکمل اور بھرپور ناقدانہ
مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی اصل قدر و قیمت بھی متعین
کی جا سکتی ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ہی نہیں بلکہ ہادی حسن کی
تمام کتابیں اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کہ انہوں نے
جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کی بازآفرینی کی کوشش کی
ہے۔ موجود مگر نامعلوم کو معلوم بنانا کوئی معمولی علمی خدمت نہیں ہے۔

حوالہ جات

شمعون اسرائیلی ۔۔۔ نے یہ بات بلا حوالہ تحریر فرمائی
ہے جس سے ۔۔۔ بات کا علم نہیں ہو پاتا کہ گاندھی
جی نے کس سنہ اور کس اخبار میں اپنے خیالات کا
اظہار فرمایا تھا۔
اس مقالے کی سوانحی معلومات ڈاکٹر معین اسرائیل
کی انگریزی تحریر مطبوعہ انڈو ایرانیکا کلکتہ
جلد ۱۶ نمبر ۲، جون ۱۹۶۳ء ص ۱۰۲۔۱۰۳ سے ماخوذ ہیں
مزید تفصیل کے لیے راقم سطور کی کتاب انعکاس
ص ۱۲۷ تا ۱۵۶ ملاحظہ ہو۔

۷۔ ہمایوں کے دیوان ۔۔۔ مخطوطہ پروفیسر سید حسن
عسکری صاحب نے منکشف کیا تھا اور اس کا
بھرپور تعارف حافظ شمس الدین احمد استاد شعبۂ
فارسی پٹنہ کالج نے رسالہ معیار میں کئی
قسطوں میں کرایا تھا۔ (میں اس اطلاع کے لیے پروفیسر
مختار الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہوں)

۸۔ ملاحظہ ہو "انعکاس" ص ۱۷۴ تا ۱۹۵۔

پروفیسر محمد بابر مرزا

پروفیسر اطہر صدیقی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوں تو اقبال کا یہ شعر کافی آسانی سے ایسے موقعوں پر پڑھ یا لکھ دیا جاتا ہے جہاں کسی کی تعریف مقصود ہو۔ لیکن پروفیسر محمد بابر مرزا پر یہ شعر بے کم و کاست صادق آتا ہے۔ مرزا صاحب استاد کی حیثیت سے سنہ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ آئے تھے۔ گذشتہ ۵۶ سال کے عرصے میں اس یونیورسٹی میں کوئی دوسرا استاد ایسا نظر نہیں آتا جس نے اپنے زمانے میں اتنے کام کیے ہوں جتنے مرزا صاحب نے انجام دیئے۔ زولوجی ڈپارٹمنٹ کی بنیاد کی پہلی اینٹ سے لے کر اس کو موجودہ پرشکوہ عمارت کی شکل دینا صرف مرزا صاحب کی دین ہے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے میں ایک دیدہ ور کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ اب بھی ان کی اس حیثیت کو کوئی دوسرا ثانوی حیثیت نہ دے سکا۔

سنہ۱۹۴۷ء کا دور مسلمانوں کے لیے خصوصی طور پر اور پورے ملک کے لیے عمومی طور پر نہایت ہنگامی دور تھا۔ یہ بندۂ پر تقصیر اسی پُرآشوب دور میں علی گڑھ پہنچا تھا۔ شاید اس امر کا تعلق بظاہر نفس مضمون سے قریب کا نہ لگے لیکن میں اس مضمون کی ابتدا وہیں سے کر رہا ہوں جب میں پہلی دفعہ علی گڑھ کی سرزمین پر پہنچا تھا۔ لہٰذا مرزا صاحب کے متعلق مضمون کو قلمبند کرنے میں بہت سے کیا بلکہ زیادہ تر تاثرات ذاتی ہیں۔ اس لیے جا بجا ذکر بھی آئے گا ان کے ذکر کے ساتھ والی بات ہوگی کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوگا کہ میں مرزا صاحب پر مضمون کم لکھ رہا ہوں اور خود اپنی عکاسی زیادہ کر رہا ہوں۔ یہ بات میں دست بستہ معافی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جہاں جہاں بھی خود اپنی عکاسی کا سا احساس ہو وہاں مقصد دراصل اس عظیم انسان کی عظمت کو صحیح روشنی میں دکھانا مقصود ہے۔ اب اس کی چکاچوند روشنی سے مجھ جیسے انسان پر بھی چمک پڑے تو اس سے مرزا صاحب کی بڑائی مقصود ہے نہ کہ اپنی تعریف۔

مضمون کے شروع میں اس امر کی وضاحت میں نے اس لیے کی ہے کہ قاری مجھے غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کا شکار نہ سمجھے دراصل سورج کی کرنیں زمین پر پڑتی ہیں تو ریت کے ذرات بھی چمکنے لگتے ہیں یہی مثال مجھ پر صادق آتی ہے۔

ان کی خدمات پہلے ہی نامورانِ علی گڑھ کے دوسرے قافلے میں سراہی جا چکی ہیں (رسالہ) یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ مرزا صاحب بے حد اچھے تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور اپنی زندگی میں انہوں نے اپنی اس بیک گراؤنڈ کا ثبوت بھی دیا۔ گو کہ مرزا صاحب کی والدہ بد قسمتی سے اس وقت رحلت کر گئیں جب وہ بہت چھوٹے تھے اور والد صاحب اس وقت اس دنیا سے رخصت ہوگئے جب ان کے بیٹے بابر مرزا صاحب کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ ماں اور باپ دونوں کے سایہ سے محروم اس شخص نے جو کام آئندہ زندگی میں کیے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ محنت۔ ایمانداری۔ کارکردگی۔ فرض شناسی، تعلیمی اصلاحات اور یونیورسٹی اور قوم کی ترقی کے لیے جذبہ ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ مولوی عزیز مرزا کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا جیسے بابر مرزا صاحب تھے۔

بابر مرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم بھی علی گڑھ میں ہوئی وہ آٹھ برس کی عمر یعنی بچپن ہی میں منٹو سرکل میں داخل کر دیے گئے اور علی گڑھ سے انہوں نے انٹرمیڈیٹ کی تیاری کر کے الٰہ آباد بورڈ سے ۱۹۲۱ء میں امتحان پاس کیا۔

بی۔ایس۔سی (B.Sc) کے لیے بمبئی یونیورسٹی کے سینٹ زیویرس کالج (ST. XAVIERS COLLEGE) میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۳ء میں بی۔ایس۔سی پاس کیا۔ اس وقت وہ بمبئی یونیورسٹی کے پہلے مسلمان اور تیسرے گریجویٹ تھے۔ انہوں نے زولوجی میں امتیازی نمبر پائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے دو سال پڑھا کر وہ ۱۹۲۶ء میں جرمنی چلے گئے۔ اس کے لیے انہیں نظام حکومت سے قرض لینا پڑا جو بعد میں نہایت ایمانداری سے سال بہ سال اپنی قلیل تنخواہ سے ادا کرتے رہے۔ جرمنی سے ۱۹۲۹ء میں مرزا صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال واپس آکر پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ زولوجی کے ہیڈ مقرر ہوئے لیکن جلد ہی سر راس مسعود کی دعوت نامے پر مرزا صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا اور ۲۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو علی گڑھ کی خدمت قبول کر کے شعبۂ زولوجی کی باگ ڈور سنبھال لی۔ ان کا تقرر پانچ سو (۵۰۰) روپیہ ماہوار پر ریڈر کی حیثیت سے ہوا جس پر وہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ پروفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۳ء تک ان کی تنخواہ میں صرف سو روپے (۱۰۰) کا اضافہ ہوا وہ اس لیے کہ مرزا صاحب کا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے ان کی ریڈری کی تنخواہ پر ہوا تھا۔ اور انہیں کوئی مالی منفعت نہ ملی تھی۔

شادی و اولاد :- دوران قیام جرمنی مرزا صاحب نے گندم نما و بالا ... سے شادی کی اور بیگم کا نام عطیہ مرزا رکھا۔ یہ شادی غالباً ۱۹۲۹ء میں ہوئی اور ۳۸، ۳۹ سال تک دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ نہایت پرمسرت ازدواجی زندگی گزارتے رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۶ء تک عطیہ بیگم مرزا صاحب کے ساتھ علی گڑھ میں رہیں اور ۱۹۶۶ء میں وہ اور مرزا صاحب جرمنی چلے گئے اور سکونت وہیں اختیار کر لی۔

مرزا صاحب کے ایک ہی اولاد ہوئی۔ رضیہ مرزا جو اب جرمنی میں ہیں اور انہوں نے ایک جرمن سے شادی کی ہے اور غالباً ان کے چار لڑکے ہیں۔

مرزا صاحب پتلے دبلے لمبے اور بے حد گورے رنگ کے انسان تھے چہرے پر رخساروں کی ہڈیاں کچھ زیادہ نمایاں تھیں۔ نہایت صاف ستھرے باذوق کپڑے پہنتے تھے۔ انہیں کبھی کسی نے برے لباس میں نہیں دیکھا۔ زیادہ تر کپڑوں کے رنگ سنجیدہ ہوتے تھے۔ گرمیوں میں سفید پتلون، قمیص، فیلٹ ہیٹ، منہ میں سگریٹ ہولڈر، چہرے پر چشمہ اور ہاتھ میں بریف کیس۔ جس وقت ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوتے خاموشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ اتنی بارعب شخصیت پروفیسران میں کم دیکھی گئی ہے جو انہیں نہ جانتا ہو وہ یہ سمجھتا کہ کوئی (VISITING PROFESSOR) وزیٹنگ پروفیسر ہے۔ کسی طرف سے ہندستانی نہ لگتے تھے۔ وہ صرف مغل نہ تھے بلکہ مغل نظر بھی آتے تھے اور ان کے کردار میں بھی مغلوں کی خصوصیات تھیں۔

۱۹۵۳ء کے مئی جون میں میرا۔ ایم۔ایس۔سی کا نتیجہ آیا اور زولوجی ڈپارٹمنٹ کی تاریخ میں پہلی بار میں نے پوری فیکلٹی میں ٹاپ کیا، یہ ریکارڈ شاید ابھی تک قائم ہے۔ بہرکیف ۱۴ جولائی ۱۹۵۳ء کو میں اپنے وطن سے لوٹ کر مرزا صاحب کے کمرے میں حاضر ہوا انہوں نے بیٹھنے کو کہا، خیریت پوچھی اور جب پانچ منٹ بعد میں ان کے دفتر سے نکلا تو اس ڈپارٹمنٹ کا لیکچرر تھا۔

طرزِ رہائش :- جہاں تک مجھکو یاد پڑتا ہے مرزا صاحب ہمیشہ سے مارس یونیورسٹی روڈ (جس میں اب کامرس فیکلٹی کا دفتر ہے) میں رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اس کوٹھی پر چھپر یا پھونس کی چھت ہوتی تھی۔ سامنے پان کی شکل کے لان کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں ہوتیں۔ پورچ میں مرزا صاحب کی کالی ہلمن گاڑی کھڑی ہوتی اور کبھی کبھی مرزا صاحب بیگم مرزا کے ساتھ اپنے کتے کو ٹہلاتے نظر آجایا کرتے۔ کوٹھی کا گیٹ ہمیشہ بند ہوتا۔ اور ہم کبھی سامنے سے گذرتے تو اس کوٹھی کے مکینوں کو کسی اور دنیا کے باشندے سمجھتے۔

مرزا صاحب کوئی بہت متمول شخص نہ تھے۔ برسوں ان کو بہت کم تنخواہ ملتی رہی اور اس میں سے بھی وہ قرض (۱۵۰۰) جو جرمنی جانے کے لیے لیا تھا ادا کرتے تھے۔ جرمن بیوی کے ساتھ کی وجہ سے معیارِ زندگی میں بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس ماہانہ بہشتی۔ بھنگی کے علاوہ دو تین نوکر ضرور ہوتے۔ ان کے گھر کے اندر کا ماحول نہایت سادہ لیکن بے حد صاف ستھرا ہوتا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان کے ڈرائینگ روم میں صوفہ سیٹ بھی تھا لیکن یہ یاد پڑتا ہے کہ جو کچھ بھی تھا وہ نہایت سلیقے سے خوش نما لگتا تھا۔ اس میں بیگم مرزا کی جرمن ٹریننگ کو بھی دخل تھا اور دونوں میاں بیوی کے خوش ذوق ہونے کی زندہ مثال تھا۔

کھانے میں مرزا صاحب ایک وقت ہندوستانی اور ایک وقت یعنی شام کو ہلکا پھلکا سینڈوچ۔ کباب وغیرہ۔ اس پر ان کا ایک مقولہ یاد آتا ہے کہ "دنیا میں ہر چیز پرائی ہوسکتی ہے لیکن کھانا اور گانا صرف اپنا"۔

طریقہ تعلیم :- لوگ آج کل Audio - visual aids کا استعمال تعلیم میں افضل سمجھتے ہیں اور اس کی افادیت پر زور دیتے ہیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ سے VISUALS کا استعمال اپنی کلاس میں کرتے تھے۔ پروجیکٹر۔ epidiascope وغیرہ کی مدد سے وہ ہمیشہ اپنے لکچر کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے۔ آج بھی ۵۰ سال بعد ان کی میز اور الماری کی درازوں میں VISUALS کو پیش کرنے والے سلائیڈ اور تصاویر موجود ہیں جن کو خود انہوں نے اپنے آپ بنایا تھا۔ وہ پڑھانے کو عبادت کی حد تک اہمیت دیتے تھے۔ اس قدر محنت سے پڑھانا اور اس کے لیے اتنی محنت کرنا میں نے کسی اور استاد کو کرتے نہیں دیکھا۔ کلاس میں لکچر کے علاوہ مرزا صاحب PRACTICAL میں بھی خاص دلچسپی لیتے تھے۔ جب بھی کوئی مشکل آتی یا کوئی نیا کیڑا (Nematode) ملتا تو وہ فوراً آکر مائکرواسکوپ بیٹھ جاتے اور اس جانور کو پہچان کر بتاتے۔

مرزا صاحب کلاس ہمیشہ وقت سے لیتے تھے۔ گھنٹہ بجنے پر کلاس میں داخل ہوتے اور گھنٹہ بجنے کے ساتھ کلاس چھوڑ دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کبھی کلاس میں دو چار منٹ دیر سے داخل ہوئے ہوں اور دو چار منٹ پہلے کلاس چھوڑ دی ہو۔ اور یہ پابندی نوکری کے آخر سال تک باقی رہی۔ کچھ اساتذہ ریٹائرمنٹ کے قریب پڑھانے میں دلچسپی بس کچھ معمولی سی رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے آخری سال کے آخری وقت تک کلاس لی۔

وقت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنی گھڑیاں ملا سکتے تھے۔ جب آفتاب ہال کے پرووسٹ تھے اور ۳ بجے سہ پہر وہاں دفتر کرنے جاتے اور ایس۔ ایس ہال اور ممتاز ہاؤس کے بیچ سے جب ان کی کار گذرتی تو ایس۔ ایس ہال کے کمروں سے آوازیں آتیں "تین بج گئے گھڑی ملالو"۔ جب کبھی ڈپارٹمنٹ میں شام کو فنکشن یا پارٹی کے لیے پانچ یا چھ بجے کا وقت دیا جاتا تو مرزا صاحب ہمیشہ ٹھیک وقت سے پہنچ جاتے۔ جو لوگ دیر کرتے یا دیر سے آتے ان سے اپنی ملائم ناراضگی کا اظہار ضرور کرتے۔ بصیر صاحب مرحوم ہمیشہ دیر سے آتے اور مرزا صاحب ہمیشہ کہتے "بصیر کبھی وقت سے نہیں آسکتے"۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جس وقت مرزا صاحب نے ڈپارٹمنٹ کی باگ ڈور سنبھالی تھی اس وقت ڈپارٹمنٹ دو کمروں میں اس جگہ تھا جہاں پہلے جغرافیہ اور اب کامرس ڈپارٹمنٹ ہے۔ اسٹاف بھی چار اساتذہ سے زیادہ نہ تھے۔

سنہ ۱۹۵۶ء تک مرزا صاحب خود ہی اپنے ٹائپسٹ، میوزیم کیوریٹر لائبریرین، پرچیز آفیسر اور فوٹو آرٹسٹ تھے اور بیچ بیچ میں مختلف مشینوں کی دیکھ بھال اور مرمت بھی کر لیتے تھے۔ موجودہ بلڈنگ اور اس کی ساخت وغیرہ سب ان کے ہاتھوں ہوئی۔ ایک زندگی میں ایک شخص تنہا اتنا کام کرسکتا ہے یقین نہیں آتا۔ علی گڑھ میں زولوجی ڈپارٹمنٹ کا صحیح معمار اگر کسی کو کہا جاسکتا ہے تو صرف مرزا صاحب کو۔ اس ایک شخص نے جو کچھ اپنے ۳۰ سال کے دور میں کیا اس کا عشر عشیر بھی گذشتہ ۲۶ سال میں نہیں ہوا۔

ایک اچھے سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کو اردو زبان سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور اس معاملے میں بھی وہ PIONEER تھے۔ حیدرآباد میں زولوجی کی تعلیم اردو میں شروع کرنے میں ان کا ہاتھ تھا۔ علی گڑھ آجانے کے بعد بھی وہ اردو میں سائنسی.

مضامین لکھ کر عام آدمی کو جانوروں سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے قائل تھے۔ آکاش وانی سے تقاریر اور رسالہ حیوانیات علیگڑھ سے جاری کر کے یہ کام انہوں نے بخوبی انجام دیا۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں ڈپارٹمنٹ کا چارج لیتے ہی مرزا صاحب نے اگست ۱۹۳۰ء میں زولوجیکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور بہر پندرہویں دن اس سوسائٹی کے تحت توسیعی لکچروں کا سلسلہ قائم کیا۔ کبھی لکچرار باہر سے مدعو کیے جاتے اور کبھی اسٹاف کے لوگ خود لکچر دیتے۔ ان کے اپنے توسیعی لکچر مدینہ ورم سانپوں کے رہن سہن پر بہت مقبول ہوئے تھے۔

مرزا صاحب اپنے اور پرائے لوگوں کے کام نہایت مستعدی سے کرتے۔ کبھی کسی کو نہ ٹالتے۔ ٹالنا یا کام کو آج اور ابھی کے بجائے کل پرسوں پر چھوڑنا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ میں لکچرار ہوتے ہی ۱۹۵۳ء میں ان کے ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے رجسٹرڈ ہوگیا تھا۔ ریسرچ کا ٹاپک ملتے ہی میں نے کام شروع کر دیا اور جب جب مرزا صاحب کی مدد کی ضرورت ہوتی وہ فوراً مدد کرتے، جب تھیسس لکھنا شروع کیا تو ایک باب میں ٹائپ کرا کے ان کی میز پر رکھ آیا کرتا تھا۔ شاید کوئی مشکل سے یقین کرے گا کہ مرزا صاحب دوسرے دن تک وہ باب اصلاح کے بعد کر کے لوٹا دیتے۔ اسی مستعدی اور کام میں دلچسپی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں نے لکچرار شپ کے فرائض کے ساتھ ڈھائی سال کے اندر پی۔ ایچ۔ ڈی ختم کر لی۔ جیسے ہی تھیسس تحریر میں آیا اس کو ٹائپ کرانا ڈرائنگس کے فوٹو بنوانے میں مدد کرنا اور بعد میں زبانی امتحان کرانا ۔۔ کسی بھی کام میں مرزا صاحب نے لیت و لعل سے کام نہیں لیا۔ پڑھنے لکھنے کے کاموں کے لیے ان کے پاس ہمیشہ وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ باوجود ڈپارٹمنٹ کی ساری ذمہ داریوں کے انہوں نے ریسرچ کے کام کو شائع کرنے میں اور اس میں ایڈیٹنگ کا کام کرنے میں بے حد وقت دیا۔ ان کی قیادت میں قادری صاحب بصیر صاحب جیسے قابل لوگوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اور تقریباً ۱۴۰ سے زیادہ پرچے اور ۸ ۔۔ کتابیں Indian Insect Types کے تحت شائع ہوئیں۔ ایک جرمن ریسرچ اسکالر Klaus Saunders جو اب ارلانگن یونیورسٹی میں پروفیسر ہے، نے بھی مرزا صاحب کی قیادت میں پی ایچ ڈی کی۔ سب سے پہلی D. Sc بھی

اسی یونیورسٹی میں قادری صاحب نے مرزا صاحب کی قیادت میں کی اور دوسری بصیر صاحب نے۔

پڑھائی میں مدد کے علاوہ بھی مرزا صاحب لڑکوں کی مدد کرتے۔ ڈپارٹمنٹ میں ایک صاحب ریسرچ مکمل کر کے باہر کا اسکالرشپ پا گئے۔ لیکن ان کے پاس ٹکٹ تک کے پیسے نہیں تھے۔ مرزا صاحب نے نہ صرف ان کے ٹکٹ کے لیے مدد کی بلکہ کچھ گرم کپڑے بھی بنوا دیے کہ جہاں وہ جا رہے تھے وہاں سردی بہت پڑتی ہے۔ جاتے ہی مشکل کا سامنا ہوتا۔ کتنے چیرمین اس طرح اپنے شاگردوں کے کام آتے ہیں۔ کیا انسان دوست شخص تھے !

سالم علی صاحب آج ہندوستان اور دنیا بھر کے قابل چڑیلوں کے سائنس داں مانے جاتے ہیں ان کو جتنے بھی اعزاز ملے وہ پچھلے دس سال میں عطا ہوئے ہوں گے۔ مرزا صاحب نے سالم علی کی قابلیت کو بہت پہلے تسلیم کر لیا تھا اور سب سے پہلے D. S. C. کی ڈگری ان کو ۱۹۵۸ء میں اس یونیورسٹی سے CONFER کرائی۔ سالم علی صاحب کے نزدیک بھی اس D. S. C کی ڈگری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں کیا ہے[۳] وہ جوہر شناس تھے اور اس میں بخل نہیں کرتے تھے۔ خود ان کو D.S.C کی ڈگری اس یونیورسٹی نے ۱۹۷۵ء میں عطا کی۔

مرزا صاحب اپنی زندگی میں کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے وہ وائس چانسلر ہو یا کوئی اور۔ ان کے دور میں رادھا کرشنن آئے پروفیسر ہالڈین آئے۔ اور جانے کون کون لوگ U. G. C. کی کمیٹیوں پر آتے رہے۔ مرزا صاحب سب سے برابر کے ساتھ گفتگو کرتے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کہتا تو فوراً جواب دے دیتے۔ ہالڈین کمیٹی نے کچھ خراب رپورٹ لکھی۔ مرزا صاحب نے اس کا جواب بہت سخت الفاظ میں دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کمیٹی میں کوئی صاحب مضمون کے نہ تھے اور انہیں رائے دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہالڈین کمیٹی کی رپورٹ کی اہمیت ہی ختم ہوگئی۔

بذلہ سنجی :۔ مرزا صاحب بظاہر بے حد سنجیدہ بارعب اور بے حد پر تکلف شخصیت کے حامل لگتے تھے لیکن جہاں تین چار ساتھی جائے

بتنے ہوتے توان کا یہ (FACADE.) باریک چادر کی طرح اتر جاتا اور بے حد پُر مذاق اور پُر مزاح باتیں کرتے کبھی کبھی ان کے مذاق فحش ہو جاتے اور ان کی ذات کے اس پہلو کو پہلے پہل دیکھکر بہت تعجب ہوتا" لیکن چونکہ مرزا صاحب کی ذات میں کوئی چھل بٹہ نہیں تھا۔ ان کے اس پہلو کو بھی ان کی ذات کی سچائی اور زبردستی کے سنجیدہ پن سے دور ہونا ان کے کردار کی اچھائی کا ثبوت ہے۔

حمید اللہ خاں صاحب سابق پرنسپل انجنیئرنگ کالج مرزا صاحب کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ بلیرڈس کھیلتے کھیلتے کبھی آپس میں فحش سے مذاق پر اتر آتے اور کہیں بیگم مرزا جو جرمن نژاد تھیں لیکن تھوڑی بہت اردو سمجھتی تھیں فوراً مرزا صاحب کو ٹوکتیں۔ وہ ان کو پیار میں بابی کہتی تھیں۔ ایسے وقت ان کے منہ سے نکلتا "بابی بابی۔ نہیں نہیں" اور مرزا صاحب ہنس کر چپ ہو جاتے۔ ڈپارٹمنٹ میں وہ اس طرح سے مذاق سب سے زیادہ معین فاروقی صاحب سے کرتے۔ اب ہمارے معین صاحب نہ این ریش دراز زیر لب خاموشی سے سنا کرتے اور ہنسا کرتے۔

ڈسپلن :- مرزا صاحب کی بڑی خوبی ان کا Discipline تھا اس میں وہ کسی کی رعایت نہ کرتے چاہے کوئی ان سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہوتا۔ جب ڈپارٹمنٹ کے ڈسپلن کا معاملہ ہوتا تو ساری قربت دھری رہ جاتی۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں جب امریکہ سے واپس آیا تو اپنے آپ کو مرزا صاحب کا خاص الخاص اور بے تکلف شاگرد محسوس کرنے لگا۔ اسی سال B.Sc فائنل کو VERTEBRATES کا پرچہ پڑھانے کے لیے مرزا صاحب نے مجھ سے کہا۔ یہ میرا مضمون نہ تھا اور میں اپنی نادانی میں مرزا صاحب سے بولا "میں نہیں پڑھاؤں گا یہ مضمون۔ یہ میرا مضمون نہیں ہے اور اس کا پڑھانا مجھے اچھا بھی نہیں لگتا" انہوں نے اس وقت تو کچھ نہ کہا نہ ہی کسی ناراضگی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن جب کلاس میں پہنچا تو اپنی میز پر مرزا صاحب کا ایک نہایت مختصر خط جسے نوٹ کہنا مناسب ہوگا۔ پایا۔ اس میں یہ حکم صادر تھا کہ اگلے دن سے فائنل کے کلاس پڑھایئے۔ خط کے مضمون ہی انداز ہی سے اپنی جگہ کا احساس ہو گیا اور وہ دن اور آج کا دن میں نے حکم کو ملی نے ہمیشہ وہی اہمیت دی جو دینا چاہیے۔ پھر بعد میں ملاقات میں کسی ناراضگی کا اظہار مرزا صاحب نے نہ دکھایا اور نہ میری کیا ہمت تھی کہ اپنی کسی ناپسندیدگی تک کا اظہار کرتا۔ جو بھی لائن سے باہر نکلتا وہ فوراً اس کو لائن میں کھڑا کر دیتے اور پھر اس واقعے کو بھول جاتے۔ کسی اور سے بھی آپ کے رویے کی زیادتی یا حکم نہ بجا لانے یا نافرمانی کا ذکر نہ کرتے۔ آج کل اگر آپ کسی کے ساتھ کوئی اس طرح کا ایکشن لیجئے تو لوگ خفا بھی ہو جاتے ہیں اور گفتگو بھی بند کر دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں روزانہ کے تعلقات میں چائے کے کمرے میں کوئی اثر ان باتوں کا نہ ہوتا۔ وہ روز کی طرح ہنسی مذاق کرتے۔ ان کے مدنظر صرف ایک بات ہوتی جو کام آپکے سپرد ہے اس کو کرنا چاہیئے۔ آنا کانی سے کام نہیں چلتا تھا۔ میں اس واقعے سے مرزا صاحب سے کسی طرح بھی ناخوش گواری کے احساس تک میں مبتلا نہ ہوا۔ بلکہ اپنی غلطی کو مان کر حکم بجا لایا اور مرزا صاحب کی عزت میری نظروں میں اور بڑھ گئی۔ دوستی۔ شفقت اور خلوص کو ڈیوٹی سے وہ الگ رکھتے تھے اور دونوں کو mix نہیں ہونے دیتے تھے۔

ڈسپلن کے معاملے میں دراصل مرزا صاحب کا اصول یہ تھا کہ وہ سختی کے ساتھ محبت اور شفقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے بقول ان کے "اگر طلبا کا اٹھان اچھا نہیں تو یہ اساتذہ کا قصور ہے نہ کہ طلبا کا۔ طلبا ہمارے ہاتھ میں مثل موم کے ہیں جس طرح ہم ان کو موڑیں وہ مڑ جاتے ہیں۔ بعض اوقات موم بھی سخت ہوتا ہے۔ اور اس کو موڑنے میں گرمی بھی پہنچانی پڑتی ہے۔ میں نے جو سختی کی اس کو آپ نے اتنی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور میری محبت اور ہمدردی روز بروز آپ کی طرف بڑھتی گئی" ؎۲ وہ سزا اور جزا بھی لڑکوں کے معاملے میں سخت موم کو گرمی پہنچانے بھر کی حد تک ہی دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب وہ ۱۹۴۳ء میں پرووسٹ شپ چھوڑ کر ڈین فیکلٹی آف سائنس کے عہدہ پر مامور ہوئے تو ۲۳ر جون کی شب میں جو سپاسنامہ الوداعی دعوت میں پیش کیا گیا وہ اس بات کا شاہد ہے کہ باوجود ان کے سخت ڈسپلن کے لڑکے ان کے ہال سے رخصت ہونے پر آبدیدہ تھے۔ مندرجہ ذیل الفاظ بھی ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"جناب والا آپکی علمیت کا آوازہ ہم نے پہلے بھی سنا تھا لیکن

آپ کی شخصیت کے چند در چند پہلو جو کہیں آئینہ ہیں اور کہیں شمشیر اس وقت نظر کے سامنے آئے جب آپ اس ہال کے سرپرست مقرر ہوئے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم کا سایہ نہیں ہوتا عمل کا سایہ ہوتا ہے۔ علم ایک حجاب ہے۔ عمل ایک پناہ ہے۔ عمل مجسم ہے اور عمل مرکب ہے۔ آپ میں علم و عمل دونوں کا امتزاج ہے۔ آپ کی اصول پرستی۔ دیانت داری اسلام سے لگاؤ یہ سب باتیں آپ کو ورثہ میں ملی تھیں اب خدا کا شکر ہے کہ یہ سرمایہ آپ کے ہاتھوں سے ہم تک پہنچ رہا ہے ۔" ؎

صاف گوئی :۔ مرزا صاحب کی ایک بڑی خوبی جو بعض لوگوں کی نظروں میں خوبی کم اور برائی زیادہ تھی وہ تھی صاف گوئی۔ کسی مسئلہ پر ان کی جو رائے ہوتی اس کا بے دھڑک اظہار کر دیتے۔ پروفیسر تو کیا وائس چانسلر تک ان کی اس بات سے ڈرتے تھے۔ ان کی اس عادت سے ان کے دوست کم اور نکتہ چیں زیادہ بنتے گئے۔ آج بھی اور غالباً کسی بھی زمانے میں صاف گوئی قابل اعتناء نہ سمجھی گئی۔

E.C.، A.C. اور فیکلٹی کی میٹنگس میں وہ بے خوف اپنی بات کہہ جاتے۔ اس صاف گوئی کی انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی وہ صاف گوئی کے علاوہ خوشامد کرنا اور کرانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سب کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ علی گڑھ میں جرمنی سے ڈاکٹریٹ لے کر اسٹاف پر آئے تھے اور تیرہ سال تک ریڈر رہے اور جب پروفیسر ہوئے تو اسی تنخواہ پر جس پر وہ ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان سے بے حد کم تعلیم یافتہ لوگ پروفیسر کے عہدے تک ان سے پہلے پہنچا دیے گئے تھے۔ مرزا صاحب کے ساتھ یہ زیادتی اور ناانصافی علی گڑھ کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس زیادتی اور ناانصافی اور اپنا حق نہ پانے کے باوجود بھی مرزا صاحب نے اپنا عملی راستہ نہ بدلا۔ وہ اسی طرح صاف گوئی اور غیر خوشامدانہ رویے پر قائم رہے اور آخر وقت تک اس راہ پر گامزن رہے۔ آج کہاں اس طرح کی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لوگ چھوٹے چھوٹے مفاد کے لیے ساتھیوں اور بزرگوں کے علاوہ اپنے سے کم درجے تک کے لوگوں کی خوشامد پر اتر آتے ہیں اور کام نکل جانے کے بعد رفتار و رویہ بدل لیتے ہیں۔ مرزا صاحب اس کے برعکس تنقید مدعو کرتے تھے اور ان کے اپنے الفاظ میں۔ "میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھ پر تنقید یا تبصرہ کیا کیونکہ میں نے اپنے کو انہیں کی تنقید کی روشنی میں بنایا ہے۔ میری کامیابی کا سہرا طالب علموں کے سر ہے اور میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ انہیں طالب علموں کی وجہ سے ہوں۔"

"I have built myself upon criticism and I am also grateful to those who used to criticize me. My glory is indeed due to the students of my University. They have made me what I am today"

سیاسی نقطۂ نظر :۔ مکمل مغربی طرز زندگی اور جرمن نژاد بیوی ہونے کے ناطے مرزا صاحب کے متعلق لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے اور کچھ لوگ ان کو نازی (Nazi) تک سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ جرمن بیوی ہونے کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کلاس میں آنکھ سے متعلق لکچر دیتے ہوئے وہ پردے پر ہٹلر کی تصویر کا نگیٹو (negative) دکھایا کرتے تھے۔ کمرے میں بالکل اندھیرا کر دیا جاتا اور صرف تصویر نظر آتی کچھ دیر کے بعد نگیٹو (NEGATIVE) ہٹا لیا جاتا اور صرف روشنی پردے پر پڑتی رہتی۔ غور سے پردے پر دیکھتے رہنے سے ہٹلر کی POSITIVE تصویر نظر آجاتی۔ ہٹلر کی تصویر دکھانے میں انہیں ہٹلر سے عقیدت کا اظہار مقصود نہ تھا بلکہ اس زمانے میں ہٹلر بے حد مشہور تھا اور سب اس کو پہچانتے تھے سنا ہے برٹش حکومت نے مرزا صاحب کو جرمن ایجنٹ تک جانا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کے گھر کی تلاشی بھی ہوئی۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مرزا صاحب بے حد غیر سیاسی انسان تھے۔ ان کا مطمح نظر صرف اس یونیورسٹی کو بہتر بنانا تھا۔

مرزا صاحب ۳۰ سال اس یونیورسٹی کی خدمت کر کے ۱۹۶۱ء میں رٹائر ہوئے۔ علی گڑھ کو خیرباد کہنے سے بہت پہلے ہی انہوں نے جانے کے سب انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ یادگار کے طور پر ہم میں سے

تقریباً ہر شخص کو بطور یادگار کچھ نہ کچھ تحفہ دیا۔ میرے گھر میں استری
الیکٹرک میز جواب غالباً ۵۰ سال پرانی ہو گی انہیں کی دی ہوئی ہے۔
مرزا صاحب نے علی گڑھ کو یکم مئی ۱۹۶۱ء کو خیر باد کہا۔ وہ شام
۵ بجے کالکا میل سے علی گڑھ سے رخصت ہوئے۔ اسٹیشن پر پورا
اسٹاف انہیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔ کچھ لوگ دور کھڑے تھے
اور کچھ لوگ ٹرین کا جنگلہ پکڑے کھڑے تھے لیکن تقریباً سب ہی کی
آنکھوں میں آنسو تھے۔ خود مرزا صاحب کی آنکھیں بھی اس وقت نمناک
تھیں۔ ان کی زندگی کے ساٹھ سالوں میں سے صرف آٹھ سال چھوڑ کر باقی
باون سال اسی چمن میں گزرے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں علی گڑھ کے
تھے اور آخر وقت تک علی گڑھ کے رہے۔

مرزا صاحب کئی دفعہ یورپ گئے اور وہاں سوربون اور
ہامبرگ یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لیے مدعو کیے گئے۔ ؁
۱۹۵۷ء میں مرزا صاحب نے میڈگاسکر میں Pan-
Indian Ocean Scientific Congress
میں شرکت کی اور اسی زمانے میں UNESCO سے رابطہ
قائم کرنے والی Indian National Commi-
ssion for Co-operation with UNESCO
کے Executive-Board کے ممبر رہے۔ وہ بہت سی
سائنٹفک سوسائٹیوں کے ممبر تھے اور Helminthologi-
cal Society of India کے فاؤنڈر ممبر تھے۔

۱۹۶۱ء میں ہجرت کر جانے کے بعد بھی مرزا صاحب کچھ نہ کچھ
کرتے رہے۔ ۶۳-۱۹۶۲ء میں وہ فریڈرک الیکزانڈر یونیورسٹی
ارلانگن میں جرمن کاؤنسل کے فیلو رہے۔
۱۹۶۴-۶۶ء تک وہ اسٹوٹگارٹ کے اسٹیٹ میوزیم
میں Conservator کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور
آخر عمر تک جرمنی کے مختلف علمی اداروں میں Advisory
Capacity میں کام کرتے رہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا یہ نامور سائنسداں جس نے ۳۱ سال تین
ماہ اس ادارے کی بے لوث خدمت کی اس دار فانی سے
۱۲ جون ۱۹۶۷ء کو مغربی جرمنی میں رخصت ہو گیا۔ لیکن ان کی
خدمات اس یونیورسٹی میں تا دم آخر ان کی یاد تازہ رکھیں گی۔

حواشی

۱؎ مولوی عزیز مرزا۔ عبدالرحمن چغتائی۔ نامورانِ علی گڑھ
دوسرا قافلہ۔ فکر و نظر

۲؎ Prof. M.B. Mirza, My experie-
nces as Provost. آفتاب 1976

۳؎ The Fall of a Sparrow از سالم علی۔
آکسفورڈ پریس

۴؎ مسلم یونیورسٹی گزٹ۔ علی گڑھ جلد ۸۔ نمبر ۱۳۔
۱۵ جولائی ۱۹۴۳ء

۵؎ Prof M.B.Mirza and his work از اے وہاب خیری مسلم یونیورسٹی گزٹ
یکم نومبر ۱۹۴۳ء

"علی گڑھ تحریک اعتماد کی بازیابی کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندستانی مسلمان مٹی کے ڈھیلے کی طرح زمین کے سینے پر بوجھ بننے کے بجائے باخبر اور حوصلہ مند شہری بنیں۔ زمانہ سے خائف اور نفور ہونے کے بجائے وہ زمانہ سے صحت مندانہ ہم آہنگ ہوں۔ اپنے درخشاں ماضی پر فخر ضرور کریں لیکن اس فخر کو حرکت کا ذریعہ بنائیں، نیند لانے والی دوا نہیں۔ ہمت اور اتحاد کے ساتھ وہ کام کریں جس سے حال سنور جائے اور مستقبل نکھر جائے۔ وہ خول میں سمٹنے کی جگہ ساری دنیا کو ذہن و نظر کی جولاں گاہ بنالیں۔ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِر کے تحت اپنے زمانے اور ہم عصروں سے اچھی باتیں سیکھیں اور علوم نے جو ترقی کی ہے اسے جذب کریں، زمانہ کے ہم قدم ہوں، اس کی گرد راہ نہیں۔ اپنے مذہب کو ان ساری ملاوٹوں، واہموں اور جہالتوں سے پاک کریں جنھیں گردش ایام نے اس میں شامل کر دیا ہے۔ مذہب کو علم اور عقل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسلام اور جدید علوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔"

سید حامد

پروفیسر کفیل احمد چودھری

ڈاکٹر محمد اقبال

چمنستان سرسید کی آبیاری کرنے والے خوش نصیبوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں اولین مقام تو یقیناً سرسید کے ان رفقا‘ کار کا ہے جنھوں نے ملک و ملّت کے مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں اس مردِ آہن کو دامے، درمے، قدمے، سخنے تعاون بخشا اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں سرسید کے شانہ بشانہ کوشاں رہے جن کی معیت میں سرسید نے علی گڑھ کی مٹی میں وہ بارآور پودا لگایا جو آج مسلم یونیورسٹی کی شکل میں اک تناور درخت بن چکا ہے اور جس کے رنگ و بو سے آج نہ صرف وطن عزیز معطر ہے بلکہ اس کے صحت افزا اثرات جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہو کر تمام کرہ ارض بالخصوص ایشیا و افریقہ پر مرتب ہو رہے ہیں۔ دوسری صف میں وہ لوگ آتے ہیں جن کا اس ادارے کے قیام سے تو کوئی تعلق نہیں رہا لیکن انہوں نے اپنی لیاقت و صلاحیت سے کام لے کر اس قومی امانت کو زمانہ کے سرد و گرم سے محفوظ رکھا اور مسلسل کد و کاوش کے ذریعہ اسے شاہراہ ترقی پر گامزن کیا۔ ان لوگوں میں خود اسی درس گاہ کے فرزندان بھی شامل ہیں اور وہ بھی جو کسی دوسری شکل میں ادارے سے منسلک ہو کر علم و ادب اور سائنس و ٹیکنالوجی کے میدانوں میں اس کی شہرت کا باعث بنے۔ ایسے ہی ناموران علی گڑھ کی فہرست میں پروفیسر کفیل احمد چودھری کا نام بھی شامل ہے۔

چودھری صاحب کا تعلق سرزمین بنگال سے تھا۔ انہوں نے یکم فروری ۱۹۰۲ء میں مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کے نواکھالی ضلع میں واقع موضع رائے پور کے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا لہٰذا اپنی والدہ مسز حیات النسا اور بڑے بھائیوں کی نگرانی میں بچپن گذرا۔ ان کی ابتدائی تعلیم رائے پور اور لکھیم پور میں ہوئی اور بعد میں کلکتہ بھیج دیا گیا۔ بزرگوں کی خواہش تھی کہ وہ آرٹس میں ڈگری حاصل کر کے کسی اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز ہوں لیکن نوجوان کفیل کا ذہن علوم سائنس کی طرف راغب تھا۔ جوں جوں شعور پختہ ہوتا گیا حسن فطرت اور قوانین قدرت میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور آخر کار انہوں نے حیاتیات میں تعلیم حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ کافی ردّ و قدح کے بعد ان کی والدہ اس بات پر راضی ہو گئیں کہ پہلے وہ آرٹس میں ڈگری لیں اور اس کے بعد ہی جی چاہے تو سائنسی مضامین میں منتقل ہو جائیں۔ لہٰذا ۱۹۱۳ء میں کفیل احمد چودھری نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور پھر ماحولیات اور جنگلات سے متعلق ایک کورس کرنے کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ انہوں نے سائنس میں پہلی ڈگری ۱۹۲۰ء میں ایڈنبرگ یونیورسٹی سے حاصل کی اور سر ولیم رائٹ اسمتھ کی زیر نگرانی تحقیقاتی کام بھی کیا۔ قیام برطانیہ کے دوران چند معروف حیاتیاتی سائنسدانوں سے ان کا رابطہ رہا جس کے نتیجہ میں سائنسی تحقیق و جستجو کفیل چودھری کے مزاج کا جزو لازم

بن گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران لکڑی کی نوعیت اور ساخت کی اہمیت و افادیت شدت سے منظر عام پر آئی۔ چونکہ سپاہیوں کے لیے مطلوبہ ساز و سامان میں چھ سو سے بھی زائد ایسے آلات و لوازمات تھے جن کی تیاری میں لکڑی کا استعمال ہوتا تھا اور متعدد اشیا کی تیاری کے لیے چند مخصوص اقسام کی لکڑیاں درکار تھیں۔ لہذا جنگ کے ختم ہونے پر دنیا کے مختلف حصوں میں تشریح سوختہ (Wood Anatomy) سے متعلق متعدد تجربہ گاہوں اور اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستان میں بھی دہرہ دون میں ادارۂ تحقیقات بیابانی (Forest Research Institute) میں ایسی ایک تجربہ گاہ قائم کی گئی اور حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک امریکی ماہر پروفیسر ایچ۔ پی۔ براؤن کی خدمات حاصل کیں۔ ۱۹۲۳ء میں کفیل احمد چودھری کو بھی اس لیبارٹری میں ایک تکنیکی ماہر کی حیثیت سے مامور کیا گیا۔ ہندوستان میں مختصر قیام کے دوران پروفیسر براؤن نے معاشی اہمیت کی حامل ہندوستانی لکڑیوں پر ایک جامع کتاب کی تصنیف کا قصد کیا تھا۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل میں پروفیسر براؤن کی مدد کے لیے کفیل چودھری کو حکومت ہند نے امریکہ بھیجا۔ ان کی سعی پیہم سے ۱۹۳۲ء میں دو جلدوں پر مشتمل کمرشیل ٹمبرس آف انڈیا کی اشاعت عمل میں آئی۔ قیام امریکہ کے دوران چودھری صاحب نے سیراکیوز یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ وطن واپسی پر انہوں نے دہرہ دون میں رہ کر نمایاں تحقیقی کام کیا اور چہار دانگ عالم میں شہرت حاصل کی۔ ان کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۴۳ء میں برطانیہ کی ایڈنبرگ یونیورسٹی نے ان کو سائنس کی اعلیٰ ترین اعزازی ڈگری ڈی۔ ایس۔ سی۔ سے سرفراز کیا۔ چودھری صاحب نے متعدد طویل مدتی اور قلیل مدتی ریسرچ پراجیکٹ مکمل کر کے حکومت کو مختلف قسم کے درختوں اور ان سے پیدا شدہ لکڑی کی صفات پر بنیادی معلومات فراہم کی۔ لکڑی کی شناخت کے موضوع پر وہ ہندوستان کے ممتاز ترین اور دنیا کے چند گنے چنے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے قتل کے ایک پیچیدہ کیس میں جائے حادثہ پر پائے گئے لکڑی کے ذرات کا معائنہ کر کے انہوں نے محکمہ سراغ رسانی کی رہنمائی کی اور مجرم کی کامیاب نشاندہی کا ذریعہ بنے۔ اسی طرح جب صوبہ بہار میں موکامہ کے مقام پر دریائے گنگا پر ایک پل تعمیر کیا جا رہا تھا تو اس میں استعمال کے لیے سپلائی کی گئی لکڑی کی ماہیت کے بارے میں انجینیر کو کچھ شک ہوا اور صحیح صورت حال کی جانکاری کے لیے ڈاکٹر چودھری کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چودھری صاحب نے متعدد مخفی نقائص کی نشاندہی کر کے تمام مستعمل و غیر مستعمل لکڑی کو تبدیل کرنے کی سفارش کی جس پر عمل کر کے حکومت نے ایک عظیم سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ ۱۹۴۶ء میں چودھری صاحب چیف ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور بعد میں صدر ادارہ کے معاون کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی پیش کش پر چودھری صاحب مسلم یونیورسٹی شعبہ نباتیات میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے علی گڑھ آ گئے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس شعبے میں تمام تر تعمیر و ترقی ان کے دور اقتدار میں ہی عمل میں آئی۔ نہ صرف انہوں نے شعبہ کی عمارت کو بڑھایا بلکہ ریلوے لائن کے اس پار واقع پرانے قلعہ کا شعبۂ نباتیات سے الحاق کر کے اس میں شجرکاری کی اور اس کو نباتیاتی تحقیق کے مرکز کی حیثیت دی۔ دانش گاہ سرسید کی تزئین و آرائش کا کام چودھری صاحب نے ایسی دل جمعی سے کیا گویا اپنے ذاتی مکان کی آرائش کر رہے ہوں۔ شعبہ نباتیات میں تحقیق و ریسرچ کا ماحول پیدا کرنا موصوف کا ہی کام ہے اور ان کے دور اقتدار میں ہی یہ شعبہ ریسرچ کے میدان میں بین الاقوامی مقام حاصل کر چکا تھا۔ علی گڑھ میں وہ سائنس فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔ انڈین بوٹانیکل سوسائٹی اور یونیسکو کے ایک مشترکہ پروگرام کے تحت انہوں نے ہندوستانی

برما اور سری لنکا میں لکڑیوں کی ساخت پر کیے گئے تحقیقی کام پر مبنی ایک طویل تعارفی مقالہ رقم کیا جس کو مسلم یونیورسٹی پریس نے ۱۹۴۰ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے سو سے زائد تحقیقی مقالے اور سات کتابیں شائع کیں۔ ۱۹۶۸ء میں وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کی پیش کش پر شعبۂ تاریخ کی عمارت میں ایک تجربہ گاہ قائم کر کے نباتاتی آثار قدیمہ پر تحقیق کا آغاز کیا۔ تقریباً دس برس وہ یہاں پر محض اپنے سائنسی ذوق کی سیرابی کے لیے اعزازی طور پر تحقیقی کام میں منہمک رہے اور مختصر علالت کے بعد ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء کو اس عظیم محقق اور ماہر نباتات نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

چودھری صاحب علم نباتات میں ایک دیو قامت شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے اور ہندوستان و بیرون ملک بہت سے سائنسی اداروں سے ان کا تعلق تھا۔ ۱۹۴۰ء میں وہ انڈین نیشنل سائنس اکاڈمی کے فیلو منتخب ہوئے جو ہندوستانی سائنس میں ایک بڑا اعزاز ہے۔ ۱۹۴۳ء میں انگریز حکومت نے زمانۂ جنگ میں سائنسی خدمات کے صلہ میں ان کو M B E کے خطاب سے نوازا۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں پٹنہ میں ہوئی سائنس کانگریس کے نباتیاتی اجلاس کی صدارت کی اور ۱۹۵۴ء میں وہ انڈین بوٹنیکل سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اسٹاک ہوم (سویڈن) پیرس (فرانس)، مونٹریال (کناڈا) ایڈنبرگ (برطانیہ) اور سیاٹل (امریکہ) میں ہوئی بین الاقوامی نباتیاتی کانگریس میں انہوں نے ہندوستان کی نمائندگی کی اور ایڈنبرگ کے اجلاس میں اعزازی نائب صدر منتخب کیے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں ہونولولو (ہوائی لینڈ) میں ہونے والی پیسفک سائنس کانگریس کے ایک اجلاس کی بھی صدارت کی۔ ۱۹۷۰ء میں اسلام آباد (پاکستان) میں منعقدہ ایک یونیسکو کانفرنس کے وہ نائب صدر منتخب کیے گئے۔ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے انہوں نے متعدد دانش گاہوں کے دورے کیے اور لیکچر دیئے۔ ان درسگاہوں میں امریکہ، برطانیہ اور مغربی جرمنی کی معروف یونیورسٹیاں شامل ہیں۔

پروفیسر چودھری روزمرہ زندگی میں اصول و ضوابط پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور ان کے طرز بود و باش سے کافی حد تک انگریزیت جھلکتی تھی۔ مثلاً وہ اپنا خریدا ہوا روزنامہ کسی دوسرے کو پڑھنے کے لیے نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اخبار ہر فرد کو خود خرید کر پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح وہ حساب کتاب کے معاملے میں صد درجہ صاف اور با اصول تھے۔ ایک ایک دو پیسے کا بھی حساب کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ خاص طور پر ان پر اگر کسی کا ایک سکہ بھی واجب ہو تو اس کی ادائیگی لازمی تھی۔ چونکہ خود سچے اور ایماندار تھے لہذا دوسروں سے بھی ایسی ہی توقع رکھتے تھے۔ کبھی کسی ماتحت نے حیلہ بہانہ کیا تو یقین کر لیتے۔ اس کے برعکس تحقیقی معاملات میں بہت محتاط تھے۔ اپنے گروپ کے تمام کام کا بذات خود معائنہ کرتے تھے اور متعدد مرتبہ توثیق و تصدیق کے بعد ہی وہ کسی سائنسی تحقیق کو مقالہ کی شکل میں شائع کرنے کے قائل تھے۔ موصوف کو جنون کی حد تک مطالعہ کا شوق تھا۔ سرسید نگر میں واقع اپنی رہائش گاہ "رائے پور لاج" میں وہ ایک تجربہ گاہ اور ایک لائبریری کا اہتمام رکھتے تھے۔ لائبریری میں نہ صرف کتابوں کا خاصا ذخیرہ تھا بلکہ متعدد جرنلز بھی باقاعدہ طور پر منگائے جاتے تھے۔ تاریخ سائنس سے ان کو خصوصی شغف تھا۔ کوئی کتاب یا جریدہ اس وقت تک لائبریری میں جمع نہ کرتے تھے جب تک اس کا مطالعہ نہ کر لیں۔

بیرونی ممالک میں قیام کے دوران انہوں نے ترقی یافتہ اقوام میں محنت و مشقت اور احساس ذمہ داری کا جو جذبہ دیکھا تھا اسی کی توقع وہ اپنی قوم سے بھی کرتے تھے۔ سماجی بے راہ روی اور خاص طور سے دفاتر میں رشوت خوری اور بے ضابطگی کا ان کو بڑا قلق تھا۔ کہتے تھے اگر ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو ہم ملکی ترقی میں ایک رکاوٹ ہیں اور قوم و وطن کے دشمن ہیں۔ تعلیم کی کمی کو وہ سماجی برائیوں کا بنیادی سبب مانتے تھے۔ حالانکہ حفظ مراتب کا ان کو بڑا خیال تھا اور غیر ضروری

بے تکلفی سے ہمیشہ گریز کرتے تھے مگر مساوات اور جمہوریت
اقدار کو انہوں نے ہمیشہ بڑھاوا دیا۔ جب وہ شعبۂ نباتیات
کے صدر تھے ہر شخص کو رائے زنی اور تنقید کا مکمل حق حاصل تھا
یہ جمہوری ماحول ان کے بعد بڑی حد تک مجروح ہوا۔ ان کے
زیر سایہ تربیت پائے ہوئے کچھ لوگ آج بھی جرأت حق گوئی
کے لیے مشہور ہیں۔ چودھری صاحب کے بارے میں یہ بھی مشہور
ہے کہ جب وہ کلکتہ میں زیر تعلیم تھے تو اپنے چند دیگر ساتھیوں
کے ہمراہ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ حادثات
میں مرنے والوں کی لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام
اپنے خرچ سے کرنا ان کا ایک مشغلہ تھا۔ ان کی انسان دوستی
کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۹۶۳ء میں ان کی لیبارٹری میں
کام کرنے والے ایک نوجوان انور ظہیر امانی کی شادی کے موقع پر
جب کسی وجہ سے اس کے والد صاحب علی گڑھ نہ آسکے تو چودھری
صاحب اپنی کار لے کر اس نوجوان کی رہائش گاہ پر پہونچے اور دولہا
کو اپنے ہمراہ لے کر برات کے ساتھ گئے۔ دن بھر ایک بزرگ کی
حیثیت سے مصروف رہے اور شام کو دولہا دلہن اسٹیشن تک
پہونچانے کے بعد ہی اپنی قیام گاہ پر واپس آئے۔ اپنے ماتحتوں
کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اس قدآور شخصیت کا تھا جس کی رفاقت
کو ناموران ملک فخر سمجھتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب بین الاقوامی شہرت کے
مالک ڈاکٹر ایم۔ ایس سوامی ناتھن ایک سائنسی ورکشاپ کے
افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنے
علی گڑھ گئے تو انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ مناسب ہوگا
اگر میری پہلی ملاقات پروفیسر چودھری سے اس تقریب میں ہو
جس میں مجھے مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہونا ہے لہٰذا میں
تقریب میں شرکت سے قبل ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا
ہوں۔ چودھری صاحب کو ایک ممتحن کے روپ میں دیکھنے کا موقع
راقم کو ۱۹۶۵ء میں ملا جب وہ ایم فل کے لیے میرا زبانی امتحان لینے
کے لیے تشریف لائے۔ مصاحبہ کے دوران یہ احساس ہوا گویا وہ ممتحن
کم اور استاد زیادہ تھے۔ مختصر سے جواب پر بھی مطمئن ہو جاتے تھے
اور خود ہی اس موضوع کی توضیح و تشریح کرنے لگتے تھے۔ یہ
احساس ہوا کہ امیدوار کے معیار و صلاحیت کو جانچنے سے
زیادہ وہ اس کے مزاج میں تحقیق و تفتیش کا مزید شوق اور جذبۂ
تجسس بیدار کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

مجموعی طور پر چودھری صاحب جفاکشی، ایمانداری اور سادہ
مزاجی کا پیکر تھے۔ تحقیق کے میدان میں ان کا ایک بلند مقام تھا
وہ خالص علمی آدمی تھے۔ سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر
وہ سیاسی سطح پر بھی کچھ رد البطار رکھتے تو بلاشبہ ہندوستان کے
سائنس کی منصوبہ بندی کرنے والوں میں ان کا کوئی عظیم مرتبہ
ہوتا۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی کا نام علم نباتات کے تعلق
سے پوری دنیا میں روشن کیا اور یونیورسٹی میں نباتیاتی
تحقیق و تدریس کے پروگرام کو نئی سمتوں سے آشنا کیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

سید صباح الدین عبد الرحمن

۲۱ فروری کی رات کو ریڈیو میں خبر سنی کہ ڈاکٹر یوسف
حسین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ خبر سن کر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شفیق بزرگ
دائمی مفارقت دے گیا، رات بڑے کرب سے گزری، ان سے میرا پہلا
تعارف ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ میں کچھ دنوں جامعہ ملیہ میں بھی رہا۔ قرول باغ
کے جس مکان میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی
حیثیت سے سکونت پذیر تھے، اسی کے پاس میں ایک مکان میں مقیم
تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر یوسف حسین جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے استاد
تھے۔ حیدرآباد سے اپنے محبوب بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پاس آگئے تھے ان کو
پہلی دفعہ دیکھا تو سیاہ شیروانی میں ملبوس تھے۔ بہت ہی شکیل اور رعنا
جوان نظر آتے۔ اسی زمانے میں ان کے بھتیجے امتیاز حسین مرحوم یعنی ان کے
سب سے بڑے بھائی کے لڑکے جامعہ ملیہ کی بی۔ اے کی تعلیم سے فارغ ہوئے
تھے اور مزید تعلیم کے لیے یورپ جانے کی فکر میں تھے۔ وہ خالی اوقات
میں میرے پاس آجاتے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے
گھر کی عورتیں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو خوش قسمت اور مالدار سمجھتی ہیں
کیونکہ ان کے یہاں اچھے صوفہ سیٹ اور دوسرے فرنیچر ہیں جو اس زمانہ میں
پسند کیے جاتے تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ گیا
اور ان کی وجاہت سے مرعوب ہو کر گھر واپس آیا، ان ہی دنوں ڈاکٹر یوسف
حسین نے گارساں دتاسی کے خطبات کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ کیا جو رسالہ
اردو حیدرآباد دکن میں شائع ہو رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر عبدالحق کی ادارت
میں نکل رہا تھا۔ اس میں کسی کی تحریر کا شائع ہونا اس کی علمی قابلیت کی
بڑی سند تھی۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کر کے فرانس گئے۔
اور پیرس یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں کے قیام
کے زمانہ میں انہوں نے فرانسیسی زبان بڑی محنت سے سیکھی اور اس میں
مہارت حاصل کی۔ ہندوستان آکر ڈاکٹر عبدالحق کی فرمائش پر انہوں نے
خطبات گارساں دتاسی کا ترجمہ شروع کیا تو اس کے پندرہ خطبات کے
ترجمے کیے۔ جب یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع
ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحق ان کے بہت شکر گزار ہوئے۔ اس وقت وہ عثمانیہ
یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے ریڈر ہو چکے تھے۔ انہوں نے فرانسیسی ادب کے
نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ ان کی اہم تصنیف "روحِ اقبال" ۱۹۴۱ء میں
شائع ہوئی تو اس سے ہند و پاک کے تمام ارباب ذوق ان کی ادبی
بالغ نظری سے متاثر ہوئے۔

چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری مرحوم نے اس کی اشاعت پر
لکھا کہ اس سے بہتر کتاب تو پاکستان میں بھی نہیں لکھی گئی۔ ان کو اقبال
سے عشق تھا۔ اسی لیے اس کے لکھنے میں ان کے ہر صفحہ پر سرشارانہ
کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ شروع میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کو پڑھ
کر اس کے ناظرین شاید یہ کہہ اٹھے ہوں گے کہ اس کی ہر سطر پر ایک
کرشمۂ حسن ہے جس کی طرف دامن دل کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ انہوں نے
اس کی ابتدا ایسے انداز میں کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت
ان پر اقبال کی محبت اور عقیدت کا نشہ چھایا ہوا ہے۔ اقبال کی طبیعت

ایسی ہمہ گیر تھی جو اوصاف ان کی شخصیت میں ایسے مختلف عناصر جمع ہو گئے تھے جو عام طور پر کسی ایک شخص کی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ ان کے ذہن اور ان کی زندگی میں بلا کی وسعت تھی۔ ان کے جمال پرست اور عشق پرور ذہن نے اپنے تخیل کی گل کاریوں سے اپنی ایک الگ دنیا آباد کر لی تھی۔ اس دنیا کی خیالی تصویر میں انہوں نے اپنے جذبات کے موئے قلم سے ایسی رنگا رنگی اور تنوع پیدا کیا کہ انسانی نظر جب اس تصویر پر پڑتی ہے تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔

اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی عرفان جو صداقت پسند اور نظم آفریں روح تھی، جو جذبۂ دینی کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظم قائم کرنا چاہتی تھی، وہ شاعر بھی تھے اور حکیم نکتہ داں بھی، ان کے یہاں درد و سوز بھی ہے اور رندی و مستی بھی، نصیحتیں بھی ہیں، اور دین و تمدن کی تعلیم بھی، حسن و عشق کی ابدی کشمکش کا بیان بھی ہے اور حسن کی کرشمہ سازیوں کی نقاشی بھی۔

اور بہاور نقادوں کی طرح محض عبارت آرائی نہیں، یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اقبال کے آرٹ، شاعرانہ مسلک تخیلی پیکر، مقامات، خودی، مقام آفرینش، انسانی فضیلت، انسان کامل، حیات اجتماعی، فرد، جماعت اور موت کے تخیلات کے گہرے مطالعے کے بعد لکھا ہے۔ اور جس انداز میں انہوں نے اقبال کے ان تفکرات کو سمجھ کر سمجھایا وہ اقبال شناسی میں عرصہ دراز تک مدد دیتا رہے گا۔ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ اس سے زیادہ بھی لکھا جائے گا، لیکن ڈاکٹر یوسف حسین کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اقبال کو پہلی دفعہ جس طرح سمجھانے کی کوشش کی، اس کی آواز بازگشت بعد میں سنائی دی۔ غالب کو سمجھانے میں اولیت کا جو درجہ حالی کی یادگار غالب کو ہے وہی اقبال کو سمجھانے میں "روح اقبال" کا ہے۔

"روح اقبال" کے بعد ان کی مشہور کتاب "اردو غزل" منظر عام پر ۱۹۵۲ء میں آئی اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اور غیر اردو حلقہ اردو غزل کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی۔ ڈاکٹر صاحب غزل کو سمجھنے کے لیے گویا یہ پیمانہ چھوڑ گئے ہیں اور جس صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں یہ تحریر قلم بند ہوئی ہے۔ اسی کی شان ہو بہو اردو غزل "میں جلوہ گر ہے۔ جس کا انشا پردازانہ انداز ارباب ذوق کے ادبی کام و دہن کے لطف و لذت کا باعث بنا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب حسرت موہانی کی غزل گوئی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی یہ کتاب انہی کے نام سے معنون کی ان کی ایک مستقل کتاب "حسرت کی شاعری" کے نام سے بھی شائع ہوئی، جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنا خراج عقیدت ناقدانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ حسرت کی غزلوں کے استفہامی اشعار اور ضمیر جمع کے استعمال سے وہ اپنے کلام میں جو تاثیر اور حسن پیدا کرتے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کو خاص طور پر پسند تھا۔

وہ جامعہ عثمانیہ سے پنشن پا کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس کے پرو وائس چانسلر سات سال تک رہے تو ان سے علی گڑھ میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی نامزد ہوئے تو ان سے تعلقات اور بھی قریب تر ہو گئے ۱۹۷۰ء میں دار المصنفین میں طلائی جوبلی ہوئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ وہ بھی دار المصنفین تشریف لائے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب "یادوں کی دنیا" لکھی تھی یہ گویا ان کی خود نوشتہ سوانح عمری کی شکل میں ان کے بیتے ہوئے زمانے کی یادیں ہیں۔ ان کی قوت ارادی نے ان کے حافظے کے دروازے کو کھٹکھٹایا تو یہ سب کچھ سب لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوئے جس میں جذبہ کی رنگ آمیزی اور خیالی پیکروں کی تحلیل کے ساتھ ان کے آبا و اجداد و خاندان ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ، دیار فرنگ، علی گڑھ اور بہت سی علمی اور سیاسی شخصیتوں کا ذکر بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ وہ سات سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے اس لیے یونیورسٹی کے لیے دل میں بڑا درد اور نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے رہنے اور نہ رہنے کے مسئلہ پر بڑی دلسوزی سے لکھتے ہیں۔

"جو لوگ اسلامی کردار کے نام سے نا آشنا ہیں یا جن کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ اسے قومی وحدت کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں۔ اسلامی کردار سے مراد یہ ہے کہ مسلمان طلبا میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، قومیت کے جذبے کے ساتھ ساتھ بیدار ہو، یونیورسٹی کے

تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، مسلمانوں کی نمایاں اکثریت رہے، حکومت کے نامزد ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے۔ غیر مسلم ارکان ایسے منتخب کیے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب اور روایات سے واقف ہوں اور یونیورسٹی کے سچے ہمدرد ہوں، یہ باتیں نہ رجعت پسندی ہیں اور نہ فرقہ واریت اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف بلکہ اقلیتی کا تسلیم شدہ دستوری حق ہے۔ جس کو حکومت سلب نہیں کر سکتی، سوائے ایسی صورت کے وہ نا انصافی پر اتر آئے۔"

ڈاکٹر صاحب کو اقبال کے ساتھ غالب سے بھی عشق تھا، انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ وہ یورپ تعلیم کے لیے گئے تو اپنے ساتھ صرف تین کتابیں لے گئے، کلام مجید، کلام اقبال کا مجموعہ اور دیوان غالب، اسی لیے انہوں نے ۱۹۶۸ء میں غالب اور آہنگ غالب لکھی، اردو غزل میں جو باتیں اختصار کے ساتھ لکھی تھیں، اس کو پھیلا کر اس کتاب میں لکھیں غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تھی اس موقع پر جتنے مقالات لکھے اور پڑھے گئے وہ ان ہی کی نگرانی میں بین الاقوامی غالب سیمینار کے نام سے شائع ہو سکے۔

۱۹۷۶ء میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن حکومت ہند کی طرف سے منایا گیا تو اس میں بھی مجھ کو شرکت کی دعوت تھی، اس کے مختلف اجلاس میں ڈاکٹر صاحب خاص طور پر مجھ کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے، علی یاور جنگ گورنر بمبئی کی نگرانی میں اس جشن کی ساری کارروائیاں انجام پا رہی تھیں مجھ کو خسرو سے عشق ہے، ہر ناروا بات کا جواب دیتا رہا اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میری بڑی ہمت افزائی کی، جب امیر خسرو سے متعلق کوئی ناخوشگوار بات کہی جاتی تو وہ مجھ سے چپکے سے کہتے اٹھو اور جواب دو، میرا جواب سن کر میری پیٹھ پر تھپکی دیتے۔

۱۹۷۷ء میں اقبال کا جشن منایا گیا تو دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں میری بھی شرکت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس جشن کا اصلی روح رواں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس جشن کے منتظمین سے کچھ خفا سے نظر آئے، اس موقع پر غالب اکیڈمی میں ان کے لکچر ہوئے ایک کا عنوان تھا "غالب اور اقبال" اور دوسرے کا عنوان تھا "حافظ اور اقبال"۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ "حافظ اور اقبال" جناب آنند نرائن ملا کی صدارت میں پڑھا تھا جب ان کا مقالہ ختم ہوا تو آنند نرائن ملا صاحب نے اپنے مختصر تبصرہ میں کہا کہ "حافظ اور اقبال میں کوئی مماثلت نہیں" اس مختصر رائے سے حاضرین میں سناٹا چھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہ سن کر خاموش رہے، یہ موضوع کچھ ایسا ہی متنازعہ فیہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پاکستان کے ناشر چھاپ کر فائدہ اٹھا رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اقبال اکیڈمی لاہور اس کا حق طباعت اس سے خرید لے، ڈاکٹر معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی اقبال کے جشن میں دہلی آئے ہوئے تھے، میں نے ان سے گفتگو کی، انہوں نے وعدہ کیا کہ "روح اقبال" اور "حافظ اور اقبال" کو اپنی کمیٹی کے سامنے پیش کر کے ان کے حق طباعت کا معاوضہ ڈاکٹر صاحب کو دلائیں گے مگر یہ اب تک انجام نہیں پا سکا ہے

اپریل ۱۹۷۸ء میں انجمن ترقی اردو کی مجلس انتظامیہ میں میری دوبارہ رکنیت کا انتخاب تھا تو ڈاکٹر صاحب نے محض اپنی محبت میں مجھ کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دلائے، ان کی اس محبت کی قدر میرے دل میں برابر باقی رہے گی، مئی ۱۹۷۸ء میں اس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ دہلی میں تھا تو وہ اپنی وضع داری میں اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، انہوں نے اپنے گھر کے ایک وسیع کمرے میں اپنے ذوق کی بہت سی کتابیں کئی الماریوں میں جمع کر رکھی تھیں، میں نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا، تو مجھ کو ان میں سے کئی کتابیں پسند آئیں جن میں مصر کا ایک بہت ہی خوش خط مطبوعہ کلام پاک تھا، ایک لمبی تقطیع کا بھی کلام پاک تھا، جو ایران میں بہت ہی عمدہ کتابت کے ساتھ طبع ہوا۔ اس کو میں دیکھ رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم بولے کہ شہنشاہ ایران نے اس کے کچھ نسخے ایران بھیجے تھے ان میں سے ان کو بھی ایک نذر کیا گیا تھا، تاریخ و ادب کی کچھ اور کتابیں تھیں جو مجھ کو پسند آئیں، میں نے ان سے عرض کیا کہ ان میں سے آپ کچھ دار المصنفین کو فروخت کر دیں، فوراً بولے جو کتابیں پسند آئیں لے جاؤ، میری طرف سے دار المصنفین کو نذر ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ قیمت نہ لیں گے تو میں ان کو دار المصنفین کے لیے لے جانا پسند نہ کروں گا، پھر اصرار سے کلام پاک کے یہ دونوں نسخے اور کچھ کتابیں

میرے ساتھ کردیں، کلام پاک کے یہ دونوں نسخے یہاں کے کتب خانے کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں میں نے یہاں سے بھی خط لکھ کر ان کی قیمت قبول کرنے کے لیے عرض کیا مگر انہوں نے لکھا کہ اس اصرار سے تکلیف ہی ہوتی ہے۔

اسی ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے غالب کی منتخب غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ جو چھپ رہا ہے۔ اس کے کچھ پروف بھی دکھائے اور کہا کہ بعض انگریزوں نے اس ترجمہ کو پسند کیا ہے۔ خدا کرے ان کا یہ ترجمہ مقبول ہو، ان کی ایک کتاب "کاروان فکر" کے نام سے بھی شائع ہوئی جس میں اخلاقی قدریں، علم اور زندگی، تاریخ میں جبر و اختیار کی چھاؤں، اور ادبی قدریں کے عنوانات ہیں، میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اور اس حصہ کے شب و روز کے زیادہ تر لمحات صرف لکھنے پڑھنے میں گذارے، نظام الدین ویسٹ کے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے رہنے کے لیے انتخاب کر رکھا تھا، اسی میں علم و ادب کے سارے جلوے ان کی نظروں کے سامنے سمٹ کر آتے رہے۔ وہ کچھ دنوں شملہ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی میں رہے، پھر دہلی چلے آئے یہیں آخر وقت تک رہے، یہاں رہ کر علم و ادب کا مینا و کار جام پی کر سرشار اور مخمور رہے۔

ان کی "اردو غزل" اور "یادوں کی دنیا" دارالمصنفین کے طرالاشاعت کی ایجنسی میں ہیں گذشتہ جنوری میں ان کی رائلٹی کی رقم بھیجی جس کے شکریہ کا خط آیا یہی ان کا آخری خط میرے نام تھا، یہاں سے ان کی کتابوں کی رائلٹی کی رقم بھیجی جاتی تو اس کو وصول کرتے وقت ایسا محسوس کرتے کہ گویا دارالمصنفین کی طرف سے ان کو رقم مل رہی ہے، اس کو وہ اپنا کوئی حق نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی شرافت اخلاق تھی ان کی وضع داری ان کے رکھ رکھاؤ کا طریقہ ان کا استغناء اور شہرت سے بے نیازی کچھ ایسی تھی کہ اس کی مثالیں بہت کم لوگوں میں ملیں گی۔ دہلی میں رہتے تھے ہر قسم کے خاندانی ذرائع تھے، چاہتے تو اپنے لیے حکومت ہی سے بہت کچھ حاصل کر لیتے خصوصاً جب وہاں اس کے لیے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کچھ ایسے مصنف بھی ہیں، جو ایک کتاب لکھتے ہیں، اس کی رسم اجرا یا رونمائی کراتے ہیں اور ہر قسم کے فوائد اٹھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کے وقار کو کسی موقع پر جھکنے نہیں دیا، وقار خود ان کے سامنے آکر جھکا، ان کو پانچ ہزار کا ایوارڈ بھی ملا مگر ان کے بیش بہا علم کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی ان کو پدم وی بھوشن کا اعزاز بھی ملا مگر خود اس اعزاز کو ان سے عزت حاصل ہوئی۔

ان کی وفات پر خیال تھا کہ علمی حلقوں میں بڑا ماتم ہوگا۔ آجکل خاص خاص حلقے ایسے بنے ہوئے ہیں جہاں کی نرگس ہزاروں سال رونے کے بجائے صرف ایک دو سال رو کر اپنے چمن کے دیدہ ور کو دیکھ لیتی ہے۔ ایسے حلقے کی نرگس اپنی بے نوری کی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسین کی دیدہ وری کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکی، اس لیے ان کا یہاں ماتم نہ ہوا تو تعجب کرنے کی بات نہیں مگر جو اپنی نظروں میں نور رکھتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علم کی بصارت، بصیرت، ان کی رائے کی اصابت پھر ان کے ادبی ذوق کی پاکیزگی، قلم کی رعنائی، تنقید نگاری کی دل آویزی اور گہرائی کو یاد کریں گے۔ اور اکثر یاد کر کے اپنے ذوق ادب اور علم تحقیق میں نفاست نظافت اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب اب آپ وہاں ہیں جہاں اسلامی ورثہ مذہبی اضطراب اور ملی عزت و حمیت کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان محاسن کا بہت بڑا حصہ عطا کیا تھا اس لیے شفیع المذنبین کے صدقے میں آپ رب العٰلمین کی رحمتوں اور برکتوں سے ضرور سرفراز کیے جائیں گے۔ (آمین ثم آمین)

سیّدنا ابومحمّد طاہر سیفُ الدّین

ڈاکٹر حامد علی خان
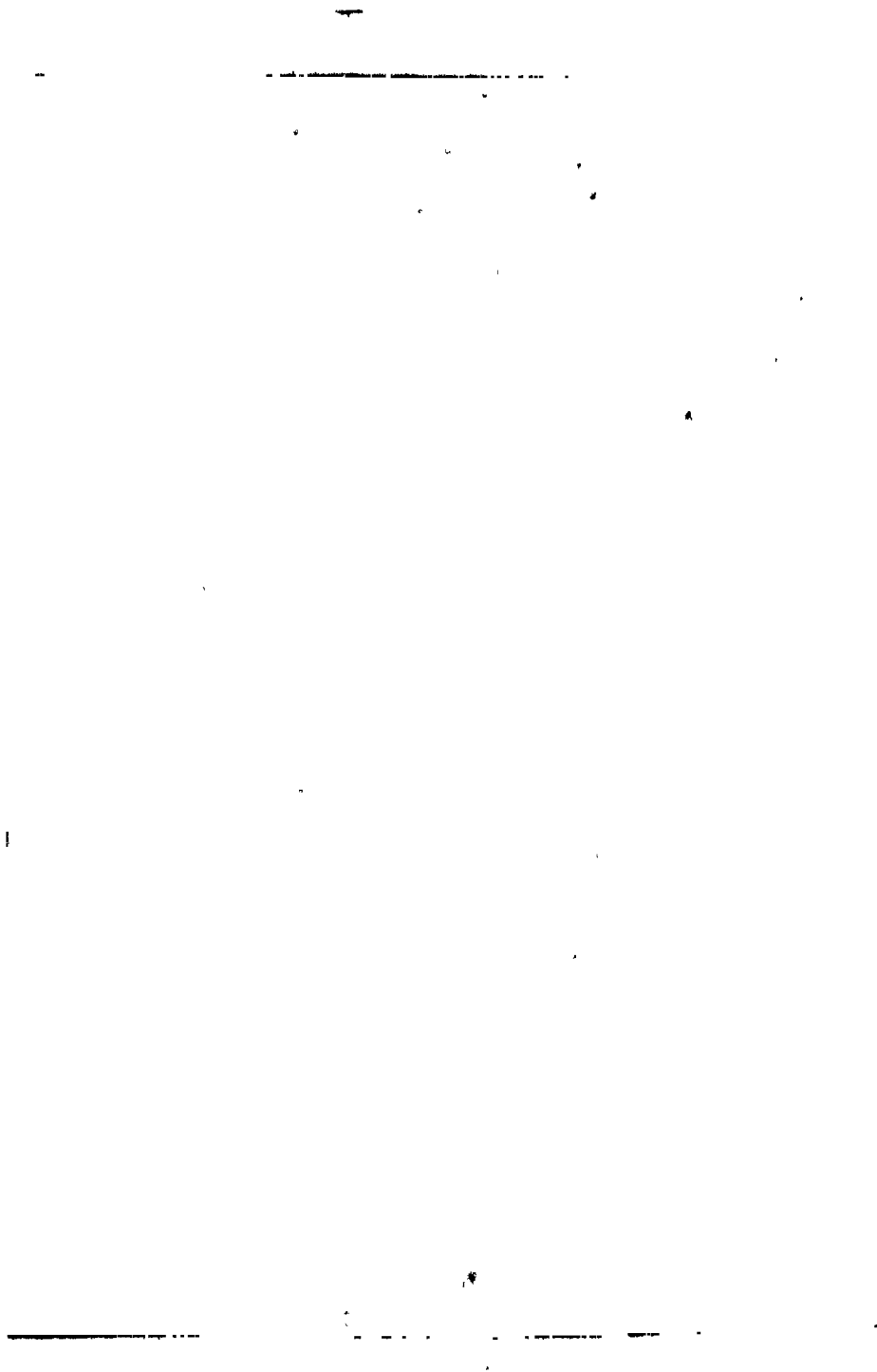
طاہر سیف الدین صاحب کی ولادت باسعادت شہر سورت میں بروز یکشنبہ بتاریخ ۴ اگست ۱۸۸۸ء / ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ ہوئی۔ اسلام کی مقدس کتابوں کی خصوصیت سے تعلیم ہوئی۔ آپ کو اسلامی تاریخ پر کامل عبور تھا اور عربی زبان و ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ اعلیٰ درجہ کے فاضل، عظیم واعظ و مبلغ، صاحب وقار، بلند کردار، بالغ نظر رہنما، نباض وقت، مفکر، مدبر، مصلح، اسلامی تعلیم کا عملی نمونہ، دردمند انسان، پیکر شرافت اور زبردست وطن پرور تھے۔ آپ دور رس نگاہوں کے مالک، دور اندیش اور دور بین تھے۔

آپ نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے تقریباً تین سو مدارس، ہائی اسکول اور کالج قائم کیے۔ اکثر مدارس میں کوئی تعلیمی فیس مقرر نہیں کی۔ آپ نے اپنی جماعت کے ہر فرد کے لیے پرائمری تعلیم لازمی قرار دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی جماعت کا کوئی فرد جاہل نہیں رہا۔ اندرون ہند اور بیرون ہند کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کے لیے وظائف مقرر کیے۔ صنعتی، زراعتی، انجینئرنگ اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے بھی وظائف عطا کیے۔ تعلیم کی توسیع و ترقی کے لیے نہ صرف مسلم اداروں بلکہ غیر مسلم تعلیمی اداروں کو بھی عطیات سے نوازا۔ آپ نے سیکڑوں تعلیمی اداروں کی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو گرانقدر عطیات مرحمت فرمائے۔ آپ کی علمی عظمت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو اسپیشل کانووکیشن میں آپ کو ڈاکٹر آف تھیالوجی کی ڈگری پیش کی گئی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے عہد میں یونیورسٹی کورٹ کے متفقہ فیصلے کے مطابق آپ کو یونیورسٹی کے چانسلر کے عظیم منصب پر ۱۹۵۳ء میں فائز کیا گیا اور تاحین حیات آپ چانسلر رہے۔ آپ سے پہلے یونیورسٹی کا چانسلر گورنر یا والی ریاست مقرر ہوتا تھا۔ آپ نے ملت اسلامی کی علمی و فکری قیادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یونیورسٹی کے چانسلر ہونے کی ذمہ داری قبول کی۔

آپ در حقیقت مذہبی انسان تھے۔ لیکن اپنی جماعت کی مادی ترقی کے خیال سے بھی آپ غافل نہ تھے۔ آپ کی جماعت تجارت پیشہ ہے۔ ان کی تجارت نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض میں ہے بلکہ پاکستان، عرب ممالک، مشرقی افریقہ، ایشیا اور یورپ کے دیگر ممالک میں ہے۔ آپ اقتصادیات کے ماہر تھے۔ آپ نے صنعت و حرفت اور کاروبار کے فروغ کی طرف توجہ مبذول کی اور آپ عملی کاروبار، مادی دولت اور خوشحالی کے بہم پہنچانے میں کامیاب رہنما ثابت ہوئے۔ آپ نے بینک اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے جماعتی ترقی کا مستحکم نظام شروع کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے صائب مشوروں پر عمل پیرا ہونے والوں نے خاطر خواہ کامیابی پائی۔

آپ کے علمی شغف کا یہ حال تھا کہ اپنے وسیع خاندان کے تمام افراد کی تعلیم پر اتنی توجہ کی کہ عربی زبان اور مذہبی امور کی خود تعلیم دیتے تھے۔ انگریزی، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ مضامین پڑھانے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کو مقرر کیا۔ اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو تعلیم کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھیجا۔ آپ نے اپنے فرزند اکبر طاہر برہان الدین صاحب کو بلاشبہ ہر طرح کی تعلیم

وتربیت سے آراستہ کیا اور عملی تعلیم دی۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی وغیرہ مسائل سے واقف کار بنایا۔ ذہانت وفطانت وغیرہ کے اعتبار سے ہر طرح قیادت وسیادت کا اہل ومرتبہ بنایا اور اپنی زندگی میں اپنا صحیح جانشین مقرر کیا۔ آپنے دوسرے صاحبزادگان کی تعلیم کے بعد انہیں دعوت کے مختلف شعبوں کا کام تفویض کیا۔ پرنس نجم الدین کو ملک کے باہر عملی مشاہدات کرنے اور تجربات حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔

آپ علم کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے مگر عمل کو ضروری قرار دیتے تھے اور اسی طرح تنظیم اور اخلاق کی تہذیب وتربیت کو لازمی قرار دیتے تھے۔ آپ نے عصری تقاضوں اور اسلامی عقائد وتصورات کے درمیان پیدا ہونے والی کشمکش کو محسوس کیا اور اس کا حل سوچا۔ آپ روحانیت ومادیت کے حسین امتزاج، قدیم وجدید کی آویزش اور دنیا ودین کے ایک ساتھ علم وعرفان کے قائل تھے یعنی مسلمان دین بھی جانے اور دنیا بھی۔ آپ تعلیمی، صنعتی اور اقتصادی میدان میں مسلمانوں کی ترقی کے خواہاں تھے۔ آپ کا ایمان ویقین تھا کہ محض اعلیٰ تعلیم کافی نہیں ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ان اوصاف حمیدہ اور اخلاقی تربیت کی ازبس ضرورت ہے جو مسلمان کو اچھا اور مثالی مسلمان بنائے یعنی جب مسلمان اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہوکر عملی دنیا میں قدم رکھے تو مذہب اور اس کے درمیان دوری نہ ہو اور اسلام سے بیگانہ نہ ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان صرف بڑا افسر، عہدہ دار، وزیر اور صنعت کار بن جانے کو اپنی امنگوں کا حاصل نہ سمجھے بلکہ وہ اسلامی اخلاق واقدار کا حامل ہو اور اتنا اچھا مسلمان ثابت ہو جو انسانیت اور انسانی آبرومندی کا اثاثہ بن جائے۔ اور مادی ترقی اس کے قدموں میں ہو۔ یہ ایسا خیال تھا کہ جس کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل کام تھا۔ آپ نے اپنی جماعت کے افراد پر اس کا تجربہ کیا چنانچہ وہ ایک طرف علم دین سے غافل نہیں ہوئے اور دوسری طرف مادی دنیا میں ترقی کرتے گئے۔ آپ کی اصابت رائے کے تحت آپ کے زندہ وجاوید تصور پر عمل کر کے بوہرہ جماعت زندہ ومتحرک موجود ہے۔ آپ نے ملت کو صنعت کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسی زمانے میں ایشین الیکٹرونک کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ مل کر بنیاد رکھی۔ ابتدا میں دشوار گذار حالات تھے مگر عزم، یقین، صداقت اور اعتماد کی بدولت کامیابی قدم بوس ہوتی گئی۔ اس طرح شکست خوردگی اور مایوسی کی شکار ملت مسلمہ میں حوصلے کی نئی فضا پیدا ہوگئی۔

آپ نے سورت میں "الجامعۃ السیفیہ" نامی عربی کالج کو بام ترقی پر پہنچایا۔ اس کالج کی لائبریری مختلف خصوصیات کی وجہ سے بالکل منفرد ہے۔ یہ عربی کا اقامتی ادارہ ہے۔ تقریباً دو سو طلبہ کے مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام ہے۔ کالج کے مختلف تعلیمی شعبوں میں سے عربی زبان وادب اور فلسفہ میں خصوصیت سے مہارت پیدا کرائی جاتی ہے۔ آپ کی مساعی جمیلہ کے عمدہ نتائج جلد ہی سب کے سامنے آگئے۔ جماعت کے اشخاص عربی درسگاہ "الجامعۃ السیفیہ" کے فارغ التحصیل ہوں یا جدید قسم کے اعلیٰ اداروں کے تعلیم یافتہ ہوں، وہ پچیس سال کے نوجوان ہوں یا کمپنیوں کے عمر رسیدہ ڈائرکٹر سب اپنے دینی رہنما کے ایک اشارے پر بڑے سے بڑا اور معمولی سے معمولی کام کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہے۔ ان کا جذبۂ عمل، ایثار، نظم وضبط، اخلاق، خدمت گزاری اور مستعدی لائق ستائش ہیں۔

اٹھائیس سال کی عمر میں ۱۹۱۵ء میں آپ پر داؤدی بوہرہ جماعت کے داعی مطلق کے عظیم منصب کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ بوہرہ جماعت کی تعداد دس لاکھ ہے۔ نصف تعداد ہندوستان میں سکونت پذیر ہے اور باقی افراد دنیا کے دسیوں ملکوں میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ اکیاونے داعی تھے۔ آپ نے پچاس سال کی طویل مدت تک امامت کے فرائض انجام دیے۔ آپ سے پہلے کسی داعی کو اس قدر طویل زمانہ میسر نہیں ہوا۔ آپنے اپنے فرائض بہت باقاعدگی اور پابندی سے ادا کیے۔ آپ اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے لہٰذا جماعت کی اصلاحات کیں، جماعتی انتشار وافتراق کو دور کیا، سب کو متحد ومتفق کر کے ترقی کی راہ پر لگایا اور سماجی ومذہبی بلندی سے ہم کنار کیا۔

آپ نے ہمت اور حوصلے کی تعلیم دی۔ ملک کی تقسیم کے موقع پر جو افسوسناک واقعات پیش آئے، ان میں دوسرے مسلمانوں کی طرح بوہرہ جماعت کو بھی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سینکڑوں مکانات جل گئے اور جائدادیں تباہ ہوگئیں۔ وہ پست ہمت ہوکر راہ فرار اختیار کرنے

اٰدہ ہوئے لیکن آپ نے ترکِ وطن کو ناپسند کرتے ہوئے یہ تلقین کی کہ
لسی کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ جو جہاں ہے وہاں ہی رہے
ور اپنے باقی ماندہ اثاثہ، محنت اور ایمان کے سہارے ایک نئی زندگی
ا تعمیر کرے۔ آپ کی تلقین اور فرمان پر مکمل طور سے عمل کیا گیا۔

آپ کے نزدیک دعوت کے بنیادی اصول ناقابل تبدیلی تھے
لبتہ ضروریات زمانہ اور جدید عہد کے حالات کو برابر پیش نظر رکھا
ن کو اپنایا گیا اور متعارف کرایا گیا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی
ویل عرصے تک حکومت کے باوجود انگریزی تعلیم کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا
تھا مگر آپ نے انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے پر نہ صرف اکسایا اور
جدید علوم کے حاصل کرنے پر زور دیا بلکہ خود جدید طرز کے مدارس قائم کیے
ور عربی زبان و ادب کے مرکز "الجامعۃ السیفیہ" میں انگریزی کی تعلیم کو
ازمی قرار دیا۔ پھر اپنی جماعت کے مردوں کے ساتھ تعلیم نسواں کو ضروری
رار دیا۔ خود اپنے صاحبزادے نجم الدین کو لندن بھیجا تاکہ جدید دور کے
قاضوں کا مشاہدہ کریں اور عملی علم سے واقف ہوں۔ آپ دنیوی ترقی
کے لیے برابر کوشاں رہے، بہت سے صنعتی اور تجارتی کاروبار کا آغاز کیا۔
پ نے حالات زمانہ کے ساتھ بہجانا کبھی پسند نہیں کیا بلکہ آپ حق و صداقت
سختی کے ساتھ استقامت کے ذریعے زمانے کو اپنا سازگار بنانے کے قائل
تھے۔ زمانے کو سازگار بنانا ہی بڑے لوگوں کا دستور رہا ہے۔ آپ نے دعوت
ے متبعین کے لیے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ آپ نے ایک طرف
دیم عہد پر ناقدانہ نظر ڈالی تو دوسری طرف جدید عہد کی تاریکی و گمراہی
ور مہلک خطرات پر نظرِ بصیرت سے کام لیا۔

آپ کے الفاظ متبعین کے لیے قوانین کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے
دفا اور معزز ناقدین کو ہمیشہ خوش آمدید کہا اور اُن کی غلط فہمیوں کا
الہ کیا۔ "تغیر پذیر حالات سے تبدیلی نہ کرنا" آپ پر سب سے
ا الزام ہے مگر آپ عقائد پر سختی سے قائم رہے، عقائد کے سلسلے میں کوئی
یم تک کو قبول نہیں کیا اور قدیم میں جدید کی پیوندکاری سے
نکار کیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں آپ کی دعوت کے پچیس سال گزرنے پر نہایت
ل و احتشام کے ساتھ سلور جوبلی منائی گئی۔ ہندوستان کے زیادہ تر
بڑے شہروں میں اس جوبلی کی یاد میں مدارس، شفاخانے اور اسی قسم کے
دوسرے ادارے قائم کیے گئے۔

آپ اپنے معمولات پر سختی سے کاربند رہے۔ آپ سحر خیز تھے اور
صرف چار گھنٹے سوتے تھے۔ طلوعِ آفتاب سے اس قدر قبل اٹھتے کہ پیدل
کے فاصلے پر واقع مسجد کو تشریف لے جاتے اور وہاں فجر کی نماز ادا کرتے
واپسی پر آپ اپنے خاندان کے جملہ افراد کو روزانہ۔ خورد و کبیر اور
دیگر متبعین کو بہ نفس نفیس تقریباً چار گھنٹے تعلیم دیتے۔ بعد ازاں لوگوں سے
ملاقاتیں کرتے، اُن کے سوالات کے جوابات دیتے اور اُن کے مسائل حل
فرماتے۔ آپ کے پاس لوگ صرف حصولِ برکت کے لیے ہی نہیں آتے
بلکہ شادی میں طرفین کے انتخاب، نکاح کی تاریخ کے تعین، جائداد کے
خرید و فروخت، دنیوی کاروبار شروع کرنے اور سفر کرنے کے بارے
تک میں مشورہ کرتے تھے۔ آپ ہر لحاظ سے اُن کے رہنما، مشیر اور مخلص
دوست تھے۔ محل اور دفتر دونوں جگہ لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپ نہایت
صبر سے یہ کام انجام دیتے رہے۔

آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ نماز، روزہ یا کوئی فرض عین
حیات ترک نہیں کیا۔ سفر و حضر میں اوقات کی پابندی کے ساتھ آپ
نماز ادا کرتے اور اہل خاندان سے بھی پابندی کراتے۔ ماہ محرم میں
خصوصیت سے طویل ترین تقریریں کرکے وعظ و نصیحت کرتے۔ آپ
گوناگوں مشاغل سے بہ حسن اسلوب عہدہ برآ ہوئے۔ آپ نے بنفسِ نفیس
تقریبات میں شرکت کی اور گرمجوشی سے ملاقاتیں کرنا روزانہ کا مشغلہ بنایا۔
آپ کام سے کبھی نہ تھکے۔ آپ "کام اور صرف کام" کو پسند کرتے تھے۔
آپ سینما یا گھوڑوں کی ریس کے میدان میں جاکر تسکان دور کرنے کے
قائل نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی جگہوں پر آپ کبھی تشریف
نہیں لے گئے۔

آپ مسلم عوام اور بے شمار غیر مسلموں کا احترام کرتے تھے۔ ہندوستان
کے اہم رہنماؤں اور متعدد والیان ریاست سے آپ کی ملاقاتیں
تھیں۔ مہاتما گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح سے ذاتی اور خصوصی تعلق
تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی تعارف تھا۔ البتہ آپ نے کسی
قسم کی سیاست میں سرگرم حصہ نہیں لیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز

نہیں بلکہ ملک کے اہم اور مخصوص حالات و واقعات سے صرف نظر کیا اور دنیا کے واقعات سے روگردانی کی۔ ہندوستان میں عوامی زندگی کے خدوخال کی تصویر کشی میں آپ کے نیک مشوروں اور گفتگوؤں نے قابل قدر رول ادا کیا۔ آپ کی صائب آرا، تجربات اور ذہانت و فراست سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔

اپنوں اور بیگانوں، مسلمانوں اور غیر مسلموں، ہندوستان کے عوام و خواص اور دیگر ممالک کے باشندوں کے نزدیک آپ یکساں طور پر معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی قدر و منزلت کا یہ ثبوت ہے کہ آپ نے ایک سے زیادہ بار ہندوستان کے بڑے شہروں کا سفر کیا اور ہر جگہ آپ سے ملاقات اور دیدار کے لیے ہجوم رہا۔ جب آپ پونہ، مدراس اور کراچی تشریف لے گئے تو آپ کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے گئے۔ اسی طرح بمبئی، کلکتہ، دہلی اور کولمبو وغیرہ شہروں میں استقبالیے دیئے گئے۔ ان خیر مقدمی تقریبات میں امراء و حکام، وزرا، و گورنروں اور ہر قوم، ذات اور پارٹی کے اہم افراد نے شرکت کی۔

اسلامی ممالک کے حالات سے آپ کو گہری دلچسپی تھی لہذا ۱۹۳۱ء میں جب دنیا کے سامنے فلسطینی مسئلہ ابھر کر سامنے آیا تو بمبئی میں پہلی فلسطینی کانفرنس آپ کی رہنمائی میں منعقد ہوئی جس میں آزادی اور امن عالم کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ مختلف الخیال علمائے فلسطین کے بارے میں تاریخی فیصلے کیے، اہم تجاویز منظور کیں اور مغربی ممالک کی اختیار کردہ پالیسی کی مخالفت کی۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین کی مجوزہ تقسیم کے خلاف آپ نے حکومت برطانیہ کو احتجاجی تار ارسال کیا۔

آپ جماعۃ المسلمین کی وحدت و فلاح اور عالم اسلام کے اتحاد کی فکر میں ہمیشہ منہمک رہے۔ آپ کا دل اسلامی اتحاد کے لیے برابر تڑپتا رہا۔ اسی لیے دینی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی میدانوں میں مسلمانوں کی تنظیم کے لیے مسلسل کوششیں جاری رہیں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے عراق کا سفر کیا۔ بغداد، بصرہ، نجف اور کربلا تشریف لے گئے۔ ہر شہر میں حکمراں خاندان، وزرا، اعیان، علما، اعیان و اشراف اور عوام نے نہایت شان و شوکت سے استقبال کیا۔ نیازمندی اور عقیدت مندی سے بھرپور جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے عملاً آپ کی تعظیم و تکریم کا ثبوت فراہم کیا۔ آپ نے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ میں حضرت علی مرتضیٰؑ اور حضرت حسینؑ کے مزارات پر حاضری دی تو دیکھا کہ دونوں مزارات کے احاطے مرمت طلب ہیں اور مرمت کی سخت ضرورت ہے۔ آپ نے دونوں کی تبدیلی کی ذمہ داری قبول کی۔ ہندوستان واپس آئے تو ہندوستان کے ماہر کاریگروں کی خدمات حاصل کیں۔ دونوں ضریحوں کی تیاری میں سونا اور چاندی استعمال کیا گیا۔ اول الذکر کی تیاری کا چھ لاکھ تولہ چاندی اور دو ہزار تولہ سونا خرچ ہوا اور مکمل ہو جانے پر ۱۹۳۶ء میں عراق کو بھیجا گیا۔ ثانی الذکر کی تیاری میں دو لاکھ تولہ چاندی اور پانچ سو تولہ سونا خرچ ہوا اور تکمیل کے بعد ۱۹۴۰ء میں عراق کو ارسال کیا گیا۔

آپ ۱۹۲۶ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین گئے۔ شاہ ابن سعود کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے سلوک کیا گیا۔ آپ کے اعزاز میں شاہ نے ایک شاندار دعوت دی۔ مکہ مکرمہ میں اسلامی ممالک کی اہم شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں اور اسلامی مفاد کے متعدد مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ آپ نے خانۂ کعبہ پر ترکی خلیفہ کے عہد کا آویزاں قالین دیکھا۔ اس قالین کو پچاس سال گذر چکے تھے اور اس کا تبدیل کیا جانا مناسب تھا لہذا ہندوستان کو مراجعت ہوئی تو بنارس میں سرخ سلک سے غلاف کعبہ تیار کرایا۔ اس پر سفید ریشم سے قرآنی آیات تحریر کی گئیں۔ یہ غلاف نہایت قیمتی اور آرٹ کا نادر شاہکار تھا۔ یہ غلاف تیار ہو گیا تو اسے مکہ معظمہ کو بھیج دیا گیا۔

فریضۂ حج سے فراغت کے بعد آپ نے شام، فلسطین اور مصر کی سیاحت کی۔ ہر ملک کے عوام و خواص نے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا اور آپ کی عظیم شخصیت کو مکمل طور پر خراج عقیدت پیش کیا۔ قاہرہ میں تقریباً ایک ماہ کے قیام کے دوران اہرام مصر کی سیر کی اور مختلف اداروں میں تشریف لے گئے۔ مصر کے فاطمی خلفا کے اکیسویں داعی کے بعد آپ نے مصر میں قدم رنجہ فرمایا۔ مصری حکومت نے فاطمی عہد خلافت کے سونے کے سکّے، خط کوفی میں تحریر شدہ ملبوسات اور نادر مخطوطات وغیرہ خدمت عالی میں پیش کیے۔ آپ نے یورپ، افریقہ، برما اور انڈونیشیا کے بھی سفر کیے۔

آپ کی وفات حسرت آیات عروس البلاد بمبئی میں بروز جمعہ بتاریخ

رنومبر ۱۹۷۵ء ۱۷ رجب ۱۳۹۵ھ ہوئی۔ قمری حساب سے آپ نے اسّی سال
مر پائی۔ آپ کو دنیا بھر میں "سفیر امن" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ آپ کا
ہرہ" الروضة الطاھرۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ "الروضة الطاہرۃ"
نصیل بیان نہایت طویل اور مستقل مضمون کا متقاضی ہے لیکن اس کا تعارف
ے کیے بغیر مضمون نامکمل رہے گا۔ اس لیے انتہائی اختصار کے ساتھ
رپر کیا جا رہا ہے۔

"اَلرَّوْضَةُ الطَّاھِرَۃُ" دنیا کا پہلا مزار ہے جو ایک طرف
ش قیمت جواہرات سے مرصع ہے تو دوسری طرف اس پر مکمل قرآن کریم
ندہ ہے۔ یہ فن تعمیر کا حسین اور نادر نمونہ ہے۔ یہ روضہ ایک عمارت کا
نہیں بلکہ عالمی آثار، وراثت علم و ہدایت، ایمان اور انسانیت کے اس
ر کا نام ہے جو سنگ مرمر سے تراش کر رکھ دیا گیا ہے۔ روضۂ ہذا کا مقصد
و جلال اور شان و شوکت کا مظاہرہ نہیں تھا بلکہ اس عمارت میں
ا صدیوں کا لب لباب اور عالمی آثار کو چن چن کر یک جا کر دیا گیا
ے۔ ان خصوصیات کی حامل عمارت کا نقشہ ماہرین فن تین سال میں
رکر سکے۔ اس تاریخی روضے کی تعمیر بمبئی کے گنجان علاقے بھنڈی بازار
۱۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو شروع ہوئی اور تعمیر پر ساٹھ لاکھ روپے صرف ہوئے
لم جماعت کے افراد سے حاصل ہوئی۔ روضۂ طاہرہ کے وسیع و عریض ہال
مین وسط میں آپ کا مزار ہے۔ مزار کے ٹھیک اوپر عظیم الشان بلوری
ومر (فانوس) آویزاں ہے۔ ہال کی چاروں سمتوں میں دروازوں کو
ندی کے پتروں سے ڈھانپا گیا ہے۔ روضۂ ہذا کے شمالی حصے میں
رکن ڈیشنڈ مسجد مصر میں دسویں صدی کی تعمیر شدہ مسجد کے نمونے
بنائی گئی ہے۔ روضۂ طاہرہ کی اونچائی بانوے فیٹ ہے اور بانوے
ون پر ہی اس کی بنیاد ہے۔ حساب جمل سے بانوے کا عدد حضرت
ت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے۔ اس پر باون فیٹ بلند گنبد ہے
اس پر بارہ فیٹ اونچا طلائی کلس ہے۔ اس کی اندرونی اونچائی سطح
ے اسّی فیٹ ہے جو مرحوم کی عمر کی طرف اشارہ ہے۔ اندرونی لمبائی اور
ائی اکیاون اکیاون فیٹ ہے جو اکیاونویں داعی کی غمازی کرتی ہے۔
ی عمارت کا وزن پانچ ٹن ہے۔

آپ جس نسخۂ قرآن سے تلاوت کرتے تھے اس کے صفحات کا فوٹو
آثار سے کے بعد سنگ مرمر کی بڑی بڑی سلوں پر اس کا عکس منتقل
کیا گیا۔ پھر اسے کندہ کرنے کے بعد ان میں سونا بھرا گیا۔ روضۂ مذکورہ کی
اندرونی دیواروں پر سات سو بہتر سنگ مرمر کی سلوں پر کامل قرآن مجید
کندہ ہے۔ ہر سورت کے آغاز میں "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کی تحریر میں
ہیرے، موتی، پنا، مرجان اور یاقوت کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ روضہ فانی
انسان کے لیے روحانی مسکن ہے جہاں روحانی فرحت و انبساط سے
بہرہ ور ہوا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ روضہ مرحوم کی سیرت، شخصیت، انداز
شیرینی، تقدس، علم دوستی اور ایمان پروری کی لطیف، دلکش اور منفرد
یادگار ہے۔

روضۂ طاہرہ کی تعمیر پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی تو نہایت پروقار طریقے
پر افتتاحی تقریب منعقد کی گئی۔ ہندوستان کے صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد
مرحوم نے بروز شنبہ بتاریخ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء / ۱۳۹۵ھ تقریب کا افتتاح
کیا۔ یہ تقریب ۲۴ اپریل تک جاری رہی۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے
اندرون ہند اور بیرون ہند دعوت نامے ارسال کیے گئے۔ چنانچہ ہندوستانی
امراء، حکام، گورنر، وزراء، ارباب علم و بصیرت، مفکرین و دانشوران کرام،
ہر عقیدہ و مسلک کے اکابر اسلام، صاحبان مرتبہ و باکمال اشخاص معزز
ہستیوں اور اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اس تقریب میں شرکت
کی۔ ایک ہزار سال میں دنیا کے مختلف الخیال علماء و فضلا اور زعماء
ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ مغربی ایشیا کے مسلم سربراہوں اور بادشاہوں
کے خصوصی نمائندوں کی شرکت نے اس تقریب میں چار چاند لگا دیا۔
جامعۂ ازہر، مصر کے شیخ الفضیلت الامام الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود بنفس نفیس
تشریف لائے۔ ایک ہزار سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ جامعۂ ازہر کے کسی
شیخ نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔

روضۂ طاہرہ کی افتتاحی تقریب کا مقصد صرف مزار کا افتتاح
یا مرحوم سے عقیدت مندی کا مظاہرہ یا آرٹ کے نادر شاہکار کی نمائش
نہ تھا بلکہ عام مسلمانوں کی ترقی اور آخری کتاب ہدایت کی طرف توجہ
منعطف کرانا اور دل و جان سے رغبت کرنا مقصد تھا۔ اسی لیے "قرآن
پاک کی قرأت کا مقابلہ" کے عنوان سے ایک پروگرام رکھا گیا تھا
جس میں اسلامی دنیا کے چوٹی کے قراء نے حصہ لیا اور اپنی سحر انگیز قرأت سے

لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں ایمانی حرارت اور ولولہ و جوش پیدا کیا۔
اس کے علاوہ عربی اور اسلامی علوم پر بین الاقوامی مباحثہ، سب سے
اہم پروگرام پہلے سے مقرر کیا گیا تھا۔ اس فقید المثال اسلامی اجتماع میں
تمام فضلا نے متعدد نشستوں میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، مفید
آراء سے نوازا اور ایک مثالی ادارہ قائم کرنے کے لیے جامع لائحۂ عمل پیش کیا
لہٰذا "معہد الدراسات الاسلامیۃ والعربیۃ" (Academy of Islamic and Arabic Studies) کا قیام عمل میں آیا اور شرکاء نے
اس ادارے کے قیام کو فالِ نیک سے تعبیر کیا۔ ادارۂ ہٰذا کے قیام کے لیے
اکیس لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی اور انجمن اسلام بمبئی کی نگرانی
میں ادارہ دیے جانے کا فیصلہ کر کے انجمن کو مذکورہ رقم کا چیک دے
دیا گیا۔ بلا مبالغہ یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ مسجد تزکیۂ نفس کے لیے ہے
اور "معہد" کا قیام علم کے لیے ہے جو مرحوم کی کشادہ دلی، وسیع المشربی اور
جمہور مسلمین کے لیے جذبۂ فلاح کا مظہر اور زندہ ثبوت ہے۔

آپ کئی زبانوں کے عالم اور شائق مطالعہ تھے۔ عربی زبان میں
غیر معمولی صلاحیت اسلامی دنیا میں مسلّم تھی۔ عربی نثر و نظم دونوں میں
مہارت و کمال تھا۔ عربی عبارات میں مختلف صنائع و بدائع کے استعمال
پر کامل قدرت تھی۔ چنانچہ آپ نے فن بدیع کی مختلف صنائع مثلاً صنعت
مہملہ، صنعت تجنیس وغیرہ یا مخصوص حرفوں مثلاً "الف" سے خالی الفاظ
یا صرف "الف" پر مشتمل الفاظ استعمال کر کے نثر و نظم میں لکھا۔ آپ صاحب
لسان بھی تھے اور صاحب قلم بھی۔ قوتِ حافظہ میں معلومات کے استحضار
کا یہ عالم تھا کہ ہر سال ماہ رمضان میں بزبان عربی ایک مذہبی تصنیف
کا تیار کرنا آپ کا معمول تھا۔ مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
میں آپ کی پینتیس تصنیفات و تالیفات موجود ہیں جن میں پانچ ہزار آٹھ
سو بارہ اشعار پر مشتمل ایک سو ستائیس قصائد درج ہیں۔ آپ کی شاعری
فطری تھی اور آپ عربی زبان کے قادر الکلام، بلند پایہ اور فی البدیہہ کہنے
والے اعلیٰ شاعر تھے۔ آپ کے چند قصیدوں کا عنوان مناجات اور نعتِ
نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ دیگر تمام قصائد کا موضوع اہل بیت کی منقبت
یا مدح ہے۔ کسی بھی قصیدے میں تشبیب کے اشعار نہیں ہیں۔ ذیل میں
چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج ہیں:۔

أحمدُ المصطفى النبيُّ التهامي　　سيّدُ المرسلين خيرُ الا
ميتُهُ في الأنامِ كالمسكِ شائعٌ　　ذكرُهُ في الدهورِ لا يَـ
نيلُهُ للعباد كالبحرِ ما　　جودُهُ للعفاةِ كالغيث
نالَهُ من متوّجٍ بجلالٍ　　من لدن ذي الجلال
فحباهُ الرحمنُ من كلِّ مجدٍ　　وفخارٍ بأجزلِ الأقسـ
وهو أسرى به الى المسجد الاقصى من المسجد الشريف ا
ثم صلّى هناك بالانبياء الـغرّ والرسل منه خيرُ
وارتقى في السبع السموات حتى　　عزّ من ان يُرى له مثـ
ورأى ربّهُ لدن سدرةِ المنتهى فاحتوى جليل ا
نورُها في الانام كالشمس بادٍ　　وبه مرّ من نوره
نفرٌ دين الهدى به ذو امتلاءٍ　　نفرٌ وجه العلا به فدابا
عصمةُ الله يُرتجى كهف الأيامى　　مؤمّلُ الخلق كافلُ الايـ
دينهُ الحقُّ عروةُ الله حقًّا　　وهي وثقى مأمونة ا
آمرٌ بالرشاد ديناً ودنيا　　ماحقاً للهدى بحسن الـ
من يزغ عن هداه يضلل ويظلل　　عاملاً مثل هذه الاذ

ترجمہ:۔ حضرت احمدؐ برگزیدہ پیغمبر اور مکہ مکرمہ کے باشندہ۔
آپؐ رسولوں کے سردار اور مخلوق میں سب سے برتر ہیں۔
مخلوق میں مشک کی طرح آپؐ کی شہرت و نیک نامی
کا ذکر خیر ہر زمانے میں رہا اور اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔
بندگانِ خدا کے لیے آپ کی فیاضی سمندر کی طرح موج
سائلین اور طلب گاروں کے لیے آپ کی سخاوت ابر کر
برابر رواں اور برسنے والی ہے۔ آپ کو اس شہنشاہ عالم
جو ذوالجلال والاکرام (اللہ تعالیٰ) نے جلال کا تاج پہنایا:
بے شک خدائے رحیم نے آپ کو ہر ایک شرف و فخر کے ا
اعلیٰ ترین اقسام سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے آپ
معراج مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف چلایا۔ وہاں ا
میں سب سے اعلیٰ و بہترین امام یعنی آپ نے روشن دعا
کو نماز پڑھائی۔ سات آسمانوں میں آپ مرتقی ہوئے
آپ کو وہ شانِ یکتائی حاصل ہوئی کہ جس میں آپ کا کوئی ہم

آپ نے سدرۃ المنتہیٰ پہنچ کر اپنے رب کی تجلی دیکھی اور اس دیدار
سے آپ نے بلند مقام پایا۔ ۱۱ آپ کا نور خلق میں آفتاب کی مانند
ہے۔ ایسے نابینا کے لیے تباہی جس نے جان بوجھ کر اس نور یزدانی
سے چشم پوشی کی۔ ۱۲ دین ہدایت کی سرحد آپ کی بدولت محفوظ
ہے اور بلندی کا رخ روشن آپ کی بدولت خنداں ہے۔
۱۳ آنحضور صلعم پناہ گزینوں کے لیے جائے پناہ، بیواؤں کے لیے
سہارا و پشت پناہ، خلق کے لیے ملجا و ماوی اور یتیموں کے لیے
ضامن و مربی ہیں۔ ۱۴ آپ کا دین حق بے شک خدا کا وہ مضبوط
رشتہ ہے جس کا ٹوٹنا ممکن نہیں ہے۔ ۱۵ دین و دنیا آپ
کی ہدایت و رہبری سے آباد ہیں۔ ہدایت آپ کے حسن نظام
سے محفوظ ہے۔ ۱۶ جو آپ کی ہدایت سے انحراف کرے گا وہ
گمراہ ہوگا اور ان جانوروں کی طرح مہمل و بے کار بن کر رہے گا۔

على محمد ربه — حبيبه من حبه حُبُّه (1)
على محمد ربه — من هو بين خلقه لُبُّه
من بين الرسل خلت — شمس هدى وكلهم شهبه
قربه ربه — حتى كقوسين فدا قربه
ن يصبه شدة فليلذ — بعزه يذل له صعبه
ث لمن قد مسه ضر — غيث لمن حل به جدبه
مد حسبي في شدتي — طوبى لمن محمد حسبه

یہ۔ حضرت محمد پر آپ کے پروردگار نے صلوٰۃ بھیجی ہے۔ محمد
ب خدا ہیں، آپ کی محبت سے خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ ان
معرعوں میں قرآن عظیم کی دو آیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان اللّٰہ
ملائکتہ یصلون علی النبی" "ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی
یحببکم اللہ"۔ ۲ حضرت محمد پر آپ کے حقیقی رب نے رحمت نازل
ائی کیونکہ آپ کی ذات گرامی ہی تمام مخلوقات کا لب لباب ہے۔
للہ کے تمام رسولوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب ہدایت
اور دوسرے رسول تاروں کی مانند ہیں۔ ۴ خدائے برتر نے حضرت
کو اپنے انتہائی تقرب سے نوازا تا آنکہ آپ کے اور خالق کے درمیان
فاصلہ ختم ہوگیا جیسا کہ "فکان قاب قوسین او ادنیٰ" ارشاد خدا

وندی ہے۔ ۶ جس کو بھی کوئی تکلیف پہنچے تو اسے آپ کے عز و شرف
کے ذریعے پناہ لینا چاہیے۔ اس طرح اس کی صعوبت دور ہو جائے گی۔
۷ محمد ہی ہر مصیبت زدہ کے لیے فریاد رس ہیں اور آپ ہی مفلس
و خستہ حال کے لیے ابر رحمت ہیں۔ ۸ میری سختی و پریشانی میں
محمد میرے لیے حقیقی مشکل کشا ہیں۔ خوش نصیبی درحقیقت اسی شخص
کی ہے کہ جس کے کفیل محمد بن جائیں۔

بنو المصطفى الغر الكرام الغطارف — لهم تالد من كل فخر وطارف (2)
لهم من لدن ذي العرش تاج عظمة — ومن حلل التطهير حقا مطارف
وهم لإله الخلق حقا مظاهر — وهم لرسول الله حقا خلائف
ووالدهم مولى البرية حيدر — مواطنه مشهورة والمواقف
لهم الارفعون الاشرفون منازلا — فمن ذا يساميهم ومن ذا يشارف
ونور هداهم في الخليقة لامع — وغيث نداهم في البرية واكف

ترجمہ۔ ۱ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد یعنی اہل بیت روشن
چہرہ، صاحبان کرم یعنی صفات حمیدہ سے متصف اور صفات ذمیمہ
سے منزہ، اسلامی امت کے معزز قائد ہیں اور ہر قسم کے جدید و قدیم یعنی
اکتسابی و موروثی فخر کے مالک ہیں۔ ۲ مالک عرش کی جانب سے ان ہی
کے لیے عظمت و فضیلت کے تاج ہیں۔ تطہیر و تقدیس کے لباسوں کی
خوشنما چادروں سے وہ آراستہ ہیں۔ ۳ بے شک اہل بیت خالق کائنات کے
مظاہر ہیں اور حقیقت میں وہ رسول اللہ کے جانشین ہیں۔ ۴ اہل بیت کے
مورث اعلیٰ اور والد علی مرتضیٰ حیدر کرار ہیں۔ ان کے بلند مراتب اور مقامات
مشہور و معروف ہیں۔ ۵ اہل بیت رفعت، شرافت اور قدر و منزلت کے
اعتبار سے اس قدر بلند مقامات پر فائز ہیں کہ نہ کوئی ان کا ہمسر ہے
اور نہ کوئی عز و شرف میں ان سے قریب تر ہے۔ ۶ مخلوق میں اہل بیت
کی ہدایت کا نور درخشاں و تاباں ہے اور ان کی سخاوت و فیاضی کا ابر
رحمت مخلوق کو مسلسل سیراب کرنے والا ہے۔

حواشی

۱ مہرجان الافتتاح السعید شمس الزمان مطبوعہ ۱۳۹۵ھ ہفت روزہ ترجمان سینا نمبر
جلد ۱۲ شمارہ ۲۵، ۲۶ ۲ قصیدہ نعتیہ ۲-۷ ۳ صحیح نور ۲۰۹
۴ سلسلۂ نور مقطع ۴۲، ۴۴

"زندگی ایک حرکت پذیر شے ہے جس میں ہر آن تغیر و تبدل رونما ہوا کرتا ہے۔ تغیر و تبدل کے تسلسل سے زندگی کی پیش رفت ہوتی ہے اور انفس و آفاق کی نئی نئی راہیں سامنے دکھائی دیتی ہیں۔ سید ؒ نے زندگی کے اس راز کو سمجھا اور اپنے زمانے کی معروف قدروں سے انحراف کرتے ہوئے ایک ایسی راہ اپنائی جو زندگی کے تغیر و تبدل کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔ اس راہ میں جو چند اہم مقامات آئے تھے ان میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، تہذیب الاخلاق کا اجرا، قدیم تاریخی کتابوں کی جدید انداز کی ترتیب و تدوین اور مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی تاسیس خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مدرسۃ العلوم مسلمانان، کالج بنا اور اس کے بعد یونیورسٹی، یہ یونیورسٹی زمانے کے گرم و سرد کا مقابلہ کرتی ہوئی اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آج اس یونیورسٹی کے شعبوں میں جو توسیع ہو چکی ہے، جو نئے نئے علوم پڑھائے جانے لگے ہیں، جو نئی نئی وسیع و عریض عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں، طلبہ کی تعداد جس قدر بڑھ چکی ہے، اب سے پچاس سال پہلے اس کا تصور بھی مشکل تھا، جب کسی ادارے میں توسیع ہوتی ہے تو نئے نئے مسائل سامنے آتے ہیں، رفتارِ سفر میں تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے، روایات میں قطع و برید ہوتی ہے، مقصد تو وہی رہتا ہے مگر حصولِ مقصد کی راہیں اکثر بدل جایا کرتی ہیں جس کو ظاہر بین افراد اصل سے انحراف کا نام دیتے ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں توسیع ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ رفتارِ سفر میں تبدیلی آئی ہے، روایات میں ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے اور حصولِ مقصد کی راہ اب وہ نہیں ہے جو اب سے ساٹھ ستر برس پہلے تھی لیکن اس کو اصل سے انحراف قرار دینا کور نظری ہوگی۔"

سید ہاشم علی

شرکائے محفل :

عبید اللہ فہد ——— رسیرچ اسکالر، شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

قمر الہدیٰ فریدی ——— نوجوان ادیب اور افسانہ نگار، رسالہ تہذیب الاخلاق کے سابق نائب مدیر، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر۔

ڈاکٹر مشرف علی ——— ریڈر شعبۂ قانون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

ضیاء الدین احمد برنی ——— معروف صحافی اور ادیب، عطیہ فیضی کے خطوط کا ترجمہ اردو میں کیا۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ——— مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین، کئی اہم کتابوں کے مصنف۔

شمس بدایونی ——— علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے، اردو رسالہ "روشن" (بدایوں) کے ایڈیٹر، کئی کتابوں کے مرتب و مصنف۔

مالک رام ——— مشہور محقق اور ماہر غالبیات، اسلامیات پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ ایک مدت تک اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف و مرتب۔

پروفیسر خورشید الاسلام ——— ممتاز نقاد اور شاعر۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر۔ کئی ادبی اور تنقیدی کتابوں کے مصنف۔ انگریزی داں طبقے کو اردو ادب سے روشناس کرانے کی ان کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔

الطاف حسین ندوی ——— شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر۔ عربی ادب کے فاضل۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ——— شعبۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ——— شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر۔ تنقید نگار اور شاعر۔ کئی کتابوں کے مصنف و مرتب۔

ڈاکٹر شان محمد ــــــــــ شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر۔ متعدد کتابوں کے مصنف۔

ڈاکٹر جمال آرا نظامی ــــــــــ ویمنس کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کی استاد۔ تصنیف و تالیف سے خاص دلچسپی ہے۔

وحید احمد ــــــــــ اڈیٹر رسالہ "نقیب" (بدایوں)۔ مضامین کا مجموعہ "گرد راہ" بہت معروف ہے۔ فانی کا پہلا دیوان نقیب پریس سے شائع ہوا۔

پروفیسر نورالحسن نقوی ــــــــــ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر، رسالہ "تہذیب الاخلاق" اور "فکر و نظر" کے سابق مدیر۔ کئی کتابوں کے مصنف و مرتب۔

شہپر رسول ــــــــــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے غیر تدریسی عملے سے منسلک ہیں۔ شعر کہتے ہیں۔ ہند و پاک کے ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات چھپتی رہتی ہیں۔

محمد محمود فیض آبادی ــــــــــ شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر۔

عبد المجید سالک (مرحوم) ــــــــــ ممتاز ادیب، صحافی، نقاد اور تذکرہ نگار۔ پٹھان کوٹ سے ادبی رسالہ "فانوس خیال" جاری کیا۔ اس کے علاوہ "تہذیب نسواں" اور "پھول" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ "ذکر اقبال" کے نام سے علامہ اقبال کی سوانح حیات قلم بند کی۔

حسن الدین احمد ــــــــــ ممتاز انشا پرداز، مترجم اور دانش ور، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے فاضل۔ رٹائرڈ آئی اے ایس۔ "بھگوت گیتا" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اپنی نوعیت کی منفرد کتاب "اردو الفاظ شماری" ترتیب دی۔

ڈاکٹر محمد انظار الحق (مرحوم) ــــــــــ شعبۂ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر تھے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ــــــــــ راجیہ سبھا کے ممبر، سابق استاد شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

پروفیسر محب الحسن ــــــــــ مشہور مورخ۔ سابق پروفیسر تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کشمیر یونیورسٹی۔ تاریخی موضوعات پر انگریزی اور اردو میں کئی اہم کتابوں کے مصنف۔

ضیاء الحق چودھری ــــــــــ لکچرر شعبۂ کسٹری، کرسچین کالج، لکھنؤ۔

پروفیسر ثریا حسین ــــــــــ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سابق صدر۔ متعدد کتابوں کی مصنف و مرتب۔

ڈاکٹر صغریٰ مہدی ــــــــــ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریڈر۔ اردو کی ممتاز ادیبہ۔

محمد صبا برصبا برحدی ــــــــــ "فکر و نظر" کے نائب مدیر۔ عربی ادب سے متعلق اردو میں کئی مضامین "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہو چکے ہیں۔ "فکر و نظر" میں بھی لکھتے رہتے ہیں۔

جلیل قدوائی ــــــــــ شاعر اور نقاد۔ حسرت پر ایک کتاب لکھی۔ متعدد روسی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

اردو کے لکچرر مقرر ہوئے بعد ازاں حکومت ہند شعبۂ اطلاعات سے وابستہ ہو گئے۔

ظفر الاسلام ——— شعبۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر۔ مختلف موضوعات پر برابر لکھتے رہتے ہیں۔

خلاق احمد ——— شعبۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر۔

ہ عابد حسین (مرحومہ) ——— ممتاز ناول نگار اور افسانہ نویس۔ تنقید سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ کئی اہم ادبی و تنقیدی کتابیں انھوں نے یادگار چھوڑی ہیں

محمد یسین ——— شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر، اردو اور انگریزی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ تنقید نگار اور متعدد کتابوں کے مصنف۔

علی جوہر ——— شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر۔

یسر اسلوب احمد انصاری ——— انگریزی اور اردو کے ممتاز نقاد۔ شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر و صدر۔ رسالہ "نقد و نظر" کے مدیر۔ انگریزی اور اردو میں کئی تنقیدی کتابوں کے مصنف۔

یسر حکیم سید ظل الرحمٰن ——— طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ علم الادویہ میں پروفیسر۔ طب پر متعدد کتابوں کے مصنف۔

فیسر آل احمد سرور ——— بلند پایہ نقاد، شاعر اور دانشور۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر، انجمن ترقی اردو ہند کے سابق جنرل سکریٹری اور اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی کے سابق ڈائرکٹر۔ انگریزی ادب پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ کئی اہم تنقیدی کتابوں کے مصنف اور متعدد ادبی اور علمی کتابوں کے مرتب۔

ڈ عبد الباری ——— شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر۔ آج کل صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

ار مسعود ——— شیخ عطاء اللہ کے فرزند ہیں۔ شیخ عطاء اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقتصادیات کے استاد تھے۔ "اقبال نامہ" کے نام سے اقبال کے خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کیا، "آوازِ دوست" اور "سفر نصیب" مختار مسعود کی مقبول کتابیں ہیں۔

ز حسین خاں (مرحوم) ——— لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل۔ ماہر تعلیم، سابق انسپکٹر آف اسکولز، سابق پرنسپل شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ۔ فلسفے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ "انواعِ فلسفہ" کے مصنف۔ اردو میں ساہتیہ اکاڈمی کے پہلے انعام یافتہ۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی ——— شعبۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے جوائنٹ ایڈیٹر، فارسی زبان وادب کے ممتاز عالم، اردو کے معروف شاعر اور نقاد۔ متعدد کتابوں کے مصنف ومرتب۔

پروفیسر اطہر صدیقی ——— شعبۂ زولوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر وصدر۔ ممتاز سائنس داں۔

ڈاکٹر محمد اقبال ——— شعبۂ باٹنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مرحوم) ——— دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سابق نگراں، رسالہ "معارف" کے سابق ایڈیٹر۔ اسلامیات اور تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اردو میں متعدد تاریخی اور علمی کتابوں کے مصنف اور مرتب۔

ڈاکٹر حامد علی خاں ——— شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق ریڈر۔